بہار نمبر

گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

مارچ 2015

نگران اعلیٰ

معراج رسول

نگہت سیما اور رفاقت جاوید کے متاثر کُن ناول

عالمی یومِ خواتین پر شائستہ زرّیں کا پُر بہار سروے

اداکارہ سنبل اقبال کی پُر لطف باتیں

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

نگرانِ اعلیٰ: معراج رسول

مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول

مدیرہ: انجم انصار

معاون: آمنہ حماد



رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا اے حمید 0323-2895528

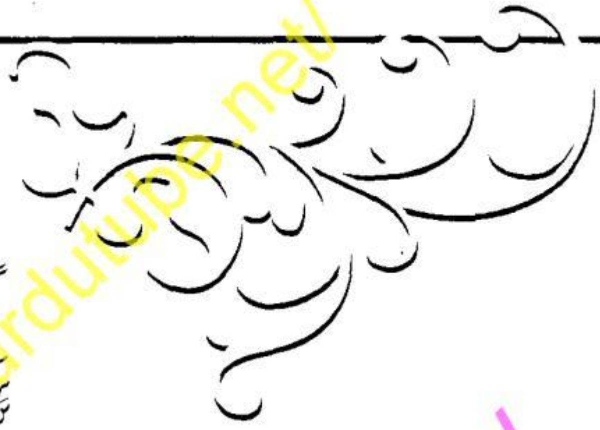
نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400

قیمت فی پرچا (پاکستان) 60 روپے

قیمت فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

زرسالانہ (اندرونِ ملک) 800 روپے ...... جلد 42 شمارہ: 12 مارچ 2015ء

اسٹائلنگ .... میک اپ روز بیوٹی پارلر .... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا



اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

مکمل ناول

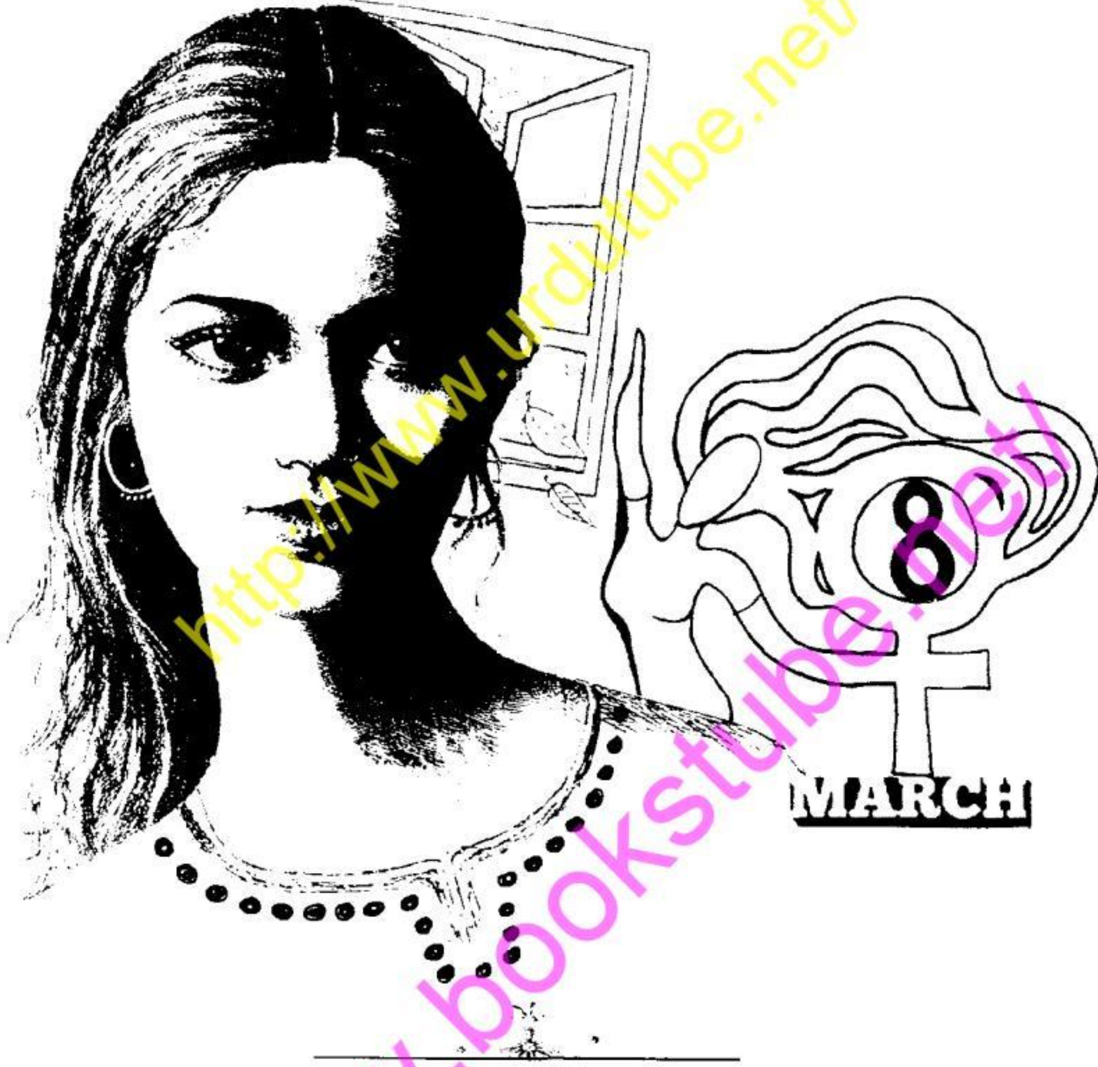
منی ناول

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ھاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com



جاسوسی ڈائجسٹ میں

انگارے



ایک نیا شاہکار سلسلہ

آپ کے محبوب مصنف کے قلم سے

زندگی کی رعنائیاں اور ہولناک سچائیاں

اپنے دامن میں سمیٹے

ایسی طویل، سنسنی خیز اور تحیر انگیز کہانی

جسے قارئین ایک ہی نشست میں پڑھنے پر خود کو مجبور پائیں گے

اس دلچسپ داستان کے مصنف کا صحیح نام

بھیجنے والے قارئین کے نام اگلے شمارے میں شائع

کیے جائیں گے۔ قرعہ اندازی کے ذریعے

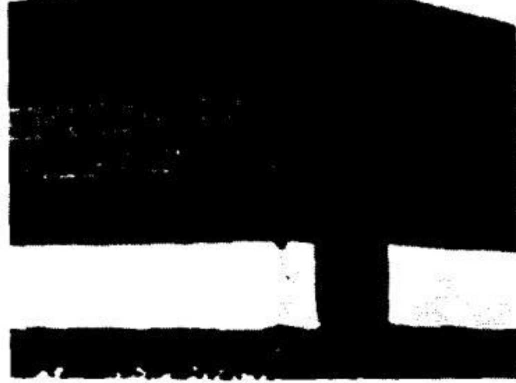
دس کامیاب قارئین کو مئی 15 کا شمارہ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک مفت ارسال کیا جائے گا

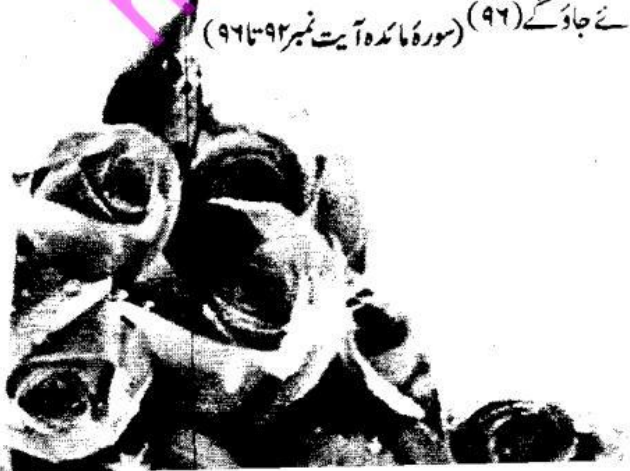


''جب سے میں نے ہوش سنبھالا ...... پریشانیوں کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔'' یہ شکوہ ہم اکثر لوگوں سے سنا کرتے ہیں۔ اگر میں خوب صورت ہوتی، اگر ہمارے پاس پیسہ ہوتا، اگر ہمیں بھی کوئی سنہری موقع مل جاتا...... اگر ہمارا بھی کوئی بڑا انعام نکل آتا...... یہ شکوے بھی اب ہر دوسرے نہیں تو چوتھے شخص کی زبان پر ضرور موجود ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ، ساتھ ایسے لوگ بھی ہمیں نظر آتے ہیں جو ہر حال میں خوش رہتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی تن آسانی کا نام نہیں بلکہ ایک جہدِ مسلسل کا نام ہے۔ وہ دشواریوں کا رونا نہیں روتے بلکہ ان سے دامن بچانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور آج آپ سے یہی کہنا ہے کہ سخت ترین جنگ وہ ہوتی ہے جو ہم حوصلہ شکنی کے خلاف لڑتے ہیں...... یہ وہ مہلک اور ہولناک بیماری ہے جو ہماری شدید ترین آرزوؤں، تمناؤں اور حوصلوں کے سوتے خشک کر کے رکھ دیتی ہے۔ یاد رکھیے...... زندگی کا سنہری اصول آج بھی یہی ہے کہ کوشش نہ کرنے سے کوشش کر کے ناکام ہو جانا لاکھ درجے بہتر ہے۔ جو لوگ اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی فکر کیے بغیر کوشش کرتے رہتے ہیں وہ ضرور کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بعض لوگوں کو اپنی ناکامی کا اتنا یقین ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ پیر چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ پھر نقصان اٹھاتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ دوسروں پر یقین کرنے کے بجائے اللہ کی ذات پر یقین رکھیں اور اپنی صلاحیتوں اور محنت پر اعتماد کر کے جدوجہد کرتے رہیں۔ انشاءاللہ کبھی ناکام نہیں ہوں گے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے اور وہی ہم سب کا رازق ہے۔

مدیرہ
انجم انصار

اور اللہ کی اطاعت کرو اور (اس کے) رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو اور (اللہ کی نافرمانی سے) بچتے رہو پھر اگر تم اعراض کرو گے تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صاف، صاف پہنچا دینا (فرض) ہے (۹۲) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے ان پر کچھ گناہ نہیں اس چیز میں کہ وہ اس کو کھائیں جبکہ انہوں نے پرہیزگاری کی اور ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے پھر انہوں نے پرہیزگاری کی اور ایمان لائے پھر انہوں نے پرہیزگاری کی اور نیک کام کیے اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے (۹۳) اے ایمان والو (حالت احرام میں) کچھ شکار سے کہ اس تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکتے ہوں ضرور اللہ تمہاری آزمائش کرے گا تا کہ اللہ اس کو ممتاز کردے جو غائبانہ اس سے ڈرتا ہے پس جو کوئی اس کے بعد (اللہ کے حکم سے) آگے بڑھ جائے گا (اور اس شکار پر ہاتھ ڈالے گا) تو اس کے لیے درد دینے والا عذاب (تیار) ہے (۹۴) اے ایمان والو حالتِ احرام میں تم شکار کو نہ مارو اور تم میں سے جو کوئی اسے قصداً مارے گا تو جس (شکار) کو مارا ایسے چوپایوں میں سے اس کا مثل جسے تم میں سے دو معتبر آدمی تجویز کردیں (اس جرم کا) بدلہ ہے۔ قربانی ہو کعبے تک پہنچے والی (یعنی کعبے کی حد میں لے جا کر قربانی کی جائے) یا (اس جرم کا) کفارہ فقیروں کو کھانا کھلانا ہے یا اس کے برابر روزے رکھنا (یہ کفارہ وغیرہ) اس لیے (ہے) کہ وہ اپنے کام کی سزا کا مزہ چکھ لے جو کچھ گزر چکا اس سے اللہ نے درگزر فرمائی اور جو کوئی دوبارہ کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا اور اللہ غالب (اور) صاحب انتقام ہے (۹۵) تم کو دریا کا شکار اور اس کا کھانا جائز کردیا گیا (محض) تمہارے فائدے کے لیے اور قافلے کے لیے اور جنگل (کے جانوروں) کا شکار جب تم احرام میں ہو تم پر حرام کردیا گیا اور (تمہیں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ) اس اللہ سے ڈرتے رہو جس کی طرف تم (مرنے کے بعد) اٹھائے جاؤ گے (۹۶) (سورۂ مائدہ آیت نمبر ۹۲ تا ۹۶)





سیدنا محمود ﷺ

۶۔مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں 'کوثر' میں ہر خیرِ کثیر داخل ہے اور اس خیر میں مراتب قرب و درجاتِ عالی سے لے کر بقائے دین اور ترقیِ اسلام سب کچھ شامل ہے جو بذاتِ خود موجب کثرت ہے۔

۷۔مولانا نعیم الدین مرادآبادیؒ نے اس کی تشریح یوں کی ہے۔"اللہ نے آپ ﷺ کو فضائلِ کثیرہ عنایت کر کے تمام خلق پر افضل کیا ہے حسن ظاہر، حسن باطن، نسب عالی، نبوت، کتاب و حکمت، شفاعت، حوض، کثرت فتوح، نعمتیں اور جن کی کوئی حد نہیں، یہ سب کوثر میں شامل ہیں۔

۳۔الحدیث:

۱۔حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (بعد انشقاق الارض کی حالت کی نسبت) فرمایا کہ مجھ کو جنت کے جوڑوں میں سے ایک جوڑا پہنایا جائے گا پھر میں عرش کی داہنی طرف کھڑا ہوں گا کہ کوئی شخص خلائق میں سے بجز میرے اس مقام پر کھڑا نہ ہوگا۔(آپ ﷺ کو اس مقام پر دیکھ کر سب اگلے اور پچھلے رشک کریں گے) ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہی مقامِ محمود ہے جہاں سے میں اپنی امت کی سفارش کروں گا۔

۲۔حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ قیامت کے روز ہر امت اپنے، اپنے پیغمبر کے پیچھے چلے گی اور کہے گی کہ اے وہ! خدا کی درگارہ میں ہماری شفاعت کیجیے جہاں تک کہ معاملہ حضور ﷺ تک پہنچے گا۔ یہی وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو مقامِ محمود میں اٹھائے گا۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس

اعتبارِ وفا

قسط ۔ 7

نگہت سیما

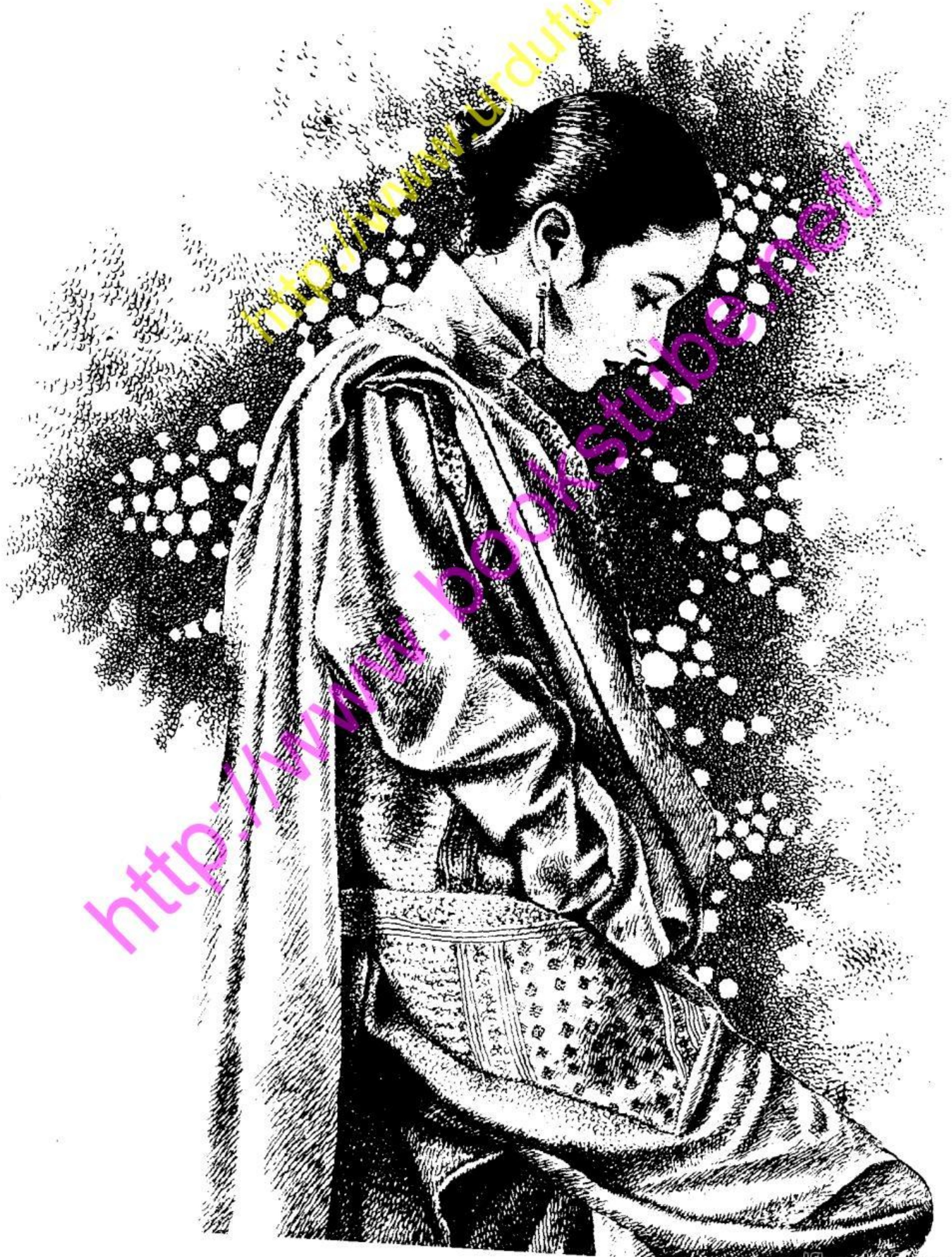
یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا . . . گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے . . . کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سجھائی تک نہیں دیتی۔

ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے . . . لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے . . . اور مان لیا جائے . . . کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے . . . اور وفا کے غنچے وہیں کھلتے ہیں . . . جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصّہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں





ثمر حیات وہاں انٹرنس پر ہی ایک بڑے سے آرائشی گملے کے پیچھے رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس پر ہلکی سی گھبراہٹ طاری ہوئی تھی۔

''یہ...... یہ یہاں؟'' وہ نہیں چاہتا تھا کہ زندگی کے اس موڑ پر اس کا اس سے سامنا ہو، وہ اپنے لیے آئندہ زندگی کا جو پلان بنا رہا تھا اس میں ماضی کے کسی حوالے کی گنجائش نہیں تھی۔ خاص طور پر اسے تو اب وہ کبھی دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنی اور عظام کی زندگی میں کوئی ہلچل نہیں چاہتا تھا۔ وہ وہیں پلر پر ہاتھ رکھے گملے کے پیچھے اس طرح کھڑا تھا کہ جب تک اندر سے آنے والا چکر کاٹ کر اس کے سامنے نہ آتا اس کا چہرہ نظر نہیں آسکتا تھا۔ عظام اپنی جھونک میں آگے نکل گیا تھا بلکہ ٹھٹک کر رک گیا تھا اور کچھ دیر کے لیے اس کے ذہن سے ثمر حیات کا خیال نکل گیا تھا۔ ان بیتے دنوں میں ہر رات اس نے دعا کی تھی کہ وہ لڑکی پھر کبھی مل جائے تو...... اور ہر بار اس نے سوچا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے، اس اتنے بڑے شہر کراچی میں وہ اس لڑکی کو دوبارہ دیکھ سکے جس کی ایک جھلک نے کئی راتوں اسے جگایا تھا۔ وہ اسے بلانا چاہتا تھا، بات کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اس پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر اس کے پاس سے گزر گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پہچان کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ وہ ایک سرسری سی نظر ڈال کر اپنے ساتھ والی لڑکی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ جس نے شوخ رنگوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اس نے میک اپ بھی کر رکھا تھا اور خاصی شوخ و شریر لگ رہی تھی جبکہ وہ آج بھی بغیر میک اپ کے تھی اور اس کا چہرہ ویسا ہی سپاٹ تھا، بے تاثر سا...... کیا تھا اگر اس کی آنکھوں میں پہچان کے رنگ جھلملاتے، لمحے بھر کے لیے ہی سہی، آخر بک شاپ پر وہ کاؤنٹر پر کافی دیر کھڑی رہی تھی اور کیا عظام ایسا لڑکا تھا کہ جسے ایک بار دیکھنے کے بعد کوئی دوسری بار پہچان نہ سکے۔ عظام کو افسوس ہوا لیکن پھر اسے خود ہی اپنی کیفیت پر ہنسی آگئی۔ اس روز بک شاپ تک آتے اور بک شاپ کے اندر نہ جانے کتنے لوگوں کو دیکھا ہوگا اور ضروری تو نہیں کہ اس نے مجھے بھی اسی دھیان سے دیکھا ہو جس سے میں نے اسے دیکھا تھا۔ اور اگر دیکھا بھی تھا تو ضروری تو نہیں کہ میری طرح سوچا بھی ہو۔ اس نے ثمر حیات کو دیکھنے کے لیے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی وہ اسے گملے کے پاس پلر پر ہاتھ رکھے کھڑے نظر آئے۔

''پاپا......!'' وہ تیزی سے اس کی طرف آیا تو وہ اب رخ موڑ چکے تھے اور پلر پر ہاتھ رکھے گلاس ڈور سے باہر دیکھ رہے تھے۔ وہ پارکنگ کی طرف جا چکی تھی اور وہ سوچ رہے تھے کہ ''یہ...... یہاں؟''

''پاپا......'' اس نے قریب آکر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''آپ ٹھیک تو ہیں ناں...... اس طرح کیوں کھڑے ہیں؟''

''بس یونہی چکر سا آگیا تھا۔'' وہ مسکرایا۔

''سوری پاپا...... میں اپنے دھیان میں آگے نکل گیا۔'' وہ تشویش سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ''مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ آپ پیچھے رک گئے ہیں۔ اگر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تو واپس چلتے ہیں گھر۔''

''ایسا کچھ نہیں، ٹھیک ہوں میں۔''

''سوری پاپا...... آپ تھکے ہوئے تھے ناں...... آپ کو آرام کرنا چاہیے تھا۔ لیکن بس میرا جی چاہ رہا تھا کہ ہم اکٹھے باہر لنچ کریں اور پھر لمبی ڈرائیو پر جائیں، ڈھیر ساری باتیں کریں، صبح تو ویسے بھی آپ نے چلے جانا ہے۔''

''کوئی بات نہیں میری جان، تم یونہی پریشان ہو گئے، میں بالکل ٹھیک ہوں...... چلیں؟''

''نہیں پاپا...... اگر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو واپس چلتے ہیں بلکہ مجھے لگ رہا ہے کہ آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ آدمی بہت حریص ہوتا ہے ناں پاپا...... اتنے دن آپ چوبیس گھنٹے میرے ساتھ رہے اور میں مزید کی حرص کر رہا ہوں۔''

''تو کرو میری جان مزید حرص کروتا کہ میں جلد از جلد اس جال سے نکل کر تم تک پہنچ جاؤں۔'' ثمر حیات مسکرایا۔

''کیسا جال پاپا؟'' عظام نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ...... یہی بزنس کا جال جو پھیلا رکھا ہے......'' ثمر حیات نے بات کر کے قدم آگے بڑھایا۔

''چلو......'' اور دونوں ایک خالی میز کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

موتیا بیڈ پر نیم دراز تھی۔ سنہری اس کے قریب ہی بیٹھی ناخنوں سے کیوٹیکس اتار رہی تھی۔ سجل نیچے کارپٹ پر دیوار کے ساتھ لگے میٹرس پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

یہ تینوں کا مشترکہ کمرا تھا کیونکہ یہ صرف دو بیڈروم کا فلیٹ تھا۔ ایک بیڈروم شاہجہان بیگم کے پاس تھا۔ موراں بھی انہی کے کمرے میں نیچے کارپٹ پر اپنا بستر لگا لیتی تھی۔ ظہورا دن بھر تو جہاں بھی ہوتا پر رات کو لاؤنج میں سوتا تھا۔ شاہجان کے باقی بندے سازندے وغیرہ ایک الگ گھر میں رہتے تھے۔ شاہجہان کو ضرورت ہوتی تو انہیں بلا لیتی۔ ان کا خرچہ پانی، گھر کا کرایہ وغیرہ سب اس کے ذمے ہی تھا۔ چونکہ بیڈروم زیادہ بڑا نہیں تھا اس لیے ایک ڈبل بیڈ کے علاوہ ایک میٹرس بچھا دیا گیا تھا۔ موتیا اور سنہری بیڈ پر سوتی تھیں جبکہ سجل میٹرس پر...... میٹرس پر اس کی کتابیں وغیرہ بھی پڑی رہتی تھیں۔ جب پڑھ لیتی تو دیوار گیر الماری میں رکھ دیتی اور مزید لے آتی۔ اس وقت بھی تکیے کے پاس دو تین کتابیں پڑی تھیں اور ایک اس کے ہاتھ میں تھی۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی موتیا کہ یہ اماں کو یکا یک کراچی آنے کی کیا سوجھی۔ اچھے بھلے تو رہ رہے تھے وہاں۔'' سنہری نے ناخنوں سے نیل پالش اتارتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''اماں کو یکا یک کوئی بات نہیں سوجھتی سنہری، وہ مہینوں سے پروگرام بنا رہی تھیں۔'' موتیا نے اس کے ہاتھ سے نیل پالش ریموور لیا اور خود بھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ''کیا تم نئی نیل پالش لائی ہو؟''

''ہاں......'' سنہری نے سر ہلایا...... اور روئی اس کی طرف بڑھائی۔

''لیکن موتیا، اماں نے کراچی آنے کا فیصلہ کیا ہی کیوں؟ وہاں لاہور میں ہم کتنا خوش تھے۔ یہاں آئے سال ہونے والا ہے لیکن میرا ذرا دل نہیں لگا ابھی تک۔''

''پتا نہیں۔'' موتیا بھی اب ناخنوں سے نیل پالش اتار رہی تھی۔ ''لیکن اماں کوئی کام بلاوجہ نہیں کرتیں۔ کوئی مقصد تو ہوگا ان کا۔''

''کیا مقصد ہوگا بھلا؟'' سنہری بڑبڑاتے ہوئے اٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے دو تین نیل پالش نکالیں اور واپس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے موتیا کی طرف دیکھا۔ ''وہاں محلے کا سب سے بڑا اور شاندار گھر تھا ہمارا...... سب محلے والیاں رشک کرتی تھیں اور سب سے زیادہ رونق بھی تو ہمارے چوبارے پر ہوتی تھی...... بالی اور رادھا میری کتنی اچھی سہیلیاں تھیں...... اور یہاں یہ......'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''یہ دو بالشت کا فلیٹ...... میرا تو دم گھٹتا ہے اس قید خانے میں...... اوپر سے اماں کا حکم کہ کسی بھی بلڈنگ والے سے فالتو بات نہیں کرنی...... وہ نیچے کے فلیٹ والی لڑکی نہیں ہے گول مٹول سی، اس نے تو کل مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دی تھی لیکن اماں کا آرڈر......''

''ہیں...... تجھے وہ کہاں ملی؟'' موتیا نے حیرت سے پوچھا۔

''سیڑھیوں میں اور کہاں۔'' سنہری نے اپنی چھوٹی سی ناک چڑھائی اور نیل پالش کی ایک شیشی اس کی طرف بڑھائی۔ ''لو یہ ٹرائی کرو، بہت پیارا کلر ہے۔''

موتیا نے شیشی لے لی تو وہ خود بھی نیل پالش اپنے ناخنوں پر لگانے لگی۔

''موتیا تم چلو گی میرے ساتھ نیچے والی لڑکی کے گھر؟''

''نہیں......'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تمہیں پتا تو ہے اماں نے منع کر رکھا ہے، آس پاس کے لوگوں سے زیادہ میل جول رکھنے سے۔''

''لیکن کیوں موتیا، اس میں حرج ہی کیا ہے؟'' سنہری نے اپنے ناخنوں پر پھونک مارتے ہوئے موتیا کی

طرف دیکھا۔
''اس لیے کہ لوگوں کو ہماری حقیقت پتا چل گئی تو انہوں نے ہمیں یہاں نہیں رہنے دینا۔''
سجل نے کتاب سے نظریں ہٹا کر سنہری کی طرف دیکھا اور پھر کتاب پر نظریں گاڑ دیں۔ سنہری لمحہ بھر کے لیے سٹپٹا گئی۔
''کیا ہمارے ماتھوں پر لکھا ہے کہ ہم کون ہیں؟'' سنہری بڑبڑائی اور دوسرے ہاتھ پر نیل پالش لگانے لگی۔ نیل پالش لگا کر اس نے پھونک مارتے ہوئے موتیا کی طرف دیکھا جو بہت اطمینان سے اپنے لمبے ناخنوں پر نیل پالش لگا رہی تھی۔ لمحہ بھر وہ اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل پر شیشی رکھ کر سجل کے پاس آکر کھڑی ہو گئی جو اس سے بے نیاز کتاب پڑھنے میں مگن تھی۔
''سجو تمہیں بھی تو لاہور یاد آتا ہوگا؟''
''ہاں......'' سجو نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔
''تمہاری پڑھائی بھی تو چھوٹ گئی ہے، تمہیں افسوس تو ہوتا ہوگا۔ اتنا شوق جو تھا تمہیں پڑھنے کا...... اور پھر وہ تمہاری سہیلی کیا نام تھا اس کا آمنہ...... جس کی بہت ساری تصویریں تھیں تمہارے پاس اور جو تمہاری چھٹیوں میں تمہیں روز فون کرتی تھی۔ وہ تو ضرور یاد آتی ہوگی ناں تمہیں......'' سجل نے بس ایک نظر اٹھا کر سنہری کی طرف دیکھا اور پھر کتاب کی طرف متوجہ ہوگئی۔
''سجو...... تم ہماری سگی بہن ہو لیکن ہم سے یوں دور، دور رہتی ہو جیسے ہماری کچھ نہیں لگتی ہو۔'' سنہری کا منہ پھول گیا تھا۔
''ایسا نہیں ہے سنہری۔'' اس کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن آنکھوں میں گداز سا تاثر لمحے بھر کے لیے نمودار ہو کر معدوم ہوگیا تھا۔
''تو پھر کیا ہے؟ دس باتیں کرو تو ایک کا جواب دیتی ہو۔'' سنہری کا منہ ہنوز پھولا ہوا تھا۔
''تمہاری باتوں کا کیا جواب دوں سنہری...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا اور میری باتیں تمہیں سمجھ نہیں آتیں۔''
''تمہاری باتیں ہماری سمجھ میں نہ آئیں تو ٹھیک ہے، ہم تمہاری طرح پڑھے لکھے نہیں ہیں لیکن ہماری باتیں تو تمہیں سمجھ آنی چاہئیں ناں۔ ایک ہی ماحول میں ایک ہی جگہ پلے پڑھے ہیں...... بچپن میں تو تم میری گود سے اترتی ہی نہیں تھیں۔ ڈھنگ سے اٹھانا بھی نہیں آتا تھا پھر بھی میری گود میں چڑھی رہتی تھیں۔'' سنہری نے شکوہ بھری نظروں سے اسے دیکھا تو وہ نادم ہوگئی۔
''سوری سنہری......'' اس نے کتاب اوندھی کر کے رکھ دی اور دونوں گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ''چلو اِدھر میرے پاس بیٹھو اور کرو باتیں...... میں سن رہی ہوں......'' سنہری اس کے قریب ہی میٹرس پر بیٹھ گئی۔
''میں تو بس یہ پوچھ رہی تھی کہ تمہیں لاہور یاد آتا ہے۔ یہاں دل لگ گیا ہے تمہارا؟''
''میرے لیے تو ساری جگہیں ایک جیسی ہیں سنہری...... پھر بھی یہاں لاہور کی نسبت اچھا ہے...... کم از کم یہاں اس فلیٹ میں رہتے ہوئے ہم کچھ دیر کے لیے سہی خود کو دھوکا تو دے سکتے ہیں کہ ہم وہ نہیں ہیں۔''
''لیکن وہاں......؟'' سنہری پتا نہیں کیا کہنا چاہتی تھی لیکن پھر اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔
''مجھے پتا ہے تمہارا دل وہاں لگتا تھا یہاں نہیں لگتا۔ یہاں بھی تو کوئی نہ کوئی ایسا شاہی محلے جیسا محلہ ہوگا ناں...... جہاں ہم جیسے رہتے ہیں پھر پتا نہیں اماں نے یہاں رہنا کیوں پسند کیا...... تم اماں سے کہو ناں کہ تمہارا دل یہاں نہیں لگتا کسی ایسی ہی جگہ پر چلیں جہاں ہم جیسے رہتے ہوں۔ یہاں رہنے سے نہ ہماری اصلیت بدلی ہے نہ

کام، آخر تم لوگ جاتو رہی ہو ناں ناچنے، گانے......'' سجل کے لہجے کی تلخی کو موتیا نے میٹھے گھونٹ کی طرح اندر اتارتے ہوئے سوچا۔ ''سجل اگر خاموش رہتی ہے تو اچھا کرتی ہے، یہ سنہری کو بھی خواہ مخواہ پنگا لینے کا شوق ہے۔''
موتیا کو بھی اماں کی طرح سجل سے بے حد محبت تھی وہ سجل سے کبھی کچھ نہیں کہتی تھی۔ سجل جو بچپن سے ہی کم گو تھی جب بولتی تو اس کی باتوں کی تلخی موتیا کو دیر تک اپنے اندر محسوس ہوتی رہتی۔

''ہم جو ہیں سجو، وہ ہیں، ہم نہ اپنی اصلیت بدلنے پر قادر ہیں نہ...... خیر چھوڑو...... یہ لمبی بات ہوگی۔ اور سنہری سنو تمہیں ایک بات بتاؤں۔'' وہ سجل کے چہرے سے نظریں ہٹا کر سنہری سے مخاطب ہوئی۔

''کیا......؟'' سنہری اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''بہت جلد تمہاری اس بند فلیٹ سے جان چھوٹ جائے گی۔ اماں یہ فلیٹ چھوڑ کر ایک بنگلے میں منتقل ہونے والی ہیں۔''

''کیا...... اماں کے ہاتھ کوئی خزانہ لگ گیا ہے یا اس عمر میں کوئی رئیس فدا ہو گیا ہے اماں پر؟'' سنہری کا اندازِ گفتگو یہی تھا سجل نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔

موتیا کو ہنسی آ گئی۔

''پتا نہیں خزانہ ہاتھ آیا ہے یا کوئی رئیس...... فدا ہوا ہے لیکن اماں ظہورے سے کہہ رہی تھیں کہ فلیٹ کے مالک کو بتا دینا کہ اگلے ماہ ہم فلیٹ چھوڑ رہے ہیں۔''

''سچی؟'' سنہری نے پاس بیٹھی موتیا کے بازو پر ہاتھ مارا۔ موتیا نے گھور کر اسے دیکھا۔

''دیکھنے میں اتنی دبلی پتلی ہے اور ہاتھ اتنا بھاری ہے تیرا۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ مجھ سے دور بیٹھا کر یا ہاتھ پیر سنبھال کر رکھا کر۔'' لیکن سنہری نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لے کر موتیا کی طرف دیکھا۔

''ہائے ہم پر آج تک کوئی ایسا فدا نہ ہوا جیسی کہانیاں اماں سناتی ہیں۔ ہماری پڑنانی پر ایک نواب ایسا فدا ہوا کہ اپنی اتنی بڑی محل نما حویلی اس کے نام کر دی اور وہ کیا نام ہے رادھا...... رادھا کی نانی کی ماسی (خالہ) پر تو ایسا عاشق ہوا کہ بیاہ کر ساتھ ہی اپنے محل میں لے گیا...... پتا نہیں اماں کی کہانیاں کتنی سچ ہیں پر میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ مجھ پر بھی کوئی نواب عاشق ہو جائے اور اپنا محل میرے نام کر دے۔''

''آج کل ایسے نواب نہیں ہوتے سنہری...... اماں بھی جانے کن وقتوں کی باتیں کرتی ہیں۔'' موتیا بیزار ہوئی۔

''اچھا محل نہ سہی، دو کمروں کا مکان ہی سہی۔''

''چل اب زیادہ خواب نہ دیکھ۔ ذرا دیکھ موراں باہر لاؤنج میں بیٹھی ہے؟'' سنہری اٹھی دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور پھر مڑ کر موتیا کی طرف دیکھا۔

''ہاں...... ٹی وی دیکھ رہی ہے، بلاؤں اسے؟''

''ہاں...... نہیں......'' موتیا نے اپنے ناخنوں کا جائزہ لیا۔ نیل پالش خشک ہو چکی تھی۔ اس نے سنہری کی طرف دیکھا جو ابھی تک دروازے کا پٹ تھامے کھڑی تھی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر بنا کچھ کہے لیٹ گئی اور منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ اب اس نے سنہری کی کسی بات کا جواب نہیں دینا۔ سنہری کچھ دیر کھڑی رہی اور پھر آ کر میٹرس پر سجل کے پاس بیٹھ گئی۔

لاہور کے شب و روز یہاں کے شب و روز سے بالکل مختلف تھے۔ وہاں اس کے پاس سوچنے کے لیے فراغت نہیں ہوتی تھی۔ دن بھر سونا شام کو تیار ہو کر انتظار کرنا پھر گانے بجانے اور رقص کی محفل...... لیکن یہاں تو جیسے سب روٹین بدل گئی تھی اور فارغ وقت میں سیکڑوں باتیں اس کے دماغ میں آتی چلی جاتیں۔

''سجو......'' اس نے سجل کا بازو ہلایا جو سنہری اور موتیا کو باتیں کرتا دیکھ کر پھر کتاب اٹھا چکی تھی۔ سجل نے کتاب سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ جو تو ہر وقت پڑھتی رہتی ہے، ان کتابوں میں کیا لکھا ہوتا ہے؟''

''کہانیاں......'' سجل کا جواب مختصر تھا۔

''کیسی کہانیاں سجو؟'' سنہری کے لہجے سے اشتیاق جھلکتا تھا۔

''جیسی اماں سناتی ہیں نوابوں کی اور حویلیوں کی......؟''

''ہاں کبھی، کبھی ایسی کہانیاں بھی ہوتی ہیں لیکن ہمیشہ نہیں۔''

''کیا یہ کہانیاں سچ ہوتی ہیں سجو؟'' اس کی آنکھوں میں تجسس تھا۔

''کچھ سچ کچھ جھوٹ۔''

''اچھا......'' لمحہ بھر چپ رہ کر اس نے پھر پوچھا۔ ''سجو سچ بتا نا یہ جو اماں نوابوں کی باتیں کرتی ہیں۔ کیا سچ میں ایسے نواب ہوتے ہیں جو ہم جیسوں کو حویلیاں دان کر دیں؟'' سجل نے [illegible] اسے دیکھا۔

''پتا نہیں...... موتیا کہہ تو رہی تھی کہ اماں پرانے وقتوں کی باتیں کرتی ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے آج کل نواب نہیں ہوتے لیکن عام بندے تو ہوتے ہیں، کیا ان کے سینے میں دل نہیں ہوتا اور کیا ان کا دل کسی پر نہیں آ سکتا؟''

''یہ تم کیا ہر وقت اوٹ پٹانگ باتیں کرتی رہتی ہو۔'' موتیا نے یک دم کروٹ بدل کر اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں میری باتوں سے تکلیف ہو رہی ہے تو نہ سنو میری باتیں...... کان بند کر لو۔ میں تو کروں گی ایسی ہی باتیں...... اوٹ...... پٹانگ......'' سنہری کی رنگت بدلی وہ ایسی ہی تھی غصہ تو اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ ذرا سی بات پر لال پیلی ہونے لگتی اور پھر ذرا دیر میں ٹھنڈی بھی ہو جاتی۔ شاہجہان کہتی تھی۔

''ارے یہ سنہری ایسی ہی ہے تیّا مرچ...... پر جب میٹھی ہو تو ایسے جیسے گڑ جس کی مٹھاس دیر تلک زبان پر رہے۔''

موتیا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر تڑخ کر بولی۔

''تو کرتی رہو ایسی اوٹ پٹانگ باتیں لیکن کوئی نواب نہیں آنے والا تمہیں اپنے محل میں لے جانے کے لیے۔''

سنہری کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور آنکھوں میں نمی پھیلتی چلی گئی۔ سجل کے دل کو دھکا سا لگا۔

''سنہری......'' اس نے سنہری کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''ہماری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ یہاں ہی اماں کے گھر اسی ماحول میں پیدا ہونا۔ ہم اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوئے اور اپنی مرضی سے اپنی تقدیر نہیں بدل سکتے۔''

''ٹھیک ہے ہم اپنی مرضی، اپنی پسند کے گھر میں پیدا نہیں ہو سکتے لیکن ہم اپنی مرضی کی زندگی کیوں نہیں گزار سکتے، اپنی تقدیر کیوں نہیں بدل سکتے؟'' سنہری اب موتیا کی طرف سے چہرہ موڑ کر سجل کو دیکھ رہی تھی۔ سجل نے...... بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے بازو سے ہٹا لیا...... اور دلگرفتگی سے بولی۔

''نہیں بدل سکتے سنہری نہ اپنی تقدیر...... نہ مقدر اور نہ اپنی مرضی کی زندگی جی سکتے ہیں۔''

''لیکن کیوں سجو؟ کیوں نہیں ہم اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتے، کیوں اپنی تقدیر نہیں بدل سکتے، پیدا ہونا تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے لیکن اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنا تو ہمارے اختیار میں ہے۔''

''بعض اوقات اختیار ہوتے ہوئے بھی آدمی بے اختیار ہی ہوتا ہے سنہری......'' سجل کے سپاٹ چہرے پر ایک نرم سا تاثر ابھرا تھا۔

''کیا مطلب......؟'' سنہری نے بھویں اچکائیں اور پھر سوالیہ نظروں سے سجل کی طرف دیکھا جو اپنے ہاتھ

پھیلائے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ جو بندہ جس ماحول میں پیدا ہو، ساری زندگی اسے اسی ماحول میں رہنا ہے، کیا امیر، غریب نہیں ہو جاتا، کیا موچی کی اولاد پڑھ لکھ کر ڈاکٹر انجینئر نہیں بن جاتی...... کیا اسلام آنے پر بت پرستوں کے گھروں میں پیدا ہونے والے مسلمان نہیں ہو گئے تھے تو ہم بھی اپنا پیشہ چھوڑ کر کچھ اور کر سکتے ہیں۔'' سنہری جوش سے تیز، تیز بول رہی تھی سجل اور موتیا حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''یہ سنہری آج کچھ زیادہ ہی جوش میں ہے، کہیں دال میں کچھ کالا تو نہیں۔'' موتیا نے سوچا اور پھر خود ہی اس کی تردید کی۔

''ایک سال پہلے تو ہم کراچی آئے ہیں اور کوئی بھی مرد اس فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر نہیں آیا تو پھر کیا......'' اس کے ذہن کی رو پھر بدلی۔ ''حیدر آباد میں سائیں کے ڈیرے پر یا پھر ملک کی شادی میں یا......'' اس نے عجیب کھوجتی ہوئی سی مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ ''کون ہے وہ سنہری جس نے تجھے اتنی باتیں سکھا دیں؟''

''کس نے ہونا ہے بھلا......'' سنہری کی آنکھوں میں کوئی حسرت کلبلائی۔ ''یہ تو میں خود ہی سوچتی ہوں جب ہر بندہ اپنے ماحول سے بہتر ماحول میں جانے کی کوشش کرتا ہے تو پھر ہم کیوں نہیں...... ہم کیوں لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔''

''تم ایسا سوچتی ہو سنہری ماحول اور کام بدلنے کے متعلق......؟'' سجل کے چہرے پر ابھی تک وہی نرم سا تاثر بکھرا ہوا تھا۔

''ہاں، میں سوچتی ہوں۔'' سنہری نے باری، باری دونوں کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی سوچ پر کوئی شرمندگی نہ تھی۔ ''اس لیے کہ میں انسان ہوں، کولہو کا بیل نہیں ہوں۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ ساری زندگی آنکھوں پر کھوپے چڑھا کر ایک ہی دائرے میں نہ گھومتی رہوں۔ مجھے زیادہ پتا نہیں تھا باہر کی دنیا کا...... لیکن جب سے ہم کراچی آئے ہیں اور میں نے ٹی وی کے ڈرامے دیکھنے شروع کیے ہیں۔ ایک گھر، بچے، محبت کرنے والا شوہر، معاشرے میں ایک مقام...... ان کی اتنی مختلف زندگی دیکھ کر میرے دل میں بھی خیال آتا ہے کہ میری زندگی ایسی کیوں نہیں ہو سکتی...... یہ اتنی مختلف کیوں ہے...... اگر ہے تو میں اسے بدل کیوں نہیں سکتی۔ کیوں کوشش نہیں کر سکتی۔''

''تم کوشش کر سکتی ہو سنہری...... شاید تم اپنی زندگی بدلنے میں کامیاب ہو جاؤ۔'' سجل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ سنہری کو کیسے مطمئن کرے۔ اس نے پہلی بار سجل سے اس طرح کی باتیں کی تھیں۔

''اور اس کوشش کا انجام کیا ہوگا؟'' موتیا خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔ ''رادھا کے چوبارے پر رہنے والی وہ لڑکی سانولی یاد ہے ناں تمہیں۔ اس نے بھی تو کوشش کی تھی اپنی زندگی بدلنے کی...... ایک دن ذلیل و خوار ہو کر واپس آ گئی۔ تمہارے ساتھ بھی کچھ الگ نہیں ہوگا۔'' موتیا اپنے لہجے کی تلخی چھپا نہیں سکی تھی۔

''تو نہ ہو کچھ الگ، افسوس تو نہیں ہوگا ناں کہ کوشش نہیں کی......''

''اچھا تو کیا کرو گی تم اپنی زندگی بدلنے کے لیے؟ ذرا مجھے بھی بتاؤ۔ کیا کسی دفتر میں افسر لگ جاؤ گی یا اسکول میں استانی بن جاؤ گی۔ الف، ب تو آتی نہیں تمہیں اور......''

''الف، ب جانے بغیر بھی تو زندگی بدلی جا سکتی ہے اگر کوئی چاہے تو...... ایک غریب شخص ساری زندگی اپنی زندگی بدلنے کے لیے کوشش کرتا رہتا ہے۔ الف، ب جانے بغیر......'' سنہری کو موتیا سے بحث کرنے میں مزہ آتا تھا۔

''کیسے...؟ لوگوں کے گھروں کی صفائی کرو گی، برتن مانجھو گی؟'' وہ ہنسی۔

''مانجھ لوں گی۔'' سنہری کو اس کا ہنسنا برا لگا۔

''اچھا......'' موتیا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تمہیں تو میری پیاری سنہری کسی نے اپنے گھر میں برتن مانجھنے

کے لیے بھی نہیں رکھنا۔ تیری یہ شکل صورت اور ناز و ادا دیکھ کر گھر والیاں ڈر جائیں گی کہ کہیں تم ان کے شوہروں کو ہی نہ پھانس لو، اپنا گھر برباد کرنے کا کسے چاؤ ہوتا ہے! یعنی تمہیں کوئی ماسی بھی نہیں رکھے گا لہٰذا خواہ مخواہ دھکے کھانے کا کیا فائدہ...... تم نے تو ساری زندگی کولہو کا بیل ہی بننا ہے سو اپنے دماغ پر بوجھ نہ ڈالا کرو۔ بس خوش رہا کرو میری طرح۔''

''تم خوش ہو اپنی زندگی سے؟'' سنہری نے پوچھا۔

''ہاں، بہت خوش اور مطمئن اور تمہیں بھی ہونا چاہیے۔''

''نہیں سنہری......'' سجل نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ ''تم اگر اس زندگی سے بہتر زندگی گزارنے کے لیے کوشش کرنا چاہتی ہو تو ضرور کرو...... لیکن اگر ناکام ہو گئیں تو اپنی ناکامی کا ڈھنڈورا مت پیٹنا۔''

سنہری نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''تاکہ دوسروں کے لیے راہیں مسدود نہ ہوں۔''

''کیا مطلب......؟'' سنہری سمجھ نہ سکی۔

''مطلب یہ کہ اگر کوئی اور تم جیسی ایسی کوئی کوشش کرنا چاہے تو تمہاری ناکامی جان کر کوشش کرنے سے پہلے ہی ہمت نہ ہار جائے۔''

''اچھا لیکن سجو میں کیا کوشش کروں اور کیسے؟'' سنہری، اب پریشان ہو گئی تھی اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے اپنی زندگی کا رنگ ڈھنگ بدل سکتی ہے۔

''کسی فیکٹری یا کارخانے میں جہاں عورتیں کام کرتی ہیں، وہاں کام مل جائے شاید۔'' تھوڑے سے تذبذب کے بعد سجل نے کہا۔

''ارے سجو، یہ تم کس چکر میں پڑ گئی ہو، اسے سال چھ مہینے بعد ایسے دورے پڑتے ہیں جب یہ ٹی وی ڈراموں میں بڑے، بڑے گھروں میں عورتوں کو راج کرتے دیکھتی ہے پھر دو چار دن میں خود ہی ٹھنڈی......''

''تم کوئی طریقہ نہیں بتا سکتیں تو اپنی زبان بند رکھو۔'' سنہری نے موتیا کو بات مکمل کرنے سے پہلے ہی ٹوک دیا۔

''ایک طریقہ ہے تو......'' موتیا کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''کیا......؟'' سنہری نے تجسس سے پوچھا۔

''کسی عقل کے اندھے اور کاٹھ کے الو کو پھانس لو......'' موتیا نے قہقہہ لگایا۔

''اچھا پھانس لوں گی۔'' سنہری کو پتا نہیں کیوں آج ضد سی ہو گئی تھی۔

''اور اس نے باپ کا نام پوچھا تو...... خاندان، پیشہ تو چھپا لو گی لیکن نکاح نامے میں باپ کا نام تو لکھا جائے گا ناں...... کیا بتاؤ گی؟''

''وہی جو اماں نے سجو کے اسکول کے فارم پر لکھوایا تھا۔'' سنہری بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی کبھی جو موتیا کے ساتھ بحث ہوتی تو ہار ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

سجل کا رنگ یک دم سپید پڑ گیا تھا۔ اس کے اسکول کالج کے سرٹیفکیٹوں پر ظہورے کا نام لکھا تھا اور وہ جانتی تھی ظہورا اس کا باپ نہیں ہے۔

''مجبوری تھی۔'' اماں نے ایک بار اس کے احتجاج پر کہا تھا۔ ''کچھ تو لکھوانا تھا ناں......'' اور پھر جب، جب ضرورت پڑی ظہورے کا ہی شناختی کارڈ اور نام کام آیا تھا۔

''یعنی ظہورے کا......'' موتیا نے پھر قہقہہ لگایا اور دوبارہ دیوار کی طرف کروٹ بدل لی۔ موتیا کے کروٹ بدلنے پر سنہری پھر سجل کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''سجو چل میں تو ان پڑھ ٹھہری...... اماں نے مجھے جو سکھایا مجھے وہی کرنا ہے، پر تجھے تو پڑھایا ہے تو کیا کبھی تیرے دل میں ایسا خیال نہیں آیا کہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے جیے......''

''اب بھی تو اپنی مرضی سے جی رہی ہوں سنہری......''

''نہیں، اپنی مرضی سے نہیں اماں کی مرضی سے۔'' سنہری نے اختلاف کیا۔ ''اماں نے تجھے پڑھنے بٹھایا، تو نے پڑھ لیا۔ ناچ گانا سکھاتی تو ناچ گانا سیکھ لیتی۔ اب بھی اماں نے ضرور تیرے لیے کچھ نہ کچھ سوچ رکھا ہوگا بلکہ مجھے تو لگتا ہے اماں نے تیرے لیے ہی لاہور چھوڑا ہے۔ کیا خبر کسی رئیس سے بات کر رکھی ہو۔ سودا کر دیا ہو تیرا۔''

''نہیں......'' سجل کانپ گئی۔

''یا پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے اماں تمہیں بھی ہمارے ساتھ ہی لگا دیں۔'' سنہری تو تھی ہی منہ پھٹ جو منہ میں آتا کہہ دیتی۔ سجل کا دل ابھی تک زور، زور سے دھڑک رہا تھا۔

''لیکن سجو تو نے پوری بارہ جماعتیں پڑھ رکھی ہیں، کہیں استانی لگ سکتی ہے، کسی دفتر میں نوکری کر سکتی ہے، افسری نہ سہی چھوٹی موٹی نوکری ہی سہی۔'' سنہری نے رائے دی۔

سجل نے بس ایک نظر اسے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

''تو اتنی پیاری ہے سجو، اتنی خوب صورت تیرے اسکول، کالج میں کیا کبھی کسی کا دل نہیں آیا تجھ پر......''

''میرے ساتھ لڑکے نہیں پڑھتے تھے سنہری۔''

''تو......؟'' سنہری کے لبوں پر شریر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''لڑکوں کی بہنیں، بھتیجیاں، بھانجیاں تو پڑھتی ہوں گی ناں تمہارے ساتھ، کسی کا جی نہیں چاہا تجھے اپنی بھابی، مامی، چاچی بنانے کو۔''

''نہیں......'' سجل کے چہرے پر کچھ دیر پہلے جو تھوڑی دیر کے لیے نرم سا تاثر ابھرا تھا اب نہیں تھا۔ وہ خالی اور سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اماں نے تو ذرا سمجھدار ہوتے ہی اسے سمجھا دیا تھا۔

''دیکھو سجو سہیلیاں نہ بناتی پھرنا وہاں...... بس اپنی پڑھائی کرنا صرف اور کسی سے اتنی بے تکلف مت ہونا کہ وہ تیرے گھر آنے کی ضد کر بیٹھے اور......'' اس سے آگے شاہجہان کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہ جانتی تھی سب...... اس نے اپنے سارے تعلیمی دور میں کسی سے دوستی نہیں کی تھی۔ نہ ہی کسی کے گھر گئی تھی نہ کسی کو گھر بلایا تھا۔ لڑکیاں اسے مغرور سمجھتی تھیں لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ آمنہ کالج میں اس کی کلاس فیلو تھی لیکن وہ آمنہ سے بھی کم ہی بات کرتی تھی پھر بھی اس نے سیکڑوں بار اس سے کہا تھا۔

''کاش میرا کوئی بھائی ہوتا تو میں تمہیں اپنی بھابی بنا لیتی۔''

''کیا تھا اگر اماں تجھے لڑکوں والے کالج میں داخل کرا دیتیں۔'' اب سنہری کا دماغ کسی اور ہی سمت چل پڑا تھا۔ ''لڑکے تو تجھے دیکھ کر......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''چلو زیادہ نہیں تو دو چار تو عاشق ہو ہی جاتے تجھ پر...... دیکھا نہیں تھا اسے کل...... وہی ہوٹل والا لڑکا...... کیسے ہونقوں کی طرح دیکھ رہا تھا تمہیں منہ کھولے جیسے فریز ہو گیا ہو۔''

کل شاہجہان کے ساتھ وہ اور سنہری شاپنگ کے لیے گئے تھے اور پھر سنہری کے اصرار پر ہی وہ کچھ کھانے پینے کے لیے گئے تھے اور واپسی پر اس نے اسے دیکھا تھا وہ وہی تھا بک شاپ والا لڑکا اسے پہچاننے میں اسے ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا۔

وہ تھا ہی ایسی سحر انگیز شخصیت کا مالک...... لیکن اماں نے کہا تھا کہ بہت سارے مرد تمہیں دیکھ کر رکیں گے، خبردار سجو تمہیں نہیں رکنا چاہے دل کتنا بھی مچلے...... اور اس نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''تم نے تو اس کی طرف دیکھا ہی نہیں...... دھیان سے دیکھ لیتیں تو پٹ سے وہاں ہی گر جاتا۔'' سنہری دل

کھول کر ہنسی لیکن بجل نے بنا کچھ کہے کتاب اٹھالی اور ورق گردانی کرنے لگی۔ لیکن وہ پڑھ تو نہیں رہی تھی بس ورق الٹتی جاتی تھی اور آنکھوں کے سامنے بار، بار اس بک شاپ والے لڑکے کی شکل آرہی تھی۔ سنہری کچھ دیر اسے دیکھتی رہی اور پھر اٹھ کر موتیا کا کندھا ہلایا۔

''سنو موتیا کیا اماں سچ مچ بنگلے میں جا کر رہیں گی؟''

''ہاں......'' موتیا نے کروٹ بدلے بغیر جواب دیا۔

''اماں وہاں جا کر کیا کریں گی؟''

''وہی جو لاہور میں کرتے تھے اور جو یہاں کررہے ہیں۔''

''جب یہی سب کچھ کرنا ہے تو لاہور والے گھر میں کیا برائی تھی۔''

''برائی تھی۔'' موتیا نے کروٹ بدل کر اسے گھورا۔ ''وہاں ایسے مخصوص محلوں میں اب صرف ٹٹ پونجیے آتے ہیں۔ ریڑھی والے، چرسی، افیونچی، بھوکے ننگے، چند ٹکے جیب میں ڈال کر آنے والے...... بڑے لوگ، پیسے والے اب بنگلوں میں آتے ہیں۔ اب ٹرینڈ بدل گیا ہے اور اماں وقت کی نبض پہچانتی ہیں۔''

''تو......کوٹھی یا بنگلا لاہور میں بھی تو لیا جا سکتا ہے۔'' سنہری بڑبڑائی۔

''کیا لاہور میں کسی کو روتا بلکتا چھوڑ آئی ہے جو لاہور کی ہڑک لگی ہے تجھے۔'' موتیا نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں، چھوڑ آئی ہوں۔'' سنہری کو آگ لگ گئی۔

''تو جا پھر اماں سے جا کر کہہ، میرا مغز نہ کھا۔ ساری دوپہر ضائع کردی تو نے۔ سونے دے مجھے۔'' سنہری نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی اور زوردار آواز سے دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

وہ ممی کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی اور وہ ہولے، ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ ڈیڈی کو اس دنیا سے رخصت ہوئے پندرہ دن ہوگئے تھے لیکن ابھی تک اس کے آنسو نہیں تھمے تھے۔ ابھی تک جدائی کا درد دل میں چٹکیاں بھرتا تھا اور آنکھیں برسنے لگتیں۔

''ممی!'' اس نے یک دم آنکھیں کھول کر اُن کی طرف دیکھا۔ ''ڈیڈی......میرے لیے کیوں پریشان رہتے تھے؟'' بہت دنوں سے اندر چکراتا ہوا سوال لبوں پر آگیا تھا۔

''شاید تمہاری دوری کی وجہ سے کئی، کئی ماہ تو تم سے ملاقات نہیں ہو پاتی تھی۔'' انہوں نے خیال ظاہر کیا۔

''کیا انہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا ممی سچ بتائیے گا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ اس لیے پریشان تھے...... وہ سمجھتے تھے کہ میں بابر کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو سکی۔''

''نہیں، ایسا تو انہوں نے کبھی نہیں کہا۔'' وہ حیران ہوئیں۔

''پہلے تو وہ تمہاری طرف سے بہت مطمئن تھے بلکہ انہیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا کہ بابر کراچی سیٹل ہوگیا ہے۔ میں کبھی گلہ کرتی تو وہ مجھے سمجھاتے تھے کہ بابر اگر وہاں رہ کر اکیلا بزنس کر کے ایزی فیل کرتا ہے تو ہمیں اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ ہماری بیٹی اس کے ساتھ خوش ہے، وہ اس کا خیال رکھتا ہے، ہمارے لیے اتنا کافی ہے۔ لیکن پچھلے چند ماہ میں دو تین بار انہوں نے کہا تھا وہ تمہارے لیے پریشان ہیں بلکہ ان دنوں بیماری میں کئی بار انہوں نے تمہارے لیے پریشانی ظاہر کی۔''

''ممی آپ نے پوچھا نہیں تھا کہ وہ میرے لیے کیوں پریشان ہیں؟'' اس نے ممی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''پوچھا تھا لیکن انہوں نے ٹال دیا۔ شاید بابر کے مزاج کی وجہ سے ان کا خیال ہو کہ اس کا رویہ تمہارے

ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ضدی اور غصیلا ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں تمہاری شادی کے بعد ہوا جب اس نے کراچی جانے کی ضد کی اور آخر چلا گیا۔'' انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے بتایا۔

''لیکن ممی ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ بابر میرا بہت خیال رکھتے ہیں، بچوں سے محبت کرتے ہیں۔ ارفی میں تو ان کی جان ہے بلکہ مجھے لگتا ہے کہ ان کے لاڈ پیار نے ارفی کو تھوڑا بگاڑ دیا ہے۔'' ایمل نے انہیں تسلی دی۔

''ٹھیک ہے بیٹا! اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ باپ تھے ناں...... تمہاری دوری کی وجہ سے وسوسوں کا شکار ہو جاتے تھے۔'' انہوں نے ایک محبت بھری نظر اس پر ڈالی۔

''کاش ڈیڈی مجھ سے یہ پوچھتے تو میں انہیں مطمئن کر دیتی۔ آپ ہی مجھ سے ذکر کر دیتیں کہ ڈیڈی کو بابر کے متعلق کچھ خدشات ہیں تو میں انہیں مطمئن کر دیتی...... لیکن آپ نے تو مجھے ان کی بیماری تک کا نہیں بتایا۔'' اس کے لہجے میں گلہ در آیا تھا۔

''دراصل......'' انہوں نے وضاحت کی۔ ''انہوں نے کبھی مجھ سے کھل کر بات ہی نہیں کی۔ پچھلے چھ سات ماہ سے بہت خاموش ہو گئے تھے۔ الجھے، الجھے سے اور پریشان لگتے تھے۔ میرے پوچھنے پر بتایا کہ تمہارے لیے پریشان ہیں۔ ان آخری دنوں میں تمہیں بہت یاد کرتے تھے۔ اور تمہارے بچپن کی اسکول، کالج کی باتیں بلکہ ایک دو بار مدثر کا بھی ذکر کیا۔ کہہ رہے تھے مدثر اچھا لڑکا تھا اور ہمیں اس کی بات سننی چاہیے تھی...... ایمل، مدثر کے ساتھ زیادہ خوش رہتی شاید۔''

''ممی......'' اس نے کسی قدر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''ڈیڈی نے ایسا کہا تھا مدثر کے متعلق تو وہ شاید یہ سمجھتے تھے کہ میں اب بھی مدثر......'' اس کا گلہ رُندھ گیا۔

''ممی میں نے بابر سے شادی کے بعد کبھی مدثر کے متعلق نہیں سوچا، میں ہمیشہ شرمندہ رہی آپ سے، ڈیڈی سے اپنے غلط انتخاب پر، میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ بابر کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔ میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر کراچی نہیں جانا چاہتی تھی لیکن اس لیے چلی گئی کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں بابر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ ڈیڈی مجھ سے پوچھتے تو میں انہیں بتاتی کہ میں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ان بائیس سالوں میں ایک بار بھی نہیں۔'' آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے۔

''نہیں میری جان، تمہارے ڈیڈی ایسا بالکل بھی نہیں سوچتے تھے۔'' ممی نے اسے گلے لگا لیا۔

''ایک بار کوئی بے اعتبار ہو جائے تو پھر اس پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ایک بار بابر کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کیا تھا تو......'' اس نے ہاتھوں کی پشت سے گیلے رخساروں کو پونچھا۔

''نہیں میری جان ایسا کچھ نہیں تھا، بتایا تو ہے تمہیں اس طرح کی منفی باتیں کیوں سوچ رہی ہو۔ وہ تو ہر لمحہ تمہاری خوشیوں کے لیے دعا گو رہتے تھے۔ وہ صرف تمہارے لیے اداس تھے اور پتا نہیں کیوں وہ بابر سے کچھ بدگمان لگتے تھے۔'' انہوں نے اس کے خیال کی تردید کی۔

''ممی ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بچے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو اپنے ماں، باپ کی ان قربانیوں کو بھول جاتے ہیں جو انہوں نے ان کے لیے دیں۔ انہیں پالا پوسا انہیں ہر سرد و گرم سے بچایا...... ان کے لاڈ اٹھائے ہر مشکل کے آگے ڈھال بن کر کھڑے ہوئے لیکن ایک اجنبی شخص انہیں اتنا عزیز ہو جاتا ہے کہ والدین کی محبت پیچھے رہ جاتی ہے۔ ممی میں نے بھی آپ کا اور ڈیڈی کا دل دُکھایا تھا آپ کو ناراض کیا تھا۔'' وہ بے حد افسردہ سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

''ہم تم سے کبھی ناراض نہیں تھے بیٹا...... بس تھوڑے تحفظات تھے تمہارے اور مدثر کے حوالے سے، ورنہ زندگی تم نے گزارنی تھی۔ تم جس لگژری زندگی کی عادی تھیں مدثر کے پاس تمہارے لیے وہ زندگی نہیں تھی پھر بھی

ہمیں تمہاری خوشی عزیز تھی۔'' انہوں نے اسے پھر اپنے قریب کرتے ہوئے اس کے سر پر پیار کیا تو اپنا سر ان کے سینے پر رکھتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں۔ کتنے سالوں بعد آج اس نے مدثر کا نام سنا تھا تو گزرے ماہ و سال آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔

مدثر حسن اس کا کلاس فیلو تھا، بے حد ذہین اور پُرکشش شخصیت کا مالک...... ایمل اس سے متاثر تھی۔ اس کی ذہانت، اس کا اخلاق، اس کی گفتگو سب کچھ ہی متاثر کن تھا۔ پتا نہیں یہ تاثر کب محبت میں ڈھلا تھا لیکن ایک روز دونوں نے اعتراف کیا کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور یہ محبت ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی اور جب ممی نے گھر میں اس کی شادی کی باتیں کرنا شروع کیں تو وہ اپ سیٹ ہوگئی تھی۔ مدثر کے علاوہ وہ کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ آسان نہیں ہوگا۔ ممی اور ڈیڈی، مدثر کے لیے مشکل سے ہی رضامند ہوں گے لیکن وہ رضامند ہو جائیں گے اسے یہ بھی یقین تھا۔ اگر چہ ممی کی خواہش تھی کہ اس کی شادی بابر سے ہو۔ بابر نوید جو سات سال کی عمر میں ممی کے ساتھ ان کے گھر آیا تھا۔ بابر نوید اس کی بڑی خالہ کا بیٹا تھا۔ ممی کو ڈاکٹروں نے بتا دیا تھا کہ اب وہ ماں نہیں بن سکتیں۔ کچھ ایسی ہی پیچیدگی ہوگئی تھی۔ تب وہ ایک بار اپنی بہن کے گھر گئیں تو واپسی پر بابر ان کے ساتھ تھا۔ بابر اور عامر دونوں جڑواں تھے۔ خالہ کی آٹھ اولادیں تھیں۔ سات بیٹے اور ایک بیٹی...... چنانچہ جب ممی نے بابر کو بیٹا بنانے کی خواہش کی تو ان کے بہنوئی ناصر نوید نے بلا تامل اس کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''یہ تمہارا بیٹا ہے، لو سنبھالو اسے۔'' اور وہ بابر کو گھر لے آئی تھیں۔ کرنل حامد کو بھی بابر سے بہت پیار تھا اور دونوں نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ وہ ایمل کی شادی بابر سے کر دیں گے۔ اس طرح ایمل ہمیشہ ان کے پاس رہے گی...... یوں بابر کا پلڑا ہر لحاظ سے مدثر حسن سے بھاری تھا۔ لیکن جب وہ مدثر کے ساتھ کھڑی ہو جاتی تو پھر مدثر حسن کا ہی پلڑا بھاری ہوتا تھا۔ یوں بھی ایمل، بابر کو کچھ خاص پسند نہیں کرتی تھی۔ اگر مدثر حسن اس کی زندگی میں نہ بھی آیا ہوتا تب بھی وہ بابر سے شادی نہیں کرتی لیکن اب تو مدثر حسن تھا جس کی محبت اس کے رگ و پے میں خون کے ساتھ دوڑتی تھی اور جب ممی بار، بار اس کی اور بابر کی شادی کی بات کرنے لگیں تو اس نے ڈیڈی سے بات کرنے کا سوچا۔ کیونکہ وہ ممی کی نسبت ڈیڈی سے زیادہ قریب تھی۔ اس روز وہ اسٹڈی میں تھے اور حسبِ معمول مطالعے میں مصروف تھے۔ وہ اسٹڈی میں گئی تو انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''ڈیڈی مجھے آپ سے کوئی بات کرنی ہے۔''

''ہاں کہو......'' انہوں نے کتاب اوندھی کر کے ٹیبل پر رکھ دی۔ اپنی ہر بات ان سے بلا جھجک کرنے والی یہ بات کرتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

''لگتا ہے معاملہ گمبھیر ہے۔'' انہوں نے تبصرہ کیا تھا۔ ''میں ہمہ تن گوش ہوں کہو......''

''ڈیڈی...... وہ...... میں......''

''کیا کوئی بڑی فرمائش ہے؟'' وہ مسکرائے۔

''نہیں ڈیڈی، وہ میں...... مجھے بابر سے شادی نہیں کرنا...... آپ ممی کو منع کر دیں۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

''کیوں؟ تم بابر سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟'' انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''وہ مجھے اچھا نہیں لگتا ڈیڈی، کچھ چھچھورا سا ہے۔''

''کوئی سولڈ ریزن دو بیٹا...... تمہاری ممی کی ہمیشہ سے یہ خواہش ہے کہ بابر......''

''لیکن ڈیڈی میں بابر کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی، بالکل بھی نہیں۔'' اس نے ان کی بات کاٹی تھی۔

''او کے تو کیا تم......'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگے تھے۔

''وہ ڈیڈی......'' وہ پھر جھجک گئی تھی اور اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔
''کون ہے وہ ایما؟'' اسے ان کا لہجہ سرد لگا تھا یا سچ مچ ہی سرد تھا۔
''وہ مدثر ہے ڈیڈی...... میرا کلاس فیلو......'' وہ نظریں جھکائے کہہ رہی تھی۔
''اس کی فیملی بہت ایجوکیٹڈ ہے، اس کے دادا بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور ایجوکیشن کے محکمے میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے اور اس کے والد......''
''ٹھیک ہے...... اسے کہو اپنے والدین کو بھیج دے۔'' اور اس کے اندر جیسے چراغاں ہو گیا تھا۔
''ایما...... ایمی......'' ممی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔
''دیکھو...... یہ تمہارے فون کی بیل ہے۔''
''ہاں......'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ فون نظر نہیں آ رہا تھا لیکن بیل ہو رہی تھی۔ اس نے تکیہ اٹھایا اور فون نظر آ گیا۔
''افنان کا ہے۔'' اس نے ممی کو بتا کر فون آن کیا۔
افنان اور ارتقاع چند دن پہلے واپس ...کراچی چلے گئے تھے۔ ان کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا۔ افنان اس کا پروگرام پوچھ رہا تھا لیکن ابھی تک اس نے واپس جانے کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ ممی کو اکیلے چھوڑ کر چلی جائے پھر بھی اس نے افنان سے کہا کہ وہ بابر سے بات کر کے اسے اپنا پروگرام بتا دے گی پھر ارتقاع کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے اس نے فون بند کر دیا تو ممی نے اس کی طرف دیکھا۔
''بیٹا تم میری فکر مت کرو، اب تو اکیلے ہی رہنا ہے۔ ملازم تو ہیں ناں......'' ان کی آواز بھرّا گئی۔
''ممی!'' وہ ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ''میں آپ کو ایسے اکیلے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ ٹھیک ہے ملازم ہیں...... پرانے وفادار ہیں لیکن ملازموں کا کیا ہے کوئی اپنا تو نہیں ہے۔ ممی میں آپ کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔''
''نہیں ایمل بیٹا، میں اپنی عدت یہاں ہی اسی گھر میں گزاروں گی۔''
''ٹھیک ہے تو میں عدت تک یہاں ہی رہوں گی آپ کے پاس۔'' وہ جذباتی ہو گئی۔
''ارے بیٹی ایسے کیسے رہو گی۔'' وہ پریشان ہو گئیں۔
''بچے اتنا عرصہ اکیلے کیسے رہیں گے اور بابر وہ کیا کہے گا۔''
''بابر صرف داماد ہی تو نہیں آپ کا بیٹا بھی تو ہے۔''
''وہ تو ہے لیکن......'' وہ متذبذب سی ہو گئی تھیں۔
''یا تو آپ میرے ساتھ چلیں یا پھر میں یہاں ہی رہوں گی۔''
''ضد نہیں کرتے ایما...... بابر جتنی اجازت دیتا ہے رہ لو...... ایک ہفتہ اور...... تب تک ہم دونوں کچھ سنبھل جائیں گے۔ میں یہ کبھی نہیں چاہوں گی کہ میرے لیے تم اپنا گھر اپ سیٹ کرو۔''
''تو پھر میں کیا کروں ممی...... میرا دل......'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
''بھئی کیا ہو گیا تمہارے دل کو؟'' بابر ایک دم ہی دروازہ کھول کر اندر آیا۔
''میرا دل نہیں مانتا بابر، امی کو یوں اکیلا چھوڑ کر جانے کو...... اور ممی، ہمارے ساتھ آنا نہیں چاہتیں۔'' ایمل نے بابر کی طرف دیکھا۔
برانڈڈ لباس، جوتے، قیمتی رسٹ واچ، تازہ کیا ہوا شیو وہ یقیناً ایک شاندار مرد لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے آسودگی اور اطمینان چھلکتا تھا اور اس کے برانڈڈ پرفیوم کی خوشبو پورے کمرے میں بکھر چکی تھی
''کیوں ممی......؟'' بابر ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ''آپ یہاں اکیلے رہ کر کیا کریں گی۔ میں تو آج شام کی فلائٹ سے جا رہا ہوں۔ ایما یہاں ہی رہے گی ہفتہ، دس دن اور آپ اس دوران گھر کا جو انتظام کرنا ہے کر لیں اور پھر

میں یا انی آ کر آپ دونوں کو لے جائیں گے۔''

''نہیں بیٹا...... ایک تو میں عدت یہاں ہی گزارنا چاہتی ہوں پھر یہ سب اتنا آسان نہیں ہے، اس طرح ایک دم گھر بند کر کے چلے جانا۔ برسوں کے پرانے ملازم ہیں اور بھی کئی بکھیڑے ہیں .... بزنس کے معاملات ہیں، بہت کچھ دیکھنا ہے، کرنل صاحب نے تو کچھ سمجھایا بتایا نہیں...... کئی کاموں میں انہوں نے پیسہ انویسٹ کیا ہوا تھا۔ مجھے کچھ خبر ہی نہیں...... ایک دوبار انہوں نے کچھ بتانا بھی چاہا لیکن میں نے سنا ہی نہیں۔'' انہوں نے تفصیل سے بات کی۔

''بزنس کے اور باہر کے معاملات تو میں دیکھ لوں گا۔ میرا آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔'' بابر نے اپنا ہاتھ ان کے بازو پر رکھ کر گویا تسلی دی۔

''سب کچھ تمہارا اور ایمل کا ہی ہے۔ تم نے ہی دیکھنے ہیں سب معاملات...... میں تو کہتی ہوں تم لوگ یہاں آ جاؤ واپس تو مجھے بے فکری ہو جائے گی۔'' انہوں نے التجا کرتی نظروں سے بابر کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے ممی ہم لوگ آ جائیں گے لیکن وہاں وائنڈ اپ کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا ناں کم از کم چھ سات ماہ تو لگ جائیں گے۔'' بابر نے ان کے بازو پر رکھے ہاتھ کو ہولے سے دبایا اور سر کی جنبش سے اپنی بات کی تائید کی۔ ایمل نے متشکر نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے بے حد حیرت ہوئی تھی۔ بابر کی بات سن کر...... ڈیڈی اور ممی نے تب کتنا اصرار کیا تھا کہ وہ کراچی نہ جائے اور اپنا الگ بزنس کرنے کے بجائے ان کا بزنس سنبھالے لیکن اس نے صاف انکار کر دیا تھا کہ لوگ کہیں گے میں نے دولت کے لالچ میں ایمل سے شادی کی ہے۔

''کون لوگ باتیں کریں گے؟'' ممی حیران ہوئی تھیں۔ ''تم بیٹے ہو ہمارے۔'' لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہا تھا یہ الگ بات تھی کہ کاروبار شروع کرنے کے لیے پیسہ ممی نے ہی دیا تھا اور ڈیڈی نے کاروبار سیٹ کرنے میں مدد کی تھی اور لوگوں سے ملوایا تھا اور کراچی میں سیٹل ہونے کا فیصلہ اس نے مدثر کی وجہ سے کیا تھا۔

''میں نہیں چاہتا کہ ہم اس شہر میں رہیں جہاں وہ رہتا ہے۔ کبھی کہیں آتے جاتے وہ نظر آ جائے تو خواہ مخواہ تم ڈسٹرب ہو گی۔'' اس نے تب ایمل سے یہ کہا تھا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے بیٹا۔'' بابر کی بات پر ممی خوش ہو گئیں۔ ''اس سے اچھی اور کیا بات ہو گی کہ تم لوگ یہاں آ جاؤ اور تم سارا کام سنبھال لو۔''

''تھینک یو بابر......'' ایمل نے بھیگی پلکوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس میں تھینک یو کی کیا بات ہے، بھئی پہلے ڈیڈی تھے تو مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ لیکن اب ممی ہماری ذمّے داری ہیں اور میں اب ایسا نا اہل بھی نہیں ہوں کہ اپنی ذمّے داریاں نہ سمجھوں۔'' اس نے مسکرا کر ایمل کی طرف دیکھا جس کی بے حد خوب صورت آنکھوں میں نمی پھیلی تھی۔ بھیگی پلکیں ہولے، ہولے لرز رہی تھیں۔ بالوں کی ایک لٹ دائیں رخسار...... کو چھو رہی تھی۔ گلابی خمدار ہونٹوں پر ہلکی نمی تھی۔ وہ آج بھی بلاشبہ بہت خوب صورت بہت دلکش تھی۔ اتنی ہی جتنی پہلی بار اسے لگی تھی۔

ناصر نوید کی آٹھ اولادوں میں وہ سیکنڈ لاسٹ تھا۔ بلکہ اس کا جڑواں بھائی بھی...... ان دونوں سے چھوٹا ایک اور بھائی بھی تھا۔ ناصر نوید نے کبھی اپنی اولاد پر کوئی خاص توجہ نہیں تھی اور نہ ہی ان کی بیوی کے پاس ان سے لاڈ پیار کرنے کا وقت ہوتا تھا۔ گھر میں اگرچہ پیسے کی فراوانی تھی۔ زمینوں کی آمدنی کافی تھی اور ناصر نوید شاہ خرچ تھے۔ لیکن بابر نوید توجہ اور پیار کا بھوکا تھا سو جب خالہ نے دو تین دن کے قیام میں بہت پیار اور توجہ دی تو اسے خالہ کے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ اور وہ خالہ کے اس اتنے بڑے گھر میں بہت خوش تھا اور اسے اپنا گھر چھوڑنے کا کوئی دکھ نہیں تھا اور نہ ہی اس نے خالہ سے جنہیں وہ ممی کہنے لگا تھا کبھی گھر جانے اور بہن بھائیوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی...... ایمل ممی کی بیٹی اس گھر میں پہلے سے ہی موجود تھی۔ اس سے چھوٹی تھی۔ ممی ڈیڈی اس

کے بھی لاڈ اٹھاتے تھے لیکن بابر پر بھی بھرپور توجہ دیتے تھے سو وہ خوش تھا اور مطمئن...... ناصر نوید جب بھی زمینوں کے مقدمات کے سلسلے میں لاہور آتے تو اس سے ملنے چلے آتے تھے یا کبھی کبھار ایک آدھ دن کے لیے اس کی اماں بھی آجاتیں۔ یہاں تک کہ وہ کالج میں آگیا۔ اس کے بڑے بھائیوں نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ کسی نے دس اور کسی نے بارہ جماعتیں پڑھ لی تھیں۔ دو کی تو شادی بھی ہوگئی تھی اور سب کا گزارہ زمینوں کی آمدنی پر ہی تھا جو ناصر نوید کی عیاشی کی وجہ سے کم ہوتی جارہی تھیں۔ اس روز ناصر نوید اسے ملنے آئے تو انہوں نے کہا تھا۔

''تمہارے بھائی سب ہڈحرام ہیں بابر، تم دل لگا کر پڑھنا...... اور کرنل صاحب اور فرحانہ کے دل میں اپنی جگہ بنانا...... ہماری زمین اب اتنی نہیں رہی کہ سات خاندانوں کا پیٹ بھر سکے۔ سب بھوکے مریں گے اگر خود کچھ ہاتھ پاؤں نہ ہلائے۔'' وہ حیران ہوا تھا کہ ناصر نوید آج کس قسم کی باتیں کر رہے تھے۔

''کرنل صاحب کی صرف ایک ہی بیٹی ہے، تم کسی قابل ہوئے تو یقیناً ان کا انتخاب تم ہی ہوگے۔ یہ سب کچھ تمہارا ہوگا...... بس تمہیں ان کا دل جیتنا ہے۔ ایمل سے شادی کرکے تم گھاٹے میں نہیں رہوگے۔''

اور اس روز پہلی بار اس نے ایمل کو کسی اور نظر سے دیکھا تھا اور اس کے نوخیز حسن نے اسے اسیر کرلیا تھا۔

''بابر بیٹا......'' ممی کو اچانک کچھ یاد آیا تھا بابر نے چونک کر ایمل کے چہرے سے نظریں ہٹائیں۔

''وہ ہمدانی صاحب کا دو تین بار فون آچکا ہے۔ وہ مجھ سے مل کر کچھ کاروباری معاملات ڈسکس کرنا چاہتے ہیں۔ اگر تم جانے سے پہلے ان سے مل لو تو...... تمہیں ہی تو سب کچھ دیکھنا ہے۔ میں کیا کروں گی مل کر......''

''ٹھیک ہے ممی......'' اس کی آنکھوں میں یک دم چمک پیدا ہوئی تھی۔

''میں جانے سے پہلے مل لوں گا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''شام کو کتنے بجے کی فلائٹ ہے آپ کی؟'' ایمل نے پوچھا۔

''چھ بجے کی ہے لیکن اس وقت میں اپنے کسی کام سے جارہا ہوں۔ ہمدانی صاحب سے بھی ملتا آؤں گا۔ لنچ پر میرا انتظار مت کیجیے گا۔ مجھے شاید دیر ہوجائے۔'' ایمل نے سر ہلادیا اور وہ خدا حافظ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ عظام کو ڈھونڈتا ہوا لائبریری کی طرف جارہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر عظام، سر جعفری کی کلاس میں نہیں تھا تو یقیناً لائبریری میں ہوگا۔ یوں تو وہ دونوں اکٹھے ہی یونیورسٹی آئے تھے لیکن اسے راستے میں فائنل کے سلیمان نے روک لیا تھا۔ سلیمان سے کچھ دن پہلے ہی جب عظام مری گیا ہوا تھا اس کی سلام دعا ہوئی تھی اور سلیمان نے اپنے... پیریویس کے کچھ اہم نوٹس اسے دینے کا وعدہ کیا تھا اور عظام کی چونکہ سلیمان سے زیادہ واقفیت نہیں تھی اس لیے وہ سلام کرکے آگے بڑھ گیا تھا اور جب وہ سلیمان سے بات کرکے سر جعفری کے روم میں آیا تو وہ لیکچر شروع کرچکے تھے۔ خاموشی سے اپنی مخصوص سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے پوری کلاس کا جائزہ لیا تھا۔ عظام کلاس میں نہیں تھا۔ اگر وہ کلاس میں نہیں تھا تو کہاں گیا تھا۔

یقیناً لائبریری ہی ایسی جگہ تھی جہاں وہ جاسکتا تھا سو وہ اسے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا لائبریری کی طرف جارہا تھا کہ اس کی نظر لان میں ایک درخت کے نیچے سنگی بینچ پر بیٹھی ارتفاع پر پڑی۔ ارتفاع آج کافی دنوں بعد یونیورسٹی آئی تھی پھر بھی اس نے کلاس اٹینڈ نہیں کی تھی۔ شاید لیٹ آئی ہوگی اور سر جعفری کی کلاس شروع ہوچکی ہوگی۔ اس نے سوچا اور لائبریری کی طرف جانے کے بجائے اس کی طرف بڑھا۔ اتنے دنوں بعد اسے دیکھ کر اس کا چہرہ کھل گیا تھا اور آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

''السلام علیکم......!'' قریب جاکر اس نے سلام کیا تو ارتفاع نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ بے حد سنجیدہ اور اداس لگ رہی تھی۔

''کیا ہوا ارفی تم ٹھیک تو ہوناں......؟'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔
''ہاں، ٹھیک ہوں۔'' اس نے آہستگی سے جواباً کہا۔
''عالیہ نے بتایا تھا تمہارے نانا جان کا...... بہت افسوس ہوا...... کیا ہوا تھا انہیں؟'' اس نے پوچھا۔
''ہارٹ اٹیک......'' ارتفاع نے پاس پڑا اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر گود میں رکھا۔
''ہم کچھ کلاس فیلوز تمہارے گھر آرہے تھے لیکن پھر عالیہ نے بتایا کہ تم لاہور گئی ہوئی ہو۔''
''ہاں، میں تین چار دن پہلے ہی لاہور سے آئی ہوں۔''
''اور تم یونیورسٹی آج آرہی ہو۔'' رواحہ کے لبوں سے پھر بے اختیار نکلا تھا۔ ارتفاع نے حیرانی سے اسے دیکھا...... اور پھر بولی۔
''میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''
''اوہ ہاں...... اتنے پیارے رشتوں کی جدائی کا دکھ سہنا آسان تو نہیں ہوتا۔ لیکن موت کے سامنے سب ہی بےبس ہیں۔'' اس نے ارتفاع کی طرف دیکھا جو شولڈر بیگ کے اسٹریپ کو اپنی انگلیوں پر لپیٹ رہی تھی۔
''آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں، اپنے آپ کو سنبھالیں۔'' لمحہ بھر سوچنے کے بعد رواحہ نے کہا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کون سے الفاظ استعمال کرے جو ارتفاع کا دکھ کم کرسکیں۔
''بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو ہمارے اختیار میں نہیں ہوتیں ان کا دکھ اور کرب اپنی جگہ لیکن ہمیں دوسروں کی خاطر خود کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ آپ اپنی امی کا سوچیں...... آپ اتنی نڈھال لگ رہی ہیں تو ان کا کیا حال ہوگا۔ آپ نے تو انہیں بھی حوصلہ دینا ہے۔ اپنا دل مضبوط کریں...... اور اپنے نانا ابو کے لیے دعا کریں۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔'' اسے ایک دم سے احساس ہوا تھا کہ ارتفاع سے وہ اتنا بےتکلف نہیں تھا کہ اسے تم کہہ کر بلائے سو بات تو اس نے تم سے شروع کی تھی مگر پھر آپ کے تخاطب پر آگیا۔ ارتفاع نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر سر جھکا کر انگلی پر اسٹریپ لپیٹنے اور کھولنے لگی۔
''یہ رواحہ نے آج سے پہلے تو کبھی اتنی باتیں نہیں کی تھیں لیکن آج ایسے بات کررہا ہے جیسے اچھا دوست ہو لیکن اسے کیا پتا کہ وہ میرے نانا جان نہیں تھے۔ افنان کے نانا تھے اگر میں اداس ہوں تو صرف افنان کے لیے...... مجھے اس کے دکھ کا احساس ہے۔ اتنے دنوں میں کتنا مرجھا کررہ گیا ہے۔ اور ماما ان کی حالت واقعی ٹھیک نہیں تھی۔ ہر وقت روتی رہتی تھیں۔'' وہ اپنے آپ کو سمجھا بجھا کر ان کے پاس بیٹھتی تھی لیکن اسے اپنے اور ان کے درمیان بہت فاصلہ محسوس ہوتا تھا۔ وہ چپ بیٹھی رہتی تھی۔
''ڈیڈی تم سے بہت پیار کرتے تھے ارفی۔'' انہوں نے کتنی بار کہا تھا اور ہر بار اس نے سوچا تھا۔
''میرا تو ان سے کوئی رشتہ نہیں تھا پھر بھلا وہ مجھ سے کیوں پیار جتاتے تھے۔ یقیناً پاپا کو خوش کرنے کے لیے شو کرتے ہوں گے جیسے ماما نے اب تک کیا ہے۔'' وہ تو وہاں زیادہ دن رکنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ تیسرے دن ہی اس نے پڑھائی کا بہانہ بنا کر واپس جانے کی رٹ لگادی تھی لیکن افنان نے انکار کیا تھا۔
''ماما کی اور نانو کی حالت دیکھ رہی ہو...... میں انہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ تم نے جانا ہے تو پاپا کے ساتھ چلی جاؤ۔'' لیکن پاپا نے بھی اسے کچھ مزید دن رکنے کو کہا تھا تو اسے مجبوراً رکنا پڑا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ اتنی بےحس ہورہی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے اسے نانا جان کی موت کا کوئی دکھ نہیں ہے پھر بھی پتا نہیں کیوں دل بجھا، بجھا سا تھا۔
''آپ یوں اداس اور افسردہ رہیں گی تو آپ کی مما کیسے سنبھلیں گی۔ ایک بیٹی کے لیے باپ کی دائمی جدائی برداشت کرنا آسان تو نہیں ہوتا ناں۔'' اسے خاموش دیکھ کر رواحہ نے پھر کہا۔ اس نے اس طرح کی باتیں کبھی کسی سے نہیں کی تھیں لیکن ارفی سے کررہا تھا کیونکہ وہ زیادہ دیر اس کے قریب رہنا اور اس سے بات کرنا چاہتا تھا یا پھر

اس کا غم غلط کرنا چاہتا تھا سو بولے چلا رہا تھا۔

''تھینک یو رواحہ......'' وہ یک دم کھڑی ہوئی۔ ''مجھے کچھ تھکن محسوس ہو رہی ہے مجھے گھر چلنا چاہیے۔''

''کیا آپ میم رابعہ کا پیریڈ اٹینڈ نہیں کریں گی؟''

''نہیں، میرے سر میں کچھ درد ہو رہا ہے، کل سے باقاعدہ یونیورسٹی آؤں گی۔''

''آپ کی پڑھائی کا تو بہت حرج ہوا ہوگا۔ اگر کوئی نوٹس وغیرہ کی ضرورت ہو تو میں ساتھ، ساتھ نوٹس تیار کر لیتا ہوں۔''

''نہیں، تھینک یو...... عالیہ سے لے لوں گی...... ویسے آپ نے عالیہ کو دیکھا ہے؟'' اس نے شولڈر بیگ دائیں کندھے پر لٹکایا۔

''نہیں کلاس میں تو نہیں تھی......شاید آج نہیں آئی۔''

تب ہی عظام اسے دور سے آواز دیتا ہوا قریب آیا۔

''کہاں رہ گئے تھے تم؟'' رواحہ نے پوچھا۔

''یار وہ......'' عظام نے بات ادھوری چھوڑ کر ارتقاع کی طرف دیکھا۔

''مس ارتقاع کیسی ہیں آپ...... آپ کے نانا جان کا سنا تھا بہت افسوس ہوا۔'' عظام کو ایک دم تعزیت کا خیال آیا تھا۔

''اللہ کی مرضی......'' ارتقاع نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر قدم آگے بڑھا دیے۔

''ہاں، اب بتاؤ کہاں تھے تم؟'' رواحہ نے اس سے نظریں ہٹا کر عظام سے پوچھا۔

''جواد کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی اس کے ساتھ ڈسپنسری چلا گیا تھا۔''

''کیا ہوا جواد کو؟'' وہ یک دم پریشان ہو گیا۔
''اچانک چکر آ گیا تھا۔ بی پی لو تھا بہت۔'' عظام نے بتایا۔
''اب کہاں ہے وہ......؟''
''اپنے روم میٹ کے ساتھ ہاسٹل واپس چلا گیا ہے، میں نے بہت کہا میں ساتھ چلتا ہوں لیکن اس نے منع کر دیا۔''
''لیکن اسے کسی ڈاکٹر کو چیک کروانا چاہیے تھا۔'' رواحہ کو تشویش ہو رہی تھی۔
''دراصل وہ رات بھر جاگ کر پڑھتا رہا۔ اس کا روم میٹ بتا رہا تھا کہ رات کو بھی کھانا نہیں کھایا اور صبح بھی بغیر ناشتا کیے ہی یونیورسٹی آ گیا۔ شاید اسی لیے چکر آ گیا تھا۔'' عظام نے تسلی دی۔
''ہوں۔'' رواحہ نے عظام کی طرف دیکھا۔
''دراصل اسے پوزیشن لینے کا جنون ہو رہا ہے لیکن بندہ اپنی صحت کا تو خیال رکھے ناں......''
''شام کو چلیں گے اس کی طرف اور کان کھینچتے ہیں۔''
''ٹھیک ہے چلیں پھر، ہم بھی گھر۔'' عظام نے پوچھا۔
''کیوں میم کا پیریڈ اٹینڈ نہیں کرنا؟'' رواحہ نے پوچھا۔
''وہ آج چھٹی پر ہیں، ابھی کسی نے بتایا ہے۔''
''چلو پھر چلتے ہیں، کھانا کھا کر تھوڑا ریسٹ کر کے جواد کی طرف چلیں گے۔'' وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے یونیورسٹی کے گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔
''ارتفاع کافی اداس اور پریشان لگ رہی تھی۔'' عظام نے تبصرہ کیا۔
''ظاہری بات ہے ابھی نانا کی موت کا دکھ کم نہیں ہوا ہوگا۔'' رواحہ نے چلتے، چلتے اس کی طرف دیکھا۔
''یار یہ رشتے بھی کتنے پیارے ہوتے ہیں۔ نانا، نانی، دادا، دادی وغیرہ اور ہم دونوں ہی ان رشتوں سے محروم ہیں۔''
''ہاں یہ تو ہے یار۔'' رواحہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
''لیکن میرے نانا، نانی ہو سکتا ہے ہوں......لیکن مجھے علم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہیں۔ انہوں نے بھی رابطہ نہیں رکھا جیسے ان کا رشتہ صرف اپنی بیٹی سے ہی تھا۔'' وہ دونوں عظام کی گاڑی کے پاس پہنچ گئے تھے۔ عظام اپنے پاپا کے اصرار پر اپنی گاڑی ساتھ ہی لایا تھا۔
''تمہارے پاپا کا کوئی فون آیا عظمی؟'' رواحہ نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
''بس وہی ایک ہی آیا تھا بنکاک پہنچے یہ...... پاپا جب باہر جاتے ہیں تو کم ہی فون کرتے ہیں اور خود میں نے کبھی نہیں کیا۔ بزی ہوتے ہیں، فارغ ہوں گے تو کر لیں گے۔'' اس نے گاڑی پارکنگ سے باہر لاتے ہوئے جواب دیا۔ رواحہ سر ہلا کر ونڈ اسکرین سے باہر دیکھنے لگا۔ اسٹاپ کے پاس سے گزرتے ہوئے یک دم ہی عظام نے بریک پر پاؤں رکھا۔
''یہ تو ارفی ہے اسٹاپ پر......شاید آج اپنی گاڑی نہیں لائی۔'' رواحہ بھی اُدھر دیکھنے لگا۔
''ارفی۔'' عظام نے شیشہ سرکا کر آواز دی۔ ارتفاع نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اس وقت اسٹاپ پر اکیلی تھی۔
''آئیں، میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔''
''نو تھینک یو عظام ابھی پوائنٹ بس آ جائے گی یا پھر کوئی دوسری سواری مل جائے گی۔'' ارتفاع نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا لیکن عظام گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا۔

''تکلف مت کریں۔ہم کلاس فیلوز ہیں......کیا اعتبار نہیں ہم پر۔''

''نہیں......اعتبار کی بات نہیں،خواہ مخواہ آپ کو زحمت ہوگی۔''

''کوئی زحمت نہیں ہوگی۔'' عظام نے پچھلا دروازہ کھولا۔

''پلیز......'' عظام نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو لمحہ بھر سوچنے کے بعد ارتقاع بیٹھ گئی۔

''دراصل میری گاڑی کچھ پرابلم کر رہی تھی۔صبح میرا بھائی افنان مجھے ڈراپ کر گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا واپسی پر عالیہ کے ساتھ آجاؤں گی لیکن عالیہ آج آئی ہی نہیں۔'' اس نے بتایا۔

رواحہ کے لبوں پر ایک لمحے کے لیے مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ آج کے دن ارتقاع سے یہ اس کی دوسری ملاقات تھی۔اس کے اندر کہیں کوئی خوشی رقص کر رہی تھی وہ ونڈ اسکرین سے باہر دیکھ رہا تھا اور وہ عظام کے پوچھنے پر اسے ایڈریس بتا رہی تھی۔

کئی بار اس کا جی چاہا وہ پیچھے مڑ کر اسے دیکھے اور اس سے کوئی بات کرے لیکن کس قدر معیوب بات ہوتی......سو وہ اسی بات پر خوش تھا کہ وہ ان کی ہمراہی میں سفر کر رہی ہے۔اس نے ان پر اعتبار کیا اور ایک روز وہ اس کی محبت پر بھی اعتبار کرلے گی اور وہ اسے بتا سکے گا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔وہ خوش رنگ خیالوں میں کھویا ہوا تھا،اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔عظام نے گاڑی کو بریک لگائی تو وہ چونکا۔

''ارے اتنی جلدی گھر آگیا ارفی کا۔'' بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا۔

''تم غالباً کوئی خوب صورت خواب دیکھ رہے تھے۔'' عظام معنی خیز نظروں سے اسے دیکھتا ہوا مسکرایا۔''ورنہ آدھا گھنٹا تو لگ ہی گیا ہے۔''

''تھینک یو۔'' ارتقاع نے دروازہ کھولتے ہوئے ایک بار پھر شکریہ ادا کیا۔

''ارے اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔'' رواحہ اب خود کو پیچھے مڑ کر دیکھنے سے نہ روک سکا۔

''آپ کو خواہ مخواہ زحمت ہوئی۔'' ارتقاع نے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں ہرگز نہیں بلکہ خوشی ہوئی کہ آپ نے اعتبار کیا۔'' رواحہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ایک لمحے کے لیے ارتقاع کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی اور پھر وہ دروازہ کھول کر اتر گئی۔

عظام نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے شریر نظروں سے رواحہ کی طرف دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں......رواحہ اس کی نظروں میں چھپی شرارت محسوس کرکے مبہم سا مسکرایا اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔یوٹرن لیتے ہوئے عظام کی نظریں ظفری کی گاڑی پر پڑی تھیں۔

''ارے،یہ تو ظفری کی پراڈو ہے۔''

''ہاں......'' رواحہ نے بھی دیکھا۔

''لیکن یہ اِدھر کہاں جا رہا ہے۔'' وہ بے چین ہوا۔

''ہوسکتا ہے،اس کا گھر بھی اِدھر ہی ہو۔'' عظام نے خیال ظاہر کیا۔

''ے......ہاں......'' رواحہ نے اتفاق کیا اور ونڈ اسکرین سے باہر دیکھنے لگا۔

''کیا تم بہت چاہتے ہو ارفی کو؟'' عظام نے ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''عظمی اب اگر تم نے مجھ سے یہ پوچھا تو میں تمہیں مار بیٹھوں گا۔تم مجھ سے ایک سو اٹھارہ بار یہ سوال کر چکے ہو۔''

''دراصل میں تمہارے لیے ڈرتا ہوں روی کہ اگر تمہیں اپنی محبت نہ ملی تو کیا کروگے، یہ سوال میں تمہاری محبت کی شدت جاننے کے لیے نہیں کرتا بلکہ خود کو تسلی دینے کے لیے کرتا ہوں کہ شاید تم اس سے شدید محبت نہ کرتے ہو اور فرض کرو تمہاری محبت تمہیں نہ مل سکے تو زندگی تمہارے لیے زیادہ مشکل نہ ہو۔'' عظام کے لہجے میں اس کے

لیے محبت چھلکتی تھی۔

''محبت ماپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا یار وہ جب ہوتی ہے تو ہو جاتی ہے۔ مجھے بھی ارفی سے محبت ہوگئی ہے...... میری محبت مجھے نہ مل سکی تو زندگی میرے لیے مشکل ہوگی یا اذیت ناک ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا...... ابھی میں ایسا نہیں سوچتا کہ مجھے میری محبت نہیں ملے گی۔ ابھی میں بہت خوش گمان ہوں۔'' رواحہ بہت پُرامید تھا۔

''لیکن روی یہ ون سائڈڈ محبت بہت تکلیف دہ ہوتی ہے ناں...... آپ کسی سے محبت کرو اور وہ بھی آپ سے محبت کر لے پھر یہ محبت کھو بھی جائے تو دل کو یہ اطمینان تو ہوتا ہے ناں کہ آپ نے جس کو چاہا وہ بھی آپ کو چاہتا ہے لیکن......''

''عظمی......'' رواحہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''مجھے تمہاری بات...... میرا مطلب ہے یہ ون سائڈڈ محبت والی بات کچھ شک میں مبتلا کر رہی ہے کہیں کوئی......''

''ارے نہیں، کوئی نہیں......'' عظام نے اسے ٹوک دیا۔

''میں تو یونہی کہہ رہا تھا کہ ون سائڈڈ محبت زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔'' اس نے اپنا بھید چھپایا اور پھر وہ رواحہ کو بتا تا بھی کیا۔ وہ لڑکی (سجل) جسے اس نے صرف دوبار دیکھا تھا۔ محض ایک نظر اور وہ جمال پیکر اس پر سحر طاری کر گئی تھی، اسے وہ محبت تو نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ اس کا معصوم، سحر طاری کرتا حسن شاید وہ اللہ کی صناعی پر ٹھٹکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حسن کی انوکھی دولت عطا کی تھی۔ شاید یہ محبت نہیں تھی بس ستائش تھی۔ اللہ کی کاریگری کا سحر تھا جو وہ اسے بھول نہیں پا رہا تھا۔ دونوں خاموش ہو کر اپنی، اپنی سوچوں میں گم ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ گھر آ گیا۔ عظام نے ہارن دیا تو خدا بخش نے گیٹ کھول دیا۔

''ارے بابا کی گاڑی کھڑی ہے، لگتا ہے آج وہ بھی جلدی آ گئے ہیں۔'' عظام نے رواحہ کی طرف دیکھا۔

''ہاں......'' رواحہ بھی گاڑی دیکھ چکا تھا۔

دونوں گاڑی سے اتر کر اندرونی گیٹ کھول کر لاؤنج میں آئے تو لاؤنج خالی تھا۔

''بابا کہاں ہیں؟'' رواحہ نے مڑ کر خدا بخش سے پوچھا جو گیٹ بند کر کے اب اندر آیا تھا۔

''اپنے کمرے میں ہیں۔'' خدا بخش نے بتایا۔

''ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں چاچا، آج جلدی کیوں آ گئے ہیں'' رواحہ نے پھر پوچھا۔

''ٹھیک ہے، کہہ رہے تھے کہ کوئی پارٹی شارٹی تھی۔''

''اچھا آپ کھانا لگائیں۔'' خدا بخش سے کہہ کر رواحہ نے عظام کی طرف دیکھا۔

''تم فریش ہو کر آ جاؤ، میں ذرا بابا کو دیکھ آؤں۔'' عظام سر ہلا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بازو آنکھوں پر رکھے لیٹے تھے۔ رواحہ نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور انہیں یوں لیٹے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

''بابا آپ اس طرح کیوں لیٹے ہیں، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' انہوں نے بازو آنکھوں سے ہٹا کر اسے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''تم آ گئے رواحہ......؟'' اس نے اپنی بات دُہرائی۔

''ہاں یار...... ٹھیک ہوں، ایسے ہی تھک گیا تھا تو لیٹ گیا۔''

''کیوں تھک گئے تھے؟'' رواحہ نے احمقوں کی طرح پوچھا تو وہ ہنس دیے۔

''عمر کا تقاضا ہے جانِ پدر۔''

''افوہ...... عمر کی بات تو نہ کیا کریں مجھ سے، کتنی عمر ہوگی آپ کی پینتالیس، چھیالیس سال......''

''ہاں تقریباً......''

''تو یہ کوئی تھکنے کی عمر ہے؟'' اس نے منہ بنایا۔

''میری جان تھکنے کے لیے عمر کا زیادہ یا کم ہونا ضروری نہیں...... کبھی آدمی اسّی سال کی عمر میں بھی نہیں تھکتا اور کبھی جوانی میں ہی تھک جاتا ہے۔ میں تو بہت پہلے ہی تھک گیا تھا۔ تم نہ ملتے رواحہ تو میں تھک کر کہیں راستے میں ہی ڈھے چکا ہوتا۔ میری ہمت، میرا حوصلہ تو تم ہو رواحہ۔''

''کیا بات ہے بابا؟'' رواحہ نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''آج کل آپ کچھ زیادہ ہی قنوطی نہیں ہوتے جا رہے...... دکھی، دکھی باتیں کرتے ہیں۔ اداس، اداس دِکھتے ہیں، دال میں کچھ کالا تو نہیں؟ سچ بتائیں۔'' وہ شرارت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن وہ سنجیدہ تھے۔

''میری عمر میں آدمی ایسا ہی ہو جاتا ہے قنوطی سا......اور ساتھ ہی ماضی پرست بھی اور ماضی ہمیشہ اداس کرتا ہے۔''

''اوہو...... بابا پھر عمر......'' وہ ہولے سے ہنسا۔

''اور ماضی کو یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے، اپنے حال کو دیکھیں، کتنا خوب صورت ہے۔'' اس نے اپنی طرف شرارت سے اشارہ کیا تو وہ ہنس دیے۔

''میرا حال واقعی بہت خوب صورت ہے۔'' وہ بے حد محبت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''یہ بتاؤ تم آج کچھ جلدی آگئے ہو اور عظام کدھر ہے؟''

''آج دو پیریڈ فارغ تھے اور عظمی فریش ہونے گیا ہے۔ خدا بخش کھانا لگا رہا ہے چلیں۔''

''نہیں یار مجھے بھوک نہیں ہے، تم لوگ کھاؤ۔''

''آپ کچھ چھپا رہے ہیں بابا، آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' رواحہ تشویش سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں میری جان...... آج ایک کولیگ کی الوداعی پارٹی تھی تو کچھ کھا لیا تھا سو دل نہیں چاہ رہا۔'' انہوں نے بتایا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، آپ آرام کریں، میں اور عظمی کھانے کے بعد جواد کی طرف جائیں گے۔ دراصل آج اس کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی تھی۔''

''طبیعت خراب ہے تو اسے ساتھ ہی لے آنا۔ وہاں ہاسٹل میں کون اس کی دیکھ بھال کرے گا۔'' انہیں رواحہ کے دوست بھی بے حد عزیز تھے۔

''جی بابا؟''

''کھانا لگ گیا صاحب......'' خدا بخش کی آواز آئی تو انہوں نے اسے جانے کے لیے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ناں بابا...... آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے ناں۔'' رواحہ نے جاتے، جاتے پھر پلٹ کر تصدیق کی۔

''ہاں...... بالکل ٹھیک ہوں۔''

''آپ اپنی میڈیسن تو لے رہے ہیں ناں باقاعدگی سے؟''

''ہوں......'' انہوں نے اسے پھر تسلی دی۔ اس کی اتنی محبت پر ان کا دل بھر آیا تھا۔ سب کچھ کھو کر صرف ایک رواحہ کو ہی تو پایا تھا انہوں نے اور اب وہی ان کا سب کچھ تھا۔ انہوں نے دل ہی دل میں اس کی زندگی اور خوشیوں کی دعا کی اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندتے ہوئے سوچا۔

''حال کتنا بھی خوب صورت کیوں نہ ہو رواحہ لیکن ماضی کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ چاہے وہ خوب صورت ہو،

چاہے اذیت ناک ..... لیکن گاہے، گاہے دل کے افق پر پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوتا رہتا ہے۔ کبھی ہنستا ہے کبھی رُلاتا ہے۔'' اور وہ تو کبھی اپنے ماضی کو نہیں بھلا سکے تھے۔ لیکن آج تو جیسے وہ ماضی کی یادوں سے نکل ہی نہیں پا رہے تھے۔

صبح کالج جاتے ہوئے سگنل پر ایک بھکاری کو کچھ دینے کے لیے شیشہ سرکایا تو اچانک ہی ان کی نظر اپنے برابر کھڑی گاڑی پر پڑی تھی۔ پسنجر سیٹ پر بیٹھی شیشہ سرکائے باہر جھانکتی بلاشبہ وہ موناتھی، اسے پہچاننے میں انہیں کچھ دقت تو ہوئی تھی لیکن انہوں نے اسے پہچان لیا تھا۔ مونا ان کے ماضی کا ایک حوالہ، ان کی چندا کی دوست، ان کی منہ بولی بہن ..... آج کتنے سالوں بعد انہوں نے اسے دیکھا تھا۔ جب وہ کراچی آرہے تھے تو وہ بلک، بلک کررو ئی تھی۔ اور بار بار اس سے رابطہ نہ توڑنے کی درخواست کی تھی لیکن چاہت کے باوجود وہ اس سے رابطہ نہیں کر سکے تھے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ انہیں اب پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔ انہوں نے ماضی کو بھلا دینا ہے لیکن وہ اپنے ماضی کو نہیں بھلا سکے تھے۔ انہوں نے مونا کو بلانا چاہا، وہ اس سے بات کرنا چاہتے تھے۔ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے تھے اور اس سے اپنے دل کی وہ باتیں شیئر کرنا چاہتے تھے جو کبھی رواحہ سے بھی نہیں کر سکے تھے ..... بلکہ کر سکتے ہی نہیں تھے۔

''مونا .....'' انہوں نے اسے بے قراری سے آواز دی ..... لیکن عین اسی لمحے اشارہ کھل گیا اور اس کی گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی انہوں نے بے بسی سے اپنے آگے کھڑی گاڑیوں کو دیکھا جو ابھی رینگ رہی تھیں اور وہ دل مسوس کر رہ گئے۔ کتنے ہی زخموں کے ٹانکے کھل گئے تھے وہ ایک زخم سیتے تو دوسرے سے خون رسنے لگتا۔ اور دل تھا کہ قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ اتنے برسوں سے دل پر ضبط کا جو پتھر رکھا تھا وہ ضبط پارہ، پارہ ہو رہا تھا کب تک وہ خود کو روک سکیں گے۔ دل تھا کہ مچلتا تھا، تڑپتا تھا اور وہ قفل لگائے زنجیریں ڈالے بیٹھے تھے ..... زنجیریں تھیں کہ آج ٹوٹ، ٹوٹ کر گر رہی تھیں اور قفل کھلتے تھے اور وہ قفل لگاتے، لگاتے نڈھال ہو چکے تھے۔

''چندا .....!'' ان کے لبوں سے سسکی نکلی۔ ''کیوں میری زندگی سے نکل گئیں اتنی جلدی ..... بس اتنی سی محبت تھی تمہاری کہ مجھے اکیلا چھوڑ دیا، تڑپنے کے لیے اور بالکل تہی داماں کر دیا۔''

وہ تو اس کی ذراسی ناراضی، ذراسی خفگی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے اور وہ ہمیشہ کے لیے خفا ہو گئی تھی کبھی ان کی زندگی میں واپس نہ آنے کے لیے ..... وہ ذراسی ناراض ہوتی تھی تو ان کی جان پر بن آتی تھی، ان دنوں بھی وہ ان سے خفا، خفا سی تھی۔

''دیکھو چندا ..... اس طرح منہ موڑ کر مت جاؤ، میں مر جاؤں گا۔'' وہ چاہتی تھی کہ وہ بابا جان کو اس کے گھر بھیجیں اور اپنی کم مائیگی کا احساس انہیں آگے بڑھنے سے روکتا تھا، وہ تھوڑا سا وقت چاہتے تھے اتنا کہ اس کے والدین کے سامنے دامن پھیلاتے ہوئے انہیں شرمندگی نہ ہو۔ اور اس روز تو وہ سچ مچ ناراض ہو گئی تھی۔ وہ آخری پیریڈ اٹینڈ کر کے گھر جانے کے لیے پارکنگ کی طرف جا رہے تھے اور وہ ان کا ہاتھ جھٹک کر چل دی تھی۔ وہ اسے پکارتے ہوئے اس کے پیچھے لپکے تھے۔ وہ دن مجسم ہو کر جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے آگیا تھا۔

''چندا ..... پلیز میری بات تو سنو۔'' وہ تیز، تیز چلتے ہوئے اس کے قریب آئے تھے۔

''کیا بات سنوں .....؟'' اس نے مڑ کر ناراضی سے انہیں دیکھا تھا۔

''چندا میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میرا یقین کرو ..... لیکن میرے اور تمہارے اسٹیٹس میں بہت فرق ہے، مجھے اس قابل تو ہونے دو کہ میں تمہارے ڈیڈی کے سامنے تمہارے لیے ہاتھ پھیلا سکوں۔ ابھی تو میری تعلیم بھی مکمل نہیں ہے۔''

''اور تمہارے کسی قابل ہونے سے پہلے ڈیڈی میری شادی کر دیں گے اور تم دیکھتے رہنا۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے چندا......'' انہوں نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔
''یہ ایسے ہوسکتا ہے کہ ممی اور ڈیڈی نے میرے لیے میرے کزن کو منتخب کرلیا ہے۔''
''تو...... وہ.'' ان کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ ''پھر بھلا تمہارے کزن کے ہوتے ہوئے وہ میرا پروپوزل کیسے قبول کریں گے۔ اس کا اور تمہارا اسٹیٹس ایک ہوگا؟''
اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تم انکار کے خوف سے کوشش ہی نہیں کرو۔ اگر اتنی ہی ہمت تھی تو محبت کرنے سے پہلے سوچ لیا ہوتا۔'' چندا بدستور ناراضی سے بول رہی تھی۔ ''جو بھی فیصلہ کرنا ہے جلدی کرو بلکہ آج ہی کرلو...... تم اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہو کہ ڈیڈی تمہارے متعلق سوچیں بھی نہیں...... جبکہ میں تمہارے متعلق ان سے بات کرچکی ہوں۔ ڈیڈی ایجوکیٹڈ لوگوں کی قدر کرتے ہیں اور تمہارے بابا پروفیسر ہیں...... معاشرے میں ایک مقام ہے ان کا۔''
لیکن چندا کے ڈیڈی تو بے حساب زمین و جائداد کے مالک تھے۔ اسے یہ بڑی ناممکن سی بات لگ رہی تھی۔
''کیا سوچنے لگے ہو؟'' چندا انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔
''کچھ نہیں چندا! میں نے تمہارے علاوہ کبھی کسی کے متعلق نہیں سوچا۔ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہو اور جب پہلی بار میں نے تمہیں مونا کے گھر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے دیکھا تھا تو تمہارا روپ اسی روز ہمیشہ کے لیے میرے دل میں کھب گیا تھا۔ اور جب دوسری بار میں نے تمہیں مونا کے گھر میں دیکھا تو میں نے خود سے کہا تھا۔ یہی وہ لڑکی ہے جسے زندگی کا سفر میرے ساتھ طے کرنا ہے۔ تب میں تمہارے متعلق کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا، مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ تم میری محبت قبول بھی کروگی یا نہیں لیکن میرے دل کو یقین تھا کہ صرف تم ہی وہ لڑکی ہو جسے زندگی کے سفر میں میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے۔''
چندا کے رخسار گلگوں ہوگئے تھے۔
''میں چاہتا تھا، اپنی تعلیم مکمل کرکے کسی جاب پر لگ جاؤں، کوئی سائڈ بزنس کرلوں...... کچھ تو ہو میرے پلے ...... کہ میں سرا ٹھا کر تمہارے اس محل نما گھر میں قدم رکھ سکوں۔'' انہوں نے وضاحت کی۔ ''لیکن تمہیں شاید میری محبت پر یقین نہیں ہے؟''
''ایسا نہیں ہے، مجھے تمہاری محبت پر شک نہیں ہے بس مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ بننے کے چکر میں تم اتنے لیٹ نہ ہوجاؤ کہ......'' وہ کچھ پریشان سی تھی۔ ''ڈیڈی تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''
''اوکے چندا!'' وہ ہار سے گئے۔ ''میں آج ہی بابا جان سے بات کرتا ہوں۔''
''تمہارے بابا جان اعتراض تو نہیں کریں گے ناں......'' چندا کو تشویش ہوئی تھی۔
''وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں چندا، جب بھی تم گھر آتی ہو بہت خوش ہوتے ہیں۔ وہ بھی کبھی، کبھی میرے اور تمہارے درمیان اسٹیٹس کے فرق کے متعلق سوچ کر پریشان ہوجاتے ہیں۔''
''خدا کے لیے اس احساسِ کمتری سے باہر نکلو...... جب مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے تو تمہیں کیوں ہے، دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی ہے۔'' وہ انہیں سمجھا رہی تھی۔ ''پھر اتنی زیادہ دولت کا مصرف بھی کیا ہوتا ہے۔ اچھا کھاتے ہو، اچھا پہنتے ہو، زندگی کی ہر سہولت تمہیں میسر ہے، تمہارے بابا جان اتنے معزز پیشے سے وابستہ ہیں۔ تمہیں تو ان پر فخر ہونا چاہیے۔''
''مجھے ان پر فخر ہے، مجھے ذاتی طور پر کبھی احساسِ کمتری نہیں ہوا۔ میں صرف ان فاصلوں سے ڈر رہا ہوں جو میرے اور تمہارے درمیان ہیں، مجھے تمہارے ڈیڈی کے انکار سے ڈر لگتا ہے۔ اگر انہوں نے انکار کردیا تو

میں کیسے برداشت کروں گا۔'' وہ جذباتی ہوگئے تھے۔
''ڈیڈی نے آج تک میری ہر بات مانی ہے۔ وہ میری مرضی کو یقیناً اہمیت دیں گے۔'' وہ بہت پُر یقین تھی۔
''جب میں کہوں گی کہ مجھے تمہارے ساتھ زندگی گزارنی ہے تو بھلا وہ کیسے انکار کرسکتے ہیں۔''
''اوکے...... آج باباجان سے بات کرکے تمہیں بتادوں گا کہ وہ کب تمہارے گھر آرہے ہیں۔'' وہ مسکرائے تھے۔
''اب موڈ ٹھیک کرو، آؤ تمہیں آئس کریم کھلاؤں۔'' اور چندا کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
''بابا......!'' رواحہ نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔
''قہوہ پئیں گے آپ؟''
''یس پلیز......'' وہ یادوں کو جھٹکتے ہوئے سیدھے ہوکر بیٹھ گئے۔ حالانکہ قہوہ پینے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن انہیں لگا تھا کہ اگر وہ قہوہ پینے سے بھی انکار کردیں گے تو رواحہ حقیقتاً پریشان ہوجائے گا۔ رواحہ نے دروازے سے باہر جھانک کر آواز دی۔
''چاچا قہوہ بنا کر بابا کے کمرے میں ہی لے آئیں۔ وہ بھی پئیں گے اور عظامی یار تم بھی آجاؤ اِدھر، آج بابا کا موڈ نہیں ہو رہا اٹھنے کا۔'' آواز لگا کر وہ ان کے پاس ہی آکر بیڈ پر بیٹھ گیا۔
''تم لوگوں نے کھانا جلدی نہیں کھالیا...... کیا اچھا نہیں بنا ہوا تھا؟'' انہوں نے رواحہ سے پوچھا۔
''ارے نہیں بابا، کھانا تو بہت مزے کا تھا۔'' رواحہ کے بجائے اندر آتے عظام نے جواب دیا۔ ''خدا بخش چاچا کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔''
''آؤ...... آجاؤ بیٹا۔'' انہوں نے بہت محبت سے اسے دیکھا۔ عظام کے لیے وہ اپنے دل میں بہت محبت و شفقت پاتے تھے۔ اس کی طرف ان کا دل کھنچتا تھا۔
''بیٹا تم یہاں سیٹ ہوناں...... کوئی پرابلم تو نہیں......؟''
''نہیں بابا، میں یہاں بہت خوش ہوں اور وہاں ہاسٹل میں تو کبھی، کبھی دل بہت گھبراتا تھا۔''
''آج بڑی عجیب بات ہوئی بابا۔'' رواحہ کو ایک دم یاد آیا۔ ''ہمارے ایک نئے پروفیسر آئے ہیں، انہوں نے ہم دونوں کو پہلے بھائی سمجھا پھر کہنے لگے۔ ضرور کوئی رشتے داری ہوگی۔ بہت مشابہت ہے تم دونوں میں...... خاص طور پر آنکھیں اور ناک تو بالکل ایک جیسی ہیں۔ جواد نے بھی تائید کی۔''
''بالکل صاحب......!'' خدا بخش نے قہوے کی ٹرے ٹیبل پر لاکر رکھی۔
''میں نے جب پہلی بار عظام صاحب کو دیکھا تھا تو مجھے بھی لگا تھا کہ اپنے رواحہ سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ خاص طور پر ان کی آنکھیں تو بالکل رواحہ جیسی ہیں۔ دیکھنے کا انداز بھی ویسا ہی ہے۔'' انہوں نے عظام کی طرف بغور دیکھا۔
واقعی انہوں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ عظام اور رواحہ میں کافی مشابہت تھی خاص کر آنکھیں تو......
''میرے پاپا کہتے ہیں میری آنکھیں تو بالکل ماما کی طرح ہیں۔'' عظام نے بتایا۔
''ارے، میری آنکھیں بھی تو اپنی ماما کی طرح ہیں۔'' رواحہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا اور اس نے تصدیق کے لیے ان کی طرف دیکھا۔
''کیوں بابا؟'' لیکن انہوں نے رواحہ کی بات ہی نہیں سنی تھی۔ وہ تو حیرت سے کبھی رواحہ کو دیکھتے کبھی عظام کو اور پھر ان کے لبوں سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی۔
''تمہارے پاپا کا نام......؟'' وہ مبہوت سے عظام کو دیکھ رہے تھے۔

(جاری ہے)



گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار

فرزانہ نگہت

وہ سنہری ریلنگ کا سہارا لیے آہستہ، آہستہ بڑے پُروقار اور مسحور کُن انداز سے مرمریں زینے اترتی ہوئی نیچے آرہی تھی۔ گہرے سبز رنگ کی بیش قیمت اور نفیس ساڑی میں اس کا حسین سراپا ہزار فتنے جگا رہا تھا۔ اس کے کانوں میں لمبے، لمبے آویزے جھول رہے تھے۔ مرمریں حسین گردن میں ہیرے کا نیکلس گویا اپنی ہی خوب صورتی میں اضافہ کر رہا تھا، گھنے سیاہ حسین بال سادگی سے سنورے ہوئے تھے۔

حسین و دلکش چہرے پر بغیر میک اپ کے بھی بے حد تابانی اور چمک تھی۔ نواب ذوالفقار نے تیزی سے سانس بھری، ان کا دل عجیب انداز سے دھڑکا..... کیا وہ اسے طلاق دے سکتے تھے؟ اسے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے خارج کر سکتے تھے؟ محض شک و شبے کی بنیاد پر...... ایک موہوم سے ثبوت کی بنیاد پر جس کی تصدیق کی بھی اپنوں نے آج تک کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کیا یہ اس پر ظلم نہ ہوتا؟ اس کے ساتھ سنگین بے انصافی نہ ہوتی؟ کتنا عرصہ گزر چکا تھا وہ اسے طلاق دینے یا نہ دینے کے بارے میں کسی حتمی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہے تھے۔

عجیلہ سے ان کی شادی کو ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کے ساتھ ان کی شادی کسی رومان یا پسند کا نتیجہ نہیں تھی۔ بلکہ ان کے خاندانوں نے باہمی رضامندی سے طے کی تھی۔ یعنی یہ ارینجڈ میرج تھی۔ عجیلہ ان کے والدِ مرحوم نواب ذوالقرنین علی خان کے پھوپی زاد بھائی، نواب افتخار علی خان کی بیٹی تھی۔ جسے انہوں نے اپنی عمر میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نواب افتخار ویسے بھی شمالی علاقے کے ایک انتہائی دور دراز کی ریاست نگر کے نواب تھے۔ وہ خاندانی تقریبات میں کبھی کبھار ہی شریک ہوتے تھے۔ ان کی بیگم کا تعلق بھی شمالی علاقے کی ایک ریاست سے تھا۔ خاندان کے لوگ ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تھے، انہیں صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ ان کے پانچ بیٹے تھے اور ایک بیٹی...... اس ایک بیٹی عجیلہ کے حسن و جمال کا خاندان بھر میں خوب شہرہ تھا...... سنا گیا تھا کہ وہ نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی بلکہ نہایت خوش اطوار اور خوش اخلاق اور خوش ذوق بھی تھی۔ جس کے لیے بڑے، بڑے امیر و بارسوخ گھرانوں سے رشتوں کے پیغام آ رہے تھے لیکن نواب افتخار اس کی شادی اپنے خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کسی رشتے کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ پھر ایک خاندانی تقریب میں جو نواب افتخار کے چچا زاد بھائی، طاہر علی خان کی شادی کے سلسلے میں برپا ہو رہی تھی، وہ اپنی بیگم کے ساتھ سمن زار پہنچے تو ان کی بیٹی عجیلہ بھی ان کے ہمراہ تھی۔ اس تقریب میں نواب ذوالفقار اور ان کی والدہ بھی شریک ہوئے تھے۔ نواب صاحب کی ملاقات صرف نواب افتخار اور ان کی بیگم سے ہی ہو سکی تھی۔ ان کی بیٹی عجیلہ انہیں اس تقریب کی گہما گہمی میں کہیں نہ دکھائی دی تھی لیکن ان کی والدہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات نے انہیں ایسا متاثر و مسحور کیا تھا کیا تھا کہ انہوں نے عجیلہ کو نواب اور ان کی بیگم سے اپنے بیٹے کے لیے مانگنے میں کوئی دیر نہ کی تھی۔ نواب افتخار اور خود اُن دونوں کو اور ان کے بیٹوں کو بھی یہ رشتہ ہر لحاظ سے اپنی بیٹی، بہن کے لیے بے حد مناسب و موزوں لگا تھا۔ یوں عجیلہ بڑی دھوم دھام سے نواب ذوالفقار علی خان کی بیگم کی حیثیت سے ”قصرِ زریں“ میں بہار بن کر داخل ہو گئی تھی۔

نواب ذوالفقار علی خان نے اب تک عجیلہ کی صرف تعریفیں ہی سن رکھی تھیں۔ اب جب انہوں نے اسے دیکھا تو اپنا آپ ہی بھلا بیٹھے، اس کے بے پناہ حسن و جمال نے گویا انہیں اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ اس کی خوش ذوقی، نفاستِ طبع اور دیگر خوبیوں نے بھی انہیں اس کا شیدا بنا دیا.... وہ دل و جان سے اس کی محبت کا دم بھرنے اور ہر دم پروانہ وار نثار ہونے لگے۔ وہ بھی ان کی محبت کا جواب محبت سے دینے میں بڑی گرم جوشی اور ان کی مرضی و پسند کا احترام کرنے والی، ان کے اشاروں پر چلنے والی خدمت گزار بیوی ثابت ہوئی۔ ان کی زندگی بھرپور راحتوں اور مسرتوں سے لبریز گویا جنت کا نمونہ بن گئی۔ پھر اس جنت کو ایک ننھے منے خوب صورت پھول نے اور بھی حسین بنا دیا۔ ننھا سلمان جو اَب آٹھ ماہ کا ہو چکا تھا اپنی دادی کی آنکھوں کا نور اور

ان کے دلوں کا سرور تھا۔

ان کی زندگی شاید اسی طرح راحتوں اور مسرتوں سے بھرپور گزرتی رہتی لیکن ایک دن ایک واقعہ ایسا رونما ہوگیا جس نے نواب ذوالفقار کے لیے زندگی کا تمام تر حسن و دلکشی غارت کر کے رکھ دی اور اس میں نفرت اور غم و غصے کا زہر بھر دیا۔ ان کے دل و دماغ کو مسموم کردیا۔ ان کی روح پر ایک بھاری بوجھ لا ڈالا۔

ہوا یہ تھا کہ اس شام وہ اور عجیلہ محل کے باہر چمن کی سیر کررہے تھے۔ ان کے درمیان ہلکی پھلکی پُرمزاح باتیں ہورہی تھیں۔ یونہی ٹہلتے، باتیں کرتے وہ چمن میں واقع وسیع و عریض تالاب میں بنی بارہ دری میں جا کر مرمریں نشستوں پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ ایک بے حد حسین شام تھی۔ عطر بیز ہوائیں فضا کو معطر کیے ہوئے تھیں۔ رنگا رنگ پھول بڑے دلکش انداز میں ہوا میں ہلکورے لے رہے تھے۔ درختوں کے پتے ہوا کی چھیڑ چھاڑ سے تالیاں بجا رہے تھے۔ اِدھر اُدھر اڑتے رنگا رنگ پروں اور تالاب کے دور دراز کے حصے میں تیرتے بگلوں اور مرغابیوں کی چہکاروں نے فضا میں نغمگی سی برپا کررکھی تھی۔ ایسی فضاؤں، ایسے نظاروں میں عجیلہ کا حسین وجود نواب ذوالفقار کو بے خود کیے دے رہا تھا۔ ان کے درمیان شادی سے پہلے کے زمانے کی باتیں ہونے لگیں۔ نواب ذوالفقار، عجیلہ کو کالج اور یونیورسٹی میں اپنے ساتھ پیش آنے والے رومانی حادثات کے بارے میں بتانے لگے تھے کہ کتنی ہی خوب صورت اور طرح دار دوشیزاؤں نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کسی کے ساتھ سنجیدہ نہ ہوئے تھے۔ اور یہ معاملاتِ دل یک طرفہ ہی رہے تھے۔ انہوں نے بعض دوشیزاؤں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا تھا اور ان کی یک طرفہ محبت پر اظہارِ تاسف بھی کیا تھا۔ پھر انہوں نے عجیلہ سے بھی پوچھا کہ آیا اس کے ساتھ بھی ایسا کوئی رومانی حادثہ پیش آیا تھا؟

تو اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر بڑے پُرسکون مگر تاثر سے بھرپور لہجے میں دھیمی، دھیمی سی معنی خیز مسکراہٹ سے صرف اتنا ہی کہا تھا۔

''گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر سے بھی''

اس پر وہ بری طرح چونکے تھے، انہوں نے تیز نظروں سے اسے گھورا تھا لیکن اس کے چہرے پر ایسے تاثرات پھیلے ہوئے تھے جیسے اس نے کوئی عام سی بات کہی ہو..... لیکن اس کے ہونٹوں پر جو خفیف سی معنی خیز سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی وہ انہیں کوئی ان کہی کہانی سناتی معلوم ہورہی تھی۔ ان کا دل ایک دم سے شکوک وشبہات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ ان کے ذہن میں بد خیالیوں اور بد گمانیوں کے ناگ سرسرانے لگے۔ اِک عجیب بے چینی اور اضطراب انہیں شدید اذیت اور کرب میں مبتلا کرنے لگا تھا۔ ان سے شادی سے پہلے کوئی مرد عجیلہ کی زندگی میں آچکا تھا شاید وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا رہ چکے تھے۔ ان کے درمیان بے تکلفی بھی ہوگی، باہمی عہد و پیمان بھی ہوئے ہوں گے۔ لیکن ان کی شادی نہ ہوسکی تھی اور عجیلہ ان کی بیوی بن گئی تھی۔ اس کا مطلب یہی ہوسکتا تھا کہ وہ محض اپنے گھر والوں کے کہنے پر ان سے شادی پر تیار ہوئی تھی ورنہ اسے حقیقی معنوں میں محبت تو اپنی زندگی میں داخل ہونے والے اس پہلے مرد سے تھی۔

انہیں اب اس کی محبت، اس کی چاہت، اس کا لگاؤ سب ریاکاری اور منافقت دکھائی دینے لگے تھے۔ ان کی نظریں اب مشکوک انداز میں اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے لگی تھیں۔ اس کے منہ سے نکلنے والی ہر بات سے وہ کوئی نہ کوئی معنی مطالب اخذ کرنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے رویّے یا باتوں سے اسے کچھ نہ محسوس ہونے دیا۔ وہ پہلے ہی کی طرح اس کے ساتھ ہنستے بولتے، اس کے ہمراہ سیر و تفریح کرتے، لوگوں سے ملتے

ملاتے جبکہ ان کے اندر ایک الاؤ سا دہک رہا ہوتا تھا۔ شدید غیظ وغضب، نفرت واذیت، شدید حسد و رقابت کے جذبات کے کھولاؤ سے ہر دم بے چین بے سکون وہ اب عجیلہ کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے بارے میں سوچنے لگے تھے جس کے لیے ان کے دل میں اب کوئی محبت، چاہت یا لگاؤ باقی نہیں رہ گیا تھا جو اُن کے نزدیک اب ایک بے وفا، فریبی، جھوٹی اور منافق عورت تھی۔ جو بظاہر اُن کی محبت و وفا کا دم بھرتے ہوئے ایک دوسرے آدمی کے خیال وتصور کو بسائے بیٹھی تھی درحقیقت اسی کی محبت و چاہت کا دم بھرتی چلی جارہی تھی۔ اور یہ ان کی برداشت سے باہر تھا۔ یہ ان کی محبت، ان کے پاکیزہ جذبات کی تذلیل ہی نہیں تھی، ان کی غیرت و حمیت پر بھی کھلا وار تھا جسے وہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ انہوں نے بارہا اسے طلاق دینے کے بارے میں سوچا تھا لیکن وہ کسی کے سامنے طلاق کی کوئی معقول وجہ نہیں پیش کرسکتے تھے۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں شدید بڑھتی جھنجلاہٹ اور مایوسی نے ان کے دل و دماغ پر برا اثر ڈالنا شروع کردیا تھا۔ ان کی صحت متاثر ہونے لگی، باوجود کوشش اور ضبط کے وہ اب اکثر عجیلہ سے سخت کلامی کر بیٹھتے۔ اس سے سرد مہری برتنے لگتے۔ اسے ڈانٹ اور جھڑک بھی دیتے۔ وہ ان کے اس رویّے پر حیران و پریشان انہیں خوش رکھنے اور ان کا ہر ممکن خیال رکھنے کی کوشش کرتی تھی لیکن وہ بدستور اس کی جانب سے کھنچے، کھنچے سے رہتے تھے۔ عجیلہ نے جب بھی اُن سے ان کے اس بدلے ہوئے رویّے کی وجہ جاننا چاہی تو انہوں نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اسے ٹال دیا۔ انہیں بعض اوقات اس سے اپنی زیادتی کا احساس ہوتا تھا۔ اور یہ خیال گزرتا کہ شاید وہ اس کے بارے میں بے جا شکوک وشبہات اور غلط فہمی کا شکار ہیں لیکن اس کے کہے ہوئے الفاظ......

''گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر سے بھی......'' ان کی یادداشت پر ان مٹ نقوش بن کر ثبت ہوچکے تھے۔ وہ انہیں نہیں جھٹلا سکتے تھے۔ اپنی ہی آگ میں جلتے کلستے مسلسل بے چینی اور اضطراب میں مبتلا وہ اپنے آپ کو چاروں طرف سے گہری تاریکیوں میں گھرا پارہے تھے۔ جن میں کہیں سے بھی روشنی کی کرن نہ دکھائی دے رہی تھی۔

وسیع وعریض تیز روشنیوں سے جگمگاتے لاؤنج میں اس وقت عجیلہ فون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھی۔ قریب ہی صوفے پر ان کی والدہ صفیہ خانم پوتے سلمان کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے چائے کی ٹرالی تھی۔ وہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔

''کہاں رہ گئے تھے زلفی......؟ یہاں چائے تمہارے انتظار میں ٹھنڈی ہوتی رہی۔'' صفیہ خانم نے پوچھا۔

''چمن میں گلاب کے پھولوں کو دیکھنے چلا گیا تھا۔ وہاں پھولوں کی نئی اقسام لا کر لگائی گئی ہیں۔'' انہوں نے بات بناتے ہوئے اپنی پیالی میں چائے انڈیلنی شروع کی۔ اسی وقت عجیلہ بھی فون سے فارغ ہوکر اُن کے قریب آبیٹھی۔

''کس کا فون تھا؟'' انہوں نے استفسار کیا۔

''عذرا کا......اس کے بھائی کی شادی ہورہی ہے، آپ کیا میرے ساتھ چل سکیں گے؟'' عذرا اس کی بچپن کی سہیلی تھی جو اکثر ملنے آتی رہتی تھی۔

''میں تو فی الحال کہیں نہیں جاسکتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ ماہرارضیات کا ایک وفد یہاں پہنچا ہوا ہے۔ مجھے ان کے ساتھ مصروف رہنا پڑتا ہے۔ تم خود چلی جاؤ، میری طرف سے معذرت کرلینا۔''

''ہاں اپنے ساتھ کچھ کنیزیں اور محافظ بھی لے جاؤ، دور کا سفر ہے......'' صفیہ بیگم بولیں۔ ''تم وہاں کتنا عرصہ رہوگی بیٹی؟''

''ہفتہ بھر تو لگ ہی جائے گا۔'' عجیلہ کچھ سوچ

کر بولی۔ ''لیکن کوشش کروں گی کہ جلد واپس آجاؤں۔ آپ ننھے کی وجہ سے اداس ہوجائیں گی ناں؟'' صفیہ خانم مسکرائیں۔ انہوں نے جھک کر بچے کو پیار کیا۔

''ہاں یہ تو مجھے بے حد یاد آئے گا لیکن یہ ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا کہ مجھے یاد رکھ سکے۔ ویسے تم کب جارہی ہو بیٹی؟''

''اگلے ہفتے عذرا نے جلد پہنچنے کی تاکید کی ہے۔''

''اچھا تم تیاریاں کرلو، میں ہوائی جہاز سے تمہارے سفر کا انتظام کروائے دیتا ہوں۔'' نواب ذوالفقار بولے اور خالی کپ ٹرالی میں رکھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔

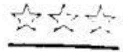
اس رات وہ دیر تک اپنے کمرے کے باہر لابی میں ٹہلتے رہے۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے ہوئے عمیق سوچوں کے گرداب میں چکراتے رہے۔ عجیلہ سے نجات پانے کا یہ اچھا موقع تھا۔ اپنی بہلی کے بھائی کی شادی کے بعد اس نے اپنے ماں، باپ اور بھائیوں سے ملنے تو ضرور جانا تھا۔ یہ اسے طلاق نامہ بھجوانے کا اچھا موقع تھا۔ اس طرح وہ کبھی سمن زار واپس نہیں آسکتی تھی۔ اپنی سسرال والوں کے سامنے اس طلاق کے لیے ان کے پاس اس کی بے وفائی اور فریب کاری کا معقول جواز موجود تھا۔ اپنی والدہ کو بھی وہ مطمئن کرسکتے تھے جو عجیلہ کو حقیقی بیٹی کی طرح چاہنے لگی تھیں۔ ننھے سلمان کی جدائی انہیں شاق گزرتی لیکن پھر انہیں صبر آ ہی جاتا۔ صبح ہونے تک وہ اس ارادے اس فیصلے کے تانے بانے بنتے رہے۔

اگلے ہفتے عجیلہ ننھے سلمان کے ساتھ اپنی ریاست پرواز کرگئی۔ اس کے بعد کے چند دن نواب ذوالفقار کے اتنے مصروف گزرے کہ انہیں عجیلہ کو طلاق نامہ بھجوانے کا خیال تک نہیں آسکا پھر جب بالآخر انہیں فرصت میسر آئی تو عجیلہ کے واپس آنے میں تھوڑے دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ اب انہیں جو کچھ کرنا تھا جلد ہی کرنا تھا۔

اس رات کھانے سے فارغ ہوکر انہوں نے کچھ وقت اپنی والدہ کے ساتھ گزارا۔ پھر اپنے کمرے میں چلے آئے۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے سگار دان سے سگار نکالا اور اسے سلگاتے ہوئے اس کے گہرے گہرے کش لیتے ہوئے صوفے کی پشت سے ٹیک کر اپنے ذہن میں طلاق کا مضمون تیار کرنے لگے۔ ان کی نظریں سامنے وارڈ روب پر جمی تھیں۔ اس وارڈ روب میں عجیلہ کے ملبوسات سجے تھے۔ سیف میں زیورات اور دیگر بیش قیمت اشیا محفوظ تھیں۔ عجیلہ ہر چیز کا بڑا اعلیٰ ذوق رکھتی تھی۔ خواہ وہ جوتے، کپڑے ہوں، زیورات، میک اپ کے لوازمات ہوں یا آرائشی اشیا...... ڈریسنگ روم میں بھی اس کی جو وارڈ روب تھی اس میں آراستہ اشیا بھی اس کی اعلیٰ ذوق کا شاندار نمونہ تھیں۔ ڈریسنگ روم کی وارڈ روب کے خیال کے ساتھ ہی نواب ذوالفقار کو کوئی خیال آیا وہ چونکے اور سیدھے ہوکر صوفے پر آ بیٹھے۔ اس وارڈ روب کی ہر کیبنٹ ہر دراز ان کی دیکھی بھالی تھی۔ ان میں بھی عجیلہ نے اپنے بیش بہا زیورات اور بہت کچھ

خودکشی

ایک آدمی خودکشی پہ تقریر کررہا تھا۔ خودکشی حرام ہے، ظلم ہے، بزدلی ہے، پاگل پن ہے، ایسی حرام موت مرنے سے بہتر ہے انسان اپنے آپ کو گولی ماردے۔''



بچہ

''ماں میں کب اتنا بڑا ہوں جاؤں گا کہ میں تم سے بنا پوچھے کہیں بھی آجاسکوں گا۔'' ایک معصوم بچے نے اپنی ماں سے پوچھا۔ ''بیٹا اتنا بڑا تو ابھی تک تیرا باپ بھی نہیں ہوا۔''

از: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

رکھا ہوا تھا لیکن ایک کیبنٹ ایسا تھا جو بند ہی چلا آرہا تھا۔ انہوں نے جب کبھی اس سے اسے کھولنے پر اصرار کیا تھا تو وہ مختلف حیلوں، بہانوں سے ٹال گئی تھی۔

ان کے رگ و پے میں اِک سنسنی دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے سگار کے کش لیتے ہوئے صوفے سے اٹھ گئے۔ عجیب حیران کُن بات تھی کہ انہیں عجیلہ کی طرف سے مشکوک اور بدگمان ہوئے اتنا عرصہ گزر چکا تھا اور انہیں ایک بار بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس ہمیشہ بند رہنے والی کیبنٹ میں کچھ ہوسکتا تھا۔ اس کے محبوب کے خطوط، تصاویر، خفیہ ڈائری یا خطرناک قسم کے کاغذات......

انہوں نے ایش ٹرے میں سگار کچلا اور ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔ اندر پہنچ کر انہوں نے روشنیاں جلائیں اور وہ وارڈ روبز کی قطاروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے عجیلہ کے اس وارڈ روب کے سامنے جا کر رک گئے۔ انہوں نے مخصوص خفیہ مقام سے اس کی چابیاں نکالیں اور وارڈ روب کھول دیا۔ مسحور کُن خوشبوؤں کے جھونکے ان کی حسِ شامہ سے ٹکرائے۔ ہینگروں پر لٹکے حسین و بیش قیمت ملبوسات کی قطاروں سے آگے اوپر تا نیچے کیبنٹوں کی قطار بنی ہوئی تھی جو سب مقفل تھے۔ انہی میں وہ کیبنٹ بھی تھا جسے کھولنے سے عجیلہ ہمیشہ انکاری رہی تھی۔ انہوں نے الماری کے خفیہ خانے سے ان کیبنٹوں کی چابیاں نکالیں اور انہیں اس کیبنٹ کے لاک پر آزمانے لگے لیکن اسے کوئی چابی نہ لگ سکی۔ شدید غصے اور جھنجلاہٹ کے عالم میں انہوں نے ایک بار پھر تمام چابیاں اس لاک پر آزما ڈالیں لیکن اس بار بھی وہی نتیجہ رہا۔ ہونا بھی یہی چاہیے تھا کہ عجیلہ اسے اس طرح بند رکھتی۔ ان کے رگ و پے میں شدید غیظ و غضب کی لہریں موجزن ہوگئیں۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا، سنگار میز پر ایک نیل کٹر پڑا تھا۔ انہوں نے اسے اٹھا لیا اور اس کا چاقو کھول کر اسے کیبنٹ کے کی ہول میں داخل کرتے ہوئے اسے پوری قوت سے گھمایا۔ کھٹکا ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی چاقو بھی ٹوٹ گیا۔ انہوں نے نیل کٹر کو ایک طرف پھینکا اور کیبنٹ کھول دیا۔ ان کا خیال غلط نہیں تھا۔ اندر واقعی کاغذوں کے کئی پلندے اور ڈائریاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ انتہائی اشتیاق و تجسس سے کچھ غیظ و غضب سے کپکپاتے، شکوک و شبہات کے گرداب میں چکراتے انہوں نے پہلے ڈائریاں دیکھنی شروع کیں مگر ان تمام ڈائریوں میں چند ایک ہی صفحات پر کچھ نام اور پتے وغیرہ لکھے ہوئے تھے یا اشعار لکھے ہوئے تھے باقی سب اوراق صاف تھے۔ انہوں نے انہیں اپنی جگہوں پر رکھتے ہوئے کاغذوں کے پلندے دیکھنے شروع کیے۔ وہ عجیلہ کے زمانۂ طالب علمی میں مختلف رسائل کو لکھے گئے افسانوں اور غزلوں وغیرہ کے تراشے تھے۔ وہ ان سب پلندوں کو توجہ سے دیکھتے رہے۔ انہیں ان میں اپنے کام کی کوئی چیز نہ مل سکی۔ اب ایک ہی پلندا باقی رہ گیا تھا۔ جس پر اخباری کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ وہ ایک فیتے سے بندھا تھا۔ شاید یہی ان کے کام کی چیز تھی۔ انہوں نے اس کے فیتے کو کھولا اس پر لپٹا اخباری کاغذ ہٹایا ان کا دل زور، زور سے دھڑک رہا تھا۔ تنفس کی رفتار تیز ہوچکی تھی۔ کاغذ ہٹتے ہی نیلے گلابی اور سفید رنگوں کے لیٹر پیڈز پر لکھے خطوط ان کے سامنے تھے۔ یہ عجیلہ کی سہیلیوں کے اس کی شادی سے پہلے کے اسے لکھے ہوئے خطوط تھے۔ انہوں نے ایک، ایک کر کے انہیں پڑھنا شروع کیا۔ زیادہ خطوط میں اِدھر، اُدھر کی پُر لطف باتیں اور واقعات ہی لکھے ہوئے تھے پھر ایک خط کی سطروں پر نظریں دوڑاتے، دوڑاتے وہ بری طرح سے چونکے اور پوری توجہ سے ان سطروں کو پڑھنے لگے۔ لکھا تھا ''تو تم نے اپنے خوابوں کے شہزادے کو پا ہی لیا۔ افسوس کی بات ہے جو وہ تمہیں نہ دیکھ سکے ورنہ

ان کا حال بھی تم سے مختلف نہ ہوتا۔ اب تو تم اپنی ہر خاندانی تقریب میں شرکت کیا کرو، ممکن ہے کہ کسی موقع پر ان کا تمہارا آمنا سامنا ہو جائے.....'' ان کے دانت سختی سے بھنچ گئے، خوابوں کا شہزادہ.....

اب انہیں معلوم ہوا تھا کہ عجیلہ اس کیبنٹ کو اس طرح کیوں بند رکھتی تھی۔ ان کے اصرار کے باوجود اسے کھولنے پر کیوں آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے کہ اس میں ایسے خطرناک خطوط محفوظ تھے۔ انہوں نے شدید غیظ و غضب سے کپکپاتے ہاتھوں اور تیز سانسوں کے ساتھ دوسرا خط کھولا۔ یہ عجیلہ کی خاص سہیلی عذرا کا خط تھا۔ رسمیات اور کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد لکھا تھا۔

''اور کیا تمہاری اپنے خوابوں کے شہزادے سے اب تک ملاقات نہیں ہوئی؟ خاندانی تقریبات میں تو وہ شریک ہوتے ہی ہوں گے۔ تم ایسے ہی کسی موقع پر ان کے سامنے آ جاؤ تو یہ ناممکن ہی ہوگا کہ وہ تمہارے حصول کے لیے بے تاب نہ ہونے لگیں۔ ہم سب اس وقت کے بے چینی سے منتظر ہیں۔''

شدید حسد و رقابت کی آگ میں جلتے بھنتے، غیظ و غضب کی لہروں سے تھرتھراتے انہوں نے باقی خطوط پر نظر ڈالنا بیکار سمجھ کر انہیں عجیلہ کی بے وفائی اور مکر و فریب کا پختہ ثبوت سمجھتے ہوئے اسے طلاق نامہ لکھنے کے لیے ان خطوط کو اکٹھا کیا۔ پھر جانے کس خیال کے تحت انہوں نے باقی خطوط پر بھی نظر ڈال لینا ضروری سمجھتے ہوئے اگلے تہ شدہ گلابی لیٹر پیڈ پر لکھے ہوئے خط کو کھولا اور اس کی سطروں پر نظریں دوڑانے لگے۔ وہ بھی عذرا کی تحریر میں تھا۔ اس میں کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد لکھا تھا۔

''میں گزشتہ ہفتے ثمن زار عقیلہ کے بیٹے کی سالگرہ پر گئی تھی۔ بڑی دھوم دھامی سالگرہ تھی وہ۔ آخر عمران، عقیلہ کا ایک ہی بیٹا جو ہے۔ وہاں رشتے داروں کے علاوہ عمائدینِ شہر کی بھاری تعداد بھی مدعو تھی۔ ان میں تمہارے خوابوں کے شہزادے نواب ذوالفقار علی خان (اب تو ان کا نام لکھنے میں کوئی حرج نہیں، تمہاری ان سے منگنی جو ہو چکی ہے) بھی آئے ہوئے تھے۔ اس تقریب میں مجھے انہیں اچھی طرح سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ واقعی اس قابل ہیں کہ تمہارے خوابوں کے شہزادے کہلا سکیں اب.....''

اس سے آگے نواب ذوالفقار سے کچھ نہ پڑھا جا سکا۔ ان کے دل و دماغ میں عجیب ہیجان سا برپا ہو گیا تھا۔ انہیں ذہنوں پر دھچکے لگ رہے تھے۔ تو یہ تھی عجیلہ کے اس معنی خیز جملے کی حقیقت.....''گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر سے بھی'' جس کا اس نے ان کے سامنے کھل کر اعتراف نہیں کیا تھا۔ اپنی زندگی کے حسین راز کو ہمیشہ پوشیدہ رکھا تھا۔ ایک بے بہا سرمائے کی طرح.....اُف وہ بھی کیا کرنے لگے تھے۔ بے بنیاد شکوک و شبہات کا شکار ہو کر کیسا بھیانک قدم اٹھانے لگے تھے۔

اسی وقت انہیں کمرے میں کچھ آوازیں سنائی دیں۔ دوسرے ہی لمحے عجیلہ ڈریسنگ روم میں داخل ہو گئی۔ زمین پر گری ڈائریوں، کاغذوں اور خطوں کو دیکھتے ہی وہ ایک دم ہی اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی پھر اس کی نظریں نواب ذوالفقار پر پڑیں جو ہاتھ میں ایک خط لیے عجیب تحیر و سراسیمگی کی تصویر بنے کھڑے تھے۔

''زلفی.....!'' وہ چلائی۔ ''یہ کیا ہے.....یہ سب کچھ کیا ہے.....اور یہ آپ کو کیا ہوا ہے؟''

''عجیلہ.....'' نواب ذوالفقار علی بہ مشکل تمام بولے۔ ''میری عجیلہ، میری جان..... میں..... میں تمہیں بتاتا ہوں..... میں ایک مہیب گڑھے میں گرنے جا رہا تھا..... بچ گیا۔''

اور عجیلہ ان کی اس بے ربط گفتگو اور متذبذب حالت پر اپنی خوب صورت لمبی پلکیں اٹھائے نشیلے نینوں سے انہیں تکے جا رہی تھی۔



متاعِ دل

نبیلہ ابرراجہ

ناولٹ

رات کا دوسرا پہر شروع ہوچکا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ عائلہ کی تکلیف اور کرب میں اضافہ ہورہا تھا۔ شیریں اس کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ ایک تجربہ کار دائی بھی ان کے پاس موجود تھی، وہ اپنے تئیں ہرکوشش کررہی تھی جو عائلہ کو اس تکلیف سے جلد نجات دلا سکے۔

''بھابی آپ عمر کو فون کردیں شہر میں۔'' دانت پہ دانت جما کے تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس نے



منت آمیز نگاہوں سے شیریں بھابی کی طرف دیکھا تھا۔
''شریفاں بڑی تجربے کار ہے۔ اس سے بھی مشکل کیس اس نے منٹوں میں نمٹائے ہیں۔ ویسے بھی رات کا وقت ہے عمر بھائی کو آتے، آتے چار پانچ گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے، اورنگزیب یہاں ہوتے تو پریشانی کی بات کوئی نہیں تھی پر عین وقت پر وہ بھی عمر بھائی کے ساتھ نکل گئے۔ خیر میں کچھ کرتی ہوں۔'' شیریں اسے پریشانی سے دیکھتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

عائلہ کی زچگی کا وقت قریب تھا حالانکہ ڈاکٹر کے بتائے گئے حساب کے مطابق ابھی اس کے ہاں ڈلیوری میں پندرہ سے بیس دن باقی تھے۔ یہی اطمینان تھا جس کی وجہ سے دونوں بھائی کاروباری معاملات نمٹانے شہر گئے ہوئے تھے۔ اگر انہیں پتا ہوتا تو وہ ہرگز ڈلیوری ڈیٹ سے کم سے کم ہفتہ پہلے عائلہ کو اسپتال میں ایڈمٹ کروادیتے تاکہ بی پی وغیرہ کنٹرول میں رہے۔ عمر فکرمند تھا مگر عائلہ نے خود ہی سہولت سے منع کردیا تھا کہ آپ جب واپس آئیں گے میں تب ہی اسپتال جاؤں گی پر اس کی نوبت ہی نہیں آپائی۔ عمر زیب کو گئے دوسرا دن تھا جب عائلہ کو لیبر پین شروع ہوئے۔ رات کا وقت، شہر گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔ شیریں، شریفاں دائی کو لے آئی۔ دیہات میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ نارمل کیس وہ آرام سے نمٹالیتی تھی پر عائلہ کا کیس پیچیدہ تھا۔ بڑے بیٹے شاہ زیب کی پیدائش کے بعد عائلہ کے ساتھ کوئی پیچیدگی ہوگئی تھی جس کی وجہ سے پہلے کے مقابلے میں زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔

وہ درد سے تڑپ رہی تھی۔ تکلیف اس کی برداشت سے باہر تھی۔ شریفاں الٹے پاؤں باہر نکلی تاکہ شیریں کو صورتِ حال بتاسکے۔ وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی تھی۔ حواس باختہ شریفاں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بھی اس کے اطمینان میں سرِمو کوئی فرق نہیں آیا۔
''بی بی جی یہ مسئلہ میرے بس سے باہر ہے آپ چھوٹی مالکن کو شہر لے جائیں۔'' اس نے اپنے تئیں صورتِ حال کے حساب سے درست مشورہ دیا تھا۔
''اور کتنی دیر میں......؟'' شیریں کا لہجہ معنی خیز تھا۔
جواب میں شریفاں بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔
''اچھا تم جاؤ، میں ڈرائیور کو جگاتی ہوں ساتھ ہی عمر بھائی کو فون کرکے بتاتی ہوں۔'' وہ بیڈ سے اٹھی اور اسے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ شریفاں حکم کی تعمیل میں عائلہ کے پاس واپس آگئی۔ جو درد و اذیت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ایک ثانیے کے لیے شریفاں کا دل لرز سا گیا کیونکہ شیریں بی بی کے ارادے اور تیور کچھ اور ہی لگ رہے تھے جبکہ ہر گزرنے والے پل کے ساتھ عائلہ کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جارہی تھی۔

اگلا پورا گھنٹا شیریں نے بظاہر بڑے ہنگامی اقدامات میں گزارا۔ عمر زیب اور اورنگزیب کو فون کیا۔ دونوں بھائی سوئے ہوئے تھے۔ شیریں نے فون کرنے میں پورا آدھا گھنٹا لگایا۔ فون کے بعد ڈرائیور دلدار کو جگایا۔ اِدھر عمر زیب، شیریں بھابی کی کال ریسیو کرنے کے بعد سے سخت مضطرب تھا۔ اس نے بار بار بھابی سے تاکیدی الفاظ میں کہا کہ عائلہ کو فوراً اسپتال لے جانے کا انتظام کریں۔ اورنگزیب بھائی بھی جاگ گئے تھے۔ عمر نے عائلہ کا کیس ہینڈل کرنے والی لیڈی ڈاکٹر کو فون کردیا تھا۔ اس کا اپنا جدید سہولیات سے آراستہ اسپتال تھا۔ عائلہ ایک بار خیریت سے اسپتال تک آجاتی تو باقی کا مسئلہ نہیں تھا۔

☆☆☆

عمر زیب مضطرب انداز میں برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ موسم میں اچھی خاصی خنکی تھی مگر وہ اردگرد سے بے نیاز تھا۔ اس وقت اس کی ساری حسیات سمٹ کر عائلہ کی طرف متوجہ تھی۔ عائلہ اس کی عزیز از جان محبوب بیوی، اس کے دکھ سکھ کی ساتھی، اس کے پیارے سے بیٹے کی ماں۔ وہ دوبارہ تخلیق کے کرب ناک مراحل سے گزر رہی تھی اور اس سمے وہ اس سے بہت دور تھا۔ وہ اکیلے یہ سب جھیل رہی تھی۔ وہ اس

کے پاس ہوتا تو اس کی تکلیف میں کمی تو نہیں کرسکتا تھا مگر اس کی ڈھارس تو بندھا سکتا تھا۔ اپنی محبت سے اس کرب کو کم تو کرسکتا تھا۔ اس نے افسوس سے ہاتھ ملے۔ ایک پرانا منظر زندہ ہوگیا تھا جب عائلہ رخصت ہوکر اس کے پاس آئی تھی۔ تب عمر نے زندگی بھر ہر دکھ درد میں اس کا ساتھ دینے کا عہد کیا تھا اور آج وہ اکیلی تھی۔ کاش وہ نہ آتا عائلہ کو اسپتال میں ایڈمٹ کرواکے ہی آتا مگر اس وقت عائلہ نے ہی تو بڑی نرمی سے انکار کردیا تھا۔ وقت گزر ہی نہیں رہا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں بھی جیسے رک رک کے چل رہی تھیں۔ بھائی بھی اس کی حالت دیکھ کر بہت پریشان تھے۔ عمر زیب انہیں سونے کا کہہ کر خود داخلی دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا۔ آسمان پر بادل جمع ہورہے تھے۔ بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے ایک نظر آسمان کو دیکھا جہاں بادل برسنے کو تیار کھڑے تھے۔

''الٰہی خیر۔'' جانے کیوں اس کا دل ڈر گیا۔

اس نے دوبارہ کمرے میں آکر جیکٹ پہنی اور حویلی فون کیا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ عائلہ کو ابھی کچھ دیر پہلے شیریں بھابی کے ساتھ گھر سے لے جایا گیا ہے۔ اسے سخت غصہ آیا۔ شیریں بھابی نے ڈیڑھ گھنٹا پہلے فون کرکے اطلاع دی تھی۔ اس حساب سے انہیں فوراً روانہ ہوجانا چاہیے تھا اور کال ریسیو کرنے والی ملازمہ بتارہی تھی کہ وہ لوگ ابھی ابھی روانہ ہوئے ہیں۔ اس نے غصے سے ریسیور کریڈل پر پٹخا۔

''کاش ...... کاش میں شہر نہ آتا۔'' اس نے اپنے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔

☆☆☆

گاڑی نارمل رفتار سے سیاہ کولتار کی سڑک پر اپنا سفر طے کررہی تھی۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے کی تیاری میں تھا۔ عائلہ کی گلابی مائل رنگت پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اب بالکل خاموش تھی۔ وقفے، وقفے سے اب اس پر غشی طاری ہورہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر شریفاں کے ہاتھ پاؤں پھولے جارہے تھے۔ اس کے برعکس شیریں کے چہرے پر کسی پریشانی کے آثار نہ تھے۔ شریفاں دائی تھی اسے آئندہ پیش آنے والے حالات کا کچھ اندازہ ہوچکا تھا۔ عائلہ ہوش کی وادی سے دور جارہی تھی۔ اگر کچھ ایسا ویسا ہوگیا تو اس کی جان کہیں عذاب میں نہ آجائے۔ یہ تصورات اسے خوفزدہ کررہے تھے۔

گاڑی شہر کی حدود میں داخل ہوچکی تھی۔ شیریں نے عائلہ کے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔ اُدھر سے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں ہوا۔ وہ پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی اور ہاتھ میں تھامی تسبیح کے دانوں کو گھمانے لگی۔

☆☆☆

اسپتال کے باہر عمر زیب بے تابانہ ان کا انتظار کررہا تھا ساتھ اورنگزیب بھی تھے۔ عائلہ کو فوراً آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا تھا۔

''بھابی آپ اتنی دیر سے کیوں لائی ہیں عائلہ کو؟'' عمر زیب کے لہجے میں دبا، دبا سا غصہ تھا۔

''وہ گاڑی میں عین وقت پر کچھ خرابی ہوگئی ورنہ اتنی دیر نہ ہوتی۔''

''اور گاڑیاں بھی تو تھیں گھر میں صرف ایک گاڑی ہی تو نہیں تھی ناں!'' یوں لگ رہا تھا عمر ابھی رودے گا۔ شیریں چپ سی ہوگئی۔

''میں نے اپنی طرف سے کوئی کمی یا کسر نہیں چھوڑی، یہ شریفاں ساتھ تھی اس نے ہر ممکن طور پر عائلہ کا ساتھ دیا بس آنے سے کچھ دیر پہلے ہی عائلہ کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی ورنہ پہلے سب ٹھیک تھا۔'' شیریں کا لہجہ غلط بیانی کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں لڑکھڑایا نہ کمزور ہوا۔ عمر زیب کے کندھے ڈھیلے پڑگئے۔ وہ طویل کاریڈور میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ بھائی نے اس کے کندھے پر بازو پھیلا دیا۔

''حوصلہ کرو، اللہ خیر کرے گا۔ عائلہ کے لیے صحت وزندگی کی دعا مانگو۔'' وہ انہیں کیسے بتاتا کہ اس وقت اس کا رُواں رُواں عائلہ کے لیے دعا گو ہے۔ خاصی دیر گزر چکی تھی... عائلہ کو آپریشن تھیٹر میں لے کر

گئے ہوئے۔ عمر زیب کو اپنی آتی جاتی سانس بوجھ لگ رہی تھی۔ اسے اپنا دم گھٹتا سا محسوس ہو رہا تھا۔ پتا نہیں وقت کیا دکھانے والا تھا۔

یوں لگ رہا تھا وہ پل صراط پر کھڑا ہے اور بس اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ انہی خیالات میں غلطاں تھا وہ، جب نرس کے ساتھ ڈاکٹر روبینہ ان تینوں کی طرف آئی۔ عمر زیب میکانکی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر روبینہ کا چہرہ سنجیدگی و افسردگی کی تصویر بنا تھا۔

''اللہ نے بہت پیاری بیٹی دی ہے آپ کو مگر... فی الحال آپ اسے نہیں دیکھ سکتے کیونکہ بچی انکیو بیٹر میں ہے۔ اس کی حالت جیسے ہی تسلی بخش ہوتی ہے اسے لے جایئے گا اور آئی ایم سوری عمر صاحب ہم عائلہ کو نہیں بچا سکے۔ آپ انہیں بہت دیر سے لائے اگر کچھ پہلے لے آتے تو شاید کچھ ہو سکتا تھا۔ میں نے عائلہ کے حوالے سے ان تمام پرابلمز سے آپ کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ اتنا لمبا سفر پھر آپ کی مسز کی کنڈیشن......ہم کچھ نہیں کر پائے۔ اسی وجہ سے بچی کی حالت بھی زیادہ ٹھیک نہیں ہے۔''

عمر زیب کے کانوں میں سائیں، سائیں ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا اس نے ایک لفظ نہیں سنا۔ اگر سنا بھی ہے تو یقین نہیں کیا ہے۔ بھلا عائلہ کیسے اسے چھوڑ کے جا سکتی ہے۔ اس نے تو وعدہ کیا تھا میں ہر حال میں آپ کے ساتھ رہوں گی پھر اتنی جلدی وہ کیسے بھول گئی سب کچھ۔

شیریں کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسو، غم والم کی تصویر بنا اورنگزیب کا چہرہ اور شریفاں کے بین...... عمر زیب کو یہ حقیقت باور کروا چکے تھے کہ عائلہ سچ مچ اسے چھوڑ کے جا چکی ہے۔ کویت میں جنم لینے والی عائلہ کا سفر پاکستان میں آ کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

عمر زیب ایک روایتی زمینداروں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا مگر طبیعتاً اپنے خاندانی مزاج سے بالکل الگ اور غیر روایتی......ان کے خاندان میں نوکری نہیں کی جاتی تھی۔ جدی پشتی زمیندار تھے، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ تین بڑے بھائی......زمینداری ہی کر رہے تھے پر عمر زیب نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد نوکری کرنے کی ٹھانی تو بڑے چوہدری صاحب روایتی جلال میں آ گئے پر عمر زیب بھی انہی کا بیٹا تھا۔ اس نے مخالفتوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایک غیر ملکی کمپنی میں نوکری کر لی اور پانچ سال کے کنٹریکٹ پر کویت آ گیا۔ اس کمپنی کے مالک وہاں بسنے والے ایک پاکستانی باشندے شیخ عمار بن حیان تھے۔ وہ ایک عرصے سے وہاں رہ رہے تھے۔ عائلہ حیان ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ اکثر و بیشتر آفس آتی جاتی رہتی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی مڈبھیڑ عمر زیب سے نہ ہوتی۔ وہ عیاش طبع اور دل پھینک نہیں تھا پر عائلہ میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ دل اس کے نام کی مالا جپنے لگا تھا۔ اس کی نگاہوں کا خاموش پیغام عائلہ حیان تک پہنچ چکا تھا۔ عشق کی آگ دونوں طرف بھڑک رہی تھی۔ شیخ عمار بن حیان بے خبر نہیں تھے۔ انہوں نے عائلہ کو روکنے کی کوشش کی پر اس چڑھتی ندی کے آگے بند باندھنا مشکل تھا۔ محبت کی جیت ہوئی اور عائلہ، عمر زیب کی بیوی بن گئی۔

اس شادی کے لیے عمر زیب کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑے اسے ہی پتا تھا۔ پاکستان میں کوئی اس شادی کے لیے راضی نہیں تھا پر عمر زیب بھی اڑ گیا۔ بڑے چوہدری صاحب کو بادل ناخواستہ ہار ماننا پڑی۔

یہ شادی کویت میں انجام پائی اور اپنی روایتوں کا سر اونچا رکھنے کی خاطر عمر زیب، عائلہ کو ایک ہفتے کے لیے پاکستان بھی لایا۔ یہ ایک ہفتہ پلک جھپکتے گزر گیا اور اسے دوبارہ کویت جانا پڑا کیونکہ اسے کاروباری معاملات کو بھی دیکھنا تھا۔ عائلہ کی شادی کے چار ماہ بعد شیخ عمار ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اگر عمر زیب جیسا مخلص ہم سفر نہ ہوتا تو عائلہ کو باپ کی دائمی جدائی کے صدمے کو برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا خصوصاً

اس حالت میں جب وہ ماں بننے کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ عائلہ کی ماں تو بہت پہلے ہی فوت ہو چکی تھی۔ ایک بھائی تھا جو اپنی فیملی اور اپنے بزنس کے ساتھ اپنی دنیا میں مگن تھا۔ اب اس کے لیے عمر زیب ہی سب کچھ تھا۔

شاہ زیب ان کی محبت کی نشانی کویت میں ہی پیدا ہوا۔ عمر زیب پر پاکستان واپس آنے کے لیے دباؤ بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ اُدھر عائلہ کے رشتے دار بھی اس سے ناراض تھے کہ اس نے ایک غیر خاندان کے جوان کو شریکِ سفر چنا ہے۔

عمر زیب واپسی کا سامان باندھ چکا تھا۔ کمپنی کا سارا انتظام و انصرام عائلہ اس کے سپرد کر چکی تھی۔ منیجر بہت قابلِ بھروسا تھا، بھائی بھی قابلِ اعتماد تھا سو عمر زیب عارضی طور پر معاملات ان کے حوالے کر کے ڈھیروں خواب لیے عائلہ اور ننھے شاہ زیب کے ساتھ واپس پاکستان آ گیا۔

ان کا ویسا والہانہ استقبال نہیں ہوا جو اُن کے تصور میں تھا۔ اس سے پہلے عائلہ صرف چند دن کے لیے پاکستان آئی تھی۔ اس وقت اس کے ساس، سسر بھی زندہ تھے سب کی نگاہوں میں اسے پیار ہی نظر آیا۔ یہ بھی محض اس کی نظر کا دھوکا تھا اب مستقل طور پر یہاں رہنا پڑا تو ایک، ایک کر کے سب خوب صورت خواب چھناکے سے ٹوٹتے چلے گئے۔

شیریں بھابی کی چھوٹی بہن بینا کا رشتہ بزرگوں کی ایما پر عمر زیب سے شروع سے ہی طے تھا پر وہ عائلہ کی محبت میں ہر روایات کو توڑ بیٹھا اور اب نفرتیں اس کی منتظر تھیں۔ بینا کے گھر والے اس کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہ تھے، شیریں اس گھر میں اپنی بہن کی آمد کے سپنے دیکھ رہی تھی جو عمر کی بغاوت نے چکنا چور کر دیے۔ عائلہ ایک اٹل حقیقت تھی ویسے بھی جب تک بڑے چوہدری صاحب حیات تھے تو دلوں میں چھپا زہر کھل کر سامنے نہ آ سکا تھا مگر اب وہ چاروں... طرف سے مخالفتوں میں گھرا ہوا تھا۔ انہی حالات میں عائلہ دوسری بار امید سے ہوئی تو ڈاکٹر نے اس کے معائنے کے بعد بتا دیا کہ اس بار بہت احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ بازی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ وہ گھریلو حالات اور نفرتوں کی وجہ سے بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ عمر زیب کا سہارا ہی اس کے لیے سب کچھ تھا پر اسے بھی غمِ دوراں نے اتنی فرصت نہیں دی تھی کہ سکون سے عائلہ کے دل کی بات جان پاتا۔ وہ اندر ہی اندر گھل رہی تھی۔

کویت میں اتنا بڑا بزنس تھا جسے عائلہ کا بھائی اور منیجر دیکھ رہے تھے ادھر اورنگزیب بھائی اور شیریں بھابی نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ وہ وہاں جا ہی نہیں پا رہا تھا۔ ورنہ دل اس کا بھی کرتا تھا کہ عائلہ کو یہاں سے لے کر بہت دور چلا جائے۔ اورنگزیب بھائی ہی اب خاندان میں بڑے اور کرتا دھرتا تھے ان کا حکم ماننا بھی لازم تھا۔ ویسے بھی چھوٹے بھائی اور بھاوج کے ساتھ ان کا رویہ بہت نرم تھا۔

وہ کہتے تھے کہ عائلہ اب اس گھر کی بہو ہے، ہمارے گھرانے کی عزت ہے اسے ہماری روایتوں کا امین ہونا چاہیے۔ عمر زیب، بھائی کا کہا کیسے ٹال سکتا تھا۔ اس نے عائلہ سے کہا تھا کہ میں اب ساری عمر اِدھر ہی گزاروں گا تم بھی کویت کو بھول جاؤ۔ وہ شوہر پرست عورت ہر حالت میں شوہر کی خوشی میں خوش تھی۔ عمر زیب دل ہی دل میں کچھ پلان کر رہا تھا۔ عمر زیب سارا کاروبار پاکستان شفٹ کرنے کی فکر میں تھا۔ عائلہ نے کمپنی کے شیئرز فروخت کرنے کو کہا تھا۔ اس سلسلے میں عمر کی کچھ اور کمپنیوں سے بات بھی ہو چکی تھی۔ عائلہ کی ڈلیوری قریب تھی۔ وہ ابھی تک گاؤں میں ہی رہائش پذیر تھے۔ عمر شہر میں بڑا شاندار گھر بنوا رہا تھا جو تعمیر کے آخری مراحل میں تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ عائلہ نئے مہمان سمیت نئے گھر میں قدم رکھے پر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ عائلہ اب اپنے ابدی گھر روانہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

عائلہ کو یہ دنیا چھوڑے تین ماہ گزر چکے تھے۔ شیریں بھابی اورنگزیب بھائی اور خاندان کے دیگر افراد نے عمر کی بھرپور دلجوئی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ عائلہ کی آخری نشانی کو عمر زیب نے متاعِ جاں بنالیا تھا۔ بڑے چاؤ سے اس کا نام دُرِّ یکتا رکھا تھا۔ شیریں بھابی نے شاہ زیب اور ننھی دریکتا کو بہت اچھے طریقے سے سنبھالا تھا۔ ان کی مدد کروانے کی خاطر بینا بھی حویلی آجاتی۔ اسے دُرِّ یکتا سے بہت پیار تھا۔ اسے اٹھائے، اٹھائے پھرتی۔ عائلہ کی جگہ خالی تھی اور یہ خلا پُر ہونا ہی تھا۔ یہ اٹل حقیقت تھی کیونکہ اورنگزیب چھوٹے بھائی کو بارہا دوسری شادی کا کہہ چکے تھے۔ وہ نہ انکار کرتا نہ اقرار بس خاموش ہوجاتا۔ اس کی خاموشی میں ہزارہا معنی چھپے ہوئے تھے۔ شاہ زیب ابھی صرف ڈھائی سال کا تھا اور ننھی دریکتا چند ماہ کی۔ دونوں بچوں کو ماں کی آغوش کی شدید ضرورت تھی۔

☆☆☆

''عمر کیا سوچا ہے تم نے؟'' اورنگزیب بھائی اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ بینا بھی پاس موجود تھی اور دُرِّ یکتا کو گود میں لٹائے لاڈ کررہی تھی۔

''بھائی جان میں شہر میں سیٹل ہونے کی پوری تیاری کرچکا ہوں۔ کمپنی کے سارے شیئرز میں نے فروخت کرکے ایک اور کاروبار میں لگادیے ہیں۔ مجھے اب بزنس کی دیکھ بھال کرنی ہے اور اپنے بچوں کو بھی دیکھنا ہے۔ فی الحال میں نے شادی کا نہیں سوچا ہے۔ یہی بچے میری کل کائنات ہیں۔'' وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر بول رہا تھا۔ شیریں کو یہ باتیں سخت ناگوار گزر رہی تھیں۔ اسے عمر کا فیصلہ ایک آنکھ نہیں بھایا۔ بینا چار ماہ سے عمر کے بچوں کو سنبھال رہی تھی، راتوں کی نیندیں حرام کررہی تھی اور عمر نے یہ صلہ دیا تھا۔ وہ شہر جانے کی بات کررہا تھا اور واقعی اس نے اپنا کہا پورا کردکھایا۔ دو ماہ کے مختصر عرصے میں سب کچھ سمیٹ کر وہ گاؤں کی حویلی خالی کرگیا تھا۔

بینا ایک بار پھر روتی تڑپتی رہ گئی۔ اب اس کی ساری امیدیں دم توڑ گئی تھیں۔ گھر والوں نے اس کا رشتہ زبردستی کہیں اور طے کردیا تھا۔ لڑکا کراچی میں سیٹل تھا اور بینا کی دور پرے کی خالہ کا بیٹا تھا۔ کھاتا پیتا گھرانا تھا چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہوا۔

☆☆☆

عمر زیب نے دونوں بچوں کے لیے گورنس رکھ لی تھی مگر دوست احباب یہی مشورہ دیتے کہ شادی کرلو۔ اس طرح بچوں کو ماں کا پیار بھی ملے گا اور گھر کے لیے عورت کی ضرورت بھی پوری ہوجائے گی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے دوستوں کی مانتے ہوئے شادی کرلی۔ راحیلہ بہت اچھی بیوی اور ذمّے دار ماں ثابت ہوئی۔ ایک بار پھر عمر زیب کی زندگی میں گھریلو سکون اور خوشیاں لوٹ آئی تھیں۔ راحیلہ دونوں بچوں کی پرورش سگی ماں کی طرح کررہی تھی۔ عمر کو ہر طرح کا سکون میسر تھا۔

اس کی دوسری شادی نے بڑے بھائی اور بھاوج کو ناراض کردیا تھا۔ انہوں نے اس سے ملنا جلنا ہی ختم کردیا۔ عمر خود ہی ڈھیٹ بن کر گاؤں جاتا پر ان میں گرمجوشی ختم ہوگئی تھی۔ شیریں کے اپنے شکوے تھے اب تو اورنگزیب بھی اس کے ہمنوا بن چکے تھے۔

عمر زیب کی دوسری زندگی کی خوشیوں کا دور بھی مختصر ثابت ہوا۔ راحیلہ کو بلڈ کینسر تھا۔ والدین نے بیٹی کی خوشیوں کی خاطر بغیر بتائے اس کی شادی کردی تھی پھر بھی اس نے سات آٹھ سال گزار لیے۔ شاہ زیب اور دریکتا کچھ سمجھدار ہوچکے تھے۔ خاص طور پر دُرِّ یکتا سمجھدار ہونے کے ساتھ، ساتھ حساس بھی تھی۔

راحیلہ نے ان دونوں بچوں کو ماں کا پیار دیا تھا۔ ان کی پرورش، دیکھ بھال، تعلیم وتربیت میں اپنا تمام تر خلوص اور محبت صرف کی تھی۔ راحیلہ، عمر زیب کی پسند یا محبت نہیں تھی مگر ان کے بھائی اور بھابی اس بات پر ناراض تھے کہ عمر نے ایک بار پھر خاندان سے باہر کی لڑکی کو چنا تھا۔ شیریں بھابی کو اپنا غم کھائے جارہا تھا کہ عمر نے بینا کو دوسری بار بھی ٹھکرادیا۔

بڑھتے بڑھتے اس کے دل کا یہ زخم ناسور بن چکا تھا۔ عمر کی دوسری شادی کے بعد اس نے اورنگزیب کے دوسرے دو بھائیوں اور ان کی بیویوں کو بھی اپنا ہم خیال بنالیا تھا۔ عمر گاؤں آتا، راحیلہ کے ساتھ دونوں بچوں کو بھی لاتا پر ان سب کا رویہ اجنبیوں اور بیگانوں والا ہوتا۔ کوئی سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ راحیلہ ہنس، ہنس کر اس کی شرمندگی دور کرنے کی کوشش کرتی۔ راحیلہ کی دائمی جدائی عمر کے ساتھ، ساتھ ان دونوں بچوں کے لیے بھی کسی سانحے سے کم نہیں تھی۔ یہ راحیلہ ہی تھی جس نے عمر زیب کو گھر کی طرف سے بے فکر کردیا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے اپنے بزنس کو بھرپور ترقی دی تھی کیونکہ راحیلہ نے بچوں کی ماں کی کمی پوری کردی تھی۔ شاہ زیب اور دریکتا نے پُرسکون نارمل گھریلو ماحول میں پرورش پائی تھی۔ کوئی اور عورت شاید یہ سب نہ کرپاتی جو راحیلہ نے کیا تھا۔ اس نے ان دونوں کو ماں کا پیار دیا تھا۔

☆☆☆

سیٹی پر شوخ سی دُھن بجاتے ہوئے وہ آئینے میں خود کو دیکھتا بالوں میں برش کررہا تھا۔ برش کرنے کے بعد اس نے پرفیوم اٹھایا اور خود پر اسپرے کیا۔ مکمل طور پر اپنی تیاری سے مطمئن ہونے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکلا۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس کا انتظار ہورہا تھا۔ عمر زیب نے بڑے فخر سے لمبے چوڑے شاہ زیب کو دیکھا۔ قد کاٹھ، شکل صورت میں وہ ہو بہو ان کی ہی کاپی تھا۔ انہی کی طرح کھڑی ناک، روشن آنکھیں۔

''اللہ نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔'' عمر زیب نے اپنی نظر لگنے کے ڈر سے ایک ثانیے کے لیے اپنی نگاہیں اس کی طرف سے ہٹالی تھیں۔

''بھائی جلدی کرو ناں، ناشتا ٹھنڈا ہورہا ہے۔'' دُرِیکتا نے خفگی سے اپنی ستواں ناک سکوڑی۔ تب تک شاہ زیب کرسی گھسیٹ کر اس کے مقابل بیٹھ چکا تھا۔

وہ جلدی، جلدی کھا رہا تھا۔ کالج پہنچنے کی جلدی تھی۔ دُرِیکتا اولیول کررہی تھی۔ ڈرائیور اسے پہلے ڈراپ کرنے کے بعد پھر شاہ زیب کو کالج چھوڑتا۔ شاہ زیب ڈرائیونگ سیکھ چکا تھا پر عمر نے ابھی تک اسے ڈرائیونگ کی اجازت نہیں دی تھی۔ مجبوراً وہ بائیک چلا کر اپنا شوق پورا کرتا تھا۔ عمر زیب اس کے علم میں لائے بغیر ایک گاڑی اس کے لیے پسند کرکے ادائیگی بھی کرچکے تھے۔ چند دن بعد اس کی سالگرہ تھی یہ تحفہ اس خاص موقع پر شاہ زیب کو ملنا تھا۔ عمر زیب دونوں بچوں کو دیکھ، دیکھ کر جیتے تھے۔

☆☆☆

وہ اپنے ایک دوست کی طرف گیا ہوا تھا۔ دریکتا بھائی کے انتظار میں گیٹ کے آس پاس ہی ٹہل رہی تھی دُرِیکتا اسی کے انتظار میں تھی۔

''ابھی تک جاگ رہی ہو؟'' شاہ زیب نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی۔ اچانک بائیک آکر رکی تھی اور وہ گیٹ کے اندر داخل ہوا۔

''بھائی، پپا گاؤں جارہے ہیں۔'' اس نے گیٹ کے ساتھ بنی پختہ روش پہ چلتے، چلتے اسے بتایا تو وہ رک گیا۔

''تمہیں کس نے بتایا؟''

''خود پپا نے بتایا ہے کہ ان کا گاؤں جانے کا بہت دل کررہا ہے، پچھلے کئی سالوں سے وہ جا نہیں پائے ہیں۔''

''اچھا یہ تو نئی بات بتائی ہے تم نے۔'' چلتے، چلتے شاہ زیب اپنے بیڈروم کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دونوں اندر جاکے بیٹھ گئے۔

''بھائی میرا دل بھی کررہا ہے جانے کو پپا کے ساتھ۔''

''تو چلی جاؤ ناں۔'' اس نے جوتے اتارتے ہوئے مشورہ دیا۔

''بھائی تم بھی چلو ناں میرے ساتھ۔'' اس کے لہجے میں بے انتہا لجاجت تھی۔

''میں نہیں جارہا...... پپا پسند نہیں کرتے...... میں تو آخری بار شاید چار سال پہلے گیا تھا گاؤں۔'' اس نے حساب لگا کر بتایا۔

”نہیں......اگر ہم دونوں مل کر پپا سے کہیں گے تو وہ مان جائیں گے۔“

”بہت خوب تم اس لیے میرے انتظار میں تھیں۔“ شاہ زیب فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ نہ جانے کیوں ان کا گاؤں جانا عمر زیب پسند نہیں کرتے تھے۔ کبھی کھل کر اس نے اس موضوع پر اظہارِ خیال بھی نہیں کیا تھا۔ عمر زیب نہیں چاہتے تھے کہ رشتے داروں کی اندرونی مخالفتیں ان کی اولاد پر عیاں ہوں۔

گزشتہ کچھ سالوں سے ان کا گاؤں جانا نہ ہونے کے برابر تھا۔ آخری بار جب وہ گئے تھے تو تینوں بھائیوں میں سے کسی نے بھی سلام دعا کے علاوہ ان سے کوئی اور بات نہیں کی تھی۔ شیریں بھابی کا رویہ سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ مجبوراً وہ عائلہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کر کے لوٹ آئے تھے۔

اب اتنے سال بعد عمر زیب نے گاؤں جانے کا قصد کیا تو دریکتا نے بھی دبے دبے لفظوں میں جانے کی بات کی۔ اُدھر سے کسی نے بھی ان سالوں میں چکر نہیں لگایا تھا۔ عمر زیب کا دل مچل رہا تھا اپنوں سے ملنے کو......ان کے دل میں تو سب کی محبت موجود تھی۔ یہ محبت ہی تھی جو انہیں وہاں لے جاتی تھی۔ اُدھر سے تو جیسے سب نے نہ آنے کی قسم کھالی تھی۔

اب دُریکتا، شاہ زیب کی منتیں کر رہی تھی کہ وہ بھی پپا سے بات کر لے تا کہ وہ راضی ہو جائیں۔

☆☆☆

عمر زیب نے باری، باری ان دونوں کے چہروں کی طرف دیکھا۔ دونوں کے چہرے نہایت معصوم اور خاندانی سیاستوں سے پاک تھے۔ دریکتا کے ساتھ، ساتھ شاہ زیب نے بھی کہا تھا کہ وہ ان کے ساتھ گاؤں جانا چاہتا ہے۔ اب فرار کی گنجائش نہیں تھی۔ مجبوراً وہ مان گئے۔ وہ کس طرح مانے تھے یہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔

پہلے صرف اورنگزیب ہی شیریں کے کہنے میں آ کر اس سے ناراض ہوئے تھے بعد میں باقی دونوں بھائی بھی ان کے ہم خیال ہو گئے تھے۔ عمر زیب ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ سگے رشتوں کی یہ سفاک حقیقتیں ان کی اولاد پہ عیاں ہوں۔ پر دریکتا ضد کر رہی تھی اور ساتھ بھائی کو بھی ملا لیا تھا۔

”تم دونوں اپنے کپڑے اور ضروری سامان رکھ لو، ہمیں کل صبح نکلنا ہے۔“ عمر زیب نے بالآخر حامی بھر ہی لی۔

”اوہ...... پپا زندہ باد......!“ دریکتا اٹھ کر ان سے لپٹ گئی۔ شاہ زیب بھی مسکرانے لگا۔

عمر زیب انہیں خوش دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے سب کچھ بھول گئے۔

☆☆☆

کچا راستہ شروع ہو چکا تھا۔ گاڑی اِدھر اُدھر ڈول رہی تھی۔ پر ڈرائیور بہت ہوشیار اور تجربے کار تھا۔ عمر ان دونوں کو اپنی زمینوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ سڑک کے ساتھ کچے میں ایک پرانا کنواں تھا جو اَب سوکھ چکا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی عمر کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ اس کے کچھ آگے اجڑا ہوا ڈیرا تھا جہاں کبھی بڑے چوہدری صاحب محفلیں سجاتے تھے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کے ساتھ......اب تو کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

ڈیرے سے کچھ آگے ان کے خاندانی قبرستان کی حدود شروع ہو رہی تھیں۔ عمر نے گاڑی اُدھر رکوائی اور دروازہ کھول کر نیچے اترے۔ وہ قبرستان کے داخلی دروازے کی طرف جا رہے تھے دریکتا اور شاہ زیب نے بھی ان کی تقلید میں قدم ان کے ساتھ ملا دیے۔ عمر نے سب کی قبروں پہ فاتحہ خوانی کی۔ واپسی پہ ان کی آنکھوں کے گوشے نم تھے۔ خود دریکتا کی بھی ایسی ہی حالت تھی۔

ڈرائیور نے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ اب سرسبز کھیت سامنے تھے۔ راستہ اب بھی کچا ہی تھا.... ہریالی نظروں کو بھا رہی تھی۔ دریکتا دلچسپی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ بالآخر یہ طویل سفر حویلی کے لوہے کے بلند و بالا گیٹ کے سامنے اختتام

پزیر ہوا۔ ڈرائیور نے ہارن بجایا تو اندر سے چھوٹا گیٹ کھول کر چوکیدار باہر نکلا۔ عمر زیب کو دیکھتے ہی اٹینشن ہوگیا زوردار سلام جھاڑا اور گیٹ کھول دیا۔ گاڑی اندر آگئی۔ کبھی اس گھر کے در و دیوار کی ایک، ایک اینٹ میں اپنائیت کی مہک تھی پر آہستہ آہستہ سب کچھ ختم ہوتا گیا۔ اب بس یادیں تھیں، عمر نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ان کی آمد کی اطلاع گھر کے مکینوں تک پہنچ چکی تھی۔

ایک دراز قد گوری رنگت والی لڑکی اندرونی رہائشی دروازے سے باہر نکلی اس کا رخ انہی کی طرف تھا۔ کچھ ہی دیر میں اور بھی چہرے آنے والے مہمانوں کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ نوجوان نسل کی دلچسپی دریکتا اور شاہ زیب میں تھی۔ کچھ ہی دیر میں عمر چچا اور ان کے لمبے چوڑے خوبرو بیٹے اور نازک سی بیٹی کی آمد کی خبر گھر کے ایک، ایک مکین تک پہنچ چکی تھی۔

دریکتا اور شاہ زیب نے کافی عرصے بعد اپنے ان کزنز کو دیکھا تھا۔ خاص طور پر دریکتا کا لگاؤ واضح طور پر محسوس کیا جا رہا تھا۔ ان سب کا رویہ دوستانہ تھا۔ البتہ خاندان کے کرتا دھرتا ہنوز دل میں پرانی نفرتوں کے بیج اگائے بیٹھے تھے۔ جن کی بھرپور فصل پک کر تیار تھی۔ اس نفرت کی فصل میں کڑوے اور کانٹے دار پھل تھے۔ جن کا ذائقہ دریکتا اور شاہ زیب نے... فی الحال چکھا نہیں تھا۔ شیریں اور گھر کی دیگر عورتوں کا رویہ مناسب ہی تھا۔ چھوٹے تایا لوگوں نے بھی سر پر ہاتھ پھیر دیے تھے۔ تایا اورنگزیب نے اپنے پورشن میں ان تینوں کے لیے کمرے تیار کروا دیے تھے۔ یہ سب ہنگامی حالات میں ہوا تھا کیونکہ عمر نے اپنے آنے کی پیشگی اطلاع نہیں دی تھی پھر بھی عمر کے نزدیک ان کا رویہ غنیمت تھا۔

مائرہ رات کو دُرِیکتا اور شاہ زیب کے لیے خود دودھ کے گلاس لے کر آئی۔ شیریں چچی کی اس بیٹی کا رویہ ان کے ساتھ باقی کزنز کی نسبت بہت ہی نرم اور پُرمحبت تھا۔ اس وجہ سے دریکتا کو وہ اچھی بھی لگی تھی۔

☆☆☆

دونوں بہن بھائی ایک ہی کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مائرہ کو بھی دریکتا نے پاس بٹھالیا۔

''آپ کیا کرتی ہیں مائرہ؟'' شاہ زیب نے پہلی بار پوری توجہ سے اس کی سمت دیکھا، کیسی گھور نشیلی، روشن آنکھیں تھیں مائرہ نے نظر چرالی۔

''ایف ایس سی فرسٹ ائیر میں ہوں۔ اصل میں مجھے اس وقت تک ایف ایس سی کلیئر کر لینا چاہیے تھا مگر مجھے ایڈمیشن لینے میں دیر ہوگئی پھر میں یہاں کی تعلیم کے معیار سے مطمئن نہیں ہوں۔ ایک قریبی شہر کے کالج میں ایڈمیشن لیا ہے۔ آنے جانے میں کافی ٹائم لگ جاتا ہے۔'' اس نے تفصیل سے بتایا اور چہرے پر آئے بال پیچھے کیے۔ مائرہ، شاہ زیب سے کچھ چھوٹی ہی تھی اس لیے دریکتا اسے آپ جناب کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

''آپ ہمارے ساتھ چلیں ناں میرے کالج میں ہی ایڈمیشن لے لیں، اُدھر ہی رہیں۔'' اس نے پورے خلوص سے مائرہ کو یہ آفر کی جسے کاریڈور سے گزرتے شیریں نے بھی سن لیا۔ وہ اِدھر ہی آرہی تھی۔ یہ بات سن کر اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی ہلکے سے دروازہ بجا کر وہ اندر داخل ہوگئی۔ شاہ زیب انہیں دیکھ کر مؤدب ہوگیا۔

''اور سناؤ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، مائرہ کو بتادو لے آئے گی۔'' ان کے لہجے میں یکا یک در آنے والا پیار بے سبب نہیں تھا۔

''نہیں تائی جان کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہے۔'' دریکتا انہیں اپنے درمیان پا کر خوش ہوگئی۔

''پھر تم لوگ باتیں کرو، میں جا رہی ہوں۔ دن بھر ہونے والی بھاگ دوڑ مجھے تھکا دیتی ہے۔'' وہ انہیں اسی طرح باتیں کرتا چھوڑ کر اٹھ گئیں۔ مائرہ رات ایک بجے کے بعد اپنے بیڈروم میں آ کر لیٹی۔ وہ بھی ایسے کہ اس کی آنکھوں میں دور، دور تک نیند کے آثار نہیں تھے۔

اُدھر دریکتا بھی شاہ زیب کے پاس سے اٹھ آئی تھی۔ اسے پپا سے دل ہی دل میں کچھ شکوے ہو چلے تھے کہ وہ انہیں اتنے عرصے بعد کیوں گاؤں لائے۔ یہاں تو سب کزنز، شیریں تائی سب کتنی محبت سے پیش آرہے تھے۔ تائی نے تو شکوہ بھی کیا کہ عمر جانے کیوں تمہیں گاؤں نہیں لاتا ہے اس لیے ہم بھی شہر اس کے پاس نہیں جاتے کہ جب وہ خود یہاں آنا پسند نہیں کرتا تو ہماری آمد بھی اپنے گھر اسے پسند نہیں آئے گی۔ دُرِیکتا دل ہی دل میں کسی حد تک ان سے متفق تھی۔

شاہ زیب بھی دروازہ بند کر کے لیٹ گیا۔ معاً اپنے پاؤں کے نیچے اسے کسی چیز کے چبھنے کا احساس ہوا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور لائٹ جلا کے دیکھا۔ یہ نازک سی پائل تھی۔ اسے یاد آگیا کہ یہ مائرہ کی ہے کیونکہ وہی اِدھر پاؤں بیڈ پر اٹھا کر بیٹھی تھی۔ اسی کی پائل تھی۔ لاک کھل جانے سے وہ اس کے پاؤں سے اتر گئی ہوگی۔ دریکتا تو جیولری پسند نہیں کرتی تھی، یہ پائل مائرہ کی ہی ہوگی۔ شاہ زیب نے پائل ہاتھ میں لے کر بغور دیکھا۔ یہ بہت نازک سی پائل تھی۔ جس میں چھوٹے، چھوٹے نگ جڑے تھے۔ بعد میں شاہ زیب کو خود ہی ہنسی آگئی تھی وہ کتنے غور سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے پائل سائڈ ٹیبل پر رکھ دی کہ صبح مائرہ کو دے دے گا۔ بہت جلد وہ نیند کی وادیوں میں اتر اتھا۔

☆☆☆

اس کا دروازہ ہولے سے بجا تھا۔ اجنبی جگہ پر رات گزاری تھی پھر بھی نیند اچھی آئی تھی۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی وہ پپا کے ساتھ گاؤں سے کوچ کر گیا تھا پھر بھی کبھی کبھی آنا ہوتا پر رات ایسی مدہوشی کی نیند سویا کہ دن گیارہ بجے وہ بھی دروازہ ناک کرنے پر آنکھ کھلی۔ شاید ان درودیوار میں اپنائیت تھی تب ہی تو وہ آرام سے سویا تھا۔ ورنہ اپنے کمرے اور بیڈ کے بغیر اسے بڑی بے آرامی ہوتی تھی۔ اس نے سلیپنگ گاؤن پہن کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے مائرہ کھڑی تھی۔

''جاگ جایئے کزن...... ناشتا تیار ہے جلدی آئیں اور ہاں دیر مت کیجیے گا۔'' اس کے لبوں پر پُرکشش مسکراہٹ سجی تھی۔ شاہ زیب کو کھڑکی سے اندر آتی دھوپ یکا یک بہت ہی دل فریب محسوس ہوئی تھی۔

''اوکے، میں آتا ہوں لیکن آپ کی ایک چیز میرے پاس ہے۔'' وہ وہیں سے مڑا۔ مائرہ اس کے پیچھے ہی اندر آگئی۔ شاہ زیب ٹیبل پر پائل ڈھونڈ رہا تھا پر وہ وہاں نہیں تھی۔

''کون سی چیز ہے میری؟'' وہ بھی شاہ زیب کے پیچھے متلاشی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''ارے رات کو اس ٹیبل پر ہی تو رکھی تھی کہاں گئی؟'' سائڈ ٹیبل کے پائے کے ساتھ کچھ چمک رہا تھا۔ شاہ زیب نے جھک کر ہاتھ بڑھایا اس کی مطلوبہ پائل مل گئی تھی۔

''یہ رہی آپ کی پائل...... رات کو آپ یہاں بیٹھی تھیں غالباً اس کا لاک کھل گیا تھا جب ہی یہ گر گئی ہوگی۔'' شاہ زیب نے پائل اس کی طرف بڑھائی۔

''میں صبح سے ڈھونڈ رہی تھی شکر ہے مل گئی۔ یہ پائل بہت پسند ہے مجھے۔ آرڈر پہ بنوائی تھی۔'' اس نے بے تابی سے پائل شاہ زیب کی ہتھیلی سے اٹھالی اور پھر داہنی ٹانگ کا پائنچہ ذرا سا اٹھا کر پاؤں بیڈ پر رکھ کر وہاں ہی پہننے لگی۔ شاہ زیب نے آنکھ چرالیں۔ بالآخر وہ پائل پہن کر سیدھی ہوئی تو شاہ زیب قدرے دور ہٹ گیا۔ ''تھینکس کزن میں جاتی ہوں آپ فریش ہو کے جلدی آئیں۔'' مائرہ خوش دلی سے بولتی دروازہ بند کر کے جا چکی تھی۔

شاہ زیب شاور لیتے ہوئے اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مائرہ کی ننھے منے نگوں والی پائل اور شفاف دودھیا پیر اس کے ذہن میں سب گڈمڈ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ناشتے میں خاصا اہتمام تھا مگر شاہ زیب قدرے شرمندہ تھا کیونکہ وہ خاصی دیر سے بیدار ہوا تھا۔ وہ اور مائرہ ڈائننگ ٹیبل پر اکیلے تھے۔ اس نے پپا کا

پوچھا تو مائرہ نے بتایا کہ وہ زمینوں پر گئے ہیں۔ وہ ناشتا کر کے فارغ ہوا تو شیریں تائی آگئیں۔ مائرہ بھی وہیں بیٹھ گئی پھر باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

''باغ میں چلتے ہیں پھر آپ کو ٹیوب ویل کی طرف بھی لے جاؤں گی۔'' مائرہ نے آفر کی تو دُریکتا جو اس کی باتوں میں بڑی خوشی، خوشی حصہ لیتی تھی جھٹ تیار ہو گئی اور شاہ زیب کو بھی آمادہ کرلیا۔ ان کے ساتھ باقی کزنز بھی تھے۔ جانے کیوں سب کو تیار ہوتا دیکھ کر مائرہ کا منہ بن سا گیا تھا۔

راستے میں جگہ، جگہ سبزہ تھا۔ آنکھوں کو تراوٹ سی مل رہی تھی۔ شاہ زیب نے ایک جگہ رک کر گہری، گہری سانسیں لیں جیسے اس ماحول اور اس فضا کی ساری تازگی کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتا ہو...... مائرہ اس کے پیچھے ہی تھی۔

''کزن آپ کو یہ سب اچھا لگ رہا ہے؟'' اس نے غور سے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بہت اچھا، میں پچھتا رہا ہوں کہ اتنے عرصہ گاؤں کیوں نہیں آیا؟''

''ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، جانے کیوں عمر چچا آپ کو گاؤں لانے سے کتراتے رہے حالانکہ ہم سب لوگ آپ کو ہمیشہ مس کرتے رہے۔'' مائرہ کا بات کرنے کا انداز بہت سادہ تھا مگر شاہ زیب کے ذہن میں اس کا جملہ اٹک سا گیا کہ ''جانے کیوں عمر چچا آپ کو گاؤں لانے سے کتراتے رہے۔'' واقعی پپا کیوں ایسا کرتے رہے۔ کل سے اب تک اس نے سب کے رویّوں میں گرمجوشی محسوس کی تھی۔ تایا اورنگزیب کے ساتھ، ساتھ ان کی اولادیں، دونوں چھوٹے تایا ان کی بیویاں، بچے سب اتنی محبت سے پیش آرہے تھے۔ کچھ ایسے ہی خیالات دریکتا کے بھی تھے کہ پپا خواہ مخواہ نہ خود اتنا عرصہ گاؤں آئے نہ انہیں آنے دیا۔ وہ اب اپنوں کی محبت سے سرشار تھی۔

☆☆☆

دعا

اے پروردگار!

مجھے وہ طاقت نہ دے جس سے میں دوسروں کو کمزور کردوں۔ مجھے وہ دولت نہ دے جس کی وجہ سے میں دوسروں کو حقیر سمجھوں۔ مجھے وہ علم نہ دے جو میں اپنے ہی سینے میں چھپا کر رکھوں۔ مجھے وہ بلندی نہ دے کہ مجھے پستی میں کچھ نظر نہ آئے۔ مجھے میرے اللہ وہ سب دے جسے میں دوسروں میں بانٹ سکوں۔

مرسلہ: سنبل ملک اعوان، لاہور

بہار کا موسم

بہار کا موسم گم شدہ چہروں کے دیدار کا موسم اور دراصل وصالِ یار کا موسم بڑے انتظار کے بعد آتا ہے۔ ویسے تو محبت سے آشنا، محبت کی روح سے آشنا، محبت کی تاثیر سے آشنا، محبت کے کرشموں سے آشنا، محبت کے اعجاز سے آشنا لوگ ہر موسم اور ہر رُت میں پیار کی بہار تلاش کر لیتے ہیں۔ پھول کھلے تو وہ غور کرتے ہیں کہ پھول کی ہستی کیا ہے، عجیب راز ہے، پھول کھلتا ہے مرجھا جاتا ہے، چند لمحات کے لیے وہ مسکرایا اور پھر ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے نامعلوم دنیا میں چلا گیا۔ بس انسان کی زندگی پھول کی مسکراہٹ سی ہے، اِدھر آئے اُدھر چلے گئے، پھول اپنی زندگی پر کیا اترائے گا، کیا فخر کرے گا۔

انتخاب: صائمہ یاسر شاہ، اٹک

مصنف: واصف علی واصف

ٹیوب ویل کے پاس بیٹھ کر مائرہ نے دونوں پاؤں ٹھنڈے تازہ پانی میں ڈبو دیئے، پل بھر میں ٹھنڈے پانی نے پاؤں کے ساتھ ساتھ ٹراؤزر کے پائنچوں کو بھی بھگو دیا تھا۔ ایک بار پھر اس کے دودھیا پیر شاہ زیب کے سامنے تھے۔ اچھی خاصی ٹھنڈ تھی پر وہ نہ جانے کس مٹی سے بنی تھی اسے سردی کا احساس ہی نہیں تھا۔ مزے سے پانی کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ شاہ زیب کو ایک بار پھر نظریں چرانا پڑیں۔ مائرہ کی معصوم سی بے باکی اسے عجیب سی لگ رہی تھی۔ جیسے اسے کچھ پتا ہی نہیں ہو، اس کا کزن کہہ کر مخاطب کرنا شاہ زیب کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ باقی لڑکے، لڑکیاں اس کا نام لے رہے تھے پر وہ صرف کزن کہہ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا مگر مائرہ کا اہمیت دینا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

کافی دیر بعد وہ لوگ گھر لوٹے تو مختلف لوازمات سے پُر طعام ان کا انتظار کر رہا تھا۔ شاہ زیب تھک چکا تھا، کھانا کھا کر سو گیا۔ مغرب کے وقت دُرِ یکتا نے بڑی مشکل سے اسے اٹھایا۔

آج اورنگ زیب تایا نے سب بھائیوں کی دعوت کی تھی۔ رات کا کھانا اُن کی طرف تھا۔ لمبے سے ڈائننگ ہال میں بڑی رونق تھی۔ صبح ان لوگوں نے واپس شہر چلے جانا تھا۔ ایک طرح سے آج ان کی الوداعی دعوت تھی۔ باتوں اور کھانوں کا سلسلہ ساتھ، ساتھ چل رہا تھا۔ شیریں بھابی نے روئے سخن عمر کی طرف موڑا۔

''عمر، مائرہ کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ یہاں کے کالج کا تو آپ کو پتا ہے، پہلے ہی اس کا ایک سال ضائع ہو گیا ہے اب قریبی شہر کے ایک کالج میں داخلہ لے تو لیا ہے پر وہاں آنے جانے میں اچھا خاصا وقت لگ جاتا ہے جب سے آپ لوگ آئے ہیں یہ کہہ رہی ہے کہ اسے بھی وہاں ہی داخلہ لینا ہے۔ ہاسٹل میں رہ لے گی آپ بس اس کا داخلہ کروا دیں۔'' شیریں بھابی کا لہجہ حد سے زیادہ پُر تکلف تھا۔ عمر کو ہاسٹل والی بات بہت بری لگی۔

''میں مائرہ کا ایڈمیشن کروادوں گا مگر میرے ہوتے ہوئے یہ ہاسٹل میں کیوں رہے۔ جیسے دریکتا میری بیٹی ہے اس طرح مائرہ بھی ہے۔ بیٹا تم اپنا ضروری سامان پیک کر لینا، کل تم بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہو۔'' اب ان کا مخاطب مائرہ تھی۔ اس کا تو خوشی کے مارے برا حال تھا۔ اتنی آسانی سے سب کچھ ہو جائے گا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس نے ہی ماں کو سب سے پہلے بتایا تھا کہ دریکتا کہہ رہی ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو اور اُدھر ہی کسی اچھے سے کالج میں ایڈمیشن لے لو۔ اورنگزیب کے آگے اسی رات شیریں نے یہ تجویز رکھی تھی۔ آئیڈیا برا نہیں تھا۔ ویسے بھی عمر اُن کا بھائی تھا۔ اگر مائرہ اس کے گھر رہ کر تعلیم حاصل کرتی تو برائی ہی کیا تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پہ جان بوجھ کر شیریں نے سب کے سامنے یہ بات چھیڑی تھی۔

ادھر گاؤں میں سب کچھ تھا۔ دولت، جائداد، کھانے پینے کی فراوانی پر شہر والی تیز رفتاری اور چکا چوند نہیں تھی۔ شیریں چاہتی تھی کہ مائرہ اُدھر رہ کر سب شہری مینرز سیکھ لے۔ شاہ زیب کو دیکھتے ہی اس کے ذہن میں ایک پرانی خواہش نے سر اٹھایا تھا۔ اسے کوئی مشکل ہی نہیں ہوئی۔ عمر بہت خوش ہوا کہ مائرہ کو پڑھنے کا اتنا شوق ہے اس نے بہت خوشی، خوشی اپنا بیگ تیار کیا تھا۔ صبح اسے عمر چچا کے ساتھ ان کے گھر چلے جانا تھا۔ اسے اچھی طرح پتا تھا کہ باقی دونوں چچیاں اور ان کی بیٹیاں دل ہی دل میں جل رہی ہوں گی کہ وہ عمر چچا کے ساتھ ان کے گھر جا رہی ہے۔ وہیں رہ کر پڑھے گی سو اس نے اپنی طرف سے ان سب کو جلانے کا پورا، پورا انتظام کر لیا تھا۔

☆☆☆

عمر زیب کا گھر بہت خوب صورت اور ویل ڈیکوریٹڈ تھا۔ پوری طرح شہری سہولیات سے آراستہ مائرہ کو دریکتا کے ساتھ والا کمرا دیا گیا۔ اگلے

کچھ دنوں میں مائرہ کا ایڈمیشن بھی ہوگیا۔ اب شاہ زیب خود ڈرائیو کرتا اور ان دونوں کو بھی ڈراپ کر دیتا۔ شہر آکر مائرہ نے خود کو پہلے سے زیادہ سنوار لیا تھا۔ بال اسٹیپس میں کٹوا لیے۔ جدید فیشن کے ملبوسات خرید لیے، وہ گاؤں کی پروردہ نظر ہی نہیں آتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں سیکھنے کی صلاحیت بہت زیادہ تھی پھر آنے سے پہلے شیریں نے اسے بہت سی ہدایات بھی دی تھیں۔ جنہیں وہ پوری طرح فالو کر رہی تھی۔ اس کا رنگ روپ مزید نکھرتا جارہا تھا۔ وہ بہت زیادہ خوب صورت نہیں تھی پر اسے خوب صورت نظر آنے کا گُر آتا تھا۔ اور اس کا استعمال اس نے بہت خوب صورتی اور سلیقے کے ساتھ کیا تھا۔ وہ شیریں جیسی ماں کے زیرِ سایہ پروان چڑھی تھی .... بے باک ونڈر اپنی طرف موڑنے اور متوجہ کرنے کے سارے طریقے اسے آتے تھے۔

☆☆☆

شاہ زیب شام کو گھر لوٹا تو بڑی خاموشی تھی حالانکہ اس وقت پپا اور دریکتا شام کی چائے پر اس کا انتظار کررہے ہوتے کہ وہ کب گھر لوٹے پھر ہر موضوع پر خوب ڈسکشن ہوتی پر آج لان میں پڑی چیئرز خالی تھیں البتہ لونگ روم میں مائرہ مل گئی وہ کوئی فیشن میگزین دیکھنے میں لگی ہوئی تھی۔

''کیا پپا ابھی نہیں آئے اور یہ دریکتا کہاں ہے؟''

''چچا تھوڑی دیر پہلے کسی دوست کی طرف گئے ہیں اور دریکتا، آنٹی زیبا کی طرف گئی ہے کہہ رہی تھی انہوں نے میلاد پہ بلوایا ہے۔'' اس نے پڑوسیوں میں سے ایک کا نام لیا۔ آنٹی زیبا کا گھر تین گھر چھوڑ کر تھا۔ کافی اچھے تعلقات تھے ان کے ساتھ۔ اس لیے آنا جانا لگا رہتا تھا۔

''تم نہیں گئیں؟''

''اصل میں میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، اس لیے نہیں گئی۔'' وہ میگزین رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوچکی تھی۔ اب ان میں اچھی خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی پر شاہ زیب ایک حد میں ہی رہتا۔ خود وہ بھی اسے کزن یا آپ کہہ کر ہی بلاتی تھی۔ اس کے ایک، ایک عمل اور انداز سے خاص توجہ کا اظہار ہوتا تھا۔ شاہ زیب کہیں سے بھی لوٹ کے گھر آتا تو اسے چائے، پانی کا پوچھتی اگر وہ رات کو لیٹ آتا تو اکثر جاگ رہی ہوتی اسے کھانے کا کہتی نہ کھایا ہوتا تو اس کے لیے کھانا گرم کر کے لے آتی۔ اس کے چھوٹے موٹے کاموں کا پوچھ لیتی یہ سب شاہ زیب کو بہت عجیب بھی لگتا اور اچھا بھی کیونکہ مائرہ کا تعلق اس خاندان سے تھا جہاں کی لڑکیاں پانی بھی ملازموں سے منگوا کے پیتی تھیں لیکن خود مائرہ اس کی خدمت کے لیے بے قرار نظر آتی۔ یہ سب باتیں ایک خاص جذبے کی طرف اشارہ کررہی تھیں۔ شاہ زیب پہ کچھ واضح نہیں تھا مگر وہ انجان بھی نہیں تھا۔

''آپ چائے پئیں گے؟'' مائرہ کچن کی طرف جارہی تھی تو اس نے پوچھا۔

''ہاں بنوادو۔'' شاہ زیب نے جیکٹ اتار کر پاس پڑے صوفے پر اچھال دی۔ مائرہ چائے کا کہہ کر واپس آگئی۔ آج پہلی بار دونوں اس طرح بیٹھے تھے کہ تیسرا کوئی نہیں تھا۔ ریڈ کلر کے ٹراؤزر شرٹ میں وہ شعلہ جوالہ لگ رہی تھی۔ سردی اور فلو کی وجہ سے آنکھیں اور ناک بھی سرخ سرخ سی نظر آرہی تھیں مگر اس عالم میں وہ شاہ زیب کو پہلے سے بڑھ کر اچھی لگ رہی تھی۔

''طبیعت زیادہ خراب ہے کیا؟'' اس نے ازراہِ ہمدردی پوچھا۔

''ہاں بس فلو ہے اس وجہ سے سر میں بھی درد ہے۔''

''تو آرام کرو ناں۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''آرام ہی تو کررہی ہوں۔'' مائرہ کے لہجے میں جانے کیا تھا شاہ زیب کو محسوس ہوا جیسے کچھ ہے...... آج سے پہلے اس نے کبھی مائرہ کو اس طرح نڈھال سا نہیں دیکھا تھا۔

''کوئی پرابلم ہے تو بتاؤ؟'' شاہ زیب اس کے

برابر رکھا میگزین اٹھاتے ہوئے اس کی طرف قدرے جھکا عین اسی وقت مائرہ نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو اپنی دُھن میں اس کا سر شاہ زیب سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی۔ شاہ زیب نے غیر ارادی طور پر اس کے لبوں پر ہاتھ رکھا تو مائرہ نے دوسرا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ جیسے سہارا لینا چاہ رہی ہو۔ پل بھر کا تصادم تھا دونوں ایک دوسرے کی دھڑکنیں تک سن سکتے تھے۔ باہر دروازے پہ آہٹ ہوئی شاید کوئی ہوا کا جھونکا تھا جو دروازے سے چھیڑ خانی کررہا تھا مگر شاہ زیب بہت تیزی سے دور ہوا۔ سارا فسوں چھناکے سے ٹوٹا۔ اس کے بعد وہ وہاں رکا نہیں اپنے بیڈروم میں آکے ہی دم لیا۔

مائرہ کو اس رات تیز بخار تھا۔ ادھر شاہ زیب بھی بے قرار تھا۔ وہ دوبارہ بہانے سے اس کے پاس آیا دریکتا، مائرہ کے پاس ہی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے چلا گیا۔ پر تھوڑی دیر بعد پھر آگیا۔ اب کی بار مائرہ اٹھ کے بیٹھی ہوئی تھی اور دریکتا کچن میں اس کے لیے سوپ لینے گئی تھی۔

''کیسی طبیعت ہے؟'' بے قراری اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

''اب ٹھیک ہوگئی ہے۔'' مائرہ کا لہجہ و انداز ایسا تھا کہ وہ اس وقت کچھ سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ دُرِیکتا کے آنے سے پہلے وہ وہاں سے ہٹ آیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چوری کررہا ہو اور رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا ڈر ہو۔ کچھ ایسا تھا ضرور مگر اسے سمجھ نہیں آرہی تھی۔

☆☆☆

مائرہ دو ماہ کے عرصے میں پہلی بار گاؤں گئی تھی۔ ماں، باپ اسے بہت یاد کررہے تھے، اورنگزیب اسے خود لینے آئے تھے۔ وہ چلی آئی حالانکہ دل نہیں کررہا تھا۔ شاہ زیب بھی گھر میں نہیں تھا۔ انہوں نے پیشگی اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی بس اچانک اسے لینے آئے تھے۔ ناچار وہ ان کے ساتھ چلی آئی۔ ماں نے کتنی بار اسے لپٹایا پیار کیا، رات کو ذرا فرصت ملی تو اس سے وہاں کی باتیں پوچھنے لگی۔

''عمر کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے؟'' شیریں نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

''بہت اچھا، وہ بہت خیال رکھتے ہیں میرا۔''

''دریکتا کی سناؤ۔''

''وہ بالکل بہنوں کی طرح ہے۔''

''اور شاہ زیب......؟'' شیریں کا لہجہ بہت معنی خیز تھا۔

''وہ بھی ٹھیک ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' شیریں مطمئن سی تھی۔

''میری بات یاد رکھنا۔''

''یاد ہے......'' مائرہ قدرے خفگی سے گویا ہوئی۔

''یاد رکھنا تم نے عمر کی بہو بننا ہے۔ ایسا نہ ہو تمہارا حال بھی بینا خالہ کی طرح ہو۔''

''آپ بینا خالہ کی بات مت کریں، میں ان کی طرح کمزور نہیں ہوں۔''

''چلو اچھی بات ہے اگر تم کمزور نہیں ہو، ویسے بھی شاہ زیب تمہارے چچا کا اکلوتا بیٹا ہے، جان ہے عمر کی اس میں۔''

''امی، شاہ زیب کی جان عنقریب میرے پاس ہوگی۔'' مائرہ نے بڑے غرور سے یہ جملہ دل ہی دل میں کہا تھا۔ بینا خالہ کے ماضی کے بابت اسے ایک ایک بات امی سے معلوم ہوئی تھی۔ لمبے چوڑے شاہ زیب کو دیکھتے ہی ذہن میں کچھ باتیں گڈ مڈ ہوئی تھیں۔ عمر زیب چچا نے پہلی شادی اپنی پسند سے کر کے بزرگوں کی روایات کو توڑا پھر عائلہ چچی کے بعد دوبارہ اپنی مرضی سے شادی کی پر بینا خالہ کے آنسو اور محبت انہیں نظر نہ آئے۔ انہیں دوسری بار ٹھکرایا گیا...... ٹھکرائے جانے کی یہ اذیت بینا کے ساتھ، ساتھ پورے گھرانے نے بھی جھیلی تھی۔ ان میں شیریں بھی شامل تھی۔ عمر زیب کا یہ جرم ناقابلِ معافی تھا۔ اب تو اورنگ زیب بھی بیوی کے ہم خیال تھے۔

چنانچہ وہ بھی عمر کے ساتھ رکھائی سے پیش آنے لگے تھے۔ راحیلہ کی موت بھی اس رکھائی اور سرد مہری کی دیوار کو نہ گرا سکی تھی۔ آہستہ آہستہ باقی چھوٹے بھائیوں کی نگاہیں بھی بدلنے لگیں۔ وہ خود ڈھیٹ بن کر ان کے پاس گاؤں آتے۔ اتنے برسوں میں شیریں نے اپنی اولاد کو یہی باور کرایا تھا کہ عمر چچا نے زیادتی کی ہے۔ اس بار عمر چچا اکیلے گاؤں نہیں آئے تھے۔ لمبا چوڑا غضب کی وجاہت سمیٹے شاہ زیب بھی ان کے ہمراہ تھا۔ شیریں بہت محبت سے ملی تھی اور تنگ زیب کا دل بھی بھائی کی محبت سے لبریز ہوا تھا۔ دریکتا اور شاہ زیب آخر تھے تو انہی کا خون...... پل بھر میں دلوں کی دوری ختم ہوئی تھی مگر یہ سب عارضی تھا۔

☆☆☆

مائرہ کے شہر جانے کے بعد دونوں بھابیاں دل ہی دل میں عمر زیب سے ناراض تھیں کہ عمر نے ان کی اولادوں کو تو بالکل بھی نہیں پوچھا اور مائرہ کو ساتھ لے گیا۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہی تھیں کہ کسی طرح دریکتا ان کی بہو بن جائے تو وہ بھی شیریں کے سامنے سر اٹھا کر بات کرسکیں۔ فوزیہ نے دل ہی دل میں اپنے بیٹے اسجد کے حوالے سے فیصلہ بھی کرلیا تھا۔ اسجد شہر کے ہاسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کررہا تھا وہ بہت آگے تک جانا چاہتا تھا۔ عمر زیب چچا کی طرح اس کی منزل بھی سب کچھ حاصل کرلینے کی تھی۔ اگر وہ عمر کا داماد بن جاتا تو یہ منزل بڑی آسانی سے حاصل ہوجاتی۔ فوزیہ مناسب وقت کا انتظار کررہی تھی کہ کب اسجد کے رشتے کے لیے عمر سے بات کرے۔

سب سے چھوٹی فرح چچی کی سوچ فوزیہ سے ذرا الگ قسم کی تھی۔ وہ مائرہ کے شہر جانے کے بعد اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور ہوئی تھی اگر عمر اُن کے بیٹے کو گھر داماد بنالیتا تو کتنا اچھا ہوتا دریکتا کے ساتھ، ساتھ بہت ساری دولت بھی ملتی۔ فوزیہ اور فرح دونوں نے اپنے، اپنے مجازی خداؤں یعنی عمر زیب کے بھائیوں سے بھی بات کرلی تھی۔ انہیں بھی اس رشتے میں کوئی برائی نظر نہیں آرہی تھی۔ آخر کو عمر چھوٹا بھائی تھا وہ اگر اسے نہ پوچھتے تو کون پوچھتا۔ خونی رشتوں کا حق تو ہوتا ہے اور وہ اپنا فرض نبھانا چاہتے تھے۔ اس بار عمر کو گاؤں آنے کی دعوت وہ خود دے رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً شہر کے چکر بھی لگا رہے تھے۔ عمر بہت خوش تھا کہ بالآخر اس کے بھائیوں کو اس کا احساس ہو ہی گیا۔ برسوں کی دوریاں ختم ہوگئیں اور برف پگھل گئی تھی۔

☆☆☆

مائرہ کہیں بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ شاہ زیب کو عجیب سی کھد بھد لگی ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ دیر رہا نہیں گیا دریکتا سے پوچھ بیٹھا۔

''مائرہ کہاں ہے کافی دیر سے نظر نہیں آئی۔''

''بھائی وہ تو تایا ابو کے ساتھ صبح، صبح گاؤں چلی گئی ہے۔ وہ لینے آئے تھے کہ سب گھر والے اسے یاد کررہے ہیں۔'' دُرِیکتا نوٹ بک پر جھکے، جھکے بولی۔ وہ شاہ زیب کے چہرے پر پھیلتی اداسی کے رنگوں کو نہ دیکھ پائی تھی ورنہ بہت کچھ جان جاتی۔

☆☆☆

مائرہ نے سکون کی سانس لی تھی۔ ابو اسے واپس چھوڑ گئے تھے اور عمر چچا کے ساتھ ساتھ دریکتا اور شاہ زیب کے لیے بہت کچھ لائے بھی تھے۔ شاہ زیب کالج سے آنے کے بعد دوستوں کی طرف نکل گیا تھا۔ وہ آج کل کم ہی گھر میں ٹکتا تھا کالج کے بعد دوست ہوتے یا پھر بائیک، آج بھی وہ اسی شغل میلے میں لگا ہوا تھا۔ مائرہ کو مایوسی ہوئی وہ گھر پر نہیں تھا۔ وہ اصل میں اس کے تاثرات جانچنا چاہ رہی تھی کہ اس کی آمد پہ اسے دیکھ کے شاہ زیب کس طرح ری ایکٹ کرتا ہے۔ جب وہ گئی تھی تب بھی شاہ زیب نہیں تھا اور اب آئی تھی تو تب بھی نہیں تھا۔ خیر اس نے آنا تو گھر ہی تھا۔ مطمئن سی ہوکر اس نے اپنے کپڑے الماری میں لٹکائے اور سفر کی دھول مٹی سے پیچھا چھڑانے کی خاطر شاور لینے چلی گئی۔

دُریکتا اسے دوبارہ اپنے درمیان پا کر بہت خوش ہوئی۔ اورنگ زیب اسے یہاں چھوڑ کر زیادہ دیر نہیں رکے اور اسے چھوڑ کر ڈرائیور کے ساتھ واپس روانہ ہوگئے۔ دریکتا نے خود اس کے لیے چائے بنائی۔ دونوں نے لان میں بیٹھ کر چائے پی۔ شاہ زیب ہنوز غائب تھا۔ مائرہ نے خود سے اس کا نہیں پوچھا۔ احتیاط لازم تھی۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی وہ اس کا کزن تھا وہ اس کے بارے میں پوچھ سکتی تھی۔ دریکتا نے بھلا کیا کہنا تھا...... پر مائرہ کے اپنے دل میں چور تھا جو اسے روک رہا تھا۔

☆☆☆

مائرہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ڈراما دیکھ رہی تھی۔ شاہ زیب اسے دیکھ کر خوشگوار حیرت سے دوچار ہوا۔

''ارے کب واپسی ہوئی اور اپنے جانے کا بتایا ہی نہیں۔ بے مروتوں کی طرح چلی گئیں میں نے تمہیں کون سا روک لینا تھا۔'' ایک دبا، دبا سا شکوہ شاہ زیب کے لبوں پر آ ہی گیا جو وہ ایک سانس میں بول گیا۔

''آپ روک لیتے تو میں کبھی نہیں جاتی۔'' وہ رک، رک کر بہت آہستہ آواز میں بولی تھی۔ شاہ زیب حیرانی سے اسے تکنے لگا۔ مائرہ نے نظر نہیں چرائی۔ جانے ابھی اس پر اپنے محسوسات کا کون سا در وا ہوا تھا وہ جان ہی نہیں پایا۔

''اچھا یہ بتاؤ گاؤں میں سب کیسے ہیں؟'' وہ فوراً ہی سنبھل گیا تھا۔

''ٹھیک ٹھاک، اے ون......'' وہ بڑی ادا سے بولی۔ ''اور امی نے آپ کے لیے کچھ چیزیں بھجوائی ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں ذرا فریش ہو لوں پھر بات ہوتی ہے۔'' شاہ زیب اسے کچھ سوچتا چھوڑ کر وہاں سے جا چکا تھا۔

☆☆☆

بہت خوب صورت موسم تھا، سرمئی، سرمئی بدلیاں آسمان پر جمع ہو کر بھاگتی پھر رہی تھیں۔ مائرہ باہر برآمدے میں بیٹھی موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ دریکتا اپنے کمرے میں سو رہی تھی اور شاہ زیب بھی کالج سے آنے کے بعد آرام کر رہا تھا۔ عمر حسب معمول آفس میں تھے۔

خوب صورت موسم کی جولانی دیکھ کر مائرہ باہر نکل آئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے موٹی، موٹی بوندیں گریں اور پیاسی دھرتی کا سینہ سیراب ہونے لگا۔ مائرہ اب لان میں آ کر بارش کے مزے لے رہی تھی۔ شاہ زیب کی آنکھ بوندوں کی آواز سے کھلی۔ اس نے گلاس ونڈو سے پردہ ہٹایا...... سامنے کا منظر بڑا واضح تھا۔ ہر چیز بارش میں نہا رہی تھی اور مائرہ اس دلفریب منظر کا حصہ بنی ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ شاہ زیب چھلانگ مار کر بیڈ سے اترا۔ اگلے لمحوں میں وہ بھی باہر برآمدے میں کھڑا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟''

''موسم انجوائے ہو رہا ہے۔'' وہ دلکشی سے مسکرائی۔ اس سمے شاہ زیب کو وہ موسم کی طرح ہی البیلی نظر آئی۔ بارش کی بوندوں نے اسے اچھا خاصا بھگو ڈالا تھا۔ وہ اپنے بال جھٹکتے ہوئے سرشاری کی کیفیت میں تھی۔ جبھی آسمان کی لامتناہی وسعتوں میں بجلی چمکی اور ساتھ ہی زور کی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ مائرہ کے لبوں سے ایک زوردار چیخ برآمد ہوئی اور اسی لمحے وہ بھاگ کر برآمدے میں کھڑے شاہ زیب سے جا ٹکرائی۔ انجانے میں اس نے شاہ زیب کے بازو پکڑ لیے تھے۔ اس کے نازک گداز ہاتھوں نے شاہ زیب کا سہارا غیر ارادی طور پر لیا تھا۔ یہ لمس، یہ احساس، یہ گرفت، یہ مہک شاہ زیب کے لیے بڑی انوکھی اور دلکش تھی۔ شاہ زیب نے اسے تھام لیا تھا۔ اس کے دل نے بے اختیار اک خواہش کی، کاش مائرہ اسی طرح اس کی بانہوں کی گرفت میں محفوظ رہے...... پر ایک لمحہ ہی تو تھا۔ مائرہ کو بہت تیزی سے احساس ہوا کہ وہ اس کے کس قدر قریب ہے۔ یہ احساس آنے کی دیر تھی کہ مائرہ اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر منظر سے ہٹی اور تیزی سے اپنے بیڈروم میں آ گئی۔

وہ کتنی دیر وہیں مائرہ کے لمس اور اس مہک کے احساس میں گھرا کھڑا رہا۔ لمبی لمبی سانسیں لے کر اس نے مائرہ کی معدوم ہوتی خوشبو کو اپنے سینے میں بھرنے کی کوشش کی...... شعور میں کسی کمی کا احساس ہوا تھا تو تکمیل کی تمنا بھی جاگ پڑی۔ مائرہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی اور دل شدت سے اس کا متلاشی تھا۔

وہ اس کے بیڈ روم کے دروازے پر رکا...... پر اندر داخل نہیں ہوا۔ کچھ سوچ کر واپس مڑ گیا۔ دل انوکھی لے پر دھڑک رہا تھا۔ وہ دل میں چھپے جذبوں کو پہچان چکا تھا۔

پھر وہ رات کے کھانے پر ہی نظر آئی مگر اس طرح کہ شاہ زیب سے گریزاں اور نظریں چرائے ہوئے...... اسے عجیب سا محسوس ہوا۔ شاہ زیب سے رہا نہیں گیا اس کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔

''مجھ سے ناراض ہو؟''

مائرہ نے حیران نگاہیں اوپر اٹھائیں اور نفی میں سر ہلایا۔

''پھر مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہیں، بھاگ کیوں رہی ہو مجھ سے؟'' وہ تفتیشی انداز میں بولا تو مائرہ کی آنکھوں میں بے بسی سی ڈولتی دکھائی دی۔

''مجھے نہیں پتا۔''

''کیوں نہیں پتا؟''

''بس نہیں پتا ناں......'' شاہ زیب کو جانے کیوں اسے تنگ کرنے میں لطف آرہا تھا۔

''پھر کس کو پتا ہے؟''

''آپ کو پتا ہوگا۔'' وہ گریزاں، گریزاں سی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

''نہیں، مجھے نہیں معلوم...... تم بتاؤ ناں......''

''آپ کو سب پتا ہے۔'' شاہ زیب حیران سا ہوا۔ سارے راز اس ایک ثانیے میں اس پر منکشف ہوئے۔

''بھلا مجھے کیا پتا ہے؟'' وہ انجان پنے سے گویا ہوا تو مائرہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ وہاں سے ہٹنا چاہ رہی تھی پر شاہ زیب دیوار بن کر اس کے راستے میں حائل تھا۔

''ہٹیں، میں جاؤں۔''

''اگر میں نہ ہٹوں تو......؟'' شاہ زیب کی چمکیلی آنکھوں میں خودسری چھلکی تو مائرہ نے دونوں ہاتھوں سے اسے آگے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ شاہ زیب نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ اس جرأت پر وہ حیران ہوئی اتنے میں دریکتا ڈائننگ ہال سے باہر نکلی تو شاہ زیب نے مائرہ کے ہاتھ چھوڑ دیے مگر وہاں سے جانے سے پہلے وہ اسے سرگوشی میں کہنا بھولا نہیں تھا کہ ''مجھے تم سے باتیں کرنی ہیں۔'' مائرہ کی نگاہ اس کے قدموں میں تھی۔

☆☆☆

نیم تاریک ریسٹورنٹ میں دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ شاہ زیب نے اپنے احساسات و خیالات اور نہ جانے کیا کچھ مائرہ کی سماعتوں تک پہنچادیا۔ یوں اس نے صاف اور سیدھے نپے تلے انداز میں چاہت کا اظہار کیا۔ مائرہ کافی دیر خاموش رہی جیسے بولنے کے لیے الفاظ جمع کر رہی ہو۔

''کیا ہماری محبت کو عمر چچا قبول کرلیں گے؟'' خاصی دیر بعد اس نے خاموشی توڑی اور جو سوال کیا تو کم از کم شاہ زیب کو تو وہ سوال عجیب ہی لگا تھا۔

''کیوں، اس میں برائی کیا ہے جو وہ قبول نہیں کریں گے بلکہ انہیں تو خوش ہونا چاہیے، وہ اپنی فیملی سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں نے ایک تڑپ دیکھی ہے ان میں، اپنے رشتوں کے لیے۔'' مائرہ نے یقین نہ کرنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

''آپ لوگ اتنا عرصہ گاؤں نہیں آئے بلکہ عمر چچا آپ کو لائے ہی نہیں...... خود بھی اُدھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ ابو، دونوں چچا، ہم سب کزنز آپ سے ملنے کی آرزو ہی کرتے رہے مگر عمر چچا کو لگتا ہے پسند نہیں تھا کہ اپنی فیملی سے، اپنے بھائیوں سے قریب ہوں، انہوں نے تو آپ دونوں بہن، بھائی کو بھی نہیں آنے دیا۔'' مائرہ کا لہجہ کاٹ دار تھا۔ شاہ زیب اس کی کہی

باتوں میں حقیقت ڈھونڈنے کی کوشش کررہا تھا۔

''مائرہ یہ سب تمہاری غلط فہمی ہے پپا اپنی فیملی سے اپنے بھائیوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔''

''اگر وہ محبت کرتے ہوتے تو اتنا عرصہ انہوں نے خود کو اور آپ لوگوں کو اپنوں سے دور کیوں رکھا۔ دوسری شادی کے بعد تو وہ گاؤں سے بالکل ہی کنارہ کش ہوگئے تھے۔ اتنے عرصے بعد وہ آپ دونوں کو گاؤں لائے۔ کبھی سوچا آپ نے کبھی پوچھا ان سے؟'' وہ ایک ہی سانس میں بولے گئی۔ شاہ زیب کے ماتھے پر تفکرات کی لکیریں نمایاں ہونے لگیں۔ مائرہ پتا نہیں کیا، کیا کہہ رہی تھی جو بھی تھ شاہ زیب سوچنے پر مجبور ہورہا تھا۔ ریسٹورنٹ کے خوابناک ماحول میں اظہارِ محبت کے بعد وہ ہلکا پھلکا تو ہوگیا تھا پر ایک اور بوجھ ذہن و دل پر سوار ہوگیا تھا۔

☆☆☆

آج کا سارا دن شاہ زیب کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ بہت مطمئن تھی۔ کتنی جلدی یہ مشکل مرحلہ بھی طے ہوگیا تھا۔ شاہ زیب نے پہلے خود محبت کا اظہار کرکے اس کے غرور میں کئی گنا اضافہ کردیا تھا۔ گاؤں کی پروردہ ایک عام سی لڑکی نے شہر کے ایک پڑھے لکھے خوبرو جوان کو اپنا اسیر بناکر ہی دم لیا تھا۔ بینا خالہ تو ناکام رہی تھیں پر جیت اس کے حصے میں آئی تھی۔ وہ جتنی بھی خوشی مناتی کم تھی۔

پہلی نظر میں ہی شاہ زیب کو دیکھ کر اس کا دل دھڑکا تھا۔ وہ نظر انداز کیے جانے کے قابل بھی تو نہیں تھا۔ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ شاہ زیب اس طرح اس سے محبت کرنے لگے گا۔ خود شاہ زیب کے اپنے کالج میں ایک سے ایک خوب صورت اور طرحدار لڑکی تھی پر اس کا دل مائرہ پہ ہی آیا۔

☆☆☆

دریکتا تیار ہورہی تھی اس کی فرینڈ کی برتھ ڈے تھی۔ شاہ زیب نے کہا تھا...'' جب تیار ہوجاؤ تو مجھے بلالینا میں جب تک تھوڑی دیر آرام کرلوں۔'' سو وہ بے فکر تھی۔ اس لیے سکون سے تیار ہوئی۔ آئینے میں خود کو دیکھا وہ مطمئن سی تھی کہ اچھی لگ رہی ہوں۔ اب شاہ زیب کو اٹھانا تھا کہ اس نے بھی تو چینج کرنا تھا۔ اس نے گنگناتے ہوئے دروازہ ناک کیا تو وہ ہاتھ کے دباؤ سے ایک دم کھل گیا۔ اندر کا منظر حیران کُن تھا۔ مائرہ، شاہ زیب کے بہت قریب کھڑی اس کی ٹائی کی ناٹ باندھ رہی تھی۔ انداز میں جنم، جنم کی بے تکلفی اور اپنائیت تھی۔ آہٹ سے وہ دونوں بیک وقت اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ مائرہ کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ پڑا۔ وہ بھاگنے والے انداز میں دریکتا کے قریب سے گزر کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ شاہ زیب بھی بہت شرمندہ لگ رہا تھا۔ گاڑی میں بھی وہ اس سے نظریں نہیں ملا پارہا تھا۔

مائرہ خود ہی اس کے بیڈ روم میں آئی تھی۔ وہ تیار ہوکر پرفیوم اسپرے کررہا تھا۔ جب وہ اس کے بہت قریب چلی آئی اور بڑے آرام سے پرفیوم کی بوتل اس کے ہاتھ سے لی اور خود اسپرے کرنے لگی۔ اس کے بال برش سے سنوارے۔ مائرہ کا انداز بہت عام اور نارمل سا تھا جیسے اس بات اور اس قربت کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

''ٹائی کی ناٹ ڈھیلی ہے میں ٹھیک کردیتی ہوں۔'' ٹائی کی ناٹ باندھنے کے بہانے دوری کچھ اور بھی کم ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ شاہ زیب بے خود ہوتا آہٹ ہوئی اور وہ حواسوں میں واپس آگیا۔ مائرہ بڑی تیزی سے باہر نکلی۔ وہ ندامت سے نگاہیں جھکا.....کے رہ گیا۔

''میں تمہیں نو بجے پک کرلوں گا۔'' بہن کو ڈراپ کرکے گاڑی موڑ کر وہ فقط یہی کہہ سکا۔ دریکتا بہت چپ، چپ سی تھی۔ مائرہ کے انداز بہت عجیب سے ہورہے تھے۔ وہ اکثر نوٹ کرتی۔ شاہ زیب کے کپڑے دھل کر آتے تو وہ پریس کرنے کھڑی ہوجاتی۔ وہ گھر میں ہوتا تو مائرہ پاس ہی بیٹھی رہتی۔ کبھی چائے اور کبھی کھانے کا پوچھتی۔ اس کے ایک، ایک

عمل سے کوئی خاص چیز جھلکتی دریکتا جسے کوئی نام دینے سے قاصر تھی اور آج اس نے جو منظر دیکھا تھا وہ ہضم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ اتنی قربت، اتنی اپنائیت مائرہ کے انداز میں اتنا استحقاق جیسے جنم، جنم کی بے تکلفی ہو، جب وہ یہاں شروع میں آئی تھی تو اتنی جھینپی جھینپی سی رہتی بالکل خاموش، خاموش سی......اس کا یہ روپ دریکتا کے لیے حیران کُن تھا۔

پارٹی میں بھی وہ اسی معاملے پر سوچتی رہی اور ٹھیک طرح سے انجوائے بھی نہیں کر سکی۔ فائنل ایگزامز کے بعد ان کی چھٹیاں تھیں۔ جبھی پپا نے کہا تھا کہ جب مائرہ گاؤں جائے تو تم بھی ساتھ چلی جانا۔ جب پپا نے کہا تھا تب وہ خوش تھی پر اب دل بجھا، بجھا سا تھا۔

☆☆☆

مائرہ واپسی کے لیے تیار تھی۔ عمر اسے چھوڑنے جا رہا تھا اور شاہ زیب بھی گاؤں جانے کو تیار تھا۔ ایسے میں دریکتا کو اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا سو وہ بھی جا رہی تھی پر بے کل دل کے ساتھ......

اس بار ان کا استقبال پہلے سے بھی بڑھ کر والہانہ انداز میں ہوا۔ گرمجوشی سب کے رویوں میں نمایاں تھی۔ رات کا کھانا فرح چچی کی طرف تھا حالانکہ اورنگزیب نے کہا تھا کہ رات کا کھانا سب اِدھر ہی کھائیں گے...... پر بھائی اور بھاوج کے سامنے ان کی ایک نہیں چلی۔ فرح اور نوید بڑی محبت اور اصرار سے ان تینوں کو اپنی طرف لے گئے۔

البتہ سونے کا انتظام تایا اورنگزیب کے گھر پر ہی تھا۔ فرح چچی نے کئی بار دُرِّیکتا سے اصرار کیا کہ رات ان کے گھر ہی رہے پر مائرہ اسے اپنے ساتھ لے آئی۔

☆☆☆

عمر زیب کے ساتھ باقی تینوں بھائی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑے اچھے ماحول میں بات چیت ہو رہی تھی۔ اچانک ہی گفتگو کا رخ دریکتا اور شاہ زیب کی طرف مڑ گیا۔

''کیا سوچا ہے دریکتا کے بارے میں؟'' یہ سوال نوید بھائی کی طرف سے آیا۔

''بھائی نوید میں آپ کا سوال نہیں سمجھ پایا ہوں۔'' عمر زیب نہ سمجھ آنے والے انداز میں انہیں تکنے لگے۔

''ارے بھائی، میرا مطلب ہے کہ دریکتا خیر سے سیانی ہوگئی ہے، اب اس کی شادی کے بارے میں بھی سوچا ہے کہ نہیں ؟'' اب کے انہوں نے کھل کے اپنا سوال دُہرایا۔

''ابھی تو پڑھ رہی ہے، جب تعلیم سے فارغ ہوگی تو دیکھا جائے گا۔'' عمر نے سکون سے جواب دیا۔

''بیٹیاں سیانی ہو جائیں اور جب رشتے بھی موجود ہوں تو اس فریضے کو جلدی ادا کر لینا چاہیے۔'' یہ ہارون بھائی بولے تھے۔

''کرلوں گا پہلے پڑھ لکھ تو جائے۔'' عمر نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

''کوئی منگنی وغیرہ......کوئی بات تو پکی کرلو۔ پڑھائی کا کیا ہے بعد میں چلتی رہے گی۔ دریکتا کے لیے کون سا رشتوں کی کمی ہے، اپنا اسجد ہے، دیکھا بھالا ہے وہ بھی ابھی پڑھ رہا ہے، تعلیم مکمل ہونے پہ شادی ہو جائے گی۔'' نوید بھائی کی بات اتنی مشکل نہیں تھی کہ عمر کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اب ہارون بھائی بھی بول پڑے......

''قاسم بھی تو ہے اسجد سے بڑا ہے، لائق فائق ہے پھر عمر جس بھتیجے کو بھی اپنی بیٹی کے لیے پسند کر لے۔''

''ہاں تم...لوگ ٹھیک کہہ رہے ہو۔ شاہ زیب اور دریکتا کی شادی خاندان میں ہی ہونی چاہیے۔ رشتے اپنے خاندان میں موجود ہوں تو باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ گھر کی دولت وعزت گھر میں ہی رہے تو اچھا ہے۔'' اورنگزیب بھائی بھی گفتگو میں شامل ہوگئے۔ عمر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے......سو چپ ہو کے ہر بات پہ سر ہلاتے رہے۔

☆☆☆

سب سے زیادہ شاہ زیب یہاں آکر خوش تھا۔ شیریں تائی کی خصوصی توجہ و محبت اسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ یہاں آکے مائرہ سے باتیں کرنے کے بے شمار مواقع آزادی سے میسر تھے۔ کوئی پوچھنے اور دیکھنے والا نہیں تھا۔ دوپہر میں مائرہ کے ساتھ وہ متروک ڈیرے کی طرف نکل گیا۔ اتنے دنوں کی بے تابیاں اکٹھی تھیں۔ جذبوں کو اظہار اور قبولیت کا راستہ مل رہا تھا اور مائرہ حوصلہ افزائی بھی کر رہی تھی پر ایسے جیسے کسی پیاسے کو کنویں کے پاس لا کر کھڑا کر دیا جائے اور پانی پینے بھی نہ دیا جائے۔ عجیب اختیار اور بے اختیاری تھی۔

''کب بات کریں گے عمر چچا سے؟'' وہ امید کے دیے جلائے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''بہت جلد کرلوں گا تم فکر نہ کرو۔ پہلے پپا کا موڈ دیکھوں گا اس کے بعد دیکھوں گا کہ یہ بات کس طرح کی جائے۔''

''آپ تو کہہ رہے تھے کہ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے اور اب کہہ رہے ہیں کہ موڈ دیکھ کر بات کروں گا۔'' وہ نروٹھے پن سے گویا ہوئی تو شاہ زیب پریشان ہوگیا۔ مائرہ کے ماتھے کے بل جیسے اس کی جان نکال لیتے تھے۔ ایسا ہی جنونی اور انتہا پسند تھا وہ اپنے جذبوں میں۔

''اچھا ناں جلد ہی بات کروں گا۔ صبر نہیں ہو رہا ہے کیا؟'' وہ شرارت پر اتر آیا۔

''میں تو صبر ہی کر رہی ہوں آپ سے ڈر لگتا ہے کہ آپ کی بے صبری و بے قراری مجھے کسی مشکل میں نہ ڈال دے۔'' وہ بڑے ناز سے ابرو چڑھا کر نشیلی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تمہاری عزت مجھے ہر چیز سے پیاری ہے، کبھی آنچ نہیں آنے دوں گا۔'' یک لخت وہ سنجیدہ ہوگیا۔

''تو پھر چلیں گھر، ایسا نہ ہو کہ اعلانِ گمشدگی نشر ہو رہا ہو۔'' مائرہ کے احساس دلانے پر اسے وقت گزرنے کا احساس ہوا تو وہ چونک گیا۔

''اچھا آؤ گھر چلیں۔''

''اگر کسی نے پوچھ لیا کہ کہاں گئے تھے تو کیا کہیں گے؟'' وہ اسے امتحان میں ڈالنے والے سوال کر رہی تھی۔

''کہہ دوں گا کچھ نہ کچھ..... آؤ چلیں۔'' شاہ زیب نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ مائرہ نے بلا جھجک اپنا ہاتھ اسے تھمایا۔ شاہ زیب کی نگاہوں میں محبت کے ان گنت رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ مائرہ نے نظریں چرالیں۔

☆☆☆

دو دن گزر چکے تھے، تیسرے دن عمر نے واپسی کا قصد کیا تو دریکتا بھی اس کے ساتھ تیار ہوگئی۔ شاہ زیب کا موڈ کچھ دن مزید رکنے کا تھا اس لیے دونوں باپ بیٹی واپس آگئے۔ پپا اسے کچھ پریشان، پریشان سے لگ رہے تھے مگر پوچھنے پر وہ ٹال گئے۔ اس نے بھی جرح نہیں کی۔ شاہ زیب کی طرف سے ایک الجھن سی تھی۔ کہاں تو وہ گاؤں کا نام سننا پسند نہیں کرتا تھا اور اب اُدھر رکنے کے لیے بے قرار تھا۔ اس کی بے قراری کا سبب دریکتا اچھی طرح جان گئی تھی، سبب بڑا مضبوط تھا۔ مائرہ ہی وجہ تھی جو وہ اُدھر رک گیا تھا۔ دریکتا جانتی اور دیکھتی تھی، عمر اس سے لاعلم تھے۔ وہ تو شاہ زیب اور مائرہ کی بڑھتی دلچسپی سے بھی واقف نہیں تھے۔ دریکتا حساس فطرت کی تھی بہت سی باتیں خود ہی محسوس کر لیتی تھی پھر دل ہی دل میں کڑھتی تھی۔ مائرہ کی جب سے شاہ زیب میں دلچسپی بڑھنی شروع ہوئی تب سے مائرہ کی بات چیت اس سے بہت کم ہو کر رہ گئی تھی۔ زیادہ تر وہ اپنے کمرے میں ہی بند رہتی۔ اس تبدیلی سے بھی وہ اپ سیٹ تھی۔ حالانکہ مائرہ کے یہاں آنے پر سب سے زیادہ خوشی اسی کو ہوئی تھی اور اب مائرہ ہی اسے اگنور کر رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کیوں ایسا کر رہی تھی، دریکتا مسلسل اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش میں تھی۔

☆☆☆

آفس سے واپسی پر عمر اپنے دوست طاہر لغاری کی طرف چلے گئے۔ ان کے ذہن پر بہت بوجھ تھا۔ اپنا ہر مسئلہ وہ طاہر سے ڈسکس کر لیتے تھے۔ عمر کے حالاتِ زندگی اور خاندان سے طاہر اچھی طرح واقف تھے۔ عمر بھی اس پر بے پناہ اعتبار کرتے تھے۔ راحیلہ کے ساتھ عمر کی شادی میں طاہر ہی پیش، پیش رہے تھے۔ طاہر لغاری کے ساتھ ان کے مضبوط دوستانہ گھریلو تعلقات بھی تھے۔ ان مضبوط تعلقات کی ایک وجہ کچھ ملتی جلتی باتیں بھی تھیں۔ طاہر کی بیوی بھی ایک حادثے میں اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ ایسی ہی کیفیت اور مسئلہ عمر کے ساتھ بھی تھا سوان کے خیالات میں بھی کافی حد تک ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔

گاؤں سے واپسی کے بعد عمر کے پاس کافی باتیں جمع ہوگئی تھیں جو اُن کے خیال میں طاہر سے ڈسکس کرنا ضروری تھیں۔

طاہر لغاری عمر زیب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

''بڑے دن بعد چکر لگایا ہے۔'' وہ عمر سے گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے۔

''سات دن ہی تو ہوئے ہیں، اتنا زیادہ وقت تو نہیں گزرا۔'' وہ پھیکے سے انداز میں زبردستی مسکرائے۔

''کیا بات ہے، کچھ آپ سیٹ لگ رہے ہو؟'' طاہر فوراً تاڑ گئے کہ کوئی بات ہے۔

''ہاں، میں گاؤں گیا ہوا تھا۔ دو دن رہ کر آ رہا ہوں۔'' انہوں نے بات کا آغاز کیا۔

''یہ تو اچھی بات ہے تم گاؤں گئے تھے مگر تمہیں تو خوش نظر آنا چاہیے، اپنوں سے مل کر تو تمہاری خوشی کئی گنا بڑھ جاتی ہے لیکن تم آج خوش نظر نہیں آ رہے ہو، کیا بات ہے؟''

''نہیں طاہر، خوش تو ہوں......'' وہ بولتے، بولتے رک گئے۔ طاہر اس دوران اسے دیکھتے رہے کہ وہ خود سے ہی کوئی بات کرے۔ ''طاہر میرے بھائی کہہ رہے ہیں کہ مجھے شاہ زیب اور دریکتا کا رشتہ

صبح تا شام

نہ کسی دریچے سے دے صدا
نہ بلا مجھے کسی بام سے
میں نکل گیا تیری صبح سے
میں چلا گیا تیری شام سے
کبھی عشق کرتا ہے یہ معجزہ
تیرے شہر کے سبھی بے وفا
مجھے سوچتے تیرے روپ سے
تجھے جانتے میرے نام سے
میں جو تیرے دام میں آگیا
میرے واسطے وہ کمال تھا
میرے واسطے یہ ملال ہے
جو نکل گیا تیرے دام سے
تیرے شہرِ دل کو انہوں نے
آ کے بہت ہی خاص بنا دیا
یہ جو لوگ ہیں بڑے مست سے
یہ جو لوگ ہیں بڑے عام سے
میری کیا مجال کہ میں تمہیں
کبھی اپنے گھر میں بلا سکوں
یونہی جھانک لینا ذرا سا تم
اِدھر آؤ گر کسی کام سے
تیرے حسن کا جو اسیر ہے
یہ ضیاؔ وہی تو فقیر ہے
کبھی سوچنا بھی نہ چھوڑنے کا
یہ قیدی زلف کے دام سے

کلام: شبانہ ضیاؔ

انتخاب: مہوش جواد، چوک اعظم لیہ

خاندان میں ہی طے کرنا چاہیے۔ اورنگزیب بھائی نے کہا ہے کہ خاندان کی عزت اور دولت خاندان میں ہی رہنی چاہیے۔ سچ پوچھو تو میں اس بات پر پریشان ہوں۔ جانے کیوں میرے دماغ میں بری، بری باتیں جنم لے رہی ہیں، خاص طور پر ان کی یہ بات میرے ذہن میں اٹک کر گئی ہے خاندان کی عزت اور دولت والی۔''

''ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو، سب کے رویے پرکھو اور اس کے بعد جو فیصلہ کرنا ہے وہ کرو۔'' طاہر نے صائب مشورہ دیا۔

''تمہیں تو معلوم ہے میری دوسری شادی کے بعد پورے خاندان نے مجھ سے ملنا ملانا اور آنا جانا ختم کر دیا تھا۔ میں خود ہی ڈھیٹ بن کے جاتا رہا، اپنے بچوں سے ہر بات چھپائی تاکہ نفرت کے شعلے کہیں ان کے دامن کو جلا نہ دیں۔ درمیان میں بھائیوں اور بھابیوں کے تلخ رویوں کی وجہ سے کافی عرصہ گاؤں جانے کی جرأت ہی نہیں کر سکا اور نہ ہی ادھر سے کبھی کسی نے آ کر میرا حال احوال پوچھنے کی ضرورت سمجھی۔ اتنے عرصے بعد گاؤں گیا تو اپنے بچوں کو لے گیا۔ سب نے ٹھیک طریقے سے بات چیت کی لیکن اب ایک دم سے بچوں کے رشتے کی بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی ہے، کہاں تو کوئی مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا اور کہاں اب بچوں کے رشتے طے کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میرے بچے ہی میرے لیے سب کچھ ہیں، میں نے اپنوں کی نفرتیں اور بیگانگی سہی ہے، نہیں چاہتا ان کا نشانہ میری اولاد بنے۔'' بولتے، بولتے عمر جذباتی ہو گئے اور آواز بھی بھرا گئی تو طاہر نے اپنا بازو ان کے گرد حمائل کر دیا۔

''فی الحال تم خاموش رہو اور صرف دیکھو...... تمہاری اولاد ہے، تمہیں اپنی اولاد کے معاملے میں پورا اختیار اور فیصلے کرنے کی آزادی ہے، جہاں تمہارا دل چاہے ان کے مستقبل کا فیصلہ کرو اور پریشان مت ہو، مرد بنو یار...... کیا عورتوں کی طرح آنسوے بہانا شروع کر دیے ہیں۔'' طاہر نے جان بوجھ کر طنز کیا اور واقعی عمر نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا پھر کچھ دیر اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

مائرہ چھٹیوں کے بعد گاؤں سے آ گئی تھی اور شاہ زیب پر زور دے رہی تھی کہ عمر چچا سے اپنے اور اس کے رشتے کی بات کرے کیونکہ بینا خالہ بھی اپنے بیٹے باسط کے لیے اس کا رشتہ مانگ رہی تھیں۔ باسط، مائرہ کا ہی ہم عمر تھا۔ بینا کی بڑی آرزو تھی کہ مائرہ اس کی بہو بنے مگر شیریں کا ارادہ کچھ اور تھا۔ اس کی نگاہ شاہ زیب پر تھی۔ اِدھر مائرہ نے باسط کے رشتے کا بتا کر شاہ زیب کو پریشان کر دیا تھا۔

''میں آج پپا سے بات کرتا ہوں۔'' وہ مائرہ کو تسلی دے کر پپا کے بیڈ روم کی طرف آ گیا مگر وہ وہاں نہیں تھے۔ معاً اسے یاد آیا کہ اس وقت وہ اسٹڈی روم میں ہوں گے۔ اس نے اُدھر کا ہی رخ کیا، وہ مطالعے میں مگن تھے۔ شاہ زیب ان کے سامنے رکا تو وہ چونک گئے۔ جانے کیا بات تھی جو اس وقت وہ ان کے پاس آیا کیونکہ جب وہ اسٹڈی میں ہوتے تو سختی سے کہتے کہ مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ شاہ زیب کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی اور اضطراب تھا۔ عمر پریشان ہو گئے اور کتاب بند کر کے رکھ دی۔

''پپا آپ سے ایک بات کرنی ہے۔'' وہ کہتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار ہونے لگا۔

''خیریت تو ہے اس وقت کون سی بات کرنی ہے جو تم نے صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا اور کہتے ہوئے گھبرا بھی رہے ہو۔''

''پپا میں مائرہ سے محبت کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے اپنا تمام تر حوصلہ جمع کر کے کہہ ہی دیا۔ عمر حیران، حیران نگاہوں سے اپنے بیٹے کو تکتے رہ گئے جیسے یہ توقع نہ کر رہے ہوں کہ وہ یہ بات بھی کر سکتا ہے۔

(باقی آئندہ)



سرکس والی

اُمِ ثمامہ

سائیکل پر چلنے والے چھنو کے پیر بڑی تیزی سے حرکت کر رہے تھے...... اور ساتھ، ساتھ شائقین کے تالیاں بجاتے ہاتھوں میں گویا بجلی بھر گئی تھی، دیکھنے والی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹ رہی تھیں اور سانس ساکن تھی...... نائیلون کی پتلی سی رسی پر وہ بڑے مزے سے سائیکل چلا رہی تھی اس خوف سے بالاتر کہ وہ نیچے گر جائے گی......

وہ ایسی ہی تھی، ہر خوف سے بے نیاز، خوب

صورت، نڈر...... اسی لیے وہ سارے سرکس کی جان تھی۔ اس کا ہر آئٹم، ہر دفعہ نیا اور خطرناک ہوتا تھا اور سرکس کا بیسٹ سیلر آئٹم بھی...... رسی بری طرح ہل رہی تھی، اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے تو تالیوں کے شور سے کان پھٹنے لگے۔ چھنو کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب اسے ڈر کو ڈرا کر مزہ آتا تھا۔

☆☆☆

''لے روٹی کھالے...... بد جات سارا وخت بیٹھے، بیٹھے روٹیاں توڑے ہے۔'' سوکھی روٹی، پتلا سا شوربہ اور ایک ادکھائی بوٹی، اس نے پلیٹ کی طرف سرسری سی نگاہ ڈالی اور اسے ہاتھ سے پرے کھسکا دیا۔

''کم بکھت کے نخرے تو دیکھو جیسے آسمان کی پری ہووے...... ابھی بتاتی ہوں، ہم اتی محنت کر کے روجی کماتے ہیں اور یہ ایسے ٹھوکریں مارے اے......''

اس سے پہلے کہ وہ جھگی سے نکل کر بھاگتی، کپڑے دھونے والا ڈنڈا اس کی کمر پر پورے زور سے آ کر لگا اور سارے بدن میں یک دم انگارے بھر گئے...... ہزار ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں پھر بھی وہ نہ روئی نہ رکی کیونکہ اسے بھوکا رہنا قبول تھا مگر وہ جھوٹا نہیں کھا سکتی تھی۔

ابا میلوں ٹھیلوں میں پتلی تماشا دکھایا کرتا تھا مگر اب خواجہ سراؤں کے آئٹم نے بے جان پتلیوں کی اہمیت ختم کر دی تھی، اس لیے ابا نے انہیں ایک بڑے سے صندوق میں بند کر دیا تھا۔ وہ کبھی، کبھی انہیں صندوق سے باہر نکالتی، صاف کرتی، ان کی ڈوریاں اپنے ننھے، ننھے ہاتھوں میں تھام کر انہیں نچاتی، اسے ان پتلیوں سے اپنی ماں کی خوشبو آتی تھی۔ وہ ساری کی ساری اس کی ماں نے اپنے ہاتھوں سے بنائی تھیں۔ اسے اپنی ماں کی ہلکی مگر محبت بھری شبیہہ یاد تھی۔

''ارے کم جات کہاں مر گئی؟'' ڈوریوں میں پھنسے ہاتھ ایک لمحے کو کانپے...... ''ایک دن تیرے سمیت ان کو جمین میں گاڑ دوں گی...... غجب خدا کا، کیا وخت ہو گیا، سارا کام نوں کا نوں پڑا ہووے۔'' اس نے جلدی، جلدی انہیں صندوق میں رکھا اور صندوق کو چارپائی کے نیچے، پیچھے دھکیل دیا۔ وہ بھول گئی تھی کہ فی الحال اس کی اپنی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔

☆☆☆

''ارے چھنو تو نے تو کمال کر دیا۔ مارے سرکس کی آدھی کمائی تو تیرے اس آئٹم کی وجہ سے ہووے ہے، اچھا کیا جو تو نے سرکس میں آنے کا پھیسلہ کر لیا، تیرے اندر جادو ہے، تھارے جیسی پاور پھل چھوری میں نے آج تک نہیں دیکھی اور پھر تو سب سے ہٹ کر ہے...... ساباس یونہی دل لگا کر کام کرتی جا......'' سرکس کے مالک نے اسے ہرے نیلے نوٹ پکڑاتے ہوئے دانت نکالے۔

''سکریہ صاحب، جندگی میں کچھ تو کرنا تھا پھر جندگی سے کھیل ہی سہی......'' چھنو ہلکی سی ہنسی، ہنستی ہوئی خیمے سے باہر نکل آئی۔

''ارے کہاں چل دی رانی...... رسی پر تو بڑے کرتب دکھاوے ہے کبھی مارے دل کے تاروں سے بھی چھیڑ چھاڑ کر لیا کر۔'' موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے والے مراد نے خیمے سے باہر نکلتی چھنو کو دیکھ کر آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

''تجھے کتنی ٹیم بولا ہے مارے رستے میں مت آیا کر، مکھی پھرتا ہے مارا...... چھنو میلے کی مٹھائی نہیں ہے۔'' اس نے نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے اتا گسہ کاہے کو کرے ہے......''

''چل ہٹ ورنہ کسم سے روج، روج کی ٹینسن کھتم کر دوں گی میں۔''

''ارے رانی دیکھ تو بھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہے اور اپن بھی موت کے گرد چکر

لگا تا اے، اپن دونوں کی جوڑی ایک دم چکا چک لگے گی، بول تو آ کر تیرے ابا سے بات کروں ہے' وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔

''نامراد، مارے کو لگے تیرا دماگ پھر گیا اے..... اپنی اوقات دیکھی ہے تونے' نوٹوں کا پہاڑ ہے تیرے پاس جو چلا ہے ابا سے بات کرنے۔ تھارے کو ماری پھکر کرنے کی کوئی جرورت نہ ہی۔'' وہ نوٹوں کو اپنے ٹراؤزر میں اڑستے ہوئے سائڈ سے نکل گئی۔ خیمے کے پیچھے سے دو آنکھوں نے دیر تک اور دور تک اس کے قدموں کا پیچھا کیا۔

☆☆☆

''چھنو آج تو بہت کھوب صورت لگے ہے.....'' گلابی جوڑے میں گلابی ہوئی چھنو کو دیکھ کر بادشاہ نے شاہانہ انداز میں کہا۔

''چل ہٹ، آیا بڑا۔ مارے کو سب پتا ہے سو کے درمیان تو سامنے بیٹھی جانانیوں سے آنکھ مٹکا کرے ہے۔'' اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔

''کسم لے، لے جو تھارے سوا کبھی کسی کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھا ہو۔''

''تو مارے سے اِتا پیار کرے ہے؟'' چھنو کی آنکھوں میں پیار ہی پیار تھا۔

''تھارے بغیر تو بادشاہ جندا ہی نہ رہ سکے۔'' اس نے چھنو کا سفید اور نرم ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''اچھا اب جیادہ ہیرو گیری مت کر، چل کچھ کھاتے ہیں، میں صبح یونہی بھوکی ہی گھر سے آ گئی تھی۔''

چھنو اور بادشاہ دونوں سمندر کے کنارے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ٹھنڈی ریت پر قدم سے قدم ملا کر خوابوں کے انجانے نگر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

رات چھنو کو جو پیسے ملے تھے اس نے آدھے آج خرچ کر لینے تھے اور آدھے اس نے ماں کے ہاتھ میں رکھ دیے تھے اور اب چار، چھ دن تک اسے چھنو کے کسی کام سے کوئی غرض نہیں ہونی تھی۔

سمندر کے کنارے نارنجی گولے نے ڈوبنے کی تیاری پکڑی تو وہ دونوں بھی بستی کی طرف روانہ ہوئے۔ بھیگی ریت کے ذروں اور سورج کی پیلی' نارنجی کرنوں نے آنے جانے والی لہروں کے کان میں جانے کیا سرگوشی کی۔ سُبک اور نرم بھیگی ہوا نے دونوں کو الوداع کہا اور رات نے تاروں سے سجے گھونگٹ کو شام کے چہرے پر ڈال دیا۔

☆☆☆

''تھارے کو پتا اے گٹو' آدمی اور جناور میں پھرک ہووے اے.....'' گٹو نے برگر کا بڑا سا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی بات کا مطلب پوچھا۔

وہ جب بھی باہر جاتی' آتے ہوئے گٹو کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کھانے کو لاتی تھی۔ سارے سرکس میں وہ واحد تھا جس سے وہ اپنے دل کی ہر بات کہہ لیتی تھی۔

''کبھی، کبھی مارے کو یوں پھکر ہووے کہ جیسے بادشاہ مارے کو بندریا سمجھے جو پیار کی ڈگڈگی پر ناچ رہی ہو۔''

''تو ایسا کیوں سوچے اے' بادشاہ تو تجھ سے بڑا پیار کرے ہے..... تو ایسا سوچ کر فضول میں اپنا مغز خراب کرتی ہے۔ بادشاہ تو تجھ سے بڑا پیار کرے.....''

''پر گٹو، جانے کیوں مارے کو اس کی آنکھوں میں وہ پیار نجر نہ آوے جو مارے روم، روم میں بسے ہے۔''

''چل چھوڑ' بلا وجہ اپنے دل میں وہم ڈالنے کی کیا جرورت ..... تو کھود اتنی پیاری اے' وہ کاہے کو تھارے سے پیار نہ کرے۔ تو دل میلا نہ کر۔ چل اب جا کر سو جا صبح تو تیرا اتا مسکل آئٹم ہے، ٹھیک سے سوئی نہیں تو آئٹم میں مجا نہ آوے گا۔''

کولڈ ڈرنک کے آخری گھونٹ پی کر وہ دیوار سے نیچے کود گیا..... چھنو سے باتیں کرنے کے لیے اسے دیوار پر چڑھ کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ وہ جانے کب

سے سرکس میں تھا......غربت اور جہالت نے اسے آج ایک تماشا بنا دیا تھا اس کا قد ڈھائی فٹ تھا اور اس کے پیدائشی تین ہاتھ تھے یعنی دو صحیح دائیں کہنی سے ایک اور ہاتھ نکلتا ہوا اور جوکروں کی پارٹی میں وہ سب سے زیادہ مقبول تھا۔

سرکس کے خیموں، جھولوں کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ موت کے کنویں کے پاس پہنچی تو اس نے غصے اور نفرت سے مراد کے بارے میں سوچا۔

اسے وہ شروع سے ہی بہت برا لگتا تھا۔ وہ مست چال چلتی اپنی جھگی میں داخل ہوئی مگر دو آنکھیں اب بھی جھگی کے ہلتے ہوئے میلے پردے کو تک رہی تھیں اس بات سے بے خبر کہ محبت کا انجام خاک میں ملنا ہی ٹھہرا ہے۔

☆☆☆

''بادشاہ اِدھر آ......'' صبح، صبح چڑیوں کی چہکار کے ساتھ، ساتھ سرکس بھی بیدار ہو چکا تھا، جانوروں اور انسانوں کی ملی جلی آوازیں دن کا حصہ بنتی جا رہی تھیں۔ وہ نلکے کے پاس بیٹھا منہ ہاتھ دھو رہا تھا کہ مراد نے اسے آواز دی۔

چھنو کو اس کا مراد سے ملنا پسند نہیں تھا مگر وہ اپنے شوق کے ہاتھوں مجبور تھا اس لیے کبھی کبھار وہ سرکس کے باہر اس سے مل لیتا تھا۔

بادشاہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے سمجھایا کہ تُو چل میں آتا ہوں، شیو بناتے ہوئے اس نے چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چھنو کی آنکھیں ہر وقت اسی کے آس پاس ڈولتی رہتی ہیں۔

قدرت نے بڑی فیاضی سے اسے مردانہ وجاہت کی دولت دی تھی جسے وہ اپنی تیاری سے چار چاند لگا لیتا تھا۔ بس اسے ایک ہی جنون تھا فلموں میں کام کرنے کا جنون، وہ اپنے آپ کو پیدائشی ہیرو سمجھتا تھا، فلم نگری میں کافی متھا ماری کے بعد اس نے آخر تھک کر ابا کے کہنے پر سرکس میں کام کر لیا تھا۔ یہاں بھی ایسے آئٹم سونگ کرنے کو مل جاتے تھے جس سے اس کے شوق کو کہیں نہ کہیں تسکین مل جاتی تھی۔

اسٹیل کے بڑے، بڑے رنگز کے چاروں طرف آگ بھڑک رہی تھی، آگ اور جوانی کے کھیل کو دیکھنے کے لیے بڑے ٹکٹ سیل ہوئے تھے۔ شو ہاؤس فل تھا۔ پردہ اٹھنے والا تھا۔

آگ کے جلتے ہوئے گول، گول دائروں میں چھنو بڑے اطمینان سے سائیکل چلا رہی تھی، آگ کی گرمائش اس کے جلتے وجود پر ٹھنڈے چھینٹے ڈال رہی تھی سب کی نظریں اس پر گڑی ہوئی تھیں جیسے ہی اس نے ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلانی شروع کی سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا، چھنو کی نظر پیڈل پر جمی ہوئی تھی مگر وہ وقت کے پہیے کو الٹا پھرتا دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

''ہائے غضب ہو گیا، میں لٹ گیا، برباد ہو گیا۔'' رونے پیٹنے کی آواز سے اچانک ننھی چھنو کی آنکھ کھلی اسے ایک دم کچھ سمجھ نہیں آیا۔ چھوٹی سی جھگی لوگوں سے بھری پڑی تھی۔

ابا، اماں کی چارپائی کے پاس بیٹھا بین کر رہا تھا اماں کے اوپر اِک پھولوں والی میلی سی چادر ڈلی ہوئی تھی۔ چند گھنٹوں بعد وہ چارپائی جہاں اس کی ماں لیٹتی تھی خالی ہو گئی تھی۔ اس کی ماں کبھی اٹھتی کبھی بیٹھتی، کبھی کھانستی جانے اسے کیا بے چینی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ اسے خون کا کینسر تھا۔

وہ پیار سے چھنو کو اپنے پاس بٹھا لیتی، دنیا کی اونچ نیچ بتاتی، گھر کے کاموں کے بارے میں سکھاتی اور کبھی جو اس کی طبیعت کچھ ٹھیک ہوتی تو وہ اپنے ہاتھوں سے اسے سوجی کا حلوا بنا کر کھلاتی، اس کے بال بناتی، اسے تیلی تماشا دکھاتی......مگر ایسا کم، کم ہوتا تھا۔ زیادہ تر وہ نڈھال پڑی رہتی اور ابا اس سے بیزار باہر گھومتا رہتا۔ اماں کے بعد چھنو کو جھگی کاٹنے کو آتی تھی، وہ اماں کی اکلوتی اولاد تھی مگر ابا نے کبھی اس

پر توجہ نہیں دی تھی وہ شاید اسے بھی بے جان پتلی سمجھتا تھا۔ پھر ایک دن ابا نے اسے بڑے دلار سے اپنے پاس بلایا اور گود میں اٹھا کر باہر لے گیا...... بازار سے اسے نئی فراک دلائی اور بہت ساری میٹھی ٹافیاں بھی، چھنو کو ابا آج بہت بدلا، بدلا اور اچھا لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسے واپس جھگی میں لے آیا، اماں کی چارپائی پر ایک لال گٹھڑی دھری تھی...... مگر اس کا چہرہ بھی تھا۔

''اے چھنو، یہ تیری نئی اماں اے، چل جا کر سلام کر......'' ابا نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

فراک کے رنگ اور مٹھی میں دبی ہوئی ٹافیوں کی خوشی دونوں یک دم ماند پڑ گئے۔ وہ جلدی سے جھگی سے باہر بھاگ گئی۔

''نواب جادی چل اٹھ کر برتن مانجھ۔ میں تھارے باپ کی نکرانی نہیں کہ سارے کام کرتی رہوں۔'' سوئی ہوئی چھنو کو کسی نے بے دردی سے جھنجوڑ ڈالا۔

''مگر مارے کو برتن دھونے نئیں آتے......'' آنکھیں مسلتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

''حرام کھور مارے سے جبان چلائے اے...... تھارے جتنی چھوریاں سب کام کرے، کرے گی تو کھود آ جاوے گا...... میں اپنی اماں کی طرف جا رہی ہوں، ماری واپسی تک سارا کام کر کے رکھنا ورنہ......''

ایک تھپڑ پھول سے گال پر پڑا اور اسے لگا وہاں آگ سی لگ گئی ہو...... پہلی بار چھنو درد سے آشنا ہوئی اور پھر ہوتی چلی گئی۔ کبھی پیاز کاٹتے چھوٹی، چھوٹی انگلیاں کٹ جاتیں، کبھی لکڑیاں جلاتے بازو جل جاتا، کبھی کپڑے دھوتے، دھوتے کمر اکڑ جاتی پھر آہستہ، آہستہ چھنو کو درد اچھا لگنے لگا وہ ذرا اور درد سے بے نیاز ہوتی چلی گئی اور پھر سولھویں سال اس نے سرکس میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہر سال ان کی جھگیوں کے

پاس میدان میں بڑا سرکس لگا کرتا تھا۔
"ابا میں سرکس میں کام کرنا چاہتی ہوں۔"
رات کو بلا جھجک اس نے سب کے سامنے یہ بات کہہ دی کہ اب وہ کسی سے نہیں ڈرتی تھی۔
"تیرا مگج کھراب ہوگیا ہے کیا، منہ کالا کروائے گی مارا....." اماں چلّائی۔
"میں نے کہہ دیا ہے، میں کل مالک سے بات کرلوں گی، میں نے ابا کو بتانا تھا، بتادیا۔"
"حرام کھور، جلیل کہیں کی، کیسے منہ کو آوے ہے۔"
"چل چھوڑ کرنے دے جو کرتی ہے، چار پیسے ہی گھر میں آویں گے، میں تو اب بڈھا ہوگیا ہوں اور تو نے جبان چلانے کے علاوہ کیا، کیا ہے۔"
"دیکھ چھنو کے ابا تھارے کو جمانے کا کج نئی پتا..... جوان چھوری ہے، کوئی گلطی ہوگئی تو جندگی بھر روئے گا۔ اڑنے سے پہلے اس کے پر کاٹ دے۔ مارا چاچا منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہے۔ ساری جندگی عیس کرے گی ہاں۔" اس نے نزدیک ہوتے ہوئے کہا۔
"چل ہٹ چنڈال، مارے کو سب پتا ہے وہ تھارا چاچا نئی یار ہووئے..... ماری تو کسمت پھوٹی تھی تھارے جیسی بانجھ کو بیاہ لایا، ایک بچہ تو دے نہ سکی مارے کو مسورہ دینے چلی ہے۔ مارے کو بیٹے کا کتنا سوق تھا مگر تو، تو گھاٹے کا سودا نکلی۔ تھارے باپ نے اتے پیسے لیے مارے سے۔" چھنو کے باپ نے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر پیسوں کی مقدار بتائی۔
چھنو کونے میں بیٹھی ساری باتیں سن رہی تھی۔ اسے پتا تھا اب اس کی ماں کچھ نہیں بولے گی۔ ایک یہی بات تو تھی جو اسے چپ لگادیتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی عورت کتنی ہی کھوب صورت اور جوان کیوں نہ ہو اگر بانجھ ہو تو مٹی برابر ہو جاتی ہے۔
"آج تو، تو نے جان نکال دی ماری۔" وہ آئٹم پورا کر کے باہر نکلی ہی تھی کہ سامنے بادشاہ چلا آیا..... چھنو نے مسکرا کر پیار سے اس کی طرف دیکھا، چھنو کی آنکھوں میں ڈر اور درد کو مات دینے کا اِک انوکھا سا نشہ ہلکورے لے رہا تھا۔
"سچ بتا تو مارے سے اتا پیار کرے، ماری اتی پھکر ہووے تھارے کو۔"
"سچ پگلی تھاری قسم....." بادشاہ نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"تو پھر ابا سے بات کرلے بادساہ..... مارے سے اب اور انتجار نہ ہووے..... میں روج، روج کی اس جنگ سے تھک گئی ہوں..... مارا بھی دل کرے ہے تو، میں اور ماری چھوٹی سی جھگی جہاں پیار ہی پیار ہووے۔" وہ یک دم سپنوں کی ڈور تھامے بہت آگے نکل گئی۔
"ہاں، ہاں تھوڑا صبر کر بلکہ مارے لیے دعا کر..... سن کل ہی مارے کو پتا لگا ہے کہ سرکس میں فلم کا یونٹ آ رہا ہے۔ انہوں نے سرکس میں کچھ شوٹ کرنے ہیں، مجھے لگتا ہے اب کے بار مارے کو چانس جرور ملے گا..... پھر تھارا بادساہ سچی کا بادساہ بن جاوے گا اور تو ماری ملکہ....."
"بادساہ تجھ کتنی بار سمجھایا ہے..... تو پھر مارے کو کہہ دلاوے، تو فلم کے منحوس کھیال کو دل سے نکال کیوں نہیں دیتا....." چھنو نے منہ پھلا کر کہا۔
"ارے ماری ملکہ تھارے باپ سے بات کرنے کے لیے بھی تو مارے کو اتے نوٹ چاہیے، تھارے کو پتا ہے پیسوں کے بگیر بیاہ کہاں ہووے اے..... اور پھر مارے کو پتا لگا تھا تھارے ابا سے تھاری ماں نے تیرے لیے اپنے پیسے والے چاچا کے لیے بات کررکھی ہے۔"
"اسے گولی مار..... چھنو اب موم کی ناک نہیں کہ جہاں چاہے موڑ لو، ابا وہی کرے گا جو میں کہوں گی..... پر تو سن لے بادساہ نوٹوں میں بڑا جور ہووے اے، یہ بوڑھے ہوتے باپ کو خرید لیویں۔" وہ دکھی ہو کر بولی۔

''اچھا آکھری بار مارے کو چانس لینے دے پھر ساری جندگی فلم کی بات نہیں کروں گا.....'' بادساہ نے اس کا ہاتھ تھام کر منت کی۔ ''تھارے کو پتا ہے مارے کو کتنا سوک اے فلم میں کام کرنے کا۔''

''میں تھارے کو آکھری بار چانس دے رہی ہوں ایسے سوک کا کیا پھائدہ جس میں صرف وخت برباد ہووے اور پھر میں ہوں ناں تھاری ہیروئن اور مارا ہیرو تو...... بادساہ میں تھارے بغیر نہ رہ سکوں۔ مارے کو یوں پھکر ہووے کہ تو اتنی بڑی فلم نگری میں جا کر کھو گیا تو چھنو کیا کرے گی، انسان پھرشتہ ناں ہووے اور پھر روشنیاں انسان کی آنکھ کا نور لے لیویں......اسے کچھ نجر نہ آوے......'' وہ بولتی جارہی تھی۔ بادشاہ کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا یا وہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

''اچھا چھوڑ کیا باتیں کرے ہے تو بھی، مارے آٹم کا وخت ہو رہا ہے سام کو ملیں گے۔''

چھنو عجیب سی نظروں سے دور جاتے ہوئے بادشاہ کو دیکھتی رہی۔لحہ، لمحہ وہ اس سے دور ہوتا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ دور میدان میں دو آنکھوں نے محبت اور اداسی میں لپٹا یہ سارا منظر دیکھا اور چھنو کی آنکھوں سے گرنے والے دو انمول موتی بھی جو نیچے گر کر مٹی میں مل گئے تھے۔

''میڈم جی آپ مجھے فلم میں کوئی بھی رول دلوا دو کسم سے میں جان توڑ محنت کروں گا۔ اور ثابت کر دکھاؤں گا کہ اداکاری مارے خون میں شامل ہے۔''

اسے مراد نے بتایا تھا کہ یونٹ کے ساتھ آنے والی ہیروئن کا چاچا ہی فلم پر پیسہ لگا رہا ہے ورنہ اس درمیانے درجے کی ہیروئن کو کون پوچھتا۔

میک اپ کرواتی اِک شوخ سی ہیروئن نے نظریں اٹھا کر اچانک آجانے والے کو دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ اس کی فلم کے ہیرو سے کہیں زیادہ ہینڈسم اور خوب صورت تھا۔

''بے بی ڈارلنگ شارٹ ریڈی ہے......''

ڈائریکٹر جلدی سے کہہ کر لوکیشن پر چلا گیا۔ جہاں ہیروئن نے شیروں کے ساتھ ایک گانا پکچرائز کروانا تھا۔

''تم اسپاٹ بوائے کو اپنا نمبر لکھوا دینا یہاں سے فارغ ہو کر میں کچھ سوچوں گی۔'' وہ جانچتی اور سوچتی نظروں سے بادشاہ کو دیکھتی اندر خیمے کی طرف چل دی۔ اس کے بھڑکیلے اور فٹنگ والے لباس نے بادشاہ کی نگاہوں کو اس کے تعاقب پر اس وقت تک مجبور کیے رکھا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی، دوسرے درجے کی ہی سہی تھی تو آخر فلم نگری کی ہیروئن......

''چھنو اے چھنو......'' آج سرکس میں فلم کی شوٹنگ کی وجہ سے چھٹی تھی۔

وہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی کہ کسی نے دھیرے سے اسے آواز دی، اس نے آنکھیں مسلتے ہوئے چارپائی کی اوپر کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ آواز کا تعاقب کرتے ہوئے اس کی آنکھیں نیچے کی طرف گئیں تو وہاں گٹو کھڑا تھا۔

''ارے تو اس وخت کیا کر رہا ہے، سب خیر تو ہے ناں؟'' چھنو نے اٹھتے ہوئے اپنے سیاہ لمبے اور گھنے بالوں کو ہاتھوں سے لپیٹتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، ہاں خیر ہے، میں تھارے کو ایک بات بتانے آیا ہوں۔'' وہ پیروں میں چپل اڑس کر باہر نکلنے تک آئی، گٹو بھی اس کے ساتھ، ساتھ چل رہا تھا۔ نیند سے بوجھل آنکھوں پر پانی کی برسات ہونے لگی۔ پانی کے ننھے، ننھے قطرے شبنم کی طرح اس کے گلاب چہرے پر چمٹے ہوئے تھے۔

''کیا بات ہے گٹو تو مارے کو پریشان لگے ہے۔'' اس نے چولھا جلایا اور چائے کا پانی رکھتے ہوئے پوچھا۔ اماں، ابا بھی کہیں گئے ہوئے تھے۔

''وہ بادساہ ہے ناں......وہ......وہ۔''

''ہاں بول بھی دے کیا وہ، وہ پہ تھاری سوئی اٹک گئی ہے۔'' وہ پریشان ہو کر بولی۔

''وہ فلم والی میڈم کے آگے پیچھے پھرے

ہے......'' پانی ابلنا شروع ہو گیا تھا اس نے دودھ اور پتی ڈالی۔

''ہاں مارے کو کھبر ہووے کل ماری بات ہوئی تھی......آ کھری بار کو سس کرے ہے پھر فلم کا نام نہ لیوے گا۔''

''مگر چھنو وہ فلم والی میڈم بہت کھوب صورت اور چالاک ہے۔''

''اس دن تو، تو مارے کو سمجھاوے تھا اور اب مارے کو پھکر میں ڈالے ہے؟ ایسا کچھ نہیں ہے گٹو اور اگر اس چنڈال نے مارے بادساہ پر میلی نجر ڈالی تو میں اس کم جات کا منہ نوچ ڈالوں گی۔ اور پھر مارا بادساہ تو مجھ سے بہت پیار کرے ہے۔'' لہجے میں یقین اور بے یقینی ایک ساتھ بولتے نظر آتے تھے، چائے کپوں میں ڈل چکی تھی مگر یونہی پڑی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

''پھر بھی تو کھیال رکھنا، جمانہ بڑا اکھراب ہے، مرد انسان ہووے پھر شتہ نہ ہووے۔'' گٹو جا چکا تھا، جھگی کا میلا پردہ ہل رہا تھا، چائے کپوں میں جوں کی توں پڑی تھی۔

☆☆☆

جھگیوں کے آس پاس برگد کا ایک پرانا اور بڑا درخت تھا جس کے آس پاس ایک گول چبوترا بنا ہوا تھا، جھگیوں میں بسنے والے لوگ جب اپنی تنگ و تاریک جھگیوں سے گھبراتے یا گھر والی سے چھپ کر کوئی بات کرنی ہوتی تو برگد والے چبوترے کا رخ کرتے، اب بھی وہاں دو مرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے، برگد کے درخت پر موجود فاختہ بے چینی سے چکر لگا رہی تھی وہ چی، چی کر رہی تھی تا کہ کوئی اس کی مدد کرے، اس کا ایک انڈا گھونسلے سے گر کر ٹوٹ چکا تھا مگر وہ اس بات سے نا آشنا تھی کہ انڈا اب جڑ کر گھونسلے میں واپس نہیں آ سکتا اور پھر چبوترے پر بیٹھے دونوں انسان اپنی باتوں میں اس قدر مگن تھے کہ انہیں برگد پر ہونے والے حادثے کی خبر نہیں تھی......

''دیکھ بختو تھارے کو سب معلوم ہووے پھر بھی تو...''

''میں تھارا نکسان نہ ہونے دوں، تھارا پھائدہ چاہوں بس اب تو سودے کی بات کر لے باقی سب میں کھود سنبھال لوں گا۔''

''اچھا مارے کو کچھ سوچنے کی مہلت تو دے۔''

''نہ اب میں تھاری ایک نہ ہی سنو، تو بس دام بتا، میں تھارے کھیال سے بڑھ کر اس سے پیار کروں ہوں......''

''میں پورے ساٹھ ہجار لوں گا، بول تو بات کر۔''

''یار کچھ تو لحاج کر اتنے پیسے......تو کھود کتنے میں چھوری لایا تھا؟''

''وہ جمانہ اور تھا اور پھر تو، تو سونے کا انڈا دینے والی مرغی مانگے ہے......اب سودے والی بات آئی تو تھارے کو اتنے پیسے لگے، یہ تو یاری والی بات ہے ورنہ تھارا اور اس کا کیا جوڑ......''

''ارے میں تو مجاک کر رہا ہوں تو، تو گسہ ہو گیا، میں تھوڑے دن میں بندوبست کر کے تھارے سے ملتا ہوں۔''

فاختہ کو صبر آ گیا تھا وہ اب باقی انڈوں کے پاس بیٹھی تھی۔ دونوں آدمی چبوترے سے اٹھ کر اپنی اپنی جھگیوں کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ بوڑھا برگد اپنے کندھے جھکائے کسی اور کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

سرکس کے اسٹیج پر آج بہت چہل پہل تھی صبح سویرے سے ہی تیاری شروع ہو گئی تھی۔ ہر طرف اِک عجیب سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی جو سنتا حیران رہ جاتا، گٹو کو جیسے ہی پتا چلا وہ بھاگتا ہوا چھنو کی جھگی کی طرف گیا اس نے جلدی سے پردہ ہٹایا۔ وہ اپنا ڈریس پہن چکی تھی اور اب میک اپ کر رہی تھی۔

''تھارا مگج پھر گیا ہے کیا چھنو......جندگی روج، روج نہ ہی ملے...... مارے کو صاحب جی نے بولا

ہے میں تھارے کو سمجھاؤں...... ہم سب تھارے سے بہت پیار کرتے ہیں...... ہم تھارے کو کھونا نہیں چاوے ہیں۔''

اس نے لپ اسٹک لگانے کے بعد نیچے رکھی، وہ پتھر کا بت بنی صرف اپنا کام کررہی تھی۔ جیسے گٹو کی کوئی آواز اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہ رہی ہو۔

''سن رہی ہے، میں تھارے سے بات کروں ہوں، تو یہ آکم نہ ہی کرے گی۔'' اس نے چھنو کے نرم وملائم گلابی ہاتھ پر اپنا چھوٹا اور بھدا سا ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے کہا۔

''تو باپ لگے ہے مارا......'' چھنو نے گٹو کا ہاتھ جھٹکا اور چلا کر بولی۔

وہ سہم کر پیچھے ہٹا، اس نے آج سے پہلے چھنو کا یہ روپ نہیں دیکھا تھا۔

''تھارے کو پتا ہے گٹو عسق کی کوئی جات نہ ہووے...... اور محبت، یہ بڑی کم جات ہووے باندر کی طرح ہر کسی کی ڈگڈی پر ناچے، مارے کو اس سے عسق ہے...... پر تھارے کو کیا پتا عسق کیا ہووے۔'' وہ اب گالوں پر روج لگارہی تھی۔ چھنو جیسے بے خودی میں اپنے آپ سے ہی باتیں کرتی جارہی تھی۔

''عسق بندے کو جوڑے ہے پھر توڑے ہے اور پھر جوڑے ہیں وہ اسے ٹوٹ کر کھتم نہ ہونے دیوے۔''

''تو کیا بولے جارہی ہے...... ساری جندگی پڑی ہے ایک بادساہ سے جندگی کھتم نہ ہووے اے......'' گٹو قریب ہو کر بڑے پیار سے بولا۔ ''بادساہ سے کوئی بہت اچھا تھارے کو مل جاوے گا۔''

''گٹو ماری دنیا تو اسی سے سروع ہو کر اسی پر کھتم ہو جاوے ہے۔ پر مارے کو بہت تکلیپھ ہووے جیسے چھری سے اندر کچھ کٹ رہا ہو۔'' اس نے سختی سے انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے کہا۔ آنکھیں لال انگارہ ہورہی تھیں مگر ابھی

تک ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا تھا۔
''گٹو میں نے تھارے کو کہا تھا ناں...... میں اس چنڈال' بدجات کا منہ نوچ لوں گی...... جہر کھالوں گی بادساہ کو ماردوں گی......دیکھ اب وخت آنے پر چھنو کج بھی نہ کرسکی......'' وہ پھر سے خود کلامی کرنے لگی تھی۔
''گٹو ماری ماں مر گئی...... میں کج نہ کرسکی۔ مارے باپ نے دوسری سادی کرلی...... میں کج نہ کرسکی۔ نئی ماں عجاب بن کر مارے پر نا جل ہوگئی...... میں کج نہ کرسکی اور اب بادساہ مارے کو چھوڑ کر چلا گیا...... میں کج نہ کرسکی۔'' پھر یک دم وہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی' درد اس کے انگ، انگ سے ٹپک رہا تھا۔
''تو کا ہے کو تڑپے ہے اس حرام کھور بے وپھا کے لیے......ساباس اٹھ چھنو......تو کوئی باجار میں بکنے والی چیج نہ ہی تو، تو انمول ہے، مارے کو یکین ہے ایک دن بادشاہ بہت تڑپے گا، پچھتائے گا...... اس نے تھارے جیسے ہیرے کی قدر نہ ہی کی چھوٹی روسنیوں کے پیچھے چلا گیا تو کا ہے کو پھکر کرے ہے۔''
''چل گٹو شو کا ٹیم ہوگیا......'' چھنو نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا اس کے چہرے پر اب کہیں درد نظر نہیں آرہا تھا۔
''کرلے اپنی مرجی...... میں کیا لگوں تھارا جو تو ماری بات مانے۔'' گٹو غصے میں بولتا ہوا جھگی کے پردے کی طرف گیا......ایک لمحے کے لیے رکا اور مڑ کر چھنو کو دیکھا۔
''اللہ کرے بادساہ اور میڈم دونوں کو کتے کی موت آوے۔'' اس نے اپنے چھوٹے اور بھدے ہاتھ اٹھا کر بددعا دی اور جھگی سے باہر نکل گیا۔
☆☆☆
''بادشاہ تمہیں پتا ہے کہ تم کس قدر خوب صورت ہو......'' بے بی اس کے بے حد قریب بیٹھی اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
''ایسا کرتے ہیں تمہارا نام پرنس رکھ دیتے ہیں۔ بادشاہ کچھ اولڈ فیشن ہے کہو، کیسا لگا نیا نام؟''
''مارے کو کیا خبر جو آپ کو صحیح لگے ویسا کرلو۔'' وہ کچھ گھبرا کر بولا۔
بادشاہ کو لگتا اسے کوئی بڑا خزانہ مل گیا ہو' وہ تھی تو دوسرے درجے کی مگر تھی تو فلمی ہیروئن اور پھر اس کا سجا سجایا بنگلا، گاڑی، نوکر چاکر وہ کچھ گھبرایا ہوا رہتا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو...ابھی آنکھ کھلے گی اور خواب چھن سے ٹوٹ جائے گا۔
''ڈارلنگ تمہاری لک تو میں نے چینج کروی ہے۔'' اس کا اشارہ اس کے تن پر سجے برانڈڈ کپڑوں کی طرف تھا۔ ''مگر تمہیں اپنے بولنے کا اسٹائل بھی بدلنا ہوگا تاکہ میں تمہیں کسی اچھے ڈائریکٹر سے ملواسکوں، میں نے ایک لڑکے سے بات کی ہے وہ کل سے آکر تمہیں سب کچھ سکھایا کرے گا۔''
آج کل انڈسٹری میں بیوٹی کی بڑی مانگ تھی اور اس طرح کے چغد مرغے فلم میکر کو سستے پڑتے تھے...... بے بی کے خیال میں بادشاہ کا حسن وہ سیڑھی تھا جس پر وہ قدم رکھ کر دوسرے نمبر سے پہلے نمبر پر آسکتی تھی اور پھر کچھ وہ اس کے دل کو بھی بھا گیا تھا۔
دونوں کے بیچ فاصلہ کم سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ میز پر ام الخبائث سجی تھی اور چند لمحوں میں رقصِ ابلیس شروع ہونے کو تھا...... بادشاہ کو کچھ ہوش نہیں تھا اسے تو ابھی تک یہ یقین نہیں آرہا تھا کہ قسمت اس پر یوں مہربان ہوچکی ہے۔ ابھی تک فلم میں کام تو نہیں ملا تھا مگر بے بی نے چند لوگوں سے بات کرلی تھی۔ سرکس سے بے بی کے بیڈ روم تک کا سفر اِک خواب معلوم ہوتا تھا، وہ جب سے سرکس سے آیا تھا واپس نہیں گیا تھا، وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ وہاں کیا ہوا اور کتنے، کتنے طوفان آئے اور کیا کچھ برباد ہوگیا۔ آنکھوں کو خیرہ کردینے والی چمک دمک کے آگے

اسے ایک لمحے کو بھی چھنو کا خیال نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

چھنو نے اس آئٹم کے لیے بہت خوشی اور جوش سے ایک مہینے تک محنت کی تھی۔ اس نے خود مالک کو بتایا تھا کہ وہ یہ آئٹم کرنا چاہتی ہے اور یہ سرکس کا اس کا آخری آئٹم ہوگا اس کے بعد وہ اور بادشاہ شادی کرلیں گے اور وہ سرکس کو خیر باد کہہ دے گی مگر اب بہت کچھ بدل گیا تھا، آئٹم تو وہ اب بھی کررہی تھی مگر...... سب نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ وہ آئٹم ابھی نہ کرے جب اس کی دماغی حالت کچھ بہتر ہو تو یہ شو رکھ لیں گے، سارا سرکس اور ساری بستی والے اس کی اور بادشاہ کی محبت کے بارے میں جانتے تھے اور اب اس قدر کھلی بے وفائی سے بھی کوئی بے خبر نہیں تھا...... مگر اس نے کسی کی نہیں مانی تھی۔

شو کا وقت شروع ہونے والا تھا پردہ اٹھنا شروع ہوگیا تھا کتنی آنکھیں سامنے اسٹیج پر گڑی تھیں ان آنکھوں میں حیرت، خوشی اور مزے کے انتظار کی کیفیت تھی۔

مگر پردے سے ذرا پیچھے دو آنکھوں میں صرف دکھ تھا، فکر تھی اور ڈھیر ساری دعائیں تھیں، خلا میں بندھی رسی پر سائیکل کو رکھا گیا، چھنو بڑی شان سے اس پر سوار ہوئی اور پھر ایک طرف سے ایک لڑکے نے رسی کو ہلانا شروع کردی، یہی سر پھرا چھنو کا آئٹم تھا...... اسے ہلتی رسی پر سائیکل چلانی تھی اور نیچے گرنے کی صورت میں اس کی ہڈیاں تو شاید ٹوٹتیں ہی مگر اس کا اور بھی بہت نقصان ہوتا کیونکہ جہاں تک رسی کی رینج تھی وہاں تک نیچے آگ جل رہی تھی۔

سائیکل اپنا آدھا رستہ پار کرچکی تھی جھٹکوں میں جھولتا چھنو کا وجود اور ہی طرح کی آندھیوں کی زد میں تھا۔ پیڈل پر اس کے پیر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے ہر آگے بڑھنے والا قدم اسے پیچھے دھکیل رہا تھا جہاں پیار تھا، ڈر تھا......

رسی کا کھیل اور آگ کا انتقام تھا۔ سائیکل اینڈنگ پوائنٹ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ شور، تالیاں واہ، واہ کی آوازیں دور کہیں دور ہوتی جارہی تھیں بس چاروں طرف ایک ہی بازگشت تھی......

''چھنو میں تمہارے سے بہت پیار کروں ہوں...... تمہارے بغیر تو بادشاہ جندا نہ رہ سکے۔''

''یہ لے چھنو رانی تمہارے بادشاہ کی فلم دیکھ لے...... بڑا گرور تھا تمہارے کو اپنے بادشاہ کے پیار پر......'' مراد نے ایک موبائل اس کے آگے کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں اس پل دنیا بھر کی حقارت اور تذلیل صاف نظر آرہی تھی، نہ چاہتے ہوئے بھی چھنو نے موبائل کی اسکرین پر دیکھا...... بڑے دن جو ہوگئے تھے بادشاہ کو دیکھے ہوئے۔

مگر وہاں جو نظارہ تھا اس نے چھنو کے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ایک لمحے کی نظر اسے اپنی نظروں میں اپنے عشق کی نظروں میں بے مول کرگئی تھی۔

''بول رانی اب کیا کھیال ہے تمہارا...... بول تو کل ہی تمہارے باپ سے بات کروں......'' مراد نے مسکرا کر موبائل اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے چھنو سے سوال کیا۔ چھنو نے کوئی جواب نہیں دیا، چپ چاپ اپنی جھگی کی طرف چل دی...... مگر مراد مطمئن تھا اس نے اپنے حصے کا کام کردیا تھا۔ اس نے کسی طرح بادشاہ اور بے بی کے قابلِ اعتراض سین حاصل کرلیے تھے اب اسے پتا تھا کہ چھنو کچھ دن سوگ منائے گی اور بالآخر اس کی ہو ہی جائے گی۔

☆☆☆

بادشاہ نامراد واپس لوٹ آیا تھا اور اب سر اور گردن جھکائے چھنو کے سامنے بیٹھا تھا...... وہ خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

بادشاہ کو چھنو کی اجنبی نگاہوں سے وحشت ہورہی تھی...... پھر وہ اسے بتانے لگا کہ کیسے اس

بدجات پچھل پیری نے اسے ایک موٹے گنجے پیسے والے سیٹھ کے لیے ٹھکرا دیا جو پیسہ لگا کر ایک فلم بنا رہا تھا اور بے بی کو ہیروئن لینا چاہتا تھا مگر وہ بادشاہ کی جگہ اپنے بیٹے کو لینا چاہتا تھا...... اور بے بی کو بھی اپنی بقا کے لیے فلم چاہیے تھی اور پھر بادشاہ اسے پہلی نظر میں اچھا لگا تھا ایک بھرپور اور مکمل مرد...... اسے اس سے قربت کے چند پل مطلوب تھے اور وہ بادشاہ نے بڑی فیاضی سے اس کی جھولی میں ڈال دیے تھے پھر اس نے بادشاہ کو اس کی اوقات یاد دلا کر واپس سرکس کی طرف دھکیل دیا تھا۔

''چھنو کچھ تو بول...... مارے سے لڑ، مارے کو برا بھلا بول، گالیاں دے، جھگڑا کر...... مگر نوں خاموس نہ رے......''

چھنو نے نظر اٹھا کر ایک بار اور بادشاہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ در آئی یک دم اس کی آنکھوں سے دو موتی نکلے اور اس کے پھولوں والے گریبان میں جذب ہو گئے وہ کرسی سے اٹھی اور جلدی سے جھگی کا پردہ ہٹا کر باہر نکل گئی۔ خیمے سے باہر دو آنکھوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا ان آنکھوں میں چھنو کے لیے آنسو تھے درد تھا، عشق تھا......

☆☆☆

ساری بستی میں جشن کا سماں تھا، ہر طرف رنگ برنگ جھنڈیوں سے سجاوٹ کی گئی تھی اور کیوں نہ کی جاتی آج سرکس کی ہیروئن کی شادی تھی...... ہر کوئی خوش تھا کہ چلو چھنو کو سرکس اور بستی چھوڑ کر نہیں جانا پڑا تھا۔ اب اس نے ساری عمر یہیں رہنا تھا۔

بادشاہ کی میلی جھگی دو سو واٹ کے بلب سے جگ مگ کر رہی تھی اور کیوں نہ کرتی سرکس کا چاند اس کی چھوٹی سی جھگی میں آن سمایا تھا۔ چھنو آسمان سے اتری پری لگ رہی تھی، لال جوڑا اس پر بڑا سج رہا تھا۔ بادشاہ کی مرحوم ماں کا سارا زیور اس کے گورے بدن پر اپنی چھب دکھا رہا تھا۔

''چھنو تھارے کو پتا ہے میں نے اس دن کا کتنا انتجار کیا...... میں نے تھارے باپ سے پہلے ہی بات کر لی تھی...... اور اب تو مارے کو یکین بھی نہیں تھا کہ تو نوں مان جاوے گی...... ماری تو قسمت بدل گئی آج میں بہت خوس ہوں...... اب میں ساری جندگی تھارا کھیال رکھوں گا، آج سے تو راج کرے گی راج......'' چھنو کا نرم اور گلابی ہاتھ تھامتے ہوئے بولتے، بولتے بختو کو پھندا سا لگا...... اب ساٹھ سال کے بوڑھے کو اگر چھنو جیسی دلہن مل جائے تو اسے سانس رک رک کر ہی آنی تھی ناں۔

چھنو نے گھونگٹ میں سے جھانک کر دیکھا سامنے بادشاہ کا بڈھا چاچا بختو، گلے میں ہار ڈالے بیٹھا تھا اور اپنی اکھڑی سانسیں بحال کر رہا تھا۔ جوانی میں پسند کی شادی نہ ہونے کے باعث اس نے ساری زندگی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اب...... یہ چھنو کے دل کا فیصلہ نہیں تھا مگر اس فیصلے کے لیے اسے اس کے دل نے ہی مجبور کیا تھا۔ چھنو نے کبھی جھوٹا سالن نہیں کھایا تھا تو یہ تو پھر مرد کا معاملہ تھا اس نے جھوٹے اور بدکردار مرد پر اس بڈھے مرد کو فوقیت دی تھی اور جو پیسہ اس نے بادشاہ کے لیے جوڑ، جوڑ کر رکھا تھا وہ اس نے گٹو کو دے دیا تھا وہ یہاں سے فرار چاہتا تھا اور اس کے لیے اسے پیسوں کی ضرورت تھی ایک انگریز ڈاکٹر ایک بار سرکس میں آیا تھا اور اسے کہہ گیا تھا کہ اگر وہ اس کے ملک آ جائے تو ایک بہتر اور فعال زندگی گزار سکتا ہے۔

اور جو پیسہ بختو نے چھنو کے باپ کو دیا تھا اس سے وہ اس کی سوتیلی ماں پر سوتن لانے والا تھا، وہ سرکس والی تھی اور اس نے سب کو حیران کرنے والا فیصلہ کر لیا تھا۔ انتقام بھرے اس فیصلے میں درد ہی درد تھا اور اسے درد پر درد کھا کر ہی مزہ آتا تھا۔

میرا درد نہ جانے کوئی

روشانے عبدالقیوم

بارش کی رِکن من برستی بوندیں تیز بوچھاڑ میں کب بدل گئیں مجھے پتا ہی نہیں چل سکا۔ میں اپنی سوچوں میں اتنی محو تھی کہ بارش تیز ہونے کا مجھے احساس ہی نہیں ہوسکا۔ بادل گرجنے پر میں ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹی۔ بارش کی ترچھی بوندیں کھڑکی سے اندر آکر مجھے اچھا خاصا بھگوچکی تھیں۔

جانے کیوں ہر بار ہی بارش مجھے اور زیادہ اداس اور تنہا کردیتی تھی اور میں سوچتی رہ جاتی کہ کیا



یہ اسی طرح ہر دل کو بوجھل کر دیتی ہے یا صرف مجھے ہی ایسے احساس سے دوچار کرتی ہے؟

''بارش کا موسم اپنے ساتھ جانے کون، کون سی یادیں لے کر آجاتا ہے۔ یہ ابرِ رحمت ہو کر بھی ہمیں اداسیاں اور تنہائیاں کیوں دے جاتی ہے۔'' میرے ہاتھ میں موجود چائے کا بھاپ اڑاتا کپ اب ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا تو ٹھنڈی چائے کی ایک خاص کڑواہٹ میرے اندر تک اترتی چلی گئی۔

''کیوں اداس ہو؟'' فرحین آپی کی آواز پر میں نے سامنے بارش میں دھندلے نظر آتے درخت پر سے نظریں ہٹا کر ایک گہری سانس کو سینے سے آزاد کیا۔

''میں اداس تو نہیں......'' میں ان کی طرف دیکھ کر بولی۔

''تو پھر تمہاری ان خوب صورت آنکھوں میں اداسیوں نے کیوں ڈیرے ڈال رکھے ہیں؟'' انہوں نے بغور میری آنکھوں میں جھانکا۔

''میں خود نہیں جانتی۔'' میں نے انہیں ٹالا۔

''کیوں اتنا سوچتی ہو؟ مت سوچا کرو، جو ہونا ہوتا ہے اسے کوئی نہیں روک سکتا، وہ ہو کر رہتا ہے۔ تمہارے سوچنے سے چیزیں بدل نہیں جائیں گی۔ مت خود کو بلاوجہ ہلکان کیا کرو، بی اسٹرانگ اینڈ بریو......'' ان کے لہجے میں میرے لیے محبت اور فکر تھی۔

''میں خود کچھ سوچنا نہیں چاہتی......مگر یہ سب میرے اختیار میں نہیں۔ میں جتنی بھی کوشش کروں ان سوچوں سے چھٹکارا پانے کی، یہ اتنا ہی مجھ سے آکر چمٹ جاتی ہیں۔'' میرے لہجے میں بے بسی تھی۔

''تم ایک بار ان فضول سوچوں سے چھٹکارا پا کر تو دیکھو۔ دیکھنا زندگی کتنی آسان ہو جائے گی۔ کوشش کرنا تو بندے کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔'' انہوں نے مجھے تسلی دی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر سامنے تیز برستی بارش پر نظریں مرکوز کر دیں۔

وہ کمرے سے چلی گئیں۔

اکثر ہی مجھ پر قنوطیت اور دلگرفتگی کا دورہ پڑتا تھا۔ خاص کر ایسے موسم اور دوپہر کی بارش تو مجھے اور بھی تنہا اور اداس کر دیتی تھی۔

☆☆☆

صبح جلدی، جلدی تیار ہو کر ناشتا کر کے میں گھر سے کالج کے لیے نکل آئی۔ پندرہ منٹ کا پیدل کا راستہ تھا کالج تک......میں اپنی سوچ میں مگن چلی جا رہی تھی جبھی کسی گاڑی کی بریکیں لگیں بالکل میرے قریب آکر میں تو اچھل ہی پڑی۔

''میڈم! دکھائی نہیں دیتا آپ کو؟ سڑک کے عین درمیان چل رہی ہیں، مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو کہیں اور جا کر اپنا یہ شوق پورا کریں۔ ہمیں کیوں مروا رہی ہیں۔'' تقریر پوری ہوئی اور گاڑی یہ جا وہ جا۔

میں حیران و پریشان کہ یہ سب کیا ہوا۔ پوری بات مجھے کچھ دیر بعد سمجھ آئی تھی کہ میں عین سڑک کے درمیان اپنے خیالوں میں مگن چل رہی تھی۔ گاڑی والے کا غصہ بجا تھا۔ بہر حال خود کو لعنت ملامت کرتی کالج پہنچی......کلاسز کے دوران بھی میں افسردہ سی رہی۔ رہ، رہ کر اپنی غلطی یاد آرہی تھی۔ تیسرا پیریڈ فری تھا۔ میں ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر آکر بیٹھ گئی۔ جبھی شازیہ مجھے آتی دکھائی دی تھی۔

''ہماری اداس بلبل یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہے؟'' وہ دھم سے میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اس کے پیچھے زاہدہ بھی چلی آئی۔ ہم تینوں کلاس فیلوز ہونے کے ساتھ، ساتھ پڑوسی بھی تھے۔ اسی لیے ہماری بہت گہری دوستی تھی۔

''میں اداس تو نہیں۔'' میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

''پھر یہ تخلیہ کس شوق میں فرمایا جا رہا ہے؟'' وہ شرارت پر آمادہ ہوئی۔

میں خاموش رہی۔

''اچھا چھوڑو ناں اس بحث کو، یہ بتاؤ ہمیں خوش خبری کب سناؤ گی؟'' زاہدہ نے شازیہ کو ٹوک کر مجھ سے پوچھا۔
''کیسی خوش خبری؟'' میں حیران ہوئی۔
''بھئی ہمیں اچھی طرح خبر ہے کہ ہماری پیاری سہیلی کے لیے رشتوں کی لائن لگی رہتی ہے مگر افسوس کہ بیشتر تو فرحین آپی کی وجہ سے ریجیکٹ ہو جاتے ہیں لیکن ہم نے سنا ہے کہ اب کی بار جو پروپوزل آیا ہے اس پر تمہارے لیے کافی سوچ بچار کی جا رہی ہے۔'' ان کے پاس مکمل معلومات تھیں۔
''بھئی اب تم مکر نا مت...... کیونکہ رپورٹ کافی تگڑی ہے... اور باوثوق ذرائع سے آئی ہے۔ سچ، سچ بتاؤ!'' زاہدہ نے شرارت سے آنکھیں نچائیں۔ اس کے انداز پر مجھے ہنسی آ گئی۔
''ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' میں جانتی تھی یہ خبر اسے فرحین آپی نے ہی اس کے اصرار پر بتائی ہوگی۔
''جناب ایسی ہی بات ہے، تم بتانا نہ چاہو تو الگ بات ہے۔'' اس نے مصنوعی خفگی دکھائی۔
''ہک ...... ہاہ! کاش ہم بھی تمہاری طرح خوب صورت ہوتے، لوگ صبح شام سوالی بن کر ہمارے دروازے پر بھی آتے، ویسے کتنی لکی ہو تم، کتنے اچھے، اچھے پروپوزل آتے ہیں تمہارے لیے اور کتنی معصوم بھی ہو تم جو منہ سے بھاپ تک نہیں نکالتیں۔ وہ تو بھلا ہو فرحین آپی کا جو ہمیں تمہاری سہیلیاں جان کر سب کچھ بتا دیتی ہیں ورنہ تم سے تو ہمیں کسی بھلائی کی امید ہے بھی نہیں۔ تمہاری جگہ میں ہوتی ناں تو سب پر اترا، اترا کر اپنی اہمیت جتاتی۔'' شازیہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر مجھ پر رشک کا اظہار کیا۔ میرے اندر تفاخر کا کوئی احساس نہیں ابھرا۔ اس کے برعکس میرا دل بے پناہ تاسف سے بھر گیا۔
''میرے اندر کتنے سناٹے ہیں، میری ذات میں چھپی محرومیاں ان آنکھیں رکھنے والوں کو دکھائی نہیں دیتیں۔ جس بات کی میرے لیے کوئی وقعت نہیں، کوئی اہمیت نہیں، دنیا اسی حوالے سے مجھ پر رشک کرے۔ اس سے زیادہ دکھ کا مقام میرے لیے کیا ہوگا، خود کو میری بہترین دوست کہنے والیاں جب میری آنکھوں اور میری ہنسی میں چھپی اداسی کو محسوس نہیں کر سکیں تو میں گلہ کس سے کروں، کسے اپنا غمگسار بناؤں، کس سے اپنا اصل درد بیان کروں۔''
وہ اپنے آپ سے محوِ گفتگو تھی۔
''بعض دفعہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ جس چیز کی ہمیں چاہ نہیں ہوتی۔ وہ بن مانگے ہماری جھولی میں آ گرتی ہے اور یہ پاگل دنیا سمجھتی ہے کہ ہمیں ہفت اقلیم کی دولت مل گئی...... جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔'' میں حیرت و تاسف سے اپنی سہیلیوں کو اپنی تعریفوں اور رشک میں مبتلا دیکھتی اور سنتی رہتی۔ میرے پاس دنیا جہاں کی نعمتیں ہیں۔ اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے مگر پھر بھی ایک کمی ہے۔ اور اس ایک کمی نے میری ذات اور میری زندگی میں خلا سا بھر دیا ہے۔ میں ادھوری سی ہوں، ایک خالی پن سا ہے جو مجھے کسی بھی خوشی سے مکمل خوش ہونے نہیں دیتا۔ یہ کمی میری ذات کا روگ بن گئی ہے۔ کسی اور کے لیے شاید یہ ایک عام سی بات ہو مگر میرے لیے میری زندگی کا سب سے سنگین ترین مسئلہ ہے۔

☆☆☆

صبح نماز اور تلاوت کے بعد میں تھوڑی دیر کے لیے سوگئی تھی۔ میری آنکھ شور کی آواز سن کر کھلی تھی۔ میں آنکھیں رگڑتی کمرے سے نکلی۔
''میرے گھر میں میرے ہی سامنے ان احسان فراموش، بے غیرت لوگوں کا ذکر بھی مت کریں، میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔'' یہ امی کے جملے تھے جو میرے کان میں پڑے تھے۔
''جو بھی ہو چاہے سوتیلے ہی سہی مگر وہ میرے

بہن، بھائی ہیں، میری باپ کی اولاد ہیں۔ میں ان سے جدا نہیں رہ سکتا، جس طرح ناخن گوشت سے الگ نہیں ہوسکتا، اسی طرح ہم ایک ہی باپ کی اولاد اور ایک ہی خون ہیں۔'' امی کی بات کے جواب میں ابو غصے سے بولے تھے۔

''ساری زندگی انہوں نے میرا حق ہی چھینا ہے، پال پوس کر جوان کیا ان کی شادیاں کیں اور اب یہ میرے ہی دشمن بن گئے۔ اب میرے بچوں کا حق بھی چھیننا چاہتے ہیں۔ اتنے سالوں سے انہیں ہم یاد نہیں آئے اور آج...... آج بیٹھے بٹھائے انہیں ہماری یاد آ گئی۔ بس میں نے کہہ دیا میں تو انہیں اپنے گھر میں قدم بھی نہیں رکھنے دوں گی۔'' وہ غصے میں بے قابو ہوئی جارہی تھیں۔

''آواز نیچی رکھو، گھٹیا عورت، ساری زندگی تم نے مجھے میرے اپنوں سے جدا رکھا، اتنے رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی میں اکیلا ہی رہا اور یہ سب صرف تمہاری وجہ سے ہوا۔'' ابو کو امی کی عمر بھر کی خدمات سب بھول گئیں کہ جب وہ بیاہ کر آئی تھیں اور انہوں نے ہی ابو کے چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالا تھا۔ اس وقت ابو کو بھی طیش چڑھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھ کر امی پر ہاتھ اٹھاتے، میں ان کے سامنے آ گئی۔

''ابو کیا کررہے ہیں آپ......؟'' میری آنکھوں میں دکھ سے آنسو آ گئے تھے۔ میں نے انہیں دونوں کندھوں سے تھام کر ان کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا۔

''جانے کیا سوچ کر میرے ماں، باپ نے مجھے اس شخص کے پلے باندھا تھا۔ جس میں غیرت نام کی کوئی شے نہیں۔ ان کے سوتیلے بھائیوں نے کیا، کیا برا نہیں کیا ہمارے ساتھ اور یہ ہیں کہ ان کے پیچھے مرے جارہے ہیں۔ جینا حرام کر رکھا ہے، میری تو زندگی ہی اجیرن کردی ان لوگوں نے۔''

''امی آپ ہی خاموش ہو جائیں، آپ دونوں کیا ہر وقت بچوں کی طرح لڑتے رہتے ہیں۔'' میں نے امی کو خاموش کروانے کی کوشش کی مگر ان کی گھوری نے میری زبان کو بریک لگا دیے تھے۔

بچپن سے میں اپنے ماں، باپ کا یہی رویّہ دیکھتی آرہی تھی۔ مگر مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں اب تک اس معمول کی عادی کیوں نہیں ہوئی۔ اپنے بہن بھائیوں کی نسبت میں کافی حساس تھی۔ چھوٹی، چھوٹی باتیں مجھے پریشان کردیتی تھیں۔ اب میں اپنی سہیلیوں اور ان کے ماں، باپ کو دیکھتی ہوں، وہ اکھٹے گھومتے، اکھٹے ہنستے بولتے اور کھاتے پیتے ہیں تو مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسا بھی ہوتا ہے...... یہ سب ایک مذاق سا لگتا ہے اور کبھی کبھار بے حد حسد بھی ہوتا ہے کہ میرے ماں، باپ ایسے کیوں نہیں؟ وہ کیوں ہمیشہ ایک دوسرے کے دشمن بنے رہے۔ اور ایسے ہی والدین کے بچے خود ترسی، احساسِ کمتری اور کبھی کبھی جارحانہ رویّوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ بڑے ہوکر انہیں سمجھ نہیں آتا کہ وہ ماں کا ساتھ دیں یا باپ کا۔ میرے ماں باپ نے ہم سب بہن بھائیوں کی ہر چھوٹی بڑی خواہش پوری کی، پڑھایا لکھایا مگر ان دونوں کی آپس کی نفرت ہمیں مکمل ہونے نہیں دیتی۔ ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے، ہر شے ہوتے ہوئے بھی۔

ابو کے سوتیلے رشتوں نے ہمیشہ میری ماں کے ساتھ ظلم وزیادتی کی اگر ان کا ذکر کرنے بیٹھوں تو پوری ایک کتاب مکمل ہوجائے۔

صرف امی نہیں، ابو کے ساتھ بھی انہوں نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ ابو نے ان کے بڑے بھائی ہونے کے ناتے باپ کا سا کردار ادا کیا۔ مگر کہتے ہیں ناں کہ بعض لوگ بہت احسان فراموش ہوتے ہیں، تو ان لوگوں کا شمار بھی انہی احسان فراموش لوگوں میں ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے گھر ہمارا آنا جانا بند ہے۔ مگر ابو ان کے یہاں ضرور جاتے ہیں اور ان کی مالی مدد بھی کرتے ہیں۔ جس کا ہمیں کسی نہ کسی طرح

پتا چل ہی جاتا ہے اور یہی بات امی کے غصے کو ہوا دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو ان کا غصہ بھی بے جا نہیں..... مگر ابو کو کون سمجھائے۔ امی کو اتنا صبر کرتے ہوئے دیکھتی ہوں تو اب مجھے بھی شادی کے نام سے نفرت سی ہونے لگی ہے۔ یہ مرد ذات اتنی خودغرض کیوں ہوتی ہے۔ کسی کے بھی احساسات کی پروا نہ کرنے والی.....! اپنی انہی سوچوں میں گھرے، گھرے میرے رب نے مجھے راہ سجھائی اور میں نے قرآن ترجمہ و تفسیر کورس میں داخلہ لے لیا۔ حفظِ قرآن میں کر چکی تھی۔ میں شروع سے ہی مذہب کی طرف مائل تھی۔

میں نہیں جانتی، میں کس طرح اتنے زیادہ لوگوں کی پسند بن گئی۔ چاہے وہ رشتے دار ہوں یا غیر..... ہر کوئی میرے گھر سوالی بن کر آنے لگا۔ لڑکیوں کے لیے یہ بات خوشی کا باعث ہوگی مگر مجھے ان سب باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جہاں تک میری بات ہے، ہاں میں خوب صورت ہوں، کم عمر ہوں، آج کل لوگوں کو ماڈرن، پڑھی لکھی، کمانے والی بہو کی خواہش ہوتی ہے مگر مجھ میں تو یہ سب کچھ بالکل نہیں..... کسی قسم کی تقاریب یا محفلوں میں بھی جانا میں پسند نہیں کرتی، صرف پڑھائی کے لیے گھر سے نکلتی، وہ بھی میری مجبوری تھی، آج میں بے حد مضطرب تھی۔ سبق میں بھی عدم توجہی کا شکار رہی۔ کلاس ختم ہوتے ہی میرے معلّمہ نے مجھے اپنے پاس آفس میں بلایا۔

مجھے دو مہینے ہوگئے تھے ترجمے کی کلاسز لیتے ہوئے۔ جبھی میری چپ، چپ اور اداسی بھری شکل دیکھ کر میری معلّمہ سے رہا نہیں گیا اور انہوں نے خاص طور پر اپنے آفس میں بلا کر مجھ سے میرے گم صم اور اداس رہنے کی وجہ جاننے کی کوشش کی۔

''عائشہ اگر کوئی پریشانی ہے تو بلا جھجک مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں، میں ہر ممکن کوشش کروں گی کہ آپ کے کام آسکوں بلکہ مجھے خوشی ہوگی آپ مجھ پر بھروسا کریں گی۔'' میں نظریں جھکائے خاموشی سے بیٹھی ان کی پُرسکون اور ٹھہری ہوئی آواز سنتی رہی۔

پھر جانے مجھے کیا ہوا کہ میں پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ انہوں نے مجھے چپ نہ کروایا نہ کوئی تسلی دی، جب میں خوب رو چکی تو خود ہی چپ ہوگئی۔ انہوں نے اٹھ کر مجھے پانی پلایا۔

''جو بھی بوجھ ہے دل پر مجھے بتا دو، پُرسکون ہو جاؤ گی.....'' انہوں نے میری طرف تسلی آمیز انداز میں دیکھا۔ وہ دکھ جو جانے میرے دل میں کب سے براجمان تھا۔ جسے میں رات کی تنہائی میں، بارش کے موسم میں، راہ چلتے ہوئے خود سے پوچھتی کہ آخر میں ہی کیوں.....؟ اب میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس صبیح چہرے والی اپنی نیک استانی سے شیئر کروں.....تاکہ وہ میرے حق میں دعا کریں۔ پانی پی کر اور استانی کی محبت بھری حوصلہ افزائی پر میں نے ہمت پکڑی اور دھیرے، دھیرے انہیں سب کچھ بتانے لگی۔

میں انہیں تمام حالات بتاتے، بتاتے شدت سے رو دی۔

''استانی جی اب بھی میرا ایک، ایک لمحہ اسی خوف میں گزرتا ہے کہ کہیں امی، ابو کی لڑائی نہ ہو جائے، ان کی آواز باہر لوگوں اور آس پاس کے پڑوسیوں تک نہیں پہنچ جائے۔ یہی خوف ہے، جو بچپن سے میرے ساتھ پلتا آیا ہے..... میرا ساتھ نہیں چھوڑتا..... خوف کے ساتھ جینا بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ کبھی، کبھی میں اللہ سے شکوہ بھی کرتی ہوں کہ جب تو نے میرا خمیر اٹھایا تو، تو ہر چیز بنانے پر قادر ہے تجھے تو معلوم تھا میرے رب کہ میں کس طبیعت کی ہوں گی یا مجھے اس ماحول میں پیدا نہ کرتا اور یا مجھے اتنا مضبوط بنایا ہوتا کہ میں بغیر کسی ڈر، خوف کے ان لوگوں کے درمیان رہتی جو میرے اپنے ہیں، جو میرے والدین ہیں مگر ایک دوسرے کے لیے اجنبی.....

آپ خود بتائیں اس سب میں ہم سب کا کیا قصور، ہم بچے ان کی نفرت کی بھینٹ چڑھتے ہیں آپس میں ہر روز جھگڑنے والے والدین کو اللہ اولاد ہی کیوں دیتا ہے۔''میں خاموش ہوئی تو انہوں نے میری طرف دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔

''جانتی ہو عائشہ، اللہ جس سے محبت کرتا ہے ناں اسے ہی آزمائش میں ڈالتا ہے، اسے یہ بھروسا ہوتا ہے کہ میں اپنے جس بندے کو اس امتحان کے لیے چن رہا ہوں، وہ اس پر پورا اترے گا۔ وہ ہر کسی کو یہ مرتبہ نہیں دیتا۔'' وہ دھیرے، دھیرے مجھے سمجھا رہی تھیں۔''اچھا یہ بتاؤ کیا تمہارے پاس اللہ کا کوئی خاص تحفہ ہے؟ مثلاً کچھ بھی ہو، کوئی ہنر کوئی کمال یا کچھ بھی...... جو تم سمجھو کہ تمہارے اردگرد کسی بھی شخص کے پاس وہ ہنر نہیں......صرف تم میں ہے۔''

''نہیں تو......''میں ان کی بات پر حیران ہوئی تھی۔

''سوچو......کچھ تو ایسا ضرور ہوگا اللہ ہر بندے میں کوئی نہ کوئی غیر معمولی صلاحیت ضرور عطا کرتا ہے۔''انہوں نے پُرزور اور مضبوط لہجے میں کہا۔

''ہاں، مجھے اللہ نے لکھنے کا ہنر دیا ہے مگر میں نے اسے ہمیشہ خود تک ہی محدود رکھا، اپنی ذات اور اپنے کمرے تک......اس سے باہر کی دنیا میرے اس ہنر کے بارے میں نہیں جانتی۔ بس میں اسکول اور کالج میں بہت لمبے، لمبے مضامین لکھتی تھی تو میری ٹیچرز بہت سراہتی تھیں۔ اب تو میں اپنے دل کی باتیں، اپنے محسوسات سب لکھتی تو ہوں مگر پھر ضائع کر دیتی ہوں کہ ان کا کیا فائدہ......''میں نے اپنے اس ہنر کو تلاشا جو میرے نزدیک کوئی خوبی نہیں تھی۔

''صلاحیت ہنر، وہ شے نہیں جسے چھپایا جائے بلکہ یہ تو وہ ہے جو دنیا سے منوایا جائے۔ ہنر کی اپنی ایک الگ پہچان ہوتی ہے، جس طرح خوشبو چھپانے سے چھپ نہیں سکتی اسی طرح صلاحیت، ہنر اور قابلیت کی بھی اپنی الگ جگہ ہے جو خود کو منوا کر ہی رہتی ہے۔''انہوں نے اپنی چمکتی ہوئی خوب صورت روشن آنکھیں مجھ پر مرکوز کر دیں۔ اور یوں ان کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ ایک، دو، تین آہستہ، آہستہ میری تحریریں ایک کے بعد ایک شائع ہونے لگیں۔ میری تحریروں کو پسند کیا جانے لگا۔ میں اخبارات میں آرٹیکل لکھنے لگی۔ رسالوں میں کہانیاں لکھنے لگی۔ آہستہ، آہستہ لگا میرا نام اچھے مصنفین کی فہرست میں شمار ہونے لگا۔ میرے اندر کی تنہائی اور تنہائی قلم کے ذریعے ختم ہونے لگی، بہت جلد میری ایک الگ دنیا بن گئی، جس میں صرف میں بطور ایک لکھاری اور میرے چاہنے اور مجھے سراہنے والے بسنے لگے۔ دھیرے، دھیرے میرے دکھ اور میری تنہائیاں پس پردہ چلی گئیں اور میری قنوطی سوچیں مثبت تحریروں میں بدلتی چلی گئیں۔ اب سوچتی ہوں تو لگتا ہے کہ کبھی، کبھی اللہ بظاہر کچھ نہ دے کر بھی بہت کچھ دے دیتا ہے۔ اگر مجھے یہ نامساعد حالات نہ ملتے، مجھے تنہائیاں نہ ملتیں تو آج میں اتنی اچھی لکھاری نہیں ہوتی، میرا اتنا نام، اتنا مقام اور اتنی عزت نہ ہوتی۔ میں گمنام زندگی جی کر مرجاتی، ایسا کچھ بھی چھوڑ کر نہ جاتی جو میرے بعد میرے نام کو زندہ رکھتا، واقعی خدا بڑا کارساز ہے، وسعت والا ہے، بے انتہا غنی ہے، ہم جو صرف ایک خواہش کے پورا نہ ہونے پر اتنا واویلا کرتے ہیں، اپنی زندگی کے بے شمار قیمتی لمحے اس نہ ملنے کے سوگ میں برباد کر دیتے ہیں اور خدا کی باقی بے شمار عنایات اور نعمتوں کو بھول جاتے ہیں اس کا شکر ادا نہیں کرتے، یہ مجھے اب جا کر سمجھ آیا ہے کہ واقعی اللہ جو کرتا ہے اسی میں ہماری بہتری ہوتی ہے۔ چاہے ہم جتنی بھی آنکھیں بند کیے پڑے رہیں مگر ایک دن ہمیں اس ذاتِ اعلیٰ صفات کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے مگر وہ بھی اس کی مکمل معرفت کے ساتھ۔





آئینہ

شیریں حیدر

"کرم مجھے ہرگز پسند نہیں کہ تم ہر دو روز کے بعد کوئی نہ کوئی عذر کر کے چھٹی مانگ لیتے ہو...... تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری تنخواہ سارے ملازموں سے زیادہ ہے اور وہ اس لیے ہے کہ ہم تم پر اعتماد کرتے ہیں، کام تم چاہے کم کرو مگر کم از کم اس گھر کے وفادار ہو اور باقی ملازموں سے اچھی طرح کام کروا لیتے ہو......" میں نے ٹی وی پر نظریں جماتے ہوئے بے نیازی سے کہا، اس ہفتے میں کرم نے

دوسری بار چھٹی پر جانے کا کہا تھا۔

''کل آ جاؤں گا باجی!'' اس نے لجاجت سے کہا۔ ''مجبوری نہ ہوتو آپ کو علم ہے کہ میں کبھی اپنے منہ سے بول کر چھٹی نہیں مانگتا......''

''اب ایک بار جو تمہارا یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے تو چلتا ہی رہے گا، لگتا ہے کہ ہمیں کوئی اور ملازم ڈھونڈنا پڑے گا۔'' میں نے نخوت سے کہا تھا۔

''اس نمانی کا بیاہ کر کے میں تو وختوں کو ہی پڑ گیا ہوں باجی......'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''اولاد ہے ناں، اسے تکلیف میں دیکھتا ہوں تو رہ نہیں پاتا، اس سے تو نہیں اچھا تھا کہ میں اس کا بیاہ ہی نہ کرتا......'' وہ کچن کی طرف چلا گیا، میرا دل تھوڑا سا نرم ہوا، اس کے جاتے ہی عابد کھنکھارے۔

''تم کچھ زیادہ ہی سختی نہیں کرتی ہو اس بیچارے کرم پر...... بھاگ جائے گا۔'' انہوں نے کہا۔ ''آج کے زمانے میں ایسے سلجھے ہوئے اور وفادار ملازم کا مل جانا نعمت سے کم نہیں، لوگوں سے پوچھو تو علم ہو کہ کس، کس طرح کے مسائل ہیں ملازموں کی عدم دستیابی کے باعث......''

''جانتی ہوں عابد، اس نے کبھی اس سے قبل یوں اس طرح بار، بار چھٹی کی بھی نہیں، جب بیٹی کو بیاہنے بھی گیا تو ایک ہفتے کے لیے اور اس کے بیاہ کو دو ماہ ہونے والے ہیں، ان دو ماہ میں آج چوتھی بار چھٹی مانگ رہا ہے یہ۔''

''ہو گی کوئی مجبوری یار......'' عابد نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''ویسے مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے واقعی ذرا زیادہ سختی سے بات کر دی ہے...... اب آپ یوں کریں کہ اس کو بلا کر کہیں کہ چلا جائے...... ایک دن کے لیے کہہ رہا ہے، آپ اسے دو دن کے لیے بھیج دیں!'' میں نے حاتم طائی کی تقلید کی۔

''میں کیوں کہوں، تم خود کہو تا کہ جو سختی تم نے کی ہے اس کا ازالہ ہو جائے...... معذرت کر لو اس سے۔''

''اچھا میں اس سے معذرت کر لوں تا کہ اس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جائے واہ!'' میں نے ابرو اچکائے۔ ''ملازموں کو ان کے مقام پر ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔''

''ویسے اس سے معذرت نہ سہی لیکن اسے چھٹی کا تم خود کہہ دیتیں تو اچھا تھا، وہ خوش ہو جاتا، یہی تمہاری معذرت ہو جاتی اور تمہارا قد بھی چھوٹا نہ ہوتا......'' عابد نے اپنی دانست میں بات مزاحیہ کی تھی مگر مجھے اپنے چھوٹے قد پر چوٹ بھی برداشت نہ ہوتی تھی۔

''آپ نے اسے بلا کر کہنا ہے تو کہہ دیں اور بھیج دیں۔'' ٹی وی کا ریموٹ اٹھا کر میں نے ٹی وی بند کیا اور اپنے کمرے کی طرف چلی، جانتی تھی کہ عابد بیٹھے ہوئے اپنا پسندیدہ ٹاک شو دیکھ رہے تھے، یہ میری ناراضی کا اظہار تھا...... بچے اپنے، اپنے کمروں میں تھے، عابد بھی تھوڑی دیر کے بعد کمرے میں آ گئے۔

''اگر کسی نے جوانی میں تم سے کہہ بھی دیا ہو گا کہ روٹھ کر تم حسین لگتی ہو تو وہ پرانی بات ہے جانم......'' انہوں نے میرے قریب بیٹھ کر کہا۔ ''اب تم صرف مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔''

''آپ اس عمر میں اللہ، اللہ کیا کریں تو بہتر ہے...... رومانس آپ کو اس وقت نہیں کرنا آیا جب آپ جوان تھے اور اب سفید سر کے ساتھ تو آپ بالکل مسخرے لگ رہے ہیں۔'' میں نے ان کا ہاتھ جھٹک کر تابڑ توڑ جواب دیا۔

ویسے حقیقت یہی تھی کہ اب مجھے بات بے بات غصہ آنے لگا ہے، ذرا سی بات پر پارہ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا، بچے جوان ہو چکے تھے اور عابد مجھے سمجھاتے رہتے ہیں کہ مجھے اپنے غصے کو قابو کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، یہ وہ وقت ہے جب ہمیں اپنے بچوں کی زندگیوں کے اہم معاملات کو طے کرنا

ہے اور کل کلاں کو اس گھر میں دو بہوئیں آئیں گی تو کیا میں ایک سخت گیر ساس نہیں بن جاؤں گی!

☆☆☆

وہ دو دن کے بعد لوٹا تو مجھے اس کے چہرے پر پریشانی نظر آئی...... کرم ہمارے پاس بیس برس سے تھا، جب آیا تو نوجوان لڑکا تھا، ہمارے بچوں کو باہر کھیلنے کے لیے لے کر جاتا، گھر کے اندر کام کاج انتہائی جلدی سیکھا اور ہوتے، ہوتے اس نے کافی ذمّے داریاں خود بخود اپنے سر لے لیں۔ اس کی شادی ہوئی، بچے ہوئے اور ساتھ، ساتھ ہمارے بچے بھی جوان ہوگئے، کرم مستقل رہنے والا ملازم تھا، باقی ملازموں کے ساتھ وہی ڈیل کرتا اور ہمیں اس سے آگاہ کردیتا، کسی کو چھٹی پر جانا ہے، کوئی نیا ملازم آتا تو وہ اس کے زیرِ تربیت چلا جاتا، ملازموں کے مسائل وہی حل کرتا، انہیں آپس میں پیار محبت سے رہنے کو کہتا اسی لیے گھر میں ملازموں کی فوج تھی مگر ہمیں ان کے مسائل کا علم نہ ہوتا، اگر ہمیں کسی کے مسائل کا علم ہوتا بھی تو وہ فقط کرم ہی تھا۔

''سب خیریت ہے ناں گھر پر؟'' میرے منہ سے ہمدردی کا فقرہ ادا ہو۔

''جی......'' اس نے چہرہ پھیر کر جواب دیا، مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

''بیٹی ٹھیک ہے تمہاری......؟''

''جی!'' اس کا جواب اب بھی مختصر ہی تھا۔

''اچھا دیکھو شام کو ہاشم اور حاتم اپنے دوستوں کی طرف جارہے ہیں۔'' میں نے اپنے جڑواں بیٹوں کا بتایا۔ ''صرف مومنہ گھر پر ہوگی، اسے صرف سوپ بنوا کر دینا ہے، کھانا وہ نہیں کھائے گی، میں اور صاحب بھی باہر جارہے ہیں، جب تک ہم لوٹ نہ آئیں ہر طرح سے خیال رکھنا۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''جی اچھا......'' اس نے آہستگی سے کہا۔

مومنہ کا خیال وہ اپنی بیٹی کی طرح ہی کرتا تھا اور ہم رات بھر بھی باہر رہتے تو وہ جاگ کر پہرہ دیتا تھا، ایک یہ خوبی اس کی لاکھ کجیوں پر بھاری ہوتی۔

''تم ٹھیک ہوں ناں؟'' میں نے چڑ کر سوال کیا، وہ منہ دوسری طرف کیے فرنیچر پر سے وہ دھول صاف کررہا تھا جو تھی ہی نہیں۔

''جی باجی ٹھیک ہوں۔'' پہلا طویل فقرہ اس کی بھرائی ہوئی آواز میں ادا ہوا تھا۔

''ٹھیک تو نہیں لگ رہے ہو مجھے......'' میں نے کندھے اچکا کر کہا اور اپنے دھیان میں ٹی وی دیکھنے لگی اور مجھے کام ہی کیا تھا۔

☆☆☆

''میں نے عمر بھر مومنہ بیٹی کو اپنی بیٹی کی طرح ہی سمجھا ہے باجی......'' اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ''یہ میری وہ بیٹی ہے جسے میں کم پیار کرتا ہوں اور مومنہ بیٹی کو زیادہ...... اس بدقسمت کی ماں سویرے اس کو یہاں چھوڑ گئی ہے جی، اس کی سسرال والے تنگ کررہے ہیں، ہمارے گھر پر بار بار آتے ہیں اور دھمکیاں دیتے ہیں، اسے کہیں مروا نہ دیں، اسی خوف سے اس کی ماں کہتی ہے کہ چند دن اسے یہاں رکھ لوں جب تک حالات موافق نہ ہوجائیں...... اگر آپ اجازت دیں تو اسے مومنہ بی بی کی خدمت کے لیے چند دن رکھ لیں......'' میں نے نظر بھر کر اس کی بیٹی کو دیکھا جس کے چہرے میں مکھن جیسی سفیدی، نرمی اور ملاحت تھی، آنکھوں میں جگنوؤں جیسی چمک اور ہرنی جیسا خوف تھا، قامت میں وہ مومنہ سے بھی نکلتی ہوئی تھی اور جوانی کا سن۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا، نظر اس کے ملیح چہرے سے ہٹ ہی نہ رہی تھی۔

''جی...... خوب صورت!'' عین اس کی عکاسی کرتا نام۔

''ہوں ...... کتنا عرصہ ہوا ہے بیاہ کو؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔

''دو مہینے جی......'' اس کا لہجہ بھی سہا ہوا تھا اور میرا انداز تو اسے مزید سہار رہا تھا۔

''ہوں ...... دو ماہ میں ہی تمہاری سسرال میں نہیں بنی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا...... وہ سٹپٹائی اور اپنے باپ کی طرف دیکھا...... ''عمر کیا ہے تمہاری؟''

''سولہ سال جی......'' اس کے بجائے کرم نے جواب دیا، شاید وہ جان گیا تھا کہ اس کی بیٹی میرے اندازِ تفتیش سے پریشان ہوگئی ہے۔

''جلدی کیا تھی تمہیں اس کے بیاہ کی کرم؟ اب اتنی سی لڑکی سسرال میں جا کر کس طرح نباہ کر سکتی ہے، ہمارے پاس تم بیس سال سے رہ رہے ہو، مومنہ چار سال کی تھی جب تم آئے تھے، اب چند ماہ بعد اس کی شادی ہے، وہ چوبیس کی ہو چلی ہے، تمہاری بیٹی چوبیس سال تک پہنچتے، پہنچتے شاید چوبیس دفعہ سسرال والوں سے جھگڑا کر کے تمہارے گھر آئے گی اور ان جھگڑوں کے باوجود آٹھ بچے بھی پیدا کر لے گی۔'' میرا انداز کافی سفاک تھا مگر میں سمجھ رہی تھی کہ بعض زخموں کی جراحی کے لیے سفاک بننا پڑتا ہے۔

''میں اب وہاں نہیں جاؤں گی کبھی نہیں جی!'' اس کی نرم آواز آئی۔

''تو کیا عمر بھر باپ کے گھر پر بیٹھی رہو گی؟'' میں نے پوچھا۔''ایسا کیا کر دیا تمہاری سسرال والوں نے چار دن میں تمہارے ساتھ کہ تم وہاں جانے کو تیار ہی نہیں ہو، شادی تو دیکھ بھال کر ہی کی ہوگی ناں تمہارے باپ نے......''

''اپنا خاندان ہے جی......'' کرم نے کہا۔''بس میری بیٹی کے مقدر ٹھنڈے ہیں کہ اسے ان عجیب حالات سے واسطہ پڑ گیا ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''بس باجی بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، اس کا خاوند دبو سا ہے اور اس کا بڑا بھائی بدنیت...... خوب صورت نے اپنے شوہر کو اس کے بھائی کی شکایت کی تو وہ اسے جھوٹا کہتا ہے، اپنے بھائی کو وہ خدا کے بعد سب کچھ سمجھتا ہے اور بیوی کی بات پر یقین نہیں کرتا...... اب اس گھر میں جہاں اس کا خاوند رات کی اور جیٹھ دن کی ڈیوٹی کرتا ہے، گھر میں اور کوئی نہیں، ساس نہ سسر، یہ کس طرح تنہا رہ سکتی ہے، اس سے پہلے کہ کوئی نقصان ہو جائے، میں دو دن پہلے جا کر اس کو لے آیا تھا، اس کے شوہر سے بات کی تو وہ کہتا ہے کہ میرا فرشتوں جیسا بھائی ہے، اس لڑکی کا دماغ خراب ہے، میں بھی غصے میں آ گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ لے آیا...... میری بیٹی جھوٹ نہیں بول سکتی، وہ کیوں جھوٹ بولے گی، اسے کوئی دشمنی تو نہیں اپنے شوہر کے بھائی سے......'' اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا اور وہ کانپ رہا تھا۔

''ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو......'' میں نے ابرو اچکائے۔''یہ اپنے شوہر کے بھائی پر الزام لگا رہی ہو...... کچھ ایسا کہا ہو اس نے جو یہ غلط سمجھی ہو......''

''نہیں جی......'' وہ تڑخ کر بولی۔''میں جھوٹ نہیں کہہ رہی، اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا ایک بار...... میرے شوہر کی غیر حاضری میں...... میں نے زبردستی چھڑایا اور بعد میں جب اپنے شوہر سے شکایت کی تو وہ کہنے لگا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی، وہ میرے باپ کی طرح ہیں، انہوں نے مجھے پالا ہے، پڑھایا ہے، خود شادی نہیں کی اور میری شادی کروا دی ہے...... میں خاموش ہوگئی، سوچا کہ میری کم عمری کی وجہ سے میں نے غلط سمجھا ہوگا...... مگر وہ حد سے بڑھنے لگا، میرے شوہر کے سامنے بھی کچھ نہ کچھ کہہ دیتا اور میرا شوہر خاموش رہتا یوں جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو اور پھر ایک رات میرے کمرے میں آ گیا، میں نے

چیخنا شروع کر دیا، گھر میں تو کوئی نہ تھا مگر پاس پڑوس کے خوف سے وہ کمرے سے نکل گیا اور جاتے، جاتے کہہ کر گیا کہ میں زیادہ عرصہ خود کو بچا نہ پاؤں گی...... میں ہر رات جاگ کر گزارتی ہوں، میرا شوہر گھر پر نہیں ہوتا، نہ صرف کمرے کے اندر سے چٹخنی چڑھا کر رکھتی ہوں بلکہ ہاتھ میں بڑا سا چھرا پکڑ کر بیٹھ جاتی ہوں، خوف سے لرزتی رہتی ہوں......''

''ہوں......'' میں نے اس کی بات سن کر گہری سانس لی۔

''ایک دن میں ایک پڑوسن کی طرف چلی گئی، اس نے مجھ سے میرے گھر کے حالات پوچھے تو میں ٹال مٹول کر گئی، تب اس نے مجھے بتایا کہ میرا جیٹھ ایک بدکار آدمی ہے، اس کی حرکتیں ایسی ہیں کہ محلے میں کئی بار پٹ چکا ہے...... مجھے اس نے کہا کہ میں اس سے بچ کر رہوں...... اور اس دن سے مزید خوفزدہ ہوگئی ہوں اور فیصلہ کر لیا کہ اب وہاں نہیں رہنا...... میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی جہاں اس کا بھائی بھی رہتا ہے...... وہ ایک بدنیت آدمی ہے اور مجھ پر بری نظر رکھتا ہے، اگر اسے اس بات کا یقین نہیں تو پھر میرے اور اس کے درمیان اعتبار اور اعتماد تو ہے ہی نہیں، اس لیے میں اس گھر کو چھوڑ دوں گی...... کہنے لگا، تم کہتی ہو کہ میرے بھائی کی نیت ٹھیک نہیں، مجھے تو لگتا ہے کہ میرے بھائی کے ساتھ تمہاری نیت ٹھیک نہیں...... مجھے انہوں نے بتایا ہے کہ تم رات کو ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتی رہتی ہو...... بیگم صاحبہ میرے تو حواس ہی سن ہو گئے، میں نے ابا کو کال کر کے ساری بات بتائی تو وہ مجھے لینے آ گئے اور اب وہ دونوں بھائی کبھی ترلے منتیں کرتے ہیں تو کبھی دھمکیاں اور ٹڑیاں دیتے ہیں......'' اس کی طویل بات اختتام کو پہنچی تو میں اس کے چہرے پر سچائی تلاش کر رہی تھی۔

''تم بچی کو چار جماعتیں پڑھاتے...... اسے ذرا سمجھدار ہونے دیتے اور اس کی مرضی پوچھ کر شادی کرتے تو یہ مسائل نہ ہوتے...... چھان بین کر کے شادی کرتے...... ناں''

''اس نے میٹرک کیا ہے جی، بہت ذہین بچی ہے اور اس کی منگنی بچپن سے طے تھی، اسے پسند تھا سب کچھ، حادثے میں اس کے شوہر کے ماں باپ مر گئے تھے چند سال پہلے تو اب ان کے گھر کا ہانڈی، چولھا چلنا مشکل ہو گیا تھا، میرے بھتیجے ہیں دونوں رشتے میں...... اور بیٹی کو بیاہنا تو تھا، ان کی امانت تھی ان کے حوالے کر دی۔''

''ہم م م......'' میں نے گہری سانس لی۔ ''جوان لڑکی ہے کرم...... شوہر گھر پر نہیں ہوتا، کیا معلوم کہ سچائی وہی ہو جو اس کا شوہر اور اس کا جیٹھ کہہ رہا ہے......'' کرم کے چہرے پر دھواں پھیل گیا۔

''میری بیٹی اتنی گھٹیا نہیں ہو سکتی باجی...... یہ

غزل

کیسے کیسے گمان میں گزری
زندگی امتحان میں گزری

بند تھے جس کے سارے دروازے
عمر ایسے مکان میں گزری

ذکر آیا تھا اس کا محفل میں
شب اسی کے دھیان میں گزری

تم کو معلوم ہے جہاں والوں
ہم پہ کیا اس جہان میں گزری

غمِ دوراں میں حیات اپنی ایم جے
عزم کے سائبان میں گزری

مرسلہ: مہوش جواد، لیہ

فرشتوں کی طرح معصوم ہے، اسے تو زمانے کی اونچ نیچ کا علم ہی نہیں، اس میں ہیر پھیر نہیں، جو میری بیٹی کہہ رہی ہے وہی سچ ہے......''

''میں سچ کہہ رہی ہوں جی...... ایک لفظ جھوٹ نہیں ہے اس میں......'' وہ سسکی تھی۔

''اولاد کی محبت ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے اور ہمیں وہی سچ نظر آتا ہے جسے ہماری اولاد سچ کہتی ہے کرم...... دوسروں کے سچ کڑوے ہوتے ہیں، وہ حلق سے نہیں اترتے ہمارے......'' میں نے اپنی طرف سے آئینہ اس کے سامنے رکھا تھا۔

''چند دن کا آسرا چاہیے باجی...... میں کوئی اور انتظام کر کے اسے کہیں اور چھوڑ آؤں گا۔'' کرم کے لہجے میں التجا اور امید تھی۔

''گھر میں سارے مرد ملازم ہیں کرم، کوارٹروں میں آٹھ مردوں کی موجودگی میں...... اسے کیسے رکھ سکتے ہو، کوئی اور انوکھا ہو جائے تو......؟'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''مگر یہ وہاں کیسے رہ سکتی ہے باجی؟''

''تو اور کہاں رہے گی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''جی...... مومنہ باجی کے کمرے میں زمین پر بستر لگا لے گی......''

''کیا......؟'' میں چیخی۔ ''میں اسے گھر کے اندر کس طرح رکھ سکتی ہوں......'' مجھے اس کا حسن خوف زدہ کر رہا تھا۔ ''گھر میں ہاشم اور حاتم ہیں...... اور...... صاحب ہیں۔''

''تو پھر کیا ہوا...... وہ تو جانتے ہیں کہ میری بیٹی ہے، جس طرح مومنہ میری بیٹی ہے، اسی طرح میری بیٹی آپ کی بیٹی جیسی اور بہنوں جیسی ہے......'' اس نے گھگیا کر کہا۔

''یہ تم کہہ رہے ہو کرم کیونکہ تم اپنی بیٹی کو فرشتوں جیسی سمجھتے ہو، میں نہیں...... نہ ہی میں اپنے گھر میں کوئی نیا کھیل ہوتے ہوئے دیکھ سکتی ہوں......'' میں نے سفاکی کی انتہا کر دی۔ ''تم جاؤ دو دن کے لیے اور اسے اسی وقت واپس اپنے گھر چھوڑ آؤ، ہو سکے تو اس کے شوہر سے صلح کر لو، اگر اس کے بھائی کی طرف سے مسئلہ ہے تو وہ...... اسے علیحدہ گھر لے کر اس میں رکھے......'' میں نے مفت میں مشورہ بھی دیا۔

''یہی تو ممکن نہیں ہے......'' کرم نے بیچارگی سے کہا۔ خوب صورت اب خاموش کھڑی دانتوں سے اپنے ہونٹوں کو کچل رہی تھی، اس کے نین کٹورے بھرے ہوئے تھے مگر وہ انہیں سنبھالے ہوئے تھی۔

''ٹھیک ہے باجی، میں اسے فیصل آباد اپنی بہن کے ہاں چھوڑ آتا ہوں، شاید وہاں تک اس کا شوہر نہ پہنچ پائے، مجھے تو خوف ہے کہ میری بیٹی کو وہ لوگ اغوا نہ کر لیں۔'' اس نے چادر اپنے کندھے پر رکھی اور بیٹی کا ہاتھ تھام کر نکل گیا۔

دو دن تو کیا دو ہفتے اور دو مہینے بھی گزر گئے، اس کی واپسی ہوئی نہ کوئی اطلاع آئی، اس کا فون بھی بند جا رہا تھا، جانے کیا مسئلہ ہو گیا تھا، کہیں فیصل آباد جاتے ہوئے کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو...... سوچ کی حد یہاں آ کر رک جاتی کیونکہ کرم کا ایسا مزاج ہی نہ تھا کہ کہے ہوئے وقت سے ایک گھنٹا بھی اوپر لگاتا اور کبھی کوئی مجبوری ہوتی تو پوری ذمے داری سے اطلاع بھی کرتا اور معذرت بھی۔ مومنہ کی شادی کے دن جوں جوں قریب آ رہے تھے، مجھے خلجان ہونے لگا کہ سارے کام کس طرح ہوں گے، کرم جیسا کوئی اور کام کرنے والا ملازم نہ تھا، باہر سے بھی خاندان کے بہت سے لوگ آ رہے تھے جو ہمارے گھر میں ہی ٹھہرتے اور کرم کے سوا کسی کو مہمانوں کا خیال کب رکھنا آتا تھا۔ وہ ہماری عدم موجودگی میں بھی پورے گھر کا نظام اس طرح چلاتا تھا کہ کسی کو کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔

عابد سے کہہ کر اس کے گھر سے بھی پتا کروایا مگر

علم ہوا کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں...... ”ایسی بھی کیا آفت آ گئی کہ اسے بتانے کی توفیق بھی نہیں ہوئی۔“ میں نے غصے کا اظہار کیا۔

”اتنی سنگ دل نہ ہوا کرو......“ عابد نے کہا۔ ”جو چند دن تم اس کی بیٹی کو پناہ دے دیتیں تو کیا قیامت آ جاتی، کیا وہ ہمارا کچھ لوٹ کر لے جاتی؟“ میں نے عابد کو غصے سے دیکھا۔ ”جانے کیا کیا لوٹ کر لے جاتی۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

”غریب آدمی کی مجبوریاں ہماری مجبوریوں سے مختلف ہوتی ہیں، جانے وہ کس پریشانی میں گھر چھوڑ کر گیا ہوگا اور کہاں، کہاں بھٹک رہا ہوگا، تم نے اس کی بیٹی کی پریشانی میں اس کا ذرا سا خیال نہیں کیا، ہماری بیٹی کو اس نے اپنی بیٹیوں کی طرح پالا ہے......“

”تو کیا میں اس کی ملازمہ بن کر اس کی بیٹی کو بھی پالتی؟“ غصے میں میرے منہ سے اور کچھ نہ نکلا۔

”تم سے تو بحث ہی فضول ہے......“ عابد وہاں سے اٹھ گئے۔

☆☆☆

پھر اچانک وہ چلا آیا...... ہم سے آدھی عمر کا کرم، ایک دم بوڑھا لگنے لگا تھا، اس نے معذرت کی کہ اس کا فون چوری ہو گیا تھا اور وہ ہم سے رابطہ نہ کر سکا کیونکہ اسے نمبر زبانی یاد نہ تھا، بیٹی کو گھر لے کر جاتے ہوئے راستے میں کسی نے اس کی جیب کاٹ لی۔ گھر پہنچا تو علم ہوا کہ پولیس بار بار اس کے گھر پر اس کی بیٹی کی بازیابی کے لیے چھاپے مار رہی تھی کیونکہ اس کے شوہر نے شکایت کی تھی کہ اس کا سسر اس کی بیوی کو اس کی مرضی کے بغیر اس کے گھر سے لے کر چلا گیا ہے، وہ رات اس نے اپنے پڑوس میں گزاری کیونکہ اس کے گھر پر کسی بھی وقت کوئی آ سکتا تھا...... پڑوسیوں کی مدد سے ہی اس نے گھر کا سامان ٹرک پر لدوایا اور اپنے بال بچوں سمیت شہر، شہر بھٹکتا رہا...... ہاتھ میں رقم نہ ہونے کے باعث کافی سامان اُسے اونے پونے داموں بیچنا پڑا تھا، کبھی کسی شہر اور کبھی کسی شہر میں بھٹکتا پھرا، بیٹی کی طرف سے خلع کا مقدمہ درج کروایا اور خود گھر والوں کا پیٹ بھرنے کے لیے محنت مزدوری کرتا رہا، اس کی بیوی بھی کام کرنے لگی کیونکہ گھر کا گزارہ نہیں چل رہا تھا۔ اسی لیے اس کی صحت یوں گر گئی تھی۔

”تین ماہ تک میں اپنی بیٹی کی خاطر بھاگ دوڑ کرتا رہا، بہن کے گھر چھوڑ کر آتا تو دو دن میں لوٹ آتا مگر وہ لوگ میرے خاندان کے سب گھروں میں اس کی تلاش میں جا چکے تھے...... اب انہیں اللہ کے آسرے پر چھوڑ کر آ گیا ہوں۔“ اس نے وضاحت کی۔ جو میں اس کو تین دن رکھ لیتی تو شاید اس غریب کو اتنا ذلیل و خوار نہ ہونا پڑتا۔ ”مومنہ بٹیا کی شادی کا یاد تھا مجھے، اس لیے آ گیا ہوں کہ اسے اپنے ہاتھوں سے وداع کروں گا اور پھر ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔“ اس نے مزید کہا تو میرے دل میں ایک لمحے کے لیے اتنے اچھے ملازم سے ہاتھ دھونے کا ملال آیا۔ شادی قریب تھی اور ایسے میں اس کا آ جانا مجھے نعمت غیر مترقبہ لگا تھا، سو اللہ کا شکر ادا کیا کہ کچھ پریشانی کم ہوئی تھی، شادی ہو جائے گی تو دیکھیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔

شام میں عابد آئے تو کرم سے بڑے تپاک سے ملے، اس سے تفصیل سے گفتگو کی، اس کے مسائل کی تفصیل سنی اور اسے تسلی دی، حاتم اور ہاشم واپس آئے تو کرم سے لپٹ کر ملے، اس سے کہا کہ وہ اسے بہت مس کرتے تھے...... اور مومنہ کی خوشی بھی دیدنی تھی۔

”چاچا...... آپ نہ آتے تو میں نے شادی نہیں کروانا تھی۔“ کرم بچوں کی طرح رونے لگا، میں ہی لیے دیے رکھتی تھی عابد اور بچے تو اس سے بہت مانوس تھے اور اس کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔

”بس بٹیا کی شادی کے لیے آیا ہوں چند دن

کے لیے پھر چلا جاؤں گا اور اپنے گھر والوں کا خیال رکھوں گا، ان کے مسائل کافی ہو گئے ہیں۔'' کرم نے آنسو پونچھ کر کہا۔

''کوئی نہیں جا رہے آپ کہیں بھی چاچا......'' حاتم نے کہا۔ ''مومنہ کی شادی کا بڑا خیال ہے آپ کو اور ہماری شادیوں کا آپ کو کوئی خیال نہیں......''

''ابھی تو ان میں بہت سال ہیں، جب آپ لوگوں کی شادیاں ہوں گی تو پھر آ جاؤں گا......'' کرم نے مسکرا کر کہا تھا۔

''تم اب کہیں نہیں جا رہے ہو کرم......'' عابد نے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں، کسی وکیل سے تمہاری بیٹی کے مقدمے کی بات بھی کرتا ہوں اور اس کے شوہر کا بندوبست بھی کرواتا ہوں۔''

''مہربانی صاحب......'' کرم نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ''مگر اب مجھے جانا ہی ہوگا کہ اپنے بال بچوں کو ملتان چھوڑ کر آیا ہوں۔''

''چلو بعد کی بعد میں دیکھیں گے......'' عابد نے بات بدلی۔ ''ابھی تو تم دیکھو کہ شادی کے کیا انتظامات کرنا ہیں...... امریکا والوں کے لیے انیکسی تیار کروا دو اور باقی لوگ......'' عابد اسے ہدایات دینے لگے اور وہ سر ہلا کر سنتا رہا، مجھے علم تھا کہ اسے یہ سب کچھ بتانے اور سمجھانے کی ضرورت نہ تھی وہ خود سارا کام سمجھتا تھا، اس کے آ جانے سے میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ ٹل گیا تھا۔

☆☆☆

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا مومی؟'' میں نے کوشش کی کہ میری آواز سرگوشی سے بلند نہ ہو۔ ''کوئی سنے تو تمہاری دماغی صحت پر شک ہی کرے گا ناں......''

''مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے مما کہ کون کیا سمجھتا ہے اور میری ذہنی یا جسمانی صحت پر کتنا شک کرتا ہے، میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ آپ میری بات کا یقین کر لیں......''

''میں تمہارے پاپا سے بات کرتی ہوں اور وہ تمہارے سسرال والوں سے بات کرتے ہیں، وہ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں......'' میں نے گویا بات ختم کر دی۔

''آپ اپنی طرف سے جو چاہے کوشش کریں، جس کو مرضی بلا کر بات کریں مگر میرا فیصلہ اٹل ہے مما، میں نے آپ کو بتا دیا ہے، آپ پاپا کو بتا دیں تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔'' وہ یوں بات کر رہی تھی جیسے یہ اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ ہاتھ سے مکھی مار دینا۔

''تم ابھی بچی ہو مومی......'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''شادی کے بعد لڑکیاں سسرال جا کر نئے نئے رشتوں سے روشناس ہوتی ہیں، ان رشتوں کے اپنے انداز ہوتے ہیں، بسا اوقات لوگوں کی شفقت کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ نوجوان لڑکیوں کو شبہے میں ڈال دیتا ہے......'' میں اسے رسان سے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میں چوبیس سال کی ہو چکی ہوں مما...... میں نے لڑکوں کے ساتھ تعلیم بھی حاصل کی ہے اور ملازمت بھی کی ہے، میں بچی نہیں ہوں...... مجھے خود پر پڑنے والی ہر نظر کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے...... مجھے اس گھر میں واپس نہیں جانا ہے مما......'' اس نے زور دے کر کہا۔ ''امید ہے کہ آپ بات سمجھ گئی ہوں گی۔'' اس کا لہجہ حتمی تھا۔

''ایک شبہے کی بنا پر...... پوری زندگی کو داؤ پر لگا دینا کہاں کی عقلمندی ہے مومنہ......'' مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ ''ہم لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے، ان کے سوالوں کا کیا جواب دیں گے......؟''

''آپ کو اپنی بیٹی کی عزت سے زیادہ لوگوں کو منہ دکھانے کی فکر ہے......'' مومنہ چیخی۔

''آہستہ بات کرو...... گھر میں دس ملازم ہیں، کیوں تماشا بنانا چاہتی ہو؟'' میں نے اسے گھرکا۔

"مما...... اطہر کی مہینے میں پندرہ دن فلائٹ ہوتی ہیں اور ان سارے دنوں میں دن کو تو گھر میں ملازمین ہوتے ہیں مگر جونہی کام ختم کر کے سب ملازمین اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے ہیں، میں اکیلی خوف زدہ ہو جاتی ہوں...... مجھے انکل سے ڈر لگتا ہے مما...... وہ مجھے عجیب انداز سے دیکھتے ہیں، پہلے پہل تو میں جانتی ہی نہ تھی اس لیے لاعلمی میں اپنے کمرے کا دروازہ بھی لاک نہ کیا...... ایک دن وہ میرے کمرے میں آ گئے تھے مما!"

"کوئی بات کرنے آئے ہوں گے بیٹا......"

"پلیز مما...... آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟"

"تمہارے باپ کی عمر کے اور اسی طرح محترم ہیں بیٹا!" میں نے لہجے میں نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"میں رات کو اپنے کمرے میں بستر پر جاگ کر بیٹھی رہتی ہوں، یہی نہیں مما، میں اپنے پاس چاقو رکھ لیتی ہوں کہ اگر کبھی وہ دروازے کا لاک کھول کر یا دروازہ توڑ کر کمرے میں داخل ہو جائیں تو......" وہ رو رہی تھی۔

"وہ ایسا کیوں کریں گے بیٹا!" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ تو اس قدر شفیق ہیں......"

"ان کی شفقت میں ہوس ہے مما...... اطہر بھی اس بات کو نہیں سمجھتے...... میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں۔" وہ اپنی ضد پر قائم رہی، میں نے عابد سے بات کی تو انہوں نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ تب ہم نے سوچا کہ اطہر اب کی بار فلائٹ سے آئے گا تو اس سے بات کریں گے کہ علیحدہ گھر لے کر مومنہ کو رکھے، کھل کر اس سے بات نہ کی جا سکتی تھی مگر گول مول لفظوں میں تو مقصد بیان کیا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

"آنٹی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مومنہ میری عدم موجودگی میں بابا کو اس طرح پریشان بھی کر سکتی ہے۔" ہمارے بات کرنے سے قبل ہی اطہر گھر پہنچا تو یہ جان کر کہ مومنہ میکے میں ہے، یہیں چلا آیا۔

"کیا پریشان کیا ہے بیٹا اس نے تمہارے بابا کو؟" میں نے ابرو اچکا کر پوچھا۔ کرم چائے پیش کر رہا تھا، اطہر نے چائے لینے سے انکار کر دیا، کرم نے باقی لوگوں کو چائے دی اور باہر نکل گیا۔

"بابا نے جو کچھ مجھے بتایا ہے اس پر مجھے یقین نہیں تھا مگر اب جبکہ مومنہ میرے بابا پر الزام لگا رہی ہے تو میں اسے بتا دوں کہ میں مر کر بھی اپنے بابا پر شک نہیں کر سکتا...... مومنہ خود ہی ایسی بدکردار ہو گی کہ میری عدم موجودگی میں اس نے میرے بابا پر......" اس نے نہایت گھٹیا الفاظ استعمال کیے جو اس کی شخصیت کے برخلاف تھے۔ "شروع کر دیے......"

"زبان سنبھال کر بات کرو برخوردار......" عابد کا ایسا لہجہ میں نے کبھی نہ سنا تھا۔ "تم میری فرشتوں جیسی معصوم بیٹی پر کیچڑ اچھال رہے ہو......"

"آپ کی بیٹی میرے فرشتوں جیسے معصوم باپ پر کیچڑ اچھال رہی ہے انکل!" وہ دوبدو بولا۔ "آپ نے اسے اچھے اور برے کی تمیز ہی نہیں سکھا کر بھیجا۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں اطہر......" مومنہ گھگیائی تھی۔ "میں جھوٹا الزام نہیں لگا رہی...... میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ بات کہنے کو تیار ہوں، آپ انکل سے کہیں کہ وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ وہ میرے کمرے میں اور میرے بستر تک نہیں آئے تھے...... اور یہ کہ وہ مجھے عجیب، عجیب باتیں آپ کی عدم موجودگی میں کہتے ہیں کہ نہیں؟" وہ سسکی۔ "میں سچ کہہ رہی ہوں پاپا......" اس نے باپ کی طرف دیکھا، میں نے اس کا چہرہ دیکھا، اس میں مجھے کسی اور چہرے کا عکس دکھائی دیا، جس پر میں نے الزام دھرا تھا، جس کی سچائی پر میں نے شک کیا تھا، جس نے کہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے مگر میں نے اسے جھوٹ سمجھا تھا،

آج وقت نے وہ لمحہ میرے روبرو لا کھڑا کیا تھا۔

''بند کرو اپنی بکواس......'' وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا ہاتھ ہوا میں ہی رک گیا جو شاید وہ جوشِ جذبات میں مومنہ پر اٹھا لیتا جو وہ ہمارے گھر پر نہ ہوتا...... ''نام دیکھو اور بکواس سنو اس کی اور حرکتیں دیکھو۔'' وہ مسلسل بک رہا تھا۔

''فوراً اس گھر سے دفع ہو جاؤ تم اور دوبارہ شکل نہ دکھانا......'' عابد چیخے۔ ''تم میں مردانگی ہوتی تو تم میری بیٹی پر ہاتھ نہ اٹھاتے......''

''آپ سب ایک ہی جیسے ہیں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ''سمجھ لوں گا میں آپ لوگوں کو...''

''تم فوراً میری بیٹی کو فارغ کرو ورنہ میں خلع کے ذریعے بھی تم سے نجات حاصل کر سکتا ہوں، بے غیرت کہیں کے......'' عابد کا پارہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔

''تم لوگوں کو میں عدالتوں میں ایڑیاں رگڑواؤں گا......'' وہ بک بک کرتا نکل گیا۔ کہیں سے وہ ایک پڑھا لکھا مہذب انسان نہیں لگ رہا تھا۔



کرم چائے کے برتن اٹھانے آیا تو اسے اندر کا منظر کچھ کچھ سمجھ میں آ گیا تھا، وہ خاموشی سے اپنا کام کرنے لگا، برتن اٹھا کر اس نے کپڑے سے میز صاف کرنا شروع کی۔

''کرم......'' میری آواز کسی کنویں سے آئی تھی۔

''جی باجی......'' اس نے سر اٹھا کر میری طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔

''تمہارے گھر والے کتنے دنوں میں یہاں آ سکتے ہیں؟''

''جی؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے معاف کر دو کرم......'' میرے آنسو بہہ نکلے۔ ''مجھے دل سے معاف کر دو۔''

''کیسی بات کر رہی ہیں باجی!'' اس نے ندامت سے کہا۔ ''میں نے آپ کو ہمیشہ اپنی ماں اور بڑی بہن کی طرح سمجھا ہے......''

''مگر میں نے نہیں کرم......'' میں نے اعتراف کیا۔ ''تمہاری اتنی وفاداری کے باوجود...... تم نے مومنہ کو ہمیشہ اپنی بیٹی کی طرح سمجھا مگر میں خوب صورت کے لیے اس انداز سے نہیں سوچ سکی......'' میں اس آئینے کے روبرو کھڑی تھی جس میں مجھے اپنا چہرہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا...... ''مجھے معاف کر دو کرم، اپنے بیوی بچوں کو یہاں لے آؤ، دو کوارٹر خالی کروا لیتے ہیں، خوب صورت اور مومنہ کا مقدمہ ایک ہی عدالت میں اور ایک ہی وکیل کے ذریعے لڑا جائے گا۔''

''وہ وہاں ٹھیک ہیں باجی......'' کرم ہچکچایا۔

''باجی کہہ رہی ہیں تو مان جاؤ ناں کرم......'' عابد نے کہا۔ ''چلو یہاں نہ سہی، کہیں قریب کرائے کا کوئی مکان دیکھ لو، کرایہ میں تمہیں دے دیا کروں گا۔''

بیٹیاں نازک آبگینوں جیسی ہوتی ہیں، انہیں ٹھیس پہنچے تو ماں باپ کے دلوں کو ٹھیس پہنچتی ہے...... کہنے کو تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ دوسرے کی بیٹیاں ہماری بیٹیوں جیسی ہیں مگر حقیقت میں ایسا کہاں ہوتا ہے۔ میں نے خوب صورت کے لیے تو بہ آسانی سوچ لیا تھا کہ وہ بدنیت ہو سکتی ہے مگر وہی لمحہ جب میری بیٹی پر آیا تو مجھے اس کے کہے بنا بھی یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے...... وہی سچ جو خوب صورت بھی کہہ رہی تھی مگر میں نے اسے جھوٹ سمجھا تھا، شاید دانستہ...... میں اس کی خوب صورتی سے خوف زدہ ہو گئی تھی کہ میرا سب رشتوں سے اعتماد اٹھ گیا تھا مگر اب ازالے کا وقت آ گیا تھا، وہ لمحہ آ گیا تھا جب میں نے کسی کے کہے بنا جان لیا تھا کہ اپنی غلطی پر معافی جب بھی موقع ملے، مانگ لینی چاہیے، اس سے قد بھی چھوٹا نہیں ہوتا...... بلکہ اللہ کی نظر میں تو بندے کا قد بلند ہو جاتا ہے۔



"نہیں، نہیں بالکل نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا، ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے۔" صبا بیگم اتنی زور سے چیخیں کہ دونوں لڑکیاں حیرانی سے انہیں دیکھنے لگیں کہ ایسی کون سی انہونی بات ہوئی ہے جس کا اتنا شدید ردِعمل...... اس سے زیادہ وہ ماں کی حالت پر پریشان ہوئیں جو یہ بات سن کر پاگلوں کی طرح نہیں، نہیں کی گردان کیے جارہی تھیں۔

انعم جلدی سے پانی کا گلاس بھر لائی اور ان کے ہونٹوں سے لگانا چاہا تو انہوں نے ہاتھ سے گلاس ایک طرف کیا اور بولیں۔

"میں نے کہہ دیا ہے کہ آئندہ یہ بات کوئی اپنے منہ سے نہیں نکالے گا اور میں بھی کبھی اس بات کی اجازت نہیں دوں گی۔"

"پہلے کبھی اجازت دی ہے؟" ماہم نے برا سا منہ بنایا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ صبا بیگم نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔

"امی ہمیشہ ہی ایسا کرتی ہیں۔" ماہم نے نروٹھے پن سے کہا۔ انعم نے بھی دل ہی دل میں اس کی تائید کی مگر چھوٹی بہن کی تسلی کی خاطر بولی۔

"چلو کوئی بات نہیں، ان کی مرضی...... نہیں ہے تو نہ سہی۔"

"مرضی کی کیا بات ہے؟" ماہم غصے سے بولی۔ "یہ کوئی تفریح تھوڑی ہورہی ہے، مجبوری ہے اس میں تو امی کو کچھ خیال کرنا چاہیے۔ یہ کیا کہ ہمیشہ اپنے اصول اور قاعدے...... عجب قیدیوں والی زندگی ہے۔ سچ میرا کتنا دل کرتا ہے کہ سہیلیوں اور محلے میں مایوں، مہندی میں دیر تک رکنے کو۔ انجوائے کرنے کو مگر امی ہمیشہ ساتھ لے کر جاتی ہیں اور ساتھ ہی واپس لے آتی ہیں۔ یہ نہیں کہ خود گھر آ کر آرام کرلیں اور ہمیں وہاں اور لوگوں کی طرح ان کے ساتھ انجوائے کرنے دیں...... اور کبھی کہو تو وہی نصیحتوں کے انبار ...... زمانے کی خرابی کا رونا...... وغیرہ وغیرہ......" دل اتنا خراب ہورہا تھا کہ ماہم نے بھی دل کھول کر بھڑاس نکالی حالانکہ اس سے بیشتر ہمیشہ ایسے موقع پر دونوں چاہے ناراضی

طوفان کے بعد

فرحت احمد



سے ہی ان کے کہنے پر سر جھکا لیا کرتی تھیں اور دو چار دنوں میں بھول، بھال جاتی تھیں۔

''بری بات ......'' انعم نے پیار سے بہن کو اپنے ساتھ لگایا اور کہا۔ ''ماں ہیں، ان کی بات ماننی چاہیے...... وہ ہمارا برا تھوڑی چاہیں گی، چلو غصہ تھوک دو۔''

''لیکن یہ کوئی غیروں کی بات تھوڑی ہے، یہ تو گھر کی بات ہے۔'' اور صبا بیگم جو اپنے رویے سے خود پریشان و پشیمان تھیں۔ دونوں لڑکیوں کے کمرے کی جانب بڑھیں تو ان کے درمیان ہوتی گفتگو سن کر وہیں رک گئیں...... اور پھر جب ماہم نے گھر کی بات ہے کہا تو وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔

''ہاں وہ بھی گھر کی ہی بات تھی۔'' دل ہی دل میں کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی جانب لوٹ گئیں اور بیڈ پر نڈھال سی ہو کر چھت کی طرف دیکھنے لگیں...... اور پھر ماہ و سال کا فاصلہ لمحوں میں طے ہو گیا۔

☆☆☆

یہ اس زمانے کی بات ہے جب صبا بیگم ...... صبا بیگم نہیں بلکہ نٹ کھٹ سی صرف صبا تھی جو اپنے والدین اور بڑی بہن کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہی تھی۔

صبا کے والدین اپنی دونوں بچیوں میں مگن ایک بھرپور اور خوشگوار زندگی بسر کر رہے تھے۔ صبا کے دادا کی مختصر سی فیملی قیام پاکستان کے بعد ہندوستان سے پاکستان آنے والی اپنے خاندان کی واحد فیملی تھی۔ جس میں صبا کے دادا، دادی اور والد افضال احمد شامل تھے۔ افضال احمد کے والد ایک تعلیم یافتہ شخص تھے، جنہیں اپنی لیاقت سے یہاں ایک اچھی سرکاری نوکری مل گئی۔ انتھک محنت سے ایک نمایاں مقام بھی حاصل ہو گیا۔ ساتھ، ساتھ افضال احمد بھی تعلیمی مدارج طے کرتے چلے گئے۔

انڈیا اور پاکستان کے درمیان آمد و رفت کی بحالی کے بعد دونوں میاں، بیوی مع افضال احمد کے کئی دفعہ وہاں جا آچکے تھے۔ ابھی افضال احمد کی شادی کا سوچا بھی نہیں تھا کہ بیوی کی اچانک موت نے افضال کے والد کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا...... اور اس سوچ کو انہوں نے عملی جامہ اس طرح پہنایا کہ جلد ہی اپنے بیٹے افضال احمد کے لیے انڈیا سے ہی اپنی بھتیجی ارجمند بانو کو بیاہ لائے جو اکلوتی ہونے کے ساتھ، ساتھ والدین کے سائے سے بھی محروم تھیں۔ اور جنہیں ان کے بڑے تایا نے پالا تھا۔

ارجمند بانو فطرتاً سیدھی سادی اور گھریلو لڑکی ثابت ہوئیں اور جلد ہی انہوں نے میاں کے ساتھ، ساتھ سسر کے دل میں بھی جگہ بنالی...... اور یوں زندگی اطمینان و سکون سے بسر ہونے لگی مگر والد کو یہ خوشیاں تا دیر دیکھنا نصیب نہ ہوئیں اور ایک دن اچانک ہی وہ دنیا سے منہ موڑ گئے۔ ان کے انتقال کے بعد انڈیا سے رہا سہا ناتا بھی ٹوٹ گیا...... اور اب پاکستان میں افضال احمد اور ارجمند بانو کا حقیقی رشتے دار تو کوئی تھا نہیں ...... بس دوست احباب اور ملنے جلنے والے ہی تھے جنہیں وہ رشتے دار گردانتے تھے۔ گزرتے وقت کے ساتھ افضال احمد اور ارجمند بانو کی گود میں یکے بعد دیگرے دو پیاری، پیاری سی بیٹیوں دعا اور صبا کا تحفہ آ گیا۔ پھر پلک جھپکتے ہی وہ شادی کی عمروں تک بھی آ گئیں...... دونوں لڑکیاں تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ، ساتھ ماں کی طرح خوب صورت اور سلیقہ شعار بھی تھیں۔

☆☆☆

''سنیں آپ کا کیا خیال ہے۔ مجھے تو لڑکا بہت اچھا لگا ہے۔'' ارجمند بانو نے دعا کے لیے آئے رشتے کے بارے میں شوہر سے استفسار کیا۔

''لڑکا تو مجھے بھی اچھا لگا ہے۔ تعلیم یافتہ ہے، نوکری بھی پکی ہے۔ گھر بھی اپنا ہے مگر خاندان کا کچھ زیادہ اتا پتا نہیں......؟'' وہ فکرمندی سے بولے۔

''بتایا تو ہے بھائی صاحب نے ہماری طرح ہی ان کے والدین بھی اکیلے پاکستان آ گئے تھے اور

ب اس بیچارے کے والدین کا بھی انتقال ہوگیا تو یہ اکیلا رہ گیا ہے...... بھائی صاحب لڑکے کے ساتھ، ساتھ اس کے والدین کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور کیا چاہیے۔''

''ہاں یہ تو ہے، ہمارے جیسے ہی حالات ہیں، اس کا تو ہم پر زیادہ حق بنتا ہے۔ ویسے میں اس کے محلے اور آفس سے بھی معلومات کرلوں گا۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے...... پھر ہم جلد ہی دعا کی شادی کردیں گے تاکہ ایک فرض سے تو سبکدوش ہوں۔'' ارجمند بانو نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ اور یوں باقی کے تمام معاملات جلد ہی خوش اسلوبی سے انجام پاگئے اور دعا اپنے والدین کی ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اپنے پیا گھر سدھاری۔

☆☆☆

فیاض نہ صرف اچھا داماد بلکہ دعا کے لیے بہت اچھا شوہر بھی ثابت ہوا۔ جہاں قسمت نے دعا کو دو بیٹیوں سے نوازا وہیں فیاض بھی ترقی کر کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتا گیا۔ ترقی کے ساتھ اس کا تبادلہ بھی دوسرے شہر ہوگیا۔ جسے ان لوگوں نے نوکری کا حصہ سمجھ کر ہنسی خوشی قبول کیا...... اور وہیں سیٹل ہوگئے۔

''میرا خیال ہے دعا اور امی کو بلالیا جائے...... اب تم سے کام بھی نہیں ہورہا اور دوسرے اس مرتبہ تمہاری حالت بھی زیادہ ٹھیک نہیں ہے۔'' فیاض ڈاکٹر کی ہدایت اور دعا کی گرتی ہوئی حالت کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''سوچ تو میں بھی یہی رہی ہوں، حالانکہ پہلے دونوں دفعہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا مگر اس مرتبہ تو سمجھ نہیں آرہا کہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔ بلڈ پریشر الگ ہائی رہنے لگا ہے۔'' دعا پریشانی سے بولی۔

''چلو تم پریشان مت ہو، اللہ بہتر کرے گا۔'' فیاض نے اسے تسلی دی۔

دعا تیسری مرتبہ ماں بننے کے مرحلے میں تھی۔ پہلے دونوں مرتبہ تو ارجمند بانو کے قریب اسی شہر میں تھی تو وہ ہر مرحلے پر موجود ہوتیں مگر اس دفعہ ماں سے دور دوسرے شہر میں اور اس پر طبیعت بھی کچھ زیادہ ہی خراب تھی تو عجیب سی پریشانی تھی اسی لیے گھبرا کر ماں کو آنے کا خط لکھ دیا۔

ارجمند بانو، دعا کا خط ہاتھ میں لیے پریشانی سے سوچ رہی تھیں۔ پہلے دونوں مرتبہ تو ارجمند بانو نے دعا کو اپنے گھر بلوالیا تھا۔ فیاض بھی یہیں سے آفس چلا جاتا تھا۔ کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر اس دفعہ تو دعا ان کے گھر بھی نہیں آسکتی تھی کہ فیاض کا آفس کا مسئلہ تھا اور دوسرے بچیاں بھی باپ سے دور نہیں رہ سکتی تھیں کہ علیحدہ رہنے کی وجہ سے صرف ماں، باپ سے ہلی ہوئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ دعا نے امی کو بلوانے کا فیصلہ کیا۔

ادھر ارجمند بانو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی جس کا دعا کو علم نہیں تھا۔ دوسرے اگر وہ کسی طرح چلی بھی جاتیں تو گھر پر افضال احمد کے آفس جانے کے بعد صبا بالکل اکیلی رہ جاتی جو کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ سو انہوں نے باہم مشورے سے صبا کو دعا کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے صبا گھر اور بچیوں دونوں کو اچھی طرح سنبھال سکتی تھی۔ یوں افضال احمد صبا کو بڑی بہن کے گھر چھوڑنے روانہ ہوگئے...... اور دوسرے دن ہی اسے چھوڑ کر واپس بھی لوٹ آئے کہ بیوی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ صبا کو بہن کے پاس آئے پندرہ دن ہوگئے تھے۔ دعا کی طبیعت تو ویسی ہی چل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ بہت...... چڑچڑی اور آدم بیزار ہوگئی۔ صبا نے گھر کو اچھی طرح سنبھال لیا تھا۔ بچیاں بھی اس سے مانوس ہوگئی تھیں۔ فیاض نے بھی اطمینان کی سانس لی تھی۔ نہیں تو وہ گھر، آفس اور بیمار بیوی کے درمیان گھن چکر بن کر رہ گیا تھا۔ صبا کے گھر اور بچیوں کو سنبھال لینے سے اب وہ گھر اور بچیوں کی جانب سے پوری طرح مطمئن تھا جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتا رہتا تھا اور

صبا کی تعریف کے ساتھ شکر گزار بھی تھا۔

''آنی دودھ چاہیے۔'' تین سالہ ندا نے ناشتا بناتی صبا کے پیچھے آکر بسورتے ہوئے کہا۔

''ارے جاگ گئیں، السلام علیکم۔'' صبا نے حسب معمول سلام سے ابتدا کی۔ ''چلو پہلے جلدی، جلدی واش روم جا کر برش کرتے ہیں پھر مزے سے دودھ کے ساتھ ناشتا بھی کریں گے۔ کیوں ٹھیک ہے ناں......'' صبا نے جلدی، جلدی فیاض کا ناشتا ٹیبل پر لگایا اور اسے ناشتا کا کہہ کے خود ندا کے ساتھ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی جہاں سے چھوٹی انعم کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ اتنے دنوں میں صبا نے بہلا، پھسلا کر بچیوں کو اپنے پاس سلانا شروع کردیا تھا۔ ویسے بھی دعا کے چڑچڑے پن کی وجہ سے بچیاں اس سے ڈری سہمی رہتی تھیں۔ اس لیے خالہ کی محبت اور توجہ پا کر اس کی جانب بڑھنے میں دیر نہیں لگی اور وہ صبا کے آگے پیچھے گھومنے لگیں۔

☆☆☆

''صبا، صبا......'' دعا کی درد میں ڈوبی آواز جیسے ہی صبا کے کانوں میں پڑی وہ دوڑتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف گئی۔ اس کی حالت اور چہرہ دیکھ کر اس کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''صبا جلدی کرو فیاض کو فون کرو اور انہیں ایمبولینس کا بھی کہنا۔'' دعا نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے کہا اور یوں دعا ایک نئی زندگی کو دنیا میں لانے کے لیے اسپتال پہنچ گئی۔

☆☆☆

''خالہ جان دعا کریں...... دعا آپی خیریت سے......'' اس سے آگے صبا سے بولا نہیں گیا اور وہ بے تحاشا رونے لگی۔

''نہ بیٹے ایسے نہیں روتے، اللہ سب خیر کرے گا... انشاء اللہ! دیکھو بچیاں دیکھیں گی تو پریشان ہوگی۔ میں بھی دعا کر رہی ہوں تم بھی دعا کرو انشاءاللہ ......سب ٹھیک ہوگا۔''

دعا کو اسپتال گئے دو دن ہوگئے تھے۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ فیاض مسلسل اسپتال میں تھے اور دعا کے پاس محلے کی ایک نیک اور ہمدرد خاتون کو چھوڑ گئے جن کی وجہ سے دعا کو بہت تسلی اور ڈھارس تھی۔ آخر تیسرے دن دعا نے تیسری بیٹی کو جنم دیا۔ بیٹی سے زیادہ دعا کی نئی زندگی کی خوشی تھی۔ صبا ایک بار پھر خوشی سے رو دی۔ خالہ نے گلے سے لگایا اور کچھ کھانے پینے کی تاکید کی کیونکہ جب سے دعا گئی تھی اس نے ڈھنگ سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔

☆☆☆

''فیاض میرا خیال ہے آج آپ گھر چلے جائیں کیونکہ میری طبیعت بھی اب ٹھیک ہے اور مجھے گھر اور بچیوں کی فکر ہو رہی ہے۔ ویسے تو صبا موجود ہے مگر بچیاں آپ کو یاد کر رہی ہوں گی۔ پہلے مجبوری تھی مگر اب اللہ کا شکر ہے، میں ٹھیک ہوں تو آپ گھر جائیں۔ دو ایک دن میں، میں بھی آجاؤں گی آپ کل صبا اور بچیوں کو لے کر آجایئے گا۔ مجھے بھی ان کی بہت یاد آرہی ہے اور آپ گھر جا کر ریسٹ کرلیں گے تو تھکن بھی اتر جائے گی۔''

''ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو...... تھکن اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے دماغ ماؤف سا ہو رہا ہے۔ گھر جا کر آرام کروں گا تو فریش ہو جاؤں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں...... اپنا خیال رکھنا۔'' فیاض نے محبت سے دعا کا ہاتھ دبا کر تاکید کی اور اللہ حافظ کہتا ہوا چلا گیا۔

☆☆☆

''صبا، صبا۔'' پڑوس سے خالہ گھبرائی ہوئی گھر میں داخل ہوئیں۔

''کیا ہوا خالہ...... سب خیریت تو ہے؟''

''خدا کرے سب خیریت ہو۔'' خالہ روہانسے لہجے میں بولیں۔ ''میرے بھانجے کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ میں

وہاں جارہی ہوں، واپسی کا کچھ پتا نہیں...... ویسے تو فیاض آج رات آنے کا کہہ کرگیا ہے مگر وہ نہ آئے تو تم برابر سے سکینہ کو بلالینا۔ اکیلی پریشان مت ہونا......"

"دونہیں...... نہیں آپ اطمینان سے جائیں۔ میری فکر بالکل نہ کریں، میں کچھ نہ کچھ کرلوں گی۔"

صبا نے انہیں تسلی کے ساتھ اطمینان دلایا تھا۔ خالہ جیسے آئی تھیں الٹے پیروں واپس لوٹ گئیں۔

☆☆☆

خالہ کے جانے کے بعد صبا گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگئی اور دن بھر کی مصروفیت کے بعد رات کو تھک ہار کر بچیوں کو سلا کر تمام دروازے کھڑکیاں چیک کرکے خود بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ فیاض بھائی کے آنے کی امید اتنی قوی تھی کہ اس نے سکینہ خالہ کو بھی آنے کا نہیں کہا۔ دوسرے اس نے سوچا کہ اگر فیاض بھائی نہیں بھی آئیں گے تو وہ اکیلی ہی رہ جائے گی۔ گھر بھی سب طرف سے محفوظ ہے فکر کی کوئی بات نہیں۔ دوسرے وہ اتنی پریشانی، تھکن اور رت جگوں کے بعد کچھ بے فکری سے اپنی نیند سونا چاہتی تھی۔ فیاض اپنے پاس موجود چابی سے دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوا تو ایک جامد سناٹے نے اس کا استقبال کیا...... رات ایک بجے کا وقت تھا۔ وہ بھی کسی کو بے آرام نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھا...... مگر بچیوں کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش کو رد نہیں کر پایا تو دبے پاؤں صبا کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ جہاں خالہ کی غیر موجودگی محسوس کرکے حیران تو ہوا مگر اب صرف یہ پوچھنے کے لیے تو نہیں جگا سکتا تھا۔ اس لیے صرف سوچ کر رہ گیا۔ دونوں بچیاں صبا کے دائیں، بائیں سورہی تھیں۔

☆☆☆

فیاض تین دن سے بچیوں سے دور تھا۔ اچانک انہیں اپنے ساتھ سلانے کی خواہش جاگی تو صبا سے

محبت

محبت اس سے ہوتی ہے جس کی خامیاں بھی اچھی لگیں اور شادی اس سے جس کی خوبیاں اچھی لگیں۔ محبت انسان ہمیشہ اپنے جیسے سے کرتا ہے۔ یعنی جو بری عورت سے محبت کرتا ہے وہ اچھا آدمی نہیں ہوسکتا۔ جو برے آدمی سے محبت کرتی ہے وہ ماں کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتی۔

کہتے ہیں محبت اس سے ہوتی ہے جو خوب صورت ہو، حالانکہ خوب صورت وہ ہوتا ہے جس سے محبت ہو۔

میرا دوست (ف) کہتا ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے، اس کی محبوبہ کو دیکھ کرتو اس کی بات کا یقین آجاتا ہے۔

مرسلہ: یاسمین اقبال، سنگھ پورہ لاہور

نظریں چرا کر باری، باری دونوں بچیوں کو اپنے کمرے میں لا سلایا۔ لائٹ بند کرنے اور صبا کو چادر اوڑھانے کے خیال سے جب دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو نہ چاہتے ہوئے بھی سوئی صبا کو دیکھنے لگا......اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ رات تنہائی، مہینوں کی تھکن اور ٹینشن نے نجات کے لیے ایک ایسا راستہ اپنا لیا کہ ایک شریف، مہذب، پڑھا لکھا اور اتنا قریبی رشتہ رکھنے والا شخص انسان کے رتبے سے ایسے گرا کہ خود سے بھی نظر ملانے کے قابل نہ رہا۔ صبا کو تو اس ناقابلِ یقین صورتِ حال سے ایسا شاک پہنچا کہ وہ سکتے کی کیفیت سے نکل ہی نہیں پائی۔

"اُف یہ میں نے کیا کردیا۔" اب فیاض اپنے کمرے میں بیٹھا اپنے آپ کو ایک گرا ہوا انسان سمجھ رہا تھا کہ نہ جانے وہ کون سا ایسا کمزور لمحہ تھا جس کی زد

سے وہ بچ نہیں سکا تھا اور وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ بہت ندامت اور شرمندگی محسوس کر رہا تھا......

اور اسی ندامت، شرمندگی اور خوف کے زیر اثر وہ صبح ہی صبح نہ جانے کہاں چلا گیا تھا اور صبا اپنے بکھرے وجود، کھلی آنکھوں اور خالی الذہنی سے نہ جانے کب سے لیٹی چھت کو تکے جا رہی تھی۔ اس میں تو رونے کا بھی حوصلہ نہیں تھا۔ آنسو جیسے جم گئے تھے کہ اچانک ندا کی آواز اسے واپس حال میں کھینچ لائی۔

''آنی اٹھو...... پاپا بھی نہیں ہیں اور آپ بھی سو رہی ہیں۔ ہمیں بھوک لگی ہے۔''

''جلدی اٹھو، مجھے دودھ۔'' انعم اپنی توتلی زبان میں بولی۔ صبا بچیوں کی خاطر اپنے حواس مجتمع کر کے اٹھ بیٹھی۔ ابھی تو وہ اپنی بربادی پر ماتم کناں بھی نہیں ہوئی تھی۔ کوئی داد فریاد بھی نہیں کی تھی۔ کسی اپنے سے لپٹ کر روئی بھی نہیں تھی کہ ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی اور پھر وہ اس بری طرح ٹوٹ کر روئی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں تو آنکھیں دل بھی رو دیے۔ اسی قیامت کی رات کی صبح اچانک دعا کا بلڈ پریشر شوٹ کر گیا اور وہ بغیر کسی سے کچھ کہے سنے ہی سب سے منہ موڑ گئی۔ اطلاع ملتے ہی والدین بھی پہنچ گئے اور انہیں دیکھ کر صبا اپنی بربادی اور بہن کی المناک موت پر اس طرح روئی کہ مانو حواس ہی کھو بیٹھی۔

☆☆☆

آج دعا کو گزرے دسواں دن تھا۔ گھر میں صبا، ارجمند بانو، افضال احمد، فیاض اور تینوں بچیاں تھیں۔ رشتے دار کوئی تھے نہیں۔ ملنے ملانے والے دوست احباب اسی وقت آئے تھے جن کو بعد میں اطلاع ملی وہ ان دس دنوں میں تعزیت کے لیے آ چکے تھے اور اب تو روٹین لائف شروع ہو گئی تھی۔ فیاض آفس جانا شروع ہو گیا تھا اور آفس سے آنے کے بعد زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتا تھا اور وہیں بچیوں کے ساتھ مصروف رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے صبا سے بھی بہت کم سامنا ہوتا تھا۔

صبا خود دل پر پتھر رکھے گھر کے کام اور دو معصوم بچیوں اور دس دن کی ننھی سی جان کی دیکھ بھال میں اتنی مصروف رہتی تھی کہ اپنے اوپر گزرا سانحہ ایک خواب محسوس ہوتا تھا مگر حقیقت کوئی بدل نہیں سکتا تھا۔ صبا تو اب تک اپنی بربادی کی داستان اپنی ماں کو بھی نہیں بتا پائی تھی۔ قیامت در قیامت نے ایسی قیامت مچائی کہ کچھ بتانے کا یارا ابھی نہیں رہا۔

ادھر ارجمند بانو بچیوں کی صبا سے انسیت، لگاؤ اور صبا کی پُرخلوص محبت اور خیال دیکھ کر کچھ اور ہی سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

صبا ننھی ماہم کو فیڈر سے دودھ پلا رہی تھی تو ارجمند بانو اس کی حالت سے بے خبر اس کے پاس بیڈ پر آ کر بیٹھیں اور گویا ہوئیں۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب کیا کریں۔ ہمیں بھی اب واپس جانا ہے۔ یہاں گھر اور بچیوں کو دیکھنے والا کوئی بھی نہیں اور ہم بچیوں کو اپنے ساتھ بھی نہیں لے جا سکتے کیونکہ بچیاں باپ سے بہت مانوس ہیں۔ ماں کی محبت سے تو ویسے ہی محروم ہو گئی ہیں اب اس طرح باپ کی شفقت اور سائے سے بھی محروم ہو جائیں گی۔''

صبا نے سب کچھ سنا مگر بولی کچھ نہیں۔ ارجمند بانو نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر بولیں۔

''میں یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ اگر فیاض گھر اور بچیوں کی خاطر دوسری شادی کرتا ہے تو آنے والی گھر کو تو اپنا سمجھے گی مگر بچیوں کو نہیں...... یہ رشتہ ہوتا ہی ایسا ہے۔ میرا تو بچیوں کا سوچ، سوچ کر دل پھٹا جا رہا ہے۔ بیٹی کا غم کیا کم ہے، جوان معصوموں کا خیال الگ مارے جا رہا ہے۔''

صبا اب بھی خاموش رہی۔ اچانک انہوں نے اپنا ہاتھ صبا کے ہاتھ پر رکھا اور بولیں۔

''تم بن جاؤ ان کی ماں' بیٹی۔'' صبا بے اختیار نظریں اٹھانے پر مجبور ہوئی...... مگر بولی پھر بھی کچھ نہیں۔

''میری مری بیٹی اور تمہاری مرحومہ بہن کی نشانیاں ہیں...... رُل جائیں گی...... ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ صرف دل ہی دُکھاتے رہیں گے۔ بڑھاپے میں یہ دن بھی دیکھنا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ ایسی بے بسی سے روئیں کہ صبا انہیں گلے لگا کر خود بھی رو پڑی۔

☆☆☆

صبا نے فیصلہ کرنے میں زیادہ دن نہیں لگائے، یوں چہلم کے فوراً بعد صبا کا نکاح فیاض سے سادگی سے کر کے ارجمند بانو اور افضال احمد اپنے گھر سدھارے۔

صبا نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اس فیصلے کی پہلی وجہ تو صرف اور صرف بچیوں کی آئندہ زندگی اور ان سے صبا کا لگاؤ اور محبت تھی اور دوسری وجہ خود صبا تھی۔ کیونکہ ابھی نہیں یا یہاں نہیں تو کہیں نہ کہیں شادی تو اسے کرنی پڑتی۔ اور یہ وہ جانتی تھی کہ اس حقیقت سے آگاہ ہونے پر کوئی اُسے کیسے قبول کرے گا اور کسی کو دھوکا دینے کے وہ حق میں نہیں تھی۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ اسی کے حق میں فیصلہ دے، دے جو خود ہی قصوار بھی ہو، دوسرے اگر کسی نے کوئی جرم یا گناہ کیا ہو تو اس کو اس کی سزا تو ملنی چاہیے ناں...... اور یہ سزا صبا نے اپنے مجرم کے لیے خود تجویز کی تھی۔

شادی کو ہفتہ ہو چلا تھا مگر ابھی تک صبا اور فیاض ندی کے دو کناروں کی طرح چل رہے تھے۔ فیاض جرم اور شرمندگی کی وجہ سے صبا سے سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔ صبح ہی صبح آفس چلے جانا اور رات گئے گھر لوٹنا...... اِدھر صبا بھی نکاح جیسے پاکیزہ بندھن میں بندھنے کے باوجود اپنے دل ودماغ کو کسی طرح بھی اس کی جانب مائل نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ یہ بندھن تو دعا کی موت کی صورت میں بحالتِ مجبوری بندھا ہے۔ اگر دعا زندہ ہوتی تو یہ رشتہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ ایسی صورت میں اس کی زندگی تو برباد ہو ہی جانی تھی۔ کیا ایسے جرم کی کوئی معافی ہو سکتی تھی۔ دونوں اپنی، اپنی جگہ ان ہی سوچوں اور الجھنوں میں گرفتار ایک دوسرے سے نظریں چرائے زندگی گزارنے کے لیے کوئی درمیانی راستہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ اچانک ایک اور طوفان نے ان کی زندگیوں کا نظام ایک مرتبہ پھر درہم برہم کر دیا۔

فیاض ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ بچیاں ماں کے بعد باپ سے بھی محروم ہو گئیں اور صبا کے حصے میں اپنے اوپر ہونے والی بربادی کے بعد ایک ہولناک مگر پُرسکون سناٹا آیا تھا۔

☆☆☆

صبا کے والد ریٹائرڈ ہو چکے تھے...... اور دونوں طرف اللہ کے فضل سے مالی پریشانی کوئی نہیں تھی اس لیے صبا نے امی، ابا کے مشورے سے ایک نئی جگہ پر گھر لے کر والدین کے ساتھ تین بچیوں کی بیوہ ماں کی حیثیت سے نئی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔

دیکھتے، دیکھتے بچیاں جوان ہو گئیں اور صبا کے والدین یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے۔ صبا بچیوں کے ساتھ پُروقار بیوہ کی زندگی گزار رہی تھی۔ رشتے دار نہ ہونے کی وجہ سے اس نئی جگہ پر لوگ تو لوگ... خود ان تینوں لڑکیوں کو بھی صبا کی پچھلی زندگی کی اصل حقیقت کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ وہ تو فقط یہ جانتی تھیں کہ ہمارے والد ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے تھے اور ہم اپنے نانا، نانی کے پاس اپنی ماں کے ساتھ رہتے تھے۔ جن کا انتقال ان کے سمجھدار ہونے پر ہوا تھا۔

یہی وہ حالات اور واقعات تھے جن کی وجہ سے صبا بیگم بچیوں کے معاملے میں اتنی احتیاط پسند اور چوکنّی ہو گئی تھیں کہ آج بچیاں ان سے برانگیختہ تھیں اور نہ جانے کیا، کیا سوچ رہی تھیں۔ آج بھی ماضی جیسی صورتِ حال آ پڑی تھی۔ انعم اور ماہم سے بڑی

نداجس کی انہوں نے شادی کر دی تھی۔ ڈلیوری کے مرحلے میں تھی اور اس نے انعم یا ماہم میں سے کسی ایک کو اپنے گھر رہنے کے لیے کہا تھا۔ جسے سن کر ایک بار پھر... ماضی کی کتاب اپنی پوری جزئیات کے ساتھ صبا بیگم کے سامنے کھل گئی تھی۔ اور بچیوں کے تحفظ کی خاطر اب وہ اس کے ورق ان کے سامنے الٹنے پر مجبور تھیں۔ انہیں سب کچھ بتانا ضروری ہوگیا تھا۔ چاہے ان کا ماضی بے نقاب ہوجائے انہیں پروا نہیں تھی۔ وہ تو یہ چاہتی تھیں کہ ان کا دل ماں کی طرف سے صاف ہوجائے اور وہ بھی ان کی احتیاط پسندی اور روک ٹوک کی اصل وجہ جان سکیں۔ صبا بیگم نے کمرے میں جھانکا تو انعم، ماہم بیڈ پر پاؤں لٹکائے منہ بنائے بیٹھی نظر آئیں۔ شاید ان کے آنے سے پہلے کچھ بات کر رہی تھیں۔ صبا بیگم دونوں کے درمیان آبیٹھیں اور اچانک ضبط کھو کر پھوٹ، پھوٹ کر رو دیں۔ دونوں بیٹیاں ناراض ہونے کے باوجود سب کچھ بھول کر پریشان ہوگئیں۔ اور انہیں چپ کرانے اور تسلی دینے کی کوشش کرنے لگیں۔ ماہم دوڑ کر پانی لے آئی۔ رونے اور پانی پینے سے دل کا غبار ہلکا ہوا تو وہ گویا ہوئیں۔

''تم دونوں مجھے کیا سمجھتی ہو؟''

''ماں اور کیا......؟'' دونوں ایک ساتھ بولیں۔

''وہ تو میں ہوں مگر ایک ظالم اور سخت دل ماں...... کیوں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں......؟''

''نہیں، نہیں بالکل نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں، ہم ایسا نہیں سمجھتے، وہ تو ویسے ہی۔'' دونوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا وضاحت کریں۔

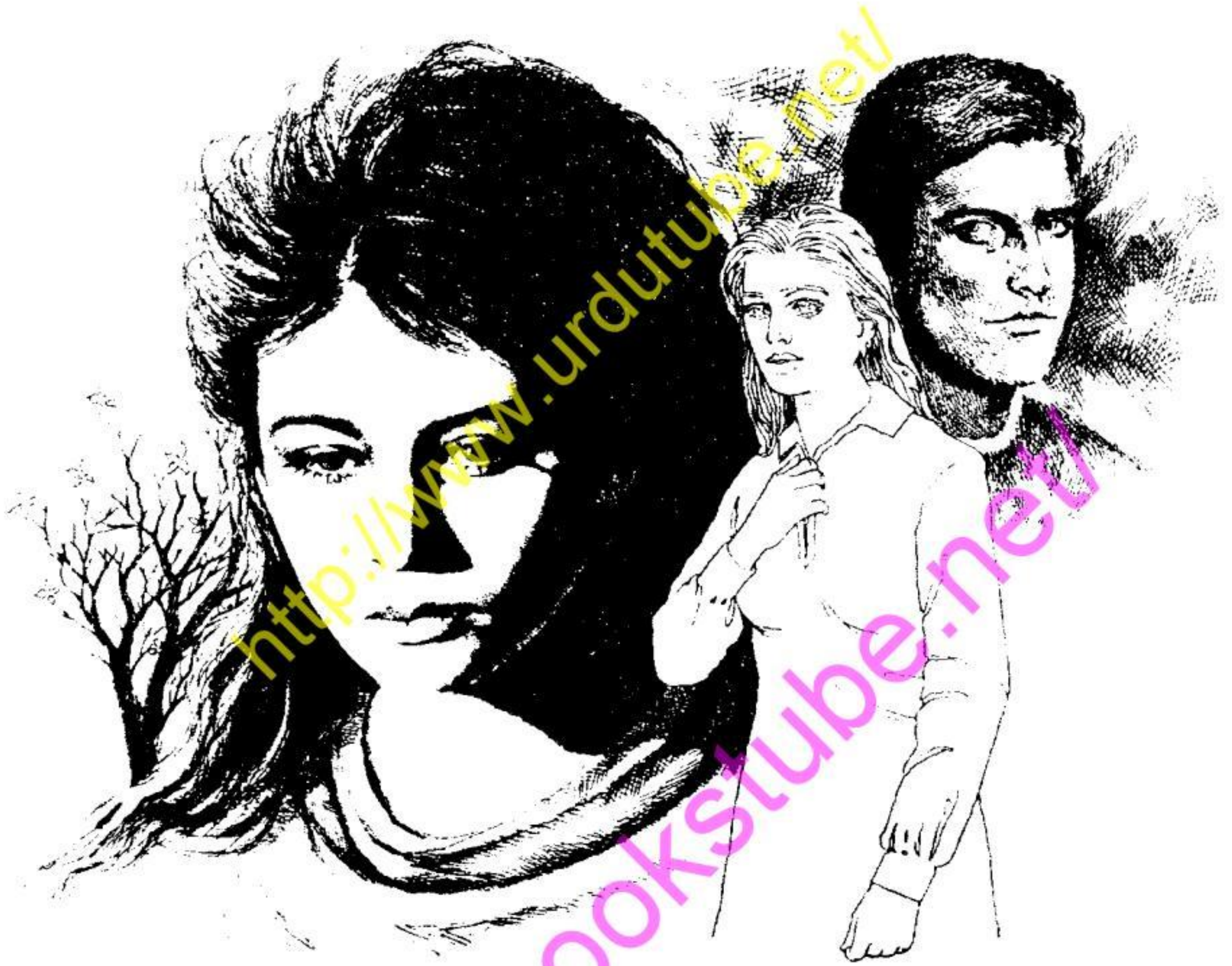
''اچھا ٹھیک ہے مگر آج میں تمہیں ایک حقیقت بتاتی ہوں۔ غور سے سننا اور پھر اپنی ماں کے بارے میں فیصلہ کرنا کہ وہ روک ٹوک اور سختی کرنے میں کتنی حق بجانب ہے۔''

پھر انہوں نے دونوں لڑکیوں کا ہاتھ تھاما اور دل پر پتھر رکھ کر ماضی کے سفر پر روانہ ہوگئیں اور جب یہ سفر تمام ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ دونوں بیٹیاں حیرت اور شاک کی کیفیت میں انہیں تک رہی ہیں۔ دونوں کو گزری زندگی کی دھندلی، دھندلی باتیں یاد آرہی تھیں۔ خالہ کی محبت، ان کا خیال، ان کی فکر مگر باپ کے حوالے سے کوئی ایسی بات یاد نہیں آرہی تھی جس سے ان کے جذبات کا اندازہ ہوتا۔ صبا نے ہمیشہ ہی عزت و احترام کے ساتھ فیاض کا ذکر کیا کیونکہ کم عمری کی وجہ سے لڑکیوں کو تو اپنے والد یاد بھی نہیں تھے۔ کجا کہ ان کی باتیں...... اس کے ساتھ ہی اس بات کا انکشاف کہ وہ ان کی اصل ماں نہیں بلکہ خالہ ہیں۔ اس کے باوجود سگی ماؤں سے بڑھ کر انہیں ان کی چاہت ملی...... یہ سب جان کر اور محسوس کر کے لڑکیوں کے دل میں ان کی محبت اور احترام کئی گنا بڑھ گیا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے لپٹ کر اور یہ کہہ کر ''امی ہمیں معاف کر دیں۔'' اس بری طرح روئیں کہ صبا بیگم کو انہیں سنبھالنا مشکل ہوگیا۔

آخر کار جب جذبات کا طوفان تھما تو انعم یوں گویا ہوئی۔

''امی آپ کی روک ٹوک بجا...... اچھا کیا آپ نے ہمیں بتادیا۔ اس میں ہمارے لیے حقیقت سے آگہی بھی ہے اور آئندہ زندگی کے لیے نہ صرف ہمارے لیے بلکہ ہر ماں کے لیے ایک سبق ہے کہ بیٹیوں کے معاملے میں والدین خصوصاً ماں کو ہمیشہ چوکنا اور احتیاط پسند ہونا چاہیے ورنہ کوئی بھی صبا کسی بھی وقت کہیں بھی زندہ درگور ہوسکتی ہے۔ ہم نہیں جائیں گے بس آپ ندا آپی کو اصرار کر کے یہیں بلوالیں۔'' یہ کہہ کر دونوں لڑکیوں نے ماں کا ایک ایک ہاتھ اپنے لبوں سے لگا کر چوم لیا اور صبا بیگم نے اطمینان سے آنکھیں موند کر دونوں کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔





نام تیرے نام

سحرش فاطمہ

''یہ تم نہیں ہوسکتیں۔'' کہیں سے اسے آوازآئی۔

''تم نے ایسا کیا بھی کیسے؟'' اس آواز پہ جو وہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی، سر اٹھایا۔ آنسوؤں سے کاجل بہہ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ خوش مزاج، چلبلی سی لڑکی، معصوم چہرے والی...... جو بھی اسے دیکھتا تعریف کیے بغیر نہیں رہ

پاتا۔ فربہی مائل جسامت میں بھی اس کی خوب صورتی غضب کی تھی۔ آواز میں ایسا لوچ اور ٹھہراؤ کہ سننے والا اس کی آواز کا دیوانہ ہو جاتا۔ جھیل جیسی گہری آنکھوں میں بلا کی شرارت اور ذہانت جھلکتی اور سب سے بڑھ کر ہر ایک کا خیال رکھنا، سب سے پیار کرنا یہی خوبی اس کو سب میں ممتاز کرتی تھی لیکن اس کے ساتھ ایسا ہوا کیا کہ اس کی یہی خوبی اس کے لیے آزار بن گئی۔ لوگ اس سے دور ہوتے چلے گئے۔

☆☆☆

کمرے میں بند وہ اپنے بال نوچ رہی تھی۔ اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ وہ اپنے کیے کی سزا چاہ رہی تھی۔

''اب کیا ہوگا؟ یہ تو اس وقت سوچنا چاہیے تھا اب کیوں منہ چھپائے کمرے میں بیٹھی ہو؟'' کوئی بولا تھا۔

اس نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑا اور اٹھنے کی کوشش کی۔

''جب کرلیا سب کچھ تو یوں بیٹھنے کا فائدہ......؟'' پھر وہی آواز آئی۔

''م...... میں نے کچھ...... کچھ نہیں کیا......'' حرمت نے اس آواز کو جواب دیا۔

''جب تمہیں لگتا ہے تم نے کچھ نہیں کیا تو پھر کیوں منہ چھپا رہی ہو، نکلو کمرے سے باہر سامنا کرو سب کا۔'' اب کی بار آواز نے اسے حوصلہ دیا۔

''میں اچھی لڑکی نہیں رہی، میں نے...... میں نے اپنی عزت''، حرمت نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا اور رونے لگی۔

''کیا کرلیا ہے ایسا...... بتاؤ تو'' آواز نے پھر اس سے پوچھا۔

''میں نے پیار کیا تھا'' حرمت نے آہ بھر کے کہا۔

''ہاہاہا......'' کہیں سے ہنسی کی آواز گونجی۔

''وہ جیسا کہتا گیا، میں کرتی گئی۔ وہ مجھ سے پیار جتاتا، میں اس کی آواز میں، اس کے سحر میں کھو جاتی، اس نے تصویریں مانگیں، میں نے دے دیں پر......'' حرمت خاموش ہوگئی۔

''پھر کیا......؟'' چند ثانیے کے بعد پھر آواز آئی۔ حرمت نے گہری سانس لی۔

''اس کی باتوں میں، آواز میں، اداؤں میں ایسی گم ہوئی کہ ہوش ہی نہیں رہا کہ میں کچھ غلط کررہی ہوں۔ کسی نے میری تصویریں انٹرنیٹ پر ڈال دیں۔'' حرمت نے افسوس سے سر جھکالیا۔

''زمانے بھر میں مجھے رسوا کردیا۔'' اس نے سسکی بھری۔

''کسی نے...... سے کیا مطلب تمہارا؟'' آواز نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی اس نے یا کسی اور نے یہ کام کیا ہے لیکن کیا ہے...... شک کسی ایک پر نہیں کرسکتی۔ اردگرد لوگ بھی تو ہوتے ہیں......'' حرمت خیالوں میں گم جواب دے رہی تھی۔

''تمہاری کیا غلطی اس میں، یہ تو اس نے کیا تھا ناں۔''

''اس کا جتنا ظرف تھا اس نے کیا...... لیکن میں کیسے بہک گئی؟''

''تم بھی نہیں بہکائی گئی تھیں۔''

''جو بھی تھا، غلطی میری ہی تھی۔ میں نے اتنا بھروسا کیا اس پر اور اس نے......'' حرمت نے پھر رونا شروع کردیا۔

''اب کیا زندگی بھر ایسے ہی رہوگی؟ اللہ سے معافی مانگو اور توبہ کرو اور وعدہ کرو پھر ایسا کچھ نہیں کروگی۔ پھر سے اچھی لڑکی بن جانا۔ یہ کوئی مشکل کام تو نہیں ہے ناں......''

''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا...... یہ دنیا والے مجھے گندی نظروں سے دیکھتے ہیں، اب بھی بہت کچھ کہتے ہیں۔ مجھ میں ہمت نہیں۔'' حرمت نے پھر اٹھنے کی کوشش کی اور چلتے، چلتے کھڑکی کی طرف آئی۔ پٹ کھولنے لگی کہ ایک دم ہوا اس کے چہرے پر لگی۔

"دیکھو تمہیں سامنا تو کرنا ہوگا دنیا کا...... میں تمہارے ساتھ ہوں، تم گھبراؤ نہیں...... میں تمہارے اندر موجود ہوں، تمہیں ہر دم حوصلہ دینے کے لیے...... اور دنیا کا کیا ہے وہ تو بولتی ہے اور بولتی رہے گی اصل تو اللہ ہے ناں، اس سے معافی مانگنا، توبہ کرنا خود کو بدلنا یہ ہے اصل بات۔ باقی دنیا سے کیا لینا دینا؟"

حرمت نے کچھ دیر کو اپنی آنکھیں بند کیں اور کچھ سوچنے لگی۔

"مگر اس دنیا کی نظریں مجھے گھوریں گی، ان کا کیا کروں گی؟" اس نے گھبرا کر ایک دم آنکھیں کھول لیں۔

"کچھ نہیں ہوگا، میں ہوں ناں تمہارے ساتھ اور اللہ بھی تو ہے۔"

"تم تو رہنے ہی دو، تم نے ہی سوال جواب کر کے مجھے اتنا ڈرا دیا ہے تم نے ہی عدالت لگالی۔" حرمت نے گردن جھکا کے کہا۔

"یہ تو اچھا ہوا ناں، تمہارے ضمیر کی عدالت پہلے لگ گئی۔ قبل اس کے کہ دنیا کی عدالت میں تمہیں پیش ہونا پڑتا...... چلو اٹھو وضو کرو، نماز پڑھو اور اپنے رب سے رو، رو کر معافی مانگو۔"

یہ آواز اس کے اندر کی تھی، اس کے اپنے ضمیر کی آواز جس نے ہر اچھے کام میں اس کا ساتھ دیا تھا لیکن اب سمجھانا بھی اس کا ہی فرض تھا۔ اور سچ بات تو یہی ہے کہ ہم دنیا کے ڈر سے ہر ظلم چپ کر کے سہہ لیتے ہیں۔ غلطی تو انسان سے ہی ہوتی ہے.... پر وہ ذات جو غفور و رحیم ہے، ہماری توبہ قبول کرنے والا ہے اور ہم دنیا سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اس ذاتِ واحد سے رجوع نہیں کرتے، اس سے معافی نہیں مانگتے۔

حرمت کے ضمیر نے اس کا سچا ساتھی بن کر اس کا حوصلہ بڑھایا اس لیے کہ انسان تو ہے ہی خطا کا پتلا۔ وہ خطا کر کے ہی سیکھتا ہے مگر جس کا ضمیر زندہ ہو۔ وہی خود احتسابی کے عمل سے بھی گزرتا ہے۔



مسکراہٹ بیگم

بی ڈی اور ٹی وی میں یہ فرق ہے کہ ٹی وی کی نشریات کے محدود اوقات ہیں جبکہ بی ڈی کے معاملے میں یہ سب آپ کی اوقات تک محدود ہے لیکن بی بی سی ٹی وی ایک تو بی بی اوپر سے ٹی وی گویا بہت ہی ٹی وی...... گزشتہ دنوں بی بی سی نے بڑی بی بی بات کی، اس نے ایک ایسا پروگرام نشر کیا جسے دیکھ کر ہم ابھی تک مسکرا رہے ہیں۔ یہ پروگرام نامی گرامی گلوکارہ مس سینڈی کا تھا۔ یہاں گرامی سے مراد گراموں میں موصوفہ کا وزنی ہونا نہیں، اگر وہ دیکھنے میں ہماری ایک اداکارہ سے ملتی ہیں جنہیں ایک صحافی نے موصوفہ کہا تو ناراض ہوگئیں کہ اس نے ہمیں منہ صوفہ کہا۔ بہرحال اس انٹرویو میں مس سینڈی نے کہا ہے کہ مجھے ہزاروں نوجوانوں کے والدین نے شادی کی درخواستیں دی ہیں۔ میں آئندہ ماہ ایک تقریب میں سب کو مدعو کروں گی جہاں جو زیادہ دیر تک مسکرائے گا اس سے شادی کرلوں گی۔

بی بی سی کی اس بی بی کی یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر ہزاروں نوجوانوں کے والدین نے ہی موصوفہ کو شادی کی درخواستیں کیوں دیں، نوجوانوں نے کوشش کیوں نہیں کی...... ہوسکتا ہے محترمہ نے مسکراہٹ کی یہ شرط رکھی ہی اس لیے ہو کہ شادی شدہ اور والدین قسم کے لوگوں کی چھانٹی ہوسکے کیونکہ شادی شدہ کو اتنا مسکرانے کی عادت نہیں ہوتی۔ شادی کے بعد تو یہ حال ہوتا ہے کہ کسی نے ایک شخص سے پوچھا۔ "آپ شادی شدہ ہیں؟" تو اس نے کہا "نہیں، دراصل میری ابھی، ابھی کار چوری ہوئی ہے اس لیے آپ کو لگ رہا ہوگا۔"

اقتباس از مزاحیات

تحریر: ڈاکٹر یونس بٹ، مرسلہ: فضہ بتول، یارہ کہو



منی ناول

جنگل کا پھول

زاہدہ پروین



ساتواں حصہ

''کیا نام ہے بیٹی تمہارا؟'' جب وہ اپنا سبق پوری طرح یاد کر چکی تو دادی اماں نے پوچھا۔

''بسنت کور...... بسنت کور میرا پورا نام ہے بڑی ماں جی...... ویسے پیار سے سب لوگ مجھے صرف بسنتی کہتے ہیں۔'' اس نے پیاری سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے، سجائے جواب دیا۔

''جیتی رہو بیٹی۔'' دادی اماں نے اس کی دیوالی کے چراغوں کی طرح لو دیتی آنکھوں کی طرف دیکھتے



ہوئے اسے دعا دی۔ جس روز سے پڑھنے آئی تھی انہیں یہ سانولی سلونی مگر شوخ و چنچل لڑکی بہت بھلی معلوم ہوئی تھی۔ جیسے ہی ان کے گھر میں داخل ہوتی، اس کی شوخ و شریر مسکراہٹوں اور کھٹی میٹھی باتوں کی آوازوں سے آنگن بھرا بھرا لگنے لگتا تھا۔ اس وقت بھی وہ برآمدے میں بیٹھی شرمین کا دیا ہوا سبق یاد کر رہی تھی۔ دادی اماں قریب ہی بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں اور پیاری بوا ترکاری بنا رہی تھیں اور ان کی باتیں دلچسپی سے سن بھی رہی تھیں۔

اسی وقت شرمین دوبارہ برآمدے میں آئی اور بسنتی کا سبق سننے لگی جو اس نے فر، فر سنا دیا۔

''چلو آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب تمہیں اجازت ہے کہ دادی اماں سے باتیں کرتی رہو۔ کل سے انشاء اللہ تمہیں لکھنے کی مشق بھی شروع کروادیں گے۔''

''شین دیدی......!'' بسنتی اسے اٹھتے دیکھ کر جلدی سے بولی۔ ''لکھنے کے لیے تختی لاؤں؟ سلیٹ لاؤں یا کاپی پینسل لاؤں؟'' شرمین بے ساختہ ہنس دی۔

''ایک تو تم نے میرے نام کو ایک دلچسپ شکل دے دی ہے دوسرے پھر سوالات بھی تم اتنے ہی دلچسپ کر رہی ہو، بھئی تمہیں کھل کر بتائے دے رہی ہوں کہ تمہیں صرف پڑھنے سے مطلب ہے، سلیٹ کاپی سب میری ذمے داری ہے۔''

''جی بہت اچھا شین دیدی۔'' اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

شرمین ٹیوشن کے بچوں کی طرف چلی گئی اور بسنتی نے اچانک دادی اماں کے پیر دبانے شروع کر دیے۔

''ارے ......ارے......'' انہوں نے پیر چھوڑنے کے لیے اصرار کیا۔ ''ایسے مت کرو بیٹی...... مت دباؤ، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' مگر وہ نہ مانی، لجاجت سے کہنے لگی۔

''مجھے اس خدمت سے مت روکیں ماں جی...... میں وہاں گاؤں میں اپنی دادی ماں کے روز پاؤں دابتی تھی۔ عادت پڑی ہوئی ہے جس دن سے یہاں آئی ہوں، کسی صورت چین ہی نہیں آ رہا......''

''اے بیگم......! داب لینے دیں...... بیچاری کو چین سکون مل جائے گا۔'' پیاری بوا اس کی سفارش میں بولیں۔

دادی اماں اس کی بے لوث محبت اور جذبہ دیکھ کر چپ ہو گئیں۔

لڑکی اچھی خاصی تقریباً شرمین کی ہم عمر تھی مگر بہت بھولی سی، سادہ لوح سی......اس نے اپنائیت بھرے رویّے سے سب کے من موہ لیے تھے۔ ہندو ہونے کے باوجود کسی چھوت چھات کی قائل نہیں تھی۔ دادی اماں جس چیز کو پوچھتیں، بخوشی کھا پی لیتی تھی۔ سارا دن اپنے گاؤں کے قصے کہانیاں سناتی رہتی پڑھ لینے کے بعد بھی وہ اکثر یہیں براجمان رہتی...... لہٰذا دادی اماں کا دل خوب اس سے لگا رہنے لگا۔

فارغ اوقات میں شرمین بھی اس سے ادھر ادھر کی باتیں کر لیتی۔ بسنتی کے یہاں آنے جانے پر اس کی ماں روک ٹوک بھی نہ کرتی تھی۔ پڑوس میں ہی تو گھر تھا۔ یعنی خان صاحب کے کرائے دار......

''تمہارا گاؤں کیسا ہے بسنتی! ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا گاؤں کیسا ہوتا ہے؟'' ایک روز شرمین نے اس سے پوچھا۔

''کیسی ہے ہماری بستی، کچھ مت پوچھو شین دیدی...... یوں سمجھو پھولوں بھرا گلدستہ ہے۔'' وہ لہک کر بولی۔

''اللہ! کس قدر حسین اور خوش رنگ منظر ہوں گے وہاں کے، ہے ناں؟'' شرمین نے حیرت اور اشتیاق سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

''بس دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، کسی روز میرے ساتھ چل کر دیکھو۔'' اس نے جھوم کر جواب دیا۔

''میں ......کہاں جاسکوں گی اتنی دور......''

شرمین نے قدرے مایوسی سے کہا۔ بسنتی اس کی معلومات میں اضافہ کرنے لگی۔

''ہماری بستی خوب صورت اس لیے ہے شین دیدی کہ وہ ایک ہرے بھرے جنگل کے کنارے آباد ہے، جنگل میں اتنی پیاری ٹھنڈی، ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ رنگ، رنگ کے پھول کھلتے ہیں، منوں پھلوں اور میوؤں کے پیڑ ہیں، ننھی منی گلہریاں، چھوٹے، چھوٹے سرخ آنکھوں والے سفید اور کالے خرگوش اور اندر جنگل میں ہرن سے لے کر ہر قسم کے چھوٹے بڑے جانور ہیں۔ پانی کی گنگناتی ندیا ہے، ندیا پر بنا لکڑیوں کا پل...... جب تیز ہواؤں کے جھونکے چلتے ہیں تو لمبی، لمبی گھاس میں خوب لہریں اٹھتی ہیں اور اس پر اڑتی ہوئی رنگ برنگی تتلیاں، بھونرے اور جہاز جیسی ٹڈیاں......'' شرمین آنکھیں حیرت سے وا کیے اس دیہاتی سی لڑکی کی بیان بازی سن رہی تھی مگر وہ ایک استغراق کے عالم میں بولے جا رہی تھی۔

''بھئی بسنت کور! تم تو اندر سے پوری شاعرہ نکلیں کیا خوب منظر کشی کی ہے اپنے گاؤں کی......'' جب وہ خاموش ہوئی تو شرمین نے اسے چھیڑا۔

''سچ کہتی ہوں، شین دیدی! اگر آپ وہاں ہوں تو آپ بھی ایسی ہی باتیں کرنے لگو......وہ جگہ ہی ایسی سندر، سندر ہے۔ وہاں کے چرند پرند بھگوان کے گیت گاتے ہیں جیسے سویرے، سویرے باہر نکلو تو ساری فضاؤں میں ننھی منی چڑیوں، طوطوں، کوؤں، کبوتروں، میناؤں اور رنگ، رنگ کے پرندوں کی بہاریں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، دور جنگل سے فاختاؤں کی پکاریں جیسے من میں اترتی چلی جاتی ہیں۔'' وہ مسکرائے بغیر سنجیدگی سے بولی۔

''پھر...... شہر تو تمہیں بالکل اچھا نہیں لگتا ہوگا؟'' شرمین نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''جی ہاں یہ تو ہے......'' بسنتی نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔ ''پر دیدی! دل تو لگانا پڑتا ہے، ہم نے کوئی زور زبردستی سے تو شہر آباد کیا نہیں ہے، اپنی خوشی، مرضی سے اور اپنی ضرورت کی خاطر آئے ہیں، پتا جی کا نقصان پر نقصان ہو رہا تھا۔''

''نقصان کیوں ہو رہا تھا تمہارے پتا جی کا؟'' شرمین نے چونک کر پوچھا۔

''اصل میں ہر سال اپنے کھیتوں پر جو ہم دھان اگاتے ہیں، اب کچھ مدت سے دھان کی وہ فصل پہلے جیسا منافع نہیں دے پا رہی تھی۔ ہر دفعہ گھاٹا ہو جاتا ہے، پتا جی کا من اس بات سے اچاٹ رہنے لگا تھا۔ انہیں وہم ہو گیا کہ وہاں پر ہمارے دیوتا ہم سے ناراض رہتے ہیں۔'' اس نے سادگی سے گردن ہلا کر جواب دیا۔

''اور...... یہاں شہر میں؟'' شرمین نے خوش مذاقی کے انداز میں پوچھا۔

''یہاں شہر میں چمڑے کی ایک بہت بڑی فیکٹری میں ہمارے ایک رشتے دار نے پتا جی کو بہت اچھی تنخواہ دلوانے کو کہا تو پتا جی نے سارا حساب کتاب لگا کر ان کی بات مان لی کیونکہ اس میں بہت زیادہ فائدہ ہے۔''

''لیکن...... میں نے سنا تھا کہ تم لوگ اپنی تعلیم کی وجہ سے شہر آ کر آباد ہوئے ہو، کیا ایسا نہیں ہے؟'' شرمین نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

''تم نے مجھے درمیان میں سے ٹوک دیا دیدی۔'' وہ اسی طرح باتیں کرتی تھی۔ کبھی آپ، کبھی تم...... کہنے لگی۔

''میری اگلی بات تو سنیں دھیان دے کر۔ یہ ایک بات تو ہوئی پتا جی کے کام دھندے اور گھاٹے، منافع کی......اب دوسری بات سنیں...... یہاں شہر میں اشوک بھیا ڈاکٹری کی پڑھائی پڑھ رہے ہیں ناں، اس کارن انہیں بورڈنگ میں رہنا پڑ رہا تھا، پتا جی ان کی طرف سے بہت کھوج اور فکر میں رہا کرتے تھے۔ لہٰذا ہمارے یہاں شہر میں آ کر رہنے سے اشوک بھیا کو بھی گھر بار کا سکھ چین مل گیا۔''

''چلو اچھا ہوا، خدا کا شکر ہے تم لوگوں کے مسائل حل ہوئے، اب وہاں گاؤں میں تمہارے اور بھی رشتے دار ہوں گے۔ تم لوگوں کا آنا جانا تو لگا ہی رہے گا۔'' شرمین نے بھی اس کی تفصیلات سن کر چین کی سانس لے کر کہا۔

''جی ہاں جی......'' وہ اداس سی ہو کر بولی۔

''میری دادی ماں، موسی، ماموں، بوا بہت لوگ ہیں، سبھی یاد آتے ہیں، پر ایک سکھی ایسی ہے جو بھولے نہیں بھولتی۔''

''سکھی...... یعنی سہیلی......؟ کیا نام ہے اس کا؟'' شرمین نے دلچسپی لے کر دریافت کیا۔

''ریشم...... نام ہے اس کا...... سارے جگ میں مجھے سب میں پیاری سب میں دلاری......'' بسنتی نے اسی انداز میں جواب دیا۔

''ریشم......'' شرمین نے متحیر ہو کر پوچھا۔ ''یعنی ...... مسلمان ہے وہ؟ وہاں گاؤں میں مسلمان بھی رہتے ہیں؟''

''ہاں شین دیدی...... کیوں نہیں ...... زیادہ تر مسلمان ہی رہتے ہیں وہاں......'' بسنتی نے اسے تفصیل بتانی شروع کر دیا۔

''بستی میں مسلموں کی مسجد بھی ہے، ہم سب لوگ بہت مل جل کر رہتے ہیں، ایک ہمارے رحمت بابا ہیں، ان کی بیٹی ہے ریشم بی بی۔ پھول کلیوں جیسی کومل، کومل اور نیاری...... ہم دونوں بچپن کی سکھیاں ہیں، ایک ساتھ پلی بڑھیں، ایک ساتھ کھیلی کودیں۔ جنگل کا کون سا حصہ ہے جو ہمارے پیار کا گواہ نہیں ہوگا...... ہر وقت کا ساتھ تھا ہمارا......''

''وہ بھی...... تمہیں بہت یاد کرتی ہوگی۔'' شرمین نے متاثر ہو کر کہا۔

''اسے تو شاید مجھے یاد کرنے کی اتنی فرصت نہیں ہوگی، ہاں میں ہر روز اس کو یاد کرتی رہتی ہوں۔'' اب بسنتی چونک سی پڑی اور مسکرا کر جواب دیا۔

''کیوں؟ اسے کیوں فرصت نہیں ہوگی یاد کرنے کی؟'' شرمین نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''اس کا بیاہ جو ہوگیا ہے شین دیدی...... وہ اپنے ساجن کو پیاری ہو چکی ہے۔ مجھے کم، کم ہی یاد کرتی ہوگی۔''

''اوہ...... اچھا۔'' شرمین نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''یہ تو ٹھیک ہے، سسرال میں اسے کم ہی تمہاری یاد آتی ہوگی۔''

''لیکن...... ریشم بیاہ کے بعد کہیں دور تھوڑی ہی گئی ہے، وہیں بستی سے تھوڑے فاصلے پر جنگل کے کنارے ریسٹ ہاؤس بنا ہوا ہے، اس میں رخصت ہو کر گئی ہے، دراصل...... ریشم کا بیاہ، جنگل بابو سے ہوا ہے، وہ دنیا میں اکیلا ہے، اس لیے وہیں رہتا ہے۔'' بسنتی نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''جنگل بابو؟ جنگل بابو...... کون؟'' شرمین نے سمجھ میں نہ آنے والے انداز میں پوچھا۔

''وہاں...... وہ پورے جنگل کا افسر ہے۔'' بسنتی نے بڑی دانشمندی سے بتایا۔

''شہزادوں کے جیسا حسین و جمیل...... اس نے بڑی چاہت اور منت مرادوں سے یہ بیاہ کیا ہے۔ بہت...... بہت چاہتا ہے ریشم کو۔'' کہتے، کہتے وہ خود ہی لجا گئی۔

''شین دیدی...... ریشم میری اتنی پکی، پکی سکھی ہے مگر افسوس کہ میں آتے سمے اس سے مل کر بھی نہ آسکی۔ کیونکہ یہاں شہر میں پہلے پہل تو ماتا جی آ کر رہی تھیں، میں تو ایک دن اچانک آئی بھیا کے ساتھ...... ریشم کو خبر بھی نہیں دے سکی۔ اب کسی دن جاؤں گی واپس......''

''ارے بیٹی! تمہاری پڑھائی ختم نہ ہوئی؟'' اچانک ذکیہ خالہ ان کے سر پر آ پہنچیں۔ ''تمہاری ماں بلا رہی ہے کہ آ کر پاپڑ بیل، بیل کر دو، جاؤ جلدی......'' بسنتی ہنستی ہوئی اٹھ کر چل دی۔ خالہ، دادی اماں کے پاس آ بیٹھیں۔ آج وہ کسی

نئ خبر کے ساتھ آئی تھیں۔ بڑی پُر جوش اور سرگرم سی دکھائی دے رہی تھیں اس وقت۔ پاندان اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے راز داری سے گویا ہوئیں۔

''ارے آپا! آج کل لوگوں نے اپنے مکان کرائے پر اٹھانے کا خوب رواج نکال لیا ہے اور ہمارے پڑوسیوں نے بھی یہی کرلیا۔''

''ارے کیا کہہ رہی ہو ذکیہ! میں خاک بھی نہ سمجھی۔'' دادی اماں نے تسبیح رکھتے ہوئے ہڑ بڑا کر دریافت کیا۔

ذکیہ خالہ نے پان کے پتے پہ خوب کتھا چونا لگایا، تمباکو، چھالیا اور شاید لونگ یا الائچی رکھی اور کہنے لگیں۔

''جب سے ہمارے پرانے کرائے دار گئے، کئی لوگوں نے کرائے کے لیے پوچھا۔ کل بھی کوئی آئے تھے، خان صاحب نے جواب دیا۔ ہم نے تو اپنا گھر کرائے پر اٹھادیا۔ پاس میں پڑوسی کھڑے تھے، بس جی فوراً ہی سٹ گٹ کر کے اپنی طرف لے گئے اور شام تک اپنا ایک حصہ دے دیا۔''

''الٰہی شکر ہے، میں تو ڈر ہی گئی تھی کیا ہوگیا۔'' دادی اماں نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔

''میں تو کہتی ہوں آپ بھی ایسا ہی کر لیں۔'' ذکیہ خالہ نے جھٹ سے دوسری تجویز پیش کردی۔

''کیسا کرلیں؟'' دادی اماں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے دریافت کیا۔

''اے یہی کہ اتنا بڑا گھر ہے ماشاء اللہ سے...... ایک حصہ علیحدہ کر کے کرائے پر اٹھادیں۔ کل کلاں کو اللہ رکھے شرمین بٹیا...... کی شادی بیاہ کا موقع آئے تو کم از کم آپ کے پاس آمدنی کا ایک ذریعہ تو رہے گا جو کہ ہوگا بھی مستقل......'' وہ سمجھا، سمجھا کر بولیں۔

''دادی اماں چونک کر ان کی صورت تکنے لگیں۔

''ہاں، ہاں ذرا غور کیجیے۔''

''آخر ایک نہ ایک دن شرمین کو رخصت تو کرنا پڑے گا کیونکہ دنیا جہان کا یہی دستور ہے، تو کیوں نہ ابھی سے اچھا برا سوچ لیا جائے۔ ابھی تو بہت مہنگائی بھی نہیں ہے، کسی نہ کسی صورت تنگی ترشی سہہ کر گھر کا الگ ایک حصہ بہ آسانی بن سکتا ہے، خود خان صاحب کھڑے ہوکر بنوادیں گے۔ اچھا خاصا ماہانہ آمدنی کا ایک معقول ذریعہ پیدا ہوسکتا ہے۔ خوب سوچ لیں۔'' دادی اماں کا منہ ان کی بات سن کر کھلے کا کھلا تھا اور آنکھوں میں سوچ کا گہرا تاثر......

☆☆☆

جب سے خرم گھر پر ایک ہفتہ رک کر آیا تھا اس کا رویّہ بہت بدلا بدلا سا ہوگیا تھا۔ بعض دن وہ گھنٹوں کمرے میں لیٹا چھت کو گھورتا رہتا...... ریشم نے خرم کی پریشانی کو بہت جلد محسوس کرلیا۔ ایک دوبار اس سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ صاف ٹال گیا۔

گھر میں اپنی شادی کی تیاریاں اس کے لیے سوہانِ روح بن گئی تھیں۔ جب ریشم نے زیادہ اصرار سے پوچھنا چاہا تو خرم نے تقریباً اسے ڈانٹ کر اپنا موڈ خراب کرلیا۔ اب وہ ریشم کو کس طرح اپنی تشویش اور فکرات میں شامل کرتا۔

اس کے ڈانٹ دینے پر وہ ہونقوں کی طرح اسے تکنے لگی پھر اس منحوس گھڑی کو کوسنے لگتی جب، جب وہ بے جا مداخلت کی مرتکب ہوئی تھی۔ مگر ساتھ ہی اسے شدید قسم کا اچنبھا آن گھیرتا۔ خرم کا اداس اور عجیب ناقابلِ فہم سا رویّہ اس کی سمجھ سے باہر ہوتا۔ وہ لاکھ سوچتی۔

''آخر اس میں برا مان جانے والی کیا بات تھی؟'' مگر جواب اس کی محدود سی عقل میں نہ سماتا۔ لیکن وہ کرید، کرید کر گھر کا ماحول بھی خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ سوچتی اگر ضروری سمجھیں گے تو خود ہی اپنی پریشانیوں میں شریک کرلیں گے۔ اب تو بستی میں بسنتی بھی نہیں تھی جس سے وہ اپنے دل کی بات کر لیتی۔ بسنتی اور اس کے گھر والوں کے شہر جابسنے کی پکی

خبر اور تفصیل اسے رحمت بابا نے سنا دی تھی۔ چنانچہ اسے اور بھی زیادہ صبروتحمل سے کام لینا تھا۔
خرم سے اتنے دنوں کی رفاقت نے اسے زباں بندی سکھا دی تھی۔ اپنے سیدھے سچے خیالات کا اظہار کر کے وہ انہیں خفا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ایسی فضول بدمزگیوں سے بچنا چاہتی تھی۔
ایک روز جب فضائیں بہت ابر آلود ہو رہی تھیں۔ اتنے بڑے گھر میں بھی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ ریشم تمام دن سونے کی کوشش کرتی رہی مگر نیند نہیں آئی گرمی کی شدت کی وجہ سے شب و روز بے کیف لگ رہے تھے۔
خرم صبح سویرے سے جنگل کے دورے پر نکلا ہوا تھا۔ آج اس نے دوپہر میں کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اس کا انتظار کرتے، کرتے ریشم کو بالآخر جھپکی آ گئی۔
دفعتاً دوپہر کے سناٹے میں...... خرم آندھی طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوا اور اس کا شانہ جھنجوڑ کر بولا۔
''ریشم، ریشم...... بات سننا ریشم۔'' وہ سوئی ہی کہاں تھی۔ اس کی آواز پر گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔
''کیا ہوا...... کک...... کیا بات ہے؟'' اس نے بوکھلا کر دریافت کیا۔ انہیں پسینے میں تربتر دیکھ کر مزید ہول گئی۔ مگر اسے اپنی حالت کا مطلق احساس نہیں تھا۔ گھبراہٹ اور وحشت میں پورے الفاظ اس کی زبان سے ادا نہیں ہو رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کہیں سے بھوت دیکھ کر آ رہا ہو، اس کے انداز میں خوف کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔
''کیا ہوا؟ بتاتے کیوں نہیں؟ بابا تو خیریت سے ہیں؟'' خرم نے چند گہری، گہری سانسیں لے کر پُرسکون ہونا چاہا۔ اتنے میں کسی نے زور، زور سے گیٹ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔
ریشم نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
''اتنی...... بھری دوپہر میں کون آ گیا؟'' خرم کی پیشانی پر ایک دفعہ پھر پسینے کی دھاریں پھوٹ نکلیں۔ وہ اس کے بہت قریب آ گیا اور سرگوشی میں بولا۔
''خانساماں تو ہے نہیں، تم گیٹ پر جاؤ...... اگر باہر سے کوئی میرے متعلق پوچھے تو کہہ دینا۔ ابھی وہ یہاں نہیں ہیں، شہر گئے ہوئے ہیں۔'' ریشم کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔ ''ارے...... میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو؟ جاؤ بھی......'' خرم نے جھنجلا کر اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔
''مم...... مگر...... میں؟'' وہ بری طرح ہکلا کر رہ گئی۔
''ارے بھئی بحث کا موقع نہیں ہے، جلدی کرو جلدی۔'' کوفت کے باوجود خرم نے آواز دبا کر کہا۔
اس کی بے تحاشا پریشانی کو دیکھتے ہوئے وہ گیٹ کی طرف چل دی جو اَب شدومد سے بجایا جا رہا تھا۔
''کون......؟'' ریشم نے پست سی آواز میں پوچھا۔
''بی بی......! خرم صاحب کو بھیج دیجیے ذرا۔'' باہر سے کسی نے بڑے شائستہ لہجے میں کہا۔
''وہ تو جی......'' ریشم کی زبان لڑکھڑا گئی لیکن سنبھل کر بولی۔ ''شہر گئے ہیں...... یہاں نہیں ہیں۔''
''اوہ......'' لہجے میں افسوس اور تھکن تھی۔ ''اچھا سنیں، کسی کے ہاتھ پانی بھجوا دیجیے۔''
''جی...... وہ......'' ریشم کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کے پیچھے خرم جگ اور گلاس لیے کھڑا باہر دینے کا اشارہ کر رہا تھا۔ ریشم نے اسے عجیب نظروں سے دیکھتے جگ گلاس لیے۔ گیٹ ذرا سا کھول کر ہاتھ باہر کر دیا اور دھیرے سے بولی۔
''یہ پانی لیجیے...... گھر پر کوئی موجود نہیں ہے۔''
''اوہ...... بہت زحمت دی آپ کو۔'' کسی نے کہتے ہوئے جگ گلاس لے لیے، تھوڑی دیر کے بعد دونوں چیزیں لوٹا دیں اور وہی مہذب آواز دوبارہ سنائی دی۔ ''اچھا جی، بہت شکریہ آپ کا، خرم صاحب آئیں تو کہہ دیجیے گا۔ آفیسر آئے تھے وزٹ پر......''

ساتھ ہی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری۔ پھر جنگل کے سناٹے میں معدوم ہوتی ہوئی ختم ہوگئی۔

ان کی بات سن کر خرم کی رنگت اُڑ گئی۔ انہوں نے سمجھا کچھ اور، ہو کچھ اور گیا تھا۔ اس وقت اس کا اندازہ اور خیال دونوں غلط ہوگئے تھے۔ مگر یہ وقت ان باتوں پر سوچ بچار کرنے کا نہیں تھا۔ شریکِ حیات سر پر ننگی تلوار بن کر لٹک رہی تھی۔

اس نے دیر سے رکی ہوئی سانس خارج کی اور ریشم کا ہاتھ پکڑ کر کمرے کی طرف چل دیا۔ بیڈ پر بیٹھ کر اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ مگر ریشم مسکرا بھی نہیں سکی۔ افسوس کے لہجے میں بولی۔

''چھپ کیوں گئے تھے آپ.....؟ بیچارے اتنی سڑی گرمی میں آئے تھے۔''

''ارے چھوڑو، کل تک کے لیے بندھ جاتا میں۔'' خرم بے پروائی سے کہہ کر لیٹ گئے۔

''لیکن..... پہلے تو کبھی آپ نے ایسا نہیں کیا؟'' ریشم کی حیرت بدستور تھی۔

''پہلے.....خانساماں بھی غیر حاضر نہیں ہوا کرتا تھا۔''

خرم نے سوچ کر جواز پیش کیا پھر شوخی سے اضافہ کیا۔ ''اور جنابہ..... آپ کو اتنا افسوس کیوں ہو رہا ہے، میں نے تو آپ ہی کی آسانی کر دی۔ اگر روک لیتا تو ظاہر ہے میری کم، آپ محترمہ کی زیادہ کمبختی آتی اس سڑی گرمی میں۔''

''اچھا تو آپ مجھے ایسا کام چور سمجھتے ہیں؟'' ریشم نے منہ پھلا لیا۔

''یا میرے مولا.....'' وہ سر پر ہاتھ مار کر تمسخرانہ انداز میں گویا ہوا۔ ''یہاں تو نیکی کا صلہ بھی الٹا ملتا ہے.....'' ریشم منہ پھیر کر مسکرانے لگی۔

''اچھا یہ بتاؤ۔'' خرم نے اس کا رخ اپنی طرف پھیر کر پوچھا۔ ''ابھی یہ کیوں پوچھ رہی تھیں کہ بابا تو خیریت سے ہیں؟'' ریشم نے یک بیک اداس ہو کر جواب دیا۔

''ہاں تو اور کیا..... آپ تو آج کل توجہ نہیں

ناممکن

چلی جاتی ہے آئے دن وہ بیوٹی پارلر
کہ مقصد ہے جواں لگنا، مثالِ حور ہو جانا
مگر یہ بات کسی خاتون کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی
کہ ممکن ہی نہیں کشمش کا پھر انگور ہو جانا

مرسلہ: رُدابہ علی، لالہ موسیٰ

حسرتیں

یوں اکیلے میں مجھے اہلِ وفا یاد آئے
جیسے بندے کو مصیبت میں خدا یاد آئے

جیسے اجڑے ہوئے پنچھی کو نشیمن اپنا
جیسے اپنوں کے بچھڑنے پہ دعا یاد آئے

جیسے ڈھلتی ہوئی شاموں کو سویرا کوئی
جیسے پنجرے میں پرندے کو فضا یاد آئے

جیسے بوڑھے کو خیالات میں بچپن اپنا
جیسے بچے کو شرارت میں پہ سزا یاد آئے

جیسے اُجڑی ہوئی بستی کو زمانہ اپنا
جیسے طوفاں کے ٹھہرنے میں دیا یاد آئے

جیسے پلکوں کے جھپکتے ہی کنارے بھیگیں
جیسے اس روز ہُوا کون جدا یاد آئے

جیسے سورج کی تمازت میں گھٹا یاد آئے
یوں اکیلے میں مجھے اہلِ وفا یاد آئے

مرسلہ: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

دے رہے، بابا بیچارے اتنے بیمار رہنے لگے ہیں۔ سارا، سارا دن گھر میں اکیلے پڑے کھانستے، کراہتے رہتے ہیں۔ کوئی دوائی دینے والا بھی نہیں ہوتا۔ کمزوری کی وجہ سے کئی، کئی دن باہر نہیں نکل پاتے۔ شاید نماز بھی گھر میں پڑھتے ہیں۔''

''ہاں یار...... بہت دنوں سے جنگل میں کہیں دکھائی بھی نہیں دے رہے۔'' خرم نے ذہن پر زور دے کر کہا۔

''یہاں...... ہمارے گھر بھی بہت دنوں سے نہیں آئے۔ بستی کا ایک نیک دل لڑکا ان کی بھیڑ بکریاں چرانے لے جاتا ہے، کوئی اوپر کے کام بھی کردیتا ہوگا۔'' ریشم کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ بھرائی آواز میں بولی۔ خرم نے دلار سے اسے لپٹا لیا اور سر تھپتھپا کر بولا۔

''تم رنجیدہ نہ ہو، ہم شام کو ہی ان کی طرف چلیں گے اور کسی طرح سمجھا بجھا کر اپنے پاس لے آئیں گے تاکہ تم ان کی خدمت کرسکو۔'' اسے تسلی تشفی دے کر وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ دماغ میں دیر سے آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ دور سے آتی ہوئی گاڑی دیکھ کر یہ سمجھا تھا کہ خاور ان کے پاس رہنے کے لیے ریسٹ ہاؤس آرہے ہیں، آج بڑی چوک ہوگئی تھی وہ نکلے اس کے آفیسر...... ہر دو لحاظ سے اس کے لیے لمحہ فکریہ تھا یہ واقعہ......

☆☆☆

موسم ذرا بدلا تو ایک رات خوب دھواں دھار بارش ہوئی اور تمام رات جم کر برسی...... صبح کے وقت بادل چھٹنے لگے اور دھلے نکھرے نیلے آسمان پر اکا دکا بادل رہ گئے۔ ہواؤں کے جھونکے بوجھل اور نمدار تھے۔

سویرے، سویرے کوئی باہر سے چند شکار کیے ہوئے پرندے بھجوا گیا تھا۔ خرم نے ناشتے میں صرف ایک پیالہ دودھ کا لیا اور ریشم سے بولا۔

''رات کو ہوائیں بہت طوفانی تھیں۔ میرا خیال ہے بہت سے پیڑ، پودے تو شاید جڑوں سے اکھڑ گئے ہوں گے۔ تم آج جلدی کھانا تیار کرلینا میں باہر کا جائزہ لے کر گیارہ بجے تک آجاؤں گا۔ پھر بابا کی طرف چلیں گے۔ آج انہیں زبردستی اٹھا لاؤں گا اس دن تو بہانہ کرکے بچ گئے تھے۔''

''برسات کا امکان نہیں ہے، اس بوجھ کو یہیں رہنے دو۔'' ریشم کے یاد دلانے کے باوجود وہ یہ کہہ کر چھتری چھوڑ گیا۔ اس کے جانے کے بعد ریشم کام کاج میں مصروف ہوگئی۔ دس بجے کے قریب آسمان پر پھر سے بادل جمع ہونے لگے۔ آن کی آن میں سیاہ گھنگور گھٹاؤں نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہواؤں میں سنسناہٹ پیدا ہونے لگی۔ گوشت بھونتے، بھونتے اس کا جی ہولنے لگا۔ ہمیشہ سے کھلی فضاؤں میں رہنے کی وجہ سے وہ موسموں کے تیور پہچانتی تھی۔ فلک پر بادلوں کے پرے کے پرے دیکھ کر اسے بخوبی اندازہ ہوگیا کہ آج کی طوفانی بارش کئی دنوں تک رکنے والی نہیں ہے۔ ہنڈیا چولھے سے اتار کر پیچھے اولے پر دھری، بھاگ کر کمرے سے چھتری اٹھائی اور دو، دو زینے پھلانگتی چھت پر آگئی۔ ذہن میں یہی خیال تھا کہ کوئی آتا جاتا نظر آگیا تو اس کے ہاتھ سے خرم کو چھتری بھجوا دے گی۔ کسی چرواہے یا راہگیر کی تلاش میں اس کی نگاہیں دور، دور بھٹکنے لگیں مگر اتفاق کی بات ہے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ہر پگڈنڈی، ہر راستہ سونا پڑا تھا۔

بارش کی آمد کا احساس ہر ذی روح کو ہوگیا تھا۔ خودرو گھاس کے قطعوں میں ننھی، منی گلہریوں اور سفید، سفید خرگوشوں نے مینڈکوں کے ساتھ مل کر جیسے جشنِ بہار کے استقبالیہ نغمے نشر کرنا شروع کردیے تھے۔ ہری گھاس میں لمبی، لمبی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ سرسبز پتوں والے پودے، پیڑ سرشاری کے عالم میں ہری بھری شاخیں ہلا، ہلا کر مست و بے خود ہونے لگے۔ آسمان پر خوشنما پرندے درجنوں کے حساب سے پر پھیلائے ننھے منے جہازوں کی طرح تیرتے نظر آرہے تھے۔

اچانک سنہرے اور دلکش رنگوں سے مزین پر

پھیلائے رقصاں ایک خوب صورت مور ریشم کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ ایسا دلفریب اور من موہ لینے والا منظر تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنے تمام مسائل بھول بیٹھی۔

مور اور مور کا ناچ، بچپن سے اس کی کمزوری رہا تھا۔ خبر نہیں کب تک وہ کھوئی رہتی کہ معاً اس کی محویت ایک دوسرے ہی نظارے نے اپنی طرف مبذول کروائی..... دور تک نظر آنے والی سڑک پر ایک بڑی سی جیپ لڑھکتی زور دار انداز میں چلی آرہی تھی جیسے لمحہ بھر میں منزل کو چھو لینا چاہ رہی ہو۔ رات بھر برستی رہنے والی بوندوں سے اینٹوں کی یہ سڑک دھل، دھل کر گہری سرخ ہو چکی تھی اور سبزے کے پس منظر میں بڑی بھلی لگ رہی تھی مگر اب ان لمحوں میں مور کا رقص اور سڑک کی خوب صورتی دیکھتے رہنے کا موقع کہاں تھا بھلا..... وہ پُرتجسس نظروں سے جیپ کو دیکھنے لگی۔ جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کی منزل یہی گھر ہے۔

وہ سیڑھیاں اتر کر جلدی سے گیٹ کی طرف آئی جہاں دستک شروع ہو گئی تھی۔

''وہ..... گھر پر نہیں ہیں۔'' اس نے اندر سے جواب دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے، وہ آئیں تو یہ دے دیجیے گا۔'' باہر سے ایک سفید لفافہ بڑھایا گیا۔ وہ الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ اس پر جانے کیا لکھا ہوا تھا۔

☆☆☆

''روبی آپا! خدا کے واسطے کچھ کریں..... کچھ تو سوچیں۔'' معصومہ نے کمرے کی لمبائیاں ناپتے ہوئے بے قراری سے کہا۔ روبی جو ان لمحات میں مختلف کیفیات کا شکار ہو رہی تھی، فقط اس کی صورت دیکھ کر رہ گئی۔ منہ سے کچھ نہ بول سکی۔

''آپ کو تو اس سے بہت ہمدردی تھی، اب کیا ہوا؟ للہ کچھ تو کیجیے، یوں منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر تو نہ بیٹھیے.....'' معصومہ جو اپنا سارا جوشِ خطابت صرف کر چکی تھی۔ بالآخر اس کے قریب بیٹھ گئی اور خوشامدانہ انداز میں بولی۔

معصومہ نے ابھی کچھ دیر قبل شادی سے متعلق ممانی نائمہ کا فیصلہ اور پھر امی اور ابا میاں کا جواب روبی کے گوش گزار کیا تھا، ظاہر ہے بات اسی کی شادی سے متعلق تھی، اسے سخت شرم آرہی تھی مگر وہ اپنے جوش و خروش میں اس کے احساسات سمجھے بغیر اپنی ہی ہانکے جارہی تھی اور کسی صورت اپنے مطالبے سے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ بالآخر روبی نے کسی صورت خود کو نارمل کیا اور ہچکچا کر بولی۔

''معصومہ! تم نے تو ننھے بچوں کو بھی مات کر ڈالا۔ اب بھلا میں اتنے بڑے شہر میں شرمین کو کہاں سے ڈھونڈ نکالوں؟''

''واہ..... آپ تو کمال کرتی ہیں۔'' وہ چمک کر بولی۔ ''یہ خاور بھائی کس دن کام آئیں گے؟ جا کر ڈاکٹر شاکرہ سے کیوں نہیں رابطہ کرتے؟ سب معلوم ہو جائے گا۔''

بات روبی کے بھی دل کو لگی۔ رفتہ، رفتہ اس کی دماغی صلاحیتیں بیدار ہونے لگیں۔ اس نے سوچا۔

''سچ تو کہہ رہی ہے معصومہ، شرمین کا اتا پتا تو یہ آسانی معلوم ہو سکتا ہے، ڈاکٹر شاکرہ کو تو ہم بھول ہی گئے تھے۔'' اندر سے اس کے دل میں بھی شرمین کے لیے معصومہ سے کم ہمدردی اور انسیت نہ تھی۔ مگر بڑوں کے سامنے مجبور تھی۔ خاص طور پر ہونے والی ساس صاحبہ کے سامنے اس لیے اس نے معصومہ کو ٹٹولا۔

''چلو ٹھیک ہے معصومہ..... مانا کہ ہمیں شرمین کا گھر بار سب معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہے۔ پھر تم کیا کرنا چاہو گی؟ کیا ہے تمہارے ذہن میں؟'' روبی کو آمادہ دیکھ کر معصومہ کو تقویت ہوئی، وہ بہت دھیمی ہو کر کہنے لگی۔

''روبی آپا! آپ خود سوچیں، وہ بیچاری اماں جان کے رویے سے کس قدر دل برداشتہ ہوئی ہو گی..... اور کچھ نہیں تو اس کے گھر جا کر ہم اس سے معافی تو مانگ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں اماں جان نے

اسے کیسے، کیسے بڑے، بڑے الفاظ اور الزامات دیے ہوں گے۔''

''سچ کہتی ہو تم...... ممانی جان بعض اوقات بہت زیادتی کر جاتی ہیں۔ ہمیں ضرور اس سے معذرت کرنی چاہیے۔'' روبی کے دل پر چوٹ سی لگی...... آہستہ سے بولی۔

''کس سے معافی تلافی کی باتیں ہو رہی ہیں چپکے، چپکے......'' اچانک خاور نے اندر داخل ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

''آہا...... خاور بھائی تو بڑے موقع سے آئے، روبی آپا! اب ان سے باقی سب باتیں طے کر لیجیے۔'' معصومہ، خاور کو دیکھتے ہی اچھل پڑی اور خوش ہو کر بولی۔

''ہاں، ہاں طے کر لیں۔ ہم بھی آج بہت کچھ طے کرنا چاہتے ہیں۔'' خاور اسی خوشگوار موڈ میں تھے، خوش دلی سے بولے۔

''ہم تو اپنی ہی کوئی بات کر رہے ہیں۔ تم کون سی بات طے کرنا چاہتے ہو۔'' روبی نے غور سے ان کی صورت تکتے ہوئے پوچھا۔

''ہے ہمارے بڑے بھائی کی شادی کی بات...... آپ کے مطلب کی بات نہیں ہے، آپ چپکی رہیں۔'' خاور نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

روبی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ واقعی چپ ہوگئی۔ اسے بخوبی اندازہ ہوگیا کہ خاور بھی بابر کی شادی کا تذکرہ کہیں سے سن آئے ہیں اس لیے اسے چھیڑنے کے موڈ میں ہیں۔

معصومہ نے جب یہ دیکھا کہ موضوع بدلنے کو ہے، وہ جلدی سے بھائی کے پاس جا کھڑی ہوئی اور ان کے کاندھے سے لگ کر بولی۔

''اللہ خاور بھائی! یہ سب باتیں تو ہوتی رہیں گی پہلے آپ میری تو سن لیجیے۔ کسی طرح ڈاکٹر شاکرہ سے شرمین کا ایڈریس معلوم کر لیجیے...... ہم لوگ اسے منانے کے لیے جائیں گے...... بعد میں تو روبی آپا...... کو فرصت بھی نہ ملے گی۔'' خاور ویسے بھی ان دونوں کی باتیں سن چکے تھے۔ ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ بجھ کر رہ گیا۔

''اور وہ...... تمہارے منانے سے...... مان جائے گی؟'' طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''مانے گی کیسے نہیں...... اماں نے کچھ کہہ دیا ہوگا، ہم سب تو خطا کار نہیں ہیں، ہمارے دلوں میں اس کی قدر اور محبت ہے اور بہت ہے۔''

''آپ کیا کہتی ہیں اس معاملے کے بیچ؟'' خاور نے روبی سے پوچھا۔

''جناب! ایک سو ایک فیصد راضی بہ رضا بلکہ پہلا ووٹ۔'' اس نے اقرار میں سر ہلا کر کہا۔

''ٹھیک ہے، کل شام کو ہی چلنا اس کے گھر۔'' خاور نے نہایت آسانی سے ہتھیار ڈال دیے اور بولے۔

''اللہ میرے بھیا کی خوشیوں کی حفاظت کرے۔'' معصومہ نے خوش ہو کر بھائی کے بال بگاڑ ڈالے۔ اسی وقت پھوپی شمسہ بیگم کے آجانے کی وجہ سے موضوع بدل گیا، ویسے بھی یہ تینوں فی الحال سب سے چھپ کر شرمین کے ہاں جانا چاہ رہے تھے۔ پھوپی کو دیکھتے ہی خاور نے نعرہ لگایا۔

''مبارک ہو پھوپی جان! سنا ہے کہ آپ کے بڑے بھتیجے کی شادی ٹھہرائی جارہی ہے، ہے ناں سچی بات؟''

''تمہیں بھی بھیا سلامت ہو...... تمہاری اطلاع سو فیصد سچ ہی ہے۔'' پھوپی جان نے مسکرا کر جواب دیا۔ روبی تیزی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

''آہا...... ہاشرما گئیں......'' خاور نے بہ آواز بلند فقرہ کسا۔ پھوپی مسکراتی رہیں، معصومہ ہنستی چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد خاور نے شمسہ بیگم کو مخاطب کیا۔

''پھوپی جان! بھلا ایک ہی جگہ سے رخصتی اور بارات اچھی لگے گی؟'' معصومہ چونک کر بھائی کی صورت دیکھنے لگی۔

''بیٹا میں تمہارے سوال کا مطلب نہیں سمجھی؟'' انہوں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

''بالکل سیدھی سادی بات کہہ رہا ہوں پھوپی جان، میرا مطلب ہے کہ ہم بارات لے کر پڑوس میں جائیں گے اور دلہن کو رخصت کروا کر پانچ منٹ میں اپنے گھر آ جائیں گے۔ بھلا خاک لطف آئے گا... درمیان میں کچھ فاصلہ ہونا چاہیے۔''

''ارے ہاں، بھیا سچ تو کہہ رہے ہیں۔'' معصومہ نے چونک کر کہا۔

''پڑوس سے نکل کر پڑوس میں چلے گئے بالکل بھی ہلا گلا نہ ہوگا۔ کوئی مزہ نہیں آئے گا۔ بارات وہ کہ جو چڑھے تو سب دیکھیں۔''

''ارے بچو...... یہ کیا تم لوگوں کی مت ماری گئی...... کیسی اونگی بونگی باتیں سوچ رہے ہو؟'' شمسہ بیگم نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''میری پیاری پھوپی جان! ذرا سمجھنے کی کوشش تو کیجیے کہ وہ منظر کیسا پھیکا پھیکا سا ہوگا جب دلہن ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پہنچادی جائے گی۔ نہیں بھئی، ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ سب سے پہلا احتجاج میرا نوٹ کر لیجیے۔'' خاور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آ بیٹھے اور بہت پیار سے پھوپی کو سمجھا، سمجھا کر بولے۔

''اور دوسرا میرا، میں بھی بھیا سے اتفاق کرتی ہوں۔'' معصومہ چلا کر بولی۔

پھوپی جان بیچاری ان دونوں کی صورتیں دیکھ رہی تھیں اور وہ دونوں اپنی، اپنی ہانکے جا رہے تھے۔ بالآخر انہیں سر تسلیم خم کر کے وعدہ کرنا پڑا۔

''تمہارے پھوپا صاحب آ جائیں ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھ دیا جائے گا۔ اب میرا دماغ مت کھاؤ۔'' اور جب نائمہ بیگم کے علم میں بچوں کا مطالبہ آیا تو انہیں یہ بات بے حد پسند آئی انہوں نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔

''بچوں کا کہنا بالکل درست ہے، اچھا ہوا ان لوگوں نے توجہ دلائی ورنہ ہمیں اپنی مصروفیت میں یہ نکتہ عقل میں نہیں آیا تھا۔ واقعی ایک ہی جگہ سے بارات اور رخصتی کی کیا تک ہے؟'' بس ان کا یہ کہنا تھا کہ یہ معاملہ پوری طرح زیر بحث آ گیا اور گھر کے بڑے سنجیدگی سے اس کا حل سوچنے لگے۔

بالآخر پھوپا متین احمد کی آمد پر اس آخری فیصلے پر مہر ثبت ہوگئی کہ شادی سے کم از کم ایک ماہ قبل پھوپی جان اپنی فیملی کے ساتھ اپنے پرانے والے گھر میں شفٹ ہو جائیں گی اور نائمہ بیگم وُہیں بارات لے کر جائیں گی اور...... بہو بیاہ کر لائیں گی۔

آج کل نائمہ بیگم خوب مصروف اور مگن دکھائی دیتیں۔ اور ہر وقت کسی نہ کسی مصروفیت میں خوش، خوش الجھی رہتیں۔ انہوں نے دور پار کی چند کنبے، برادری سے تعلق رکھنے والی سلیقہ مند عورتوں کو بلوا لیا تھا اور دن رات انہی سے سر کھپاتی رہتیں۔ اپنے مزاج و عادات کی وہ علیحدہ ہی خاتون تھیں، انہیں کسی کی رائے مشورے کی حاجت ضرورت تو تھی ہی نہیں جو ان کی اپنی سمجھ عقل میں آ رہا تھا بے دھڑک کر رہی تھیں۔

اس یادگار موقع پر انہوں نے بقول شخصے بینک کا منہ کھول ڈالا تھا۔ جہاں، جہاں جی چاہ رہا تھا بے دریغ پیسہ خرچ کر رہی تھیں اور اپنے آپ سے داد وصول کر رہی تھیں۔ آج سنار کو طلب کیا ہے تو کل جوہری بیٹھا ہے تو پرسوں درزی...... مارے خوشی اور چاؤ کے اپنے زیادہ تر بھاری، بھاری قیمتی زیورات سارے چڑھاوے کے نام پر انہوں نے تجوری سے برآمد کر لیے تھے۔ بعض زیور کے موتی تو اس قدر نایاب اور انمول تھے جو آج کل کہیں سے دستیاب بھی نہیں تھے۔ مگر نائمہ بیگم کا ذوق شوق دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مٹی چلی جا رہی تھیں۔

اول تو انہیں شروع سے ہی اپنی چہیتی نند شمسہ بیگم کی اولاد میں روبی سے والہانہ محبت رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ بھانجی ہونے کے ساتھ، ساتھ وہ اب ان کی بہو بھی بننے جا رہی تھی۔ بہو بھی کون سی...... سب سے پہلی بڑی اولاد کی بہو...... وہ لاڈ پیار اور چاؤ کی بلند ترین چوٹی پر کھڑی ہو کر چاہ رہی تھیں کہ روبی

کے لیے عرش کے تارے توڑ لائیں..... یا ہفت اقلیم کے خزانے سمیٹ کر اس کی بری میں جڑ دیں۔

اس سلسلے میں وہ کسی کی دخل اندازی کو بھی غیر ضروری سمجھ رہی تھیں۔ بھاری سے بھاری جوڑے سل رہے تھے، ٹنک رہے تھے، درزی کوٹھی کے ایک کمرے میں بیٹھے ان کے احکامات کی تکمیل کر رہے تھے۔ وہ سر سے پیر تک مستغرق تھیں اپنی مصروفیات میں۔

اسی دوران اپنی شامتِ اعمال سے ایک دن اصغری ان کے ہتھے چڑھ گئی۔ وہ حسبِ معمول آئی تھی سُن گُن لینے..... نائمہ بیگم نے وہ ،وہ بے دھڑک سنائیں کہ کان لپیٹ کر اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئی۔ تمام اگلی پچھلی کسر نکال ڈالی نائمہ بیگم نے۔

گھر کے اندر بلائی گئی لڑکیوں بالیوں کے ہاتھوں میں ہر وقت سوئی دھاگا نظر آتا تھا۔ تیاریاں خوب زور وں ... پر تھیں۔ مارا ماری لائی ٹکائی ہو رہی تھیں۔ بڑی دھوم دھام سے بری تیار کی جا رہی تھی۔ بارہ، بارہ بجے رات تک سب لگے رہا کرتے..... نائمہ بیگم کبھی یہاں دکھائی دیتیں..... کبھی وہاں..... آج کل انہیں اپنے سر پیر کا ہوش نہیں تھا تو شمسہ بیگم کا کیا ہوتا؟ وہ تو ویسے ہی جہیز کے بکھیڑوں میں الجھی تھیں۔

☆☆☆

''ذکیہ خالہ تو ایک مشورہ دے کر چلی گئی تھیں مگر دادی اماں کو سوچنے سمجھنے کی ایک راہ سُجھا گئی تھیں۔ لہٰذا دادی اماں کئی روز تک مسلسل اسی نکتے پر غور کرتی رہیں۔ الٹ پلٹ کر اس مشورے کا جائزہ لیتی رہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مسلسل غور و فکر نے ان کے دل و دماغ کے کئی بند راستے کھول ڈالے۔ جوں، جوں وہ اس گہرائی میں اترتی گئیں کہ کسی مناسب رشتے یا پیغام کے آنے کے بعد وہ اپنی پیاری پوتی کے ہاتھ پیلے کر کے اپنے سب سے اہم اور ضروری ترین فرض سے ادا ہو کر کس طرح سکھ کی سانس لے سکیں گی، آدھے گھر کو کرائے پہ اٹھا دینے کا خیال ایک دلکش تجویز بن گیا۔

یہ رائے ان کے لیے بہترین حل بن گئی اور قابلِ عمل بھی..... جو بات انہوں نے کبھی سوچی تک نہیں تھی۔ وہ نہایت آسان اور بے ضرر لگنے لگی۔

چنانچہ ایک دن موقع دیکھ کر دادی اماں نے شرمین کو اپنے پاس بٹھایا اور بڑے مدلل انداز میں گھر کے دو پورشن کر لینے سے متعلق اس کا عندیہ لینا چاہا۔ لیکن اس معاملے میں اس کی رائے لینے نہ لینے سے کوئی فرق نہیں پڑا کیونکہ اس نے کہہ دیا کہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے مجھے تو ایسے معاملات کی معلومات ہے نہ دلچسپی..... آپ جو کریں گی، بہتر کریں گی۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر دادی اماں نے ذکیہ خالہ کو بلوایا اور اپنی رضامندی دے دی۔ وہ تو خوشی سے کھل اٹھیں۔ بس ایک ہفتہ دس دن کے اندر، اندر خان صاحب نے دادی اماں کے گھر کا کام شروع کروا دیا تھا۔

اس سلسلے میں ان کے صحن میں لگا ہوا لیموں کا پیڑ سب سے پہلے کاٹا گیا۔ بس اس لمحے شرمین کو ضرور ایک گہرے افسوس کا احساس ہوا مگر پھر وہ اپنے درس و تدریس کے مشغلے میں محو ہو گئی۔

ایک ماہ بھی نہ گزرا ہو گا کہ دادی اماں کے گھر کا دوسرا حصہ بن کر تیار ہو گیا۔ حتیٰ کہ رنگ و روغن بھی ہو گیا اور خوب اچھا لگ رہا تھا چونکہ جگہ کشادہ تھی اس لیے دو حصے ہونے کے باوجود گھر کی کشادگی اور وسعت میں فرق نظر نہیں آتا تھا بلکہ خان صاحب کے تدبر اور تعمیرات کے شوق اور تجربے کی بنا پر گھر کے کئی مقدمات خوب صورت اور پائیدار ہو گئے تھے۔

جوں، جوں گھر میں تبدیلی آتی گئی پڑھنے کے لیے آتی جاتی بستی کا اشتیاق بھی بڑھتا چلا گیا۔ اسے ویسے ہی شرمین سے انتہائی درجے کی عقیدت اور انسیت پیدا ہو چکی تھی، دن بھر میں خصوصاً شام کا زیادہ وقت وہ یہیں گزارنا پسند کرتی تھی، اب یہاں کا علیحدہ پورشن دیکھ کر اس کے اندر کا جوش و خروش بھی بڑھ رہا تھا۔ جب سے اس نے سنا تھا کہ دادی اماں گھر کا یہ حصہ کرائے پر اٹھانا چاہتی ہیں، وہ دل ہی دل میں اپنے

گھر اور اس گھر کا موازنہ کرنے لگی تھی۔

حقیقت بھی یہی تھی کہ خان صاحب کی نسبت دادی اماں کا گھر زیادہ بڑا تھا۔ کرائے والے حصے میں ایک کمرا اور اسٹور کا اضافہ بھی تھا۔ چنانچہ بسنتی نے اپنے ماتا، پتا جی کو اس امر کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ دن رات دادی اماں کے گھر کی تعریفیں کرتی رہتی، وہاں کے گُن گاتی رہتی۔

جلد ہی اس کی محنت رنگ لے آئی۔ دادی اماں کے گھر کی کشادگی اس کی ماتا جی کو بھی بہت بھائی۔ انہوں نے بسنتی کے پتا جی کو اکسایا۔ پتا جی نے خان صاحب سے ذکر کیا۔ خان صاحب کا دل تو قدرت نے ویسے ہی گویا آبِ زر سے بنایا تھا۔ انہوں نے بالکل بھی کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہ کیا۔ ویسے بھی انہیں کرائے داروں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ دادی اماں کے حالات ان کے پیشِ نظر تھے۔ کرائے دار کی حیثیت سے رام داس کی فیملی اپنی شرافت اور سادگی کی وجہ سے نہایت موزوں بھی تھی۔ چنانچہ انہوں نے وقت ضائع کیے بغیر ذکیہ خالہ کے ذریعے دادی اماں کی رائے طلب کی جو بغیر کسی پس و پیش کے انہیں ہاں کی صورت میں مل گئی۔ اس لیے علیحدہ حصہ بن جانے کے بعد جلد ہی دادی اماں کا گھر کرائے داروں سے آباد ہو گیا تھا۔

اس طرح گھر کی رونق اور چہل پہل میں اضافہ ہو گیا۔ شام کے اوقات میں ویسے ہی ٹیوشن سینٹر آباد ہو جایا کرتا تھا۔ سونے پر سہاگا کرائے کی اضافی آمدنی تھی، دادی اماں تو سجدۂ شکر بجالاتیں۔ اپنے رحیم و کریم رب کا شکر ادا کرتے ان کی زبان نہ تھکتی۔ بسنتی اب زیادہ تر اِدھر ہی نظر آتی۔ جلدی، جلدی گھر کے کام کاج میں اپنی ماتا جی کا ہاتھ بٹاتی اور اس طرف بھاگ لیتی۔ شرمین اسے شام کے وقت پڑھایا کرتی تھی، دن میں جب شرمین اسکول جا چکی ہوتی تو بسنتی، دادی اماں کے ارد گرد گھوما کرتی، اس کی میٹھی، میٹھی باتیں دادی اماں کو بہت بھاتی تھیں۔

عبد اللہ اور ولی اللہ بھی اسکول چلے جاتے، گھر میں اوپر کے کام کاج کے لیے شرمین نے ایک ملازمہ رکھ لی تھی۔ باقی باورچی خانے کا کچھ کام پیاری بوا دیکھ لیتی تھیں، دادی اماں کو فرصت ہی فرصت ہوتی، ایسے میں بسنتی ان کا دل لبھانے کا سامان تھی۔ وہ ان سے بیٹھی گھنٹوں اپنے گاؤں کی باتیں کرتی رہتی۔

فطری طور سے وہ بہت ذہین تھی، دیکھتے ہی دیکھتے فرفر ہر طرح کی تحریر پڑھنا سیکھ گئی۔ گھر میں آیا ہوا اخبار اٹھا لیتی اور دادی اماں کو دنیا جہاں کی خبریں سنا ڈالتی۔ خبریں پیاری بوا بھی بڑی دلچسپی سے سنا کرتی تھیں۔ تبصرہ کرتی جاتیں، سنتی رہتیں۔

دو دن سے شرمین کو شدید نزلے کی شکایت تھی۔ اتوار کے دن وہ اندر کمرے میں بے خبر پڑی سو رہی تھی۔ بسنتی، دادی اماں کے سر میں تیل کی مالش کرنے لگی۔ پیاری بوا اٹھ کر کسی کام سے باورچی خانے میں گئی تھیں کہ باہر دروازے پر کھٹکا ہوا۔

آج ٹیوشن کی بھی چھٹی تھی۔ دادی اماں نے بسنتی کو اشارہ کیا، اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دو خوش پوش لڑکیاں جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

یہ دونوں، روبی اور معصومہ تھیں۔ آج شاپنگ کے بہانے ڈاکٹر خاور کے ساتھ آئی تھیں۔ خاور گھر کے باہر گاڑی میں ہی بیٹھے تھے۔ ان کا خود کا چہرہ بے حد سنجیدہ اور حساس ہو رہا تھا۔ دل میں اک کسک، بے چینی اور بے کلی کھٹک رہی تھی۔ یہ دونوں آہستہ، آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی قریب آئیں اور نہایت ادب سے سلام کیا۔

دادی اماں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ روبرو دو اجنبی صورتیں دیکھیں تو جلدی سے گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ محبت سے سلام کا جواب دیا نفاست اور سلیقے سے سجے سجائے ایک پرسکون کمرے میں لا بٹھایا اور غور سے دیکھتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

''بیٹی! کہاں سے آئی ہو تم لوگ......؟ پہلی بار دیکھ رہی ہوں تمہیں۔'' روبی اس وقت تک اجنبیت پر

قابو پاچکی تھی۔ اطمینان سے تعارف کرایا۔
''دادی جان! ہم دونوں شرمین کی دوست ہیں، کچھ دن پہلے تک ہمارے ہاں ٹیوشن پڑھایا کرتی تھیں۔ پھر نہ جانے کیا ہوا، انہوں نے آنا بند کردیا، معلوم نہیں کیوں؟''
''ارے ہاں......'' دادی اماں نے چونک کر کہا۔ ''شرمین جتنی جگہ ٹیوشن پڑھاتی رہتی ہے، میرا غائبانہ تعارف کرواتی رہی ہے......اس نے تم لوگوں کو بھی بتایا ہوگا، اللہ کا شکر ہے اسے سرکاری ملازمت مل چکی ہے، گھر سے نزدیک ہی ہے اس کا اسکول......اب چونکہ ڈیوٹی کے بعد زیادہ وقت نہیں مل پاتا ہے، اس لیے ٹیوشن پر جانا چھوڑ دیا ہے۔'' یہ دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھ کر رہ گئیں۔
''دادی اماں......شرمین کہاں ہیں؟ کہیں دکھائی نہیں دیں اب تک......'' تھوڑی دیر کے بعد معصومہ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔
''بیٹی......! آج وہ ذرا سی سوگئی ہے، دو تین دنوں سے طبیعت اس کی گری، گری سی ہورہی ہے بہت سخت نزلہ زکام ہوا ہے۔'' دادی اماں نے فکرمندی سے کہا۔ اتنے میں بسنتی شرماتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور دادی اماں کے بالکل قریب جاکر دھیرے سے پوچھا۔
''بڑی ماں جی! پیاری بوا پوچھتی ہیں مہمانوں کے لیے چائے دم کروں......یا شربت بناؤں؟'' بسنتی کا دھیرے بھی اتنے زور کا تھا جو اُن دونوں نے بخوبی سنا اور سن کر مسکرانے لگیں۔
''کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے دادی جان......ہم کون سا کہیں کے مہمان ہیں۔ آپ کے اپنے تو ہیں، بس آپ شرمین سے ملوادیجیے، ہم انہی سے تو ملنے کے لیے نکلے ہیں آج۔ مہربانی ہوگی۔'' روبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''دادی اماں! یہ دراصل میری ہونے والی بھابی ہیں اور شرمین کی بہت گہری سہیلی ہیں، اب ان کی شادی میں بہت کم دن رہ گئے ہیں اس لیے، ہم ان کو خود شادی کی دعوت دینے کے لیے آئے ہیں۔'' معصومہ انہیں متاثر کرنے کے لیے جلدی سے بولی۔
''اچھا...... خدا مبارک کرے......شرمین کیسے نہ شامل ہوگی سہیلی کی شادی میں۔'' دادی اماں خوش ہوکر بولیں۔ پھر روبی کو مخاطب کرکے کہنے لگیں۔
''ارے بیٹی! تم خود کیوں گھر سے نکل پڑیں؟ کسی سے خبر بھجوادی ہوتی شادی کی۔ شرمین کو ہم خود بھجوادیتے دعوت میں۔'' روبی نے لاجواب ہوکر سر جھکالیا۔ معصومہ کو ہنسی آگئی۔ ان دونوں لڑکیوں کو ہنستے مسکراتے دیکھ کر اور دل ہی دل میں شرمین کی کسمپرسی کا خیال کرکے ان کا دل بھر آیا۔ جی مسوس کر بولیں۔
''خوش رہو بیٹی......سدا ہنسو، مسکراؤ۔ اللہ نصیبے اچھے کرے...... یہی دن تو ہوتے ہیں لڑکیوں کے ہنسی، دل لگی کرنے کے۔ خدا ہر بچی کے مقدر چمکائے، میں تو بڑھاپے میں اپنی شرمین کے متعلق سوچ، سوچ کر ہولتی رہتی ہوں۔ کیسی میری بچی کی عمر گزری جارہی ہے، نہ کوئی چاؤ کرنے والا نہ ناز اٹھانے والا......بس دن، رات اپنے چھوٹے بھائیوں کے لیے محنت مشقت کی چکی میں پستی رہتی ہے، پہلے ٹیوشن کے لیے ماری، ماری پھرتی تھی۔ اب ملازمت ملی ہے تو صبح سویرے نکل جاتی ہے، دوپہر کے بعد تھکی ہاری آتی ہے، شام کو ٹیوشن سینٹر میں سر کھپانے بیٹھ جاتی ہے، اچھا...... میں جگاتی ہوں جاکر۔'' وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر آہستہ قدموں سے باہر چلی گئیں۔ اس چھوٹے سے کنبے کی بپتا سن کر روبی اور معصومہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔ انہیں یہاں کے مکینوں سے بے حد اپنائیت اور ہمدردی کا احساس ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں ملتی ہوئی شرمین اندر داخل ہوئی......مگر ان دونوں کو پہچان کر جہاں کی تہاں تھم گئی اور آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر دیکھنے لگی جیسے زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ روبی نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگالیا۔ معصومہ نے دوڑ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور محبت آمیز انداز میں بولی۔
''آپ کو معلوم بھی ہے، بابر بھائی جان کی

شادی ہو رہی ہے۔ پھر یہ میری بھابی بن جائیں گی، ہم آپ کو بلانے آئے ہیں۔'' شرمین نے نظر اٹھا کر ان نند، بھاوج کو دیکھا...... لیکن فوراً ہی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ معصومہ کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

''اللہ...... آپ تو کچھ بولتی ہی نہیں ہیں، اتنی خفا ہیں ہم سے؟ خدا کی قسم، اماں جان نے جو کچھ آپ سے کہا ہوگا، ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم...... آپ نے ایک دم ہی آنا چھوڑ دیا۔ ایک دن انہوں نے خود ہی غصے میں سب بتادیا تھا...... ایمان سے، خاور بھائی کا صدمے سے اتنا برا حال ہے کہ پیٹ بھر کر کھانا تک نہیں کھاتے، ہر وقت پریشان اور اداس رہتے ہیں...... سب کو بہت رنج ہے اماں جان کے سلوک کا......'' معصومہ کی باتیں سن سن کر شرمین کے دُکھے ہوئے دل پر جانے کیا بیت رہی تھی۔ چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سپید پڑ گیا تھا۔ ہاتھوں، پیروں میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی مگر کیا مجال کہ زبان سے ایک لفظ بھی برا یا بھلا نکالا ہو۔ دونوں پر طنز کا کوئی تیر چلایا نہ اپنی خفگی ظاہر کی اور نہ ہی نائمہ بیگم کے ناروا سلوک کا رونا رویا۔

حالانکہ روبی اور معصومہ کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ انہوں نے شرمین پر کیسے بے بنیاد الزامات لگائے اور طنز و حقارت کے زہریلے تیر چلائے تھے۔ انہیں صرف اندازہ تھا کہ بہت کچھ کہا ہوگا۔ اس لیے دونوں کو یقین تھا کہ شرمین جس بری طرح پیش آئے، کم تھا مگر یہاں معاملہ برعکس نکلا...... شرمین کے نارمل رویے نے دونوں کے دل مزید موہ لیے۔

''ہائے اللہ روبی آپا! یہ تو ہم سے بات بھی نہیں کر رہیں۔ آپ ہی ان کو منائیں ورنہ یہ تو...... شادی میں بھی نہیں آئیں گی۔'' جب وہ خاموش ہی رہی تو معصومہ نے پریشان ہو کر روبی سے کہا۔

روبی نے چالاکی سے اسے سنانے کو کہا۔

''ارے یہ کیا بولیں گی؟ ہم تو خود ہی ان کو شادی میں شامل نہ ہونے دیں گے۔ بلکہ ایک دن خود انہی کو دلہن بنا کر لے جائیں گے۔'' شرمین گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ کچھ بولنا چاہا مگر روبی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور قریب بٹھا کر سنجیدگی سے بولی۔

''دیکھو...... تمہیں اس معاملے کے بیچ بولنے کا حق نہیں ہے، میں خاور کے بھی دلی معاملات سے آگاہ ہوں۔ تمہیں تمہارا اصل مقام دلا کر رہوں گی۔ یقیناً ممانی جان نے غلیظ الزامات کی حد کردی ہوگی جو کوئی شریف لڑکی برداشت نہیں کرسکتی۔ مگر تم نے... بروقت صبر و تحمل کا مظاہرہ کر کے بہت اچھا کیا، ان باتوں کو ذہن سے جھٹک دو، بھول جاؤ، باقی رہا بھائیوں کی خاطر شادی نہ کرنے کا خیال تو ایک کو تم ڈاکٹر بناؤ گی دوسرے کو میں پروفیسر...... دادی اماں، ہم سب کی مشترکہ دادی اماں ہوں گی...... چلو مسئلہ ختم...... اب ذرا چل کر دروازے سے اپنے پیارے مکھڑے کی جھلک دکھلا دو، تمہارے ڈاکٹر صاحب غم سے آدھے ہو چکے ہیں، ان کی تسلی کردو۔'' شرمین تو جیسے خواب دیکھ رہی تھی، اسے کہاں بھلا ایسی انوکھی واردات اور نرم و نازک باتوں کی توقع تھی۔ وہ روبی کے گلے لگ کر رونے لگی۔

''ارے بھئی تم ابھی تو وداع نہیں ہو رہیں۔ ذرا صبر سے راہ تکو۔'' روبی اسے ہنسانے کے لیے بولی۔ شرمین جھینپ کر الگ ہوگئی۔ معصومہ ہنسنے لگی۔

دادی اماں نے چائے بھجوا دی تھی، دونوں پی کر خوشی، خوشی جانے کو کھڑی ہوگئیں۔

روبی اس کے کان میں سرگوشی کر کے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر خاور اسٹیئرنگ پر سنجیدہ صورت لیے خاموش بیٹھے تھے۔ روبی کا کھلا کھلا چہرہ دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی پھر اس کے ٹہوکا دینے پر چونکے اور سامنے دیکھنے لگے۔ دروازے کی اوٹ میں شرمین کا صبیح چہرہ نظر آیا۔ زرد سے پھولدار سوتی سوٹ میں وہ حسن و دلربائی اور معصومیت کا مرقع نظر آئی۔

ڈاکٹر خاور کا دایاں ہاتھ مدہوشی کے عالم

میں اٹھا اور انہوں نے بڑے اسٹائل سے اسے سلام کرڈالا۔

☆☆☆

سفید لفافہ ہاتھ میں تھامے وہ گم صم کھڑی رہ گئی۔ کئی منجمد لمحے خاموشی کی نذر ہوگئے۔ اچانک بارش کی موٹی، موٹی بوندوں نے اس گہرے سکوت میں ہلچل مچا دی۔ ہر طرف سے ٹپ، ٹپ کی مخصوص سرسراہٹیں ابھرنے لگیں۔

ریشم نے لفافہ جلدی سے اوڑھنی کے اندر چھپالیا اور خود آپ ہی آپ ہنستی ہوئی تیزی سے اندر کمرے کی طرف بھاگی۔

اندر پہنچ کر اس نے اوڑھنی سے ہاتھ نکال کر دیکھا۔ لفافہ بھیگنے سے بال، بال بچ گیا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکرادا کرتے ہوئے لفافے کو بڑی احتیاط سے الماری میں رکھا اور خود بالوں سے بوندیں جھاڑتی ہوئی چولھے کے پاس آبیٹھی، ہنڈیا دیکھی جو تیار ہوچکی تھی۔ روٹی عموماً وہ خرم کے آنے پر ہی پکایا کرتی تھی۔ معاً اسے یاد آیا کہ چھتری وہ چھت پر چھوڑآئی ہے، فوراً ہی اس نے اوپر جانے کا فیصلہ کیا اور آ بھی گئی۔ چھت پر آکر وہ ایک بار پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی۔ بارش سے گرد وغبار بیٹھ چکا تھا۔ فضائیں نکھر کر اجلی، اجلی ہوگئی تھیں۔ ہوا خوشگوار اور بھیگی، بھیگی تھی۔ زمین سے سوندھی، سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی.... برکھا کے رنگ نیارے، وقت سہانا اور روح افزا ہو رہا تھا۔ وہ چھت کی منڈیر سے چپکی تمام نظارے اپنے اندر اتار رہی تھی۔ بھیگی ہوئی چھتری لینے آئی تھی مگر اب خود ہر آن بھیگتی جارہی تھی۔ اوڑھنی اور کپڑے بھیگ کر بدن سے چپک گئے تھے۔ چہرہ دھل دھلا کر تمتما رہا تھا مگر اسے بڑا لطف آرہا تھا۔ اچھا لگ رہا تھا ہر منظر......اچانک بادل اتنے زور سے گرجے...... کہ ریشم کو لگا جیسے پوری چھت ہل کر رہ گئی ہو۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر نیچے کی طرف بھاگی اور ایک وقت میں دو، دو زینے پھلانگتی اپنے کمرے میں پہنچ کر دم لیا۔ ذرا سی دیر میں اس کی سانس پھول گئی۔ چھتری ایک دفعہ پھر وہ اوپر ہی بھول آئی تھی۔ اپنی بدحواسی پر جی کھول کر ہنسی اور ہنستے، ہنستے ہی اس نے گیلے کپڑے تبدیل کیے اور پلنگ پر لیٹ رہی۔

باہر بارش مزید تیز ہوگئی تھی۔ بادل رک، رک کر گرج رہے تھے۔ بجلی کڑک رہی تھی۔ گہرے بادلوں کی وجہ سے کمرے میں نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ریشم نے آنکھیں بند کرلیں۔ دیر تلک بھیگتے رہنے کے بعد اب اسے سردی لگنے لگی تھی۔ اسے غنودگی سی آنے لگی تھی کہ ذرا دیر کے بعد دروازہ۔۔۔ چرچراتا ہوا کھلا۔ ریشم نے آنکھیں کھول دیں۔ مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دھندلی روشنی میں خرم دروازے کے پاس کھڑا دروازہ بند کررہا تھا۔ اس کی پشت ریشم کی طرف تھی۔ دروازہ بند کرنے کے بعد وہ مڑا، وہ سر سے پاؤں تک بھیگے ہوئے کبوتر کی طرح لگ رہا تھا۔ ریشم کی نیند اور ٹھنڈ ہوا ہوگئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور خرم کی حالت دیکھ کر ہنسنا شروع ہوگئی۔

''کیا بدتمیزی ہے۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

''جلدی سے دوسرے کپڑے نکال کردو۔ سردی لگ رہی ہے۔''

''سردی......'' کا سن کر وہ جلدی سے اٹھی اور جھٹ پٹ دوسرے کپڑے نکالنے لگی۔ خرم غسلخانے میں گھس گیا تھا۔ بادل ایک بار زور سے گرجے۔ بارش تیز ہوگئی۔

خرم نہا کر، تازہ دم ہوکر باہر نکلا تو وہ روٹی پکا چکی تھی۔ ملگجے اندھیرے کی وجہ سے ریشم نے لیمپ روشن کرکے میز پر رکھ دیا تھا۔ لیمپ کی روشن کرنوں نے چاروں طرف پھیل کر اندھیروں کو مار بھگایا تھا۔ اس وقت برستی شام کا سماں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب یہ دونوں کھانا کھا رہے تھے تو دفعتاً ریشم کو وہ سفید لفافہ یاد آگیا۔ اس نے پانی کا گلاس واپس دسترخوان پر رکھ دیا، تیزی سے دوڑ کر گئی اور الماری سے لفافہ لاکر خرم کو دے دیا۔

''کیا ہے یہ......؟'' خرم نے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ایک آدمی دے کر گیا ہے باہر سے۔'' ریشم نے تفصیل سے بتانا شروع کر دیا۔

''ہرے رنگ کی جیپ گاڑی میں آیا تھا۔ پہلے آپ کے متعلق پوچھا۔ پھر بولا......ٹھیک ہے وہ آئیں تو ان کو دے دینا۔'' اتنی دیر میں خرم لفافہ چاک کر چکا تھا۔ اندر کے پیپرز برآمد ہوتے ہی اس کی رنگت متغیر ہوگئی۔ نوالہ اس نے اپنی پلیٹ میں رکھ دیا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ ایک دم ہی پریشان دکھائی دینے لگا تھا۔ اسے کھانے سے ہاتھ روکتے دیکھ کر ریشم بھی پریشان ہوگئی۔

''کیا ہوگیا؟ آپ نے کھانا کیوں چھوڑ دیا؟'' فکرمندی سے پوچھنے لگی۔

''ہوں...... کچھ نہیں، کچھ نہیں، بس یونہی......'' اس نے چونک کر جواب دیا۔

''خط میں......کوئی ایسی ویسی خبر لکھی ہے؟'' وہ اس کے قریب چلی گئی اور شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''ارے نہیں بھئی......اس نے قدرے جھنجلا کر کہا۔

''سب ٹھیک ہے بس کوئی دفتری معاملہ ہے۔'' ریشم قدرے مطمئن ہوکر برتن سمیٹنے لگی۔

خرم وہاں سے اٹھ کر ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ بہت خاموش اور متفکر سا ہوگیا تھا۔ باہر بارش پیٹ پیٹ کر برس رہی تھی۔ ہوا کے بھیگے ہوئے سے جھونکے کمرے کے اندر آتے، لیمپ کی لو بار، بار بھڑکتی، دونوں کے سائے دیوار پر لہرا کر گڈمڈ ہوجاتے۔

ریشم جب تک باورچی خانے کے کام سے نمٹ کر آئی۔ خرم کافی سنبھالا لے چکا تھا۔ اس سے اِدھر اُدھر کی روزمرہ کی باتیں کرنے لگا۔ ریشم نے فکرمندی اور لاچاری سے کہا۔

''برکھا اتنے زوروں سے برس رہی ہے، معلوم نہیں بابا کا کیا حال ہوگا؟ اکیلے پڑے ہوں گے اس مینہ پانی میں۔'' خرم نے اپنی پریشانی کے باوجود اس کی پریشانی کو محسوس کیا اور بولا۔

''ہاں سچ کہا تم نے...... آج ارادہ بھی تھا انہیں لانے کا مگر بارش نے راستہ روک لیا۔ انشاء اللہ صبح انہیں ضرور اٹھا لاؤں گا یہاں۔''

بارش کا زور کافی ٹوٹ گیا تھا مگر آسمان بادلوں سے اسی طرح ڈھکا ہوا تھا۔ سیلی، سیلی ہوائیں سائیں، سائیں کی آوازوں کے ساتھ اونچے، اونچے درختوں سے سر ٹکراتی پھر رہی تھیں۔ بادلوں بھری دوپہر پتا بھی نہیں چل سکا کہ کب شام میں تبدیل ہوگئی اور شام سے رات آگئی مگر آسمانوں سے برستے پانی کا تار نہ ٹوٹا۔

رات کے کھانے کے بعد باتیں کرتی، کرتی ریشم جلد ہی نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔ مگر خرم سے ایسا نہ ہو سکا۔ لیمپ کی روشنی میں اس نے ایک دفعہ پھر لفافہ کھول کر تحریر کو بغور پڑھا۔ نہایت سادہ الفاظ میں یہ اس کا ٹرانسفر نامہ تھا۔

یہاں سے تبادلے کے حکم نے اسے بہت ساری فکروں میں مبتلا کر ڈالا تھا۔ مگر ایسا تو ہونا ہی تھا۔ وہ کئی سال سے ایک ہی مقام پر تعینات تھا۔ اسے اپنی نہیں بلکہ ریشم کی فکر تھی۔ اب موجودہ صورتِ حال میں وہ تنہا نہیں بلکہ ایک معصوم سی بے خبر بیوی کا شوہر ہو چکا تھا اور اپنی تمام ذمّے داریوں سے آگاہ تھا۔ گھر والوں سے چھپ کر اس نے جو کارنامہ سرانجام دیا اس کا خمیازہ بھگتنے کا اندیشہ ہر آن بدحواس رکھنے لگا تھا اور اب یہ تبادلے کا حکم، اسی سوچ میں اسے دوپہر سے رات گزر گئی۔

ساری دنیا جیسے سوگئی۔ سنسان ہوگئی، ہواؤں میں مزید تیزی آگئی تھی۔ برستی بارش کی اندھیری رات ساکت کھڑی تھی۔ ہر طرف اک ہُو کا عالم طاری تھا۔ خاموشی، تاریکی اور بارش...... ہر طرف بہت ویرانی سی تھی...... سناٹا بہت گہرا تھا مگر اب خرم پر بھی غنودگی کا غلبہ ہو چکا تھا۔

یکا یک بادل زور سے گرجے، ساتھ ہی کسی نے بیرونی گیٹ پیٹ ڈالا۔ پہلی ہی دستک پر خرم اچھل کر بیٹھ گئے۔ کوئی چلا، چلا کر کہہ رہا تھا۔

''جنگل بابو، جلد آؤ، جلدی کرو...... تمہارا بسرا دب گیا۔ اس کی جھونپڑی گر گئی ہے۔'' خرم نے دروازہ کھولا تو صحن میں مینہ کی ہلکی ہلکی بوندیں آہستہ آہستہ گر رہی تھیں۔ اور جب وہ آنے والوں کے ساتھ بابا رحمت کی جھونپڑی کی طرف بھاگا جا رہا تھا تو بارش کی بوندوں کی جھالر ہوا کے تیز جھونکوں سے لہرا رہی تھی۔ اطلاع دینے والوں میں رام داس سب سے آگے تھا اور بتاتا جا رہا تھا۔

''میں کل بارش سے پہلے ہی دسہرے کی چھٹیوں پر بچوں کے ساتھ یہاں بستی پہنچا ہوں، ابھی میری بکری باڑے سے نکل بھاگی تب ہی بابا کی جھونپڑی گری ہے۔''

بالآخر قصہ مختصر...... ہوا یہ کہ مینہ کی یہ جھڑی ریشم کے بابا کو ہمیشہ کے لیے اس سے کوسوں دور لے گئی۔ وہ کھانستے، کراہتے ایسے گئے کہ ریشم کی آہ وزاری اور اشکوں کی بارات انہیں واپس نہ لا سکی۔

اگر انہی دنوں بسنتی نہ آئی ہوتی تو جانے اس پر کیا گزرتی؟ بسنتی نے ہر، ہر پل اس کی خبر گیری رکھی اور تسلی تشفی دی۔ خرم کو بھی ڈھارس رہی۔ مینہ کی جھڑی ایسی لگی کہ کئی روز تک آسمان پر بادلوں کی سرمئی چادر پھیلی رہی۔ آسمان سے زمین تک ریشم کی آنکھوں کی طرح پانی کا تار بندھا رہا۔

☆☆☆

تقریباً سہ پہر چار بجے خرم کوٹھی پہنچا۔ اتفاق سے سب لوگ سو رہے تھے۔ نائمہ بیگم کی طرف سناٹے گونج رہے تھے۔ حتیٰ کہ شرارتی بچے تک پڑے سو رہے تھے۔ خرم بہت حیران ہوا...... یوں بھی ریسٹ ہاؤس سے ہزار فکرات میں گھرا ہوا ...... سفر کرتا آ رہا تھا۔ بسنتی اور اس کے گھر والوں کی وجہ سے بہت ڈھارس ہوئی تھی۔ غمزدہ اور دلگیر ریشم کو ان کے سپرد کر کے چند دن کے لیے گھر چکر لگانے کے لیے آیا تھا۔ نہلے پہ دہلا یہ ہوا تھا کہ تبادلے کے آرڈرز آ گئے تھے۔ حالات بہت گمبھیر ہو چکے تھے۔

اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اماں جان اس کی شادی ٹھہرانے والی ہیں، جب سوچ، سوچ کر دماغ بیکار ہونے لگا تو جی میں آئی کہ گھر پہنچ کر بابر بھائی کے روبرو اعترافِ گناہ کر لیا جائے پھر جو ہو، دیکھا جائے گا۔ اس کا دل و دماغ تو ہلکا ہو جائے گا۔ ممکن ہے بابر بھائی اس کے الجھے ہوئے مسئلے کا کوئی مناسب حل سوچ سکیں۔ یہ سب سوچ کر اس نے ریشم کے پاس بسنتی کو ٹھہرایا اور بابا کے سوئم کے بعد اپنے گھر کی راہ لی۔

ایک، ایک کر کے اس نے تمام گھر کے کمرے جھانک لیے اسے انیکسی میں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا وہاں پہنچا تو اس کی نگاہیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ زمین نے گویا اس کے پیر پکڑ لیے۔ دو، دو درزی بیٹھے ہوئے دھڑا دھڑ ریشمی ملبوسات سی رہے تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

''شادی کی...... تیاریاں ہو رہی ہیں صاحب۔'' جواب ملا...... خرم کے دیوتا کوچ کر گئے۔ واپسی پر وہ گرتے، گرتے بچا۔ جیسے تیسے بابر بھائی کے کمرے میں آیا۔ وہ بھی منہ پر کتاب اوندھائے سو رہے تھے۔ یہ بھی ایک کرسی پر گر کر ہانپنے لگا۔ ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ آتے اوسان خطا ہوئے جا رہے تھے۔

''گویا یہاں شادی کی تیاریاں جاری و ساری ہیں...... اب ہوگا کیا......؟'' ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اس کی جان لے رہا تھا۔ جی ہی جی میں ''جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو'' کا ورد کرتے ہوئے بابر بھائی کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ان کے سامنے ابھی اور اسی وقت اپنی شادی کے راز پر سے پردہ اٹھا ڈالے گا۔ لیکن بہت

دیر ہوگئی وہ سو کر ہی نہ اٹھے حتیٰ کہ معصومہ کو بھائی کے آنے کی خبر ہوگئی اور وہ اسے یہ بتا کر اپنے کمرے میں لے آئی کہ ”بابر بھائی جان کو بخار ہے وہ انجیکشن لگوا کر سو رہے ہیں۔“ وہ دوڑ کر اس کے لیے پانی وغیرہ لائی پھر راز داری سے بتانے لگی۔

”خرم بھیا، آپ تو بہت دنوں بعد آئے ہیں، آپ کو معلوم نہیں ہے سیٹھ رستم علی کے ہاں جو آپ کی بات چلی رہی تھی، معلوم نہیں کس بنا پر اماں جان ان سے خفا ہوگئیں پھر اچانک ہی انہوں نے آپ کی شادی روک دی۔ اب صرف بابر بھائی جان کی شادی کر رہی ہیں، آپ کی بعد میں خاور بھائی کے ساتھ، ساتھ ہوگی۔“

”ایں......“ خرم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بے یقینی سے پوچھا۔ ”معصومہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ذرا پھر سے کہنا۔“ معصومہ نے اپنی بات دوبارہ دُہرادی اور رونی صورت بنا کر بولی۔

”بھیا! ایک دن پھوپی جان بھی کہہ رہی تھیں کہ نائمہ کے فیصلے نا قابلِ فہم ہیں، ہم تو اتنے خوش ہو رہے تھے کہ ہماری دو، دو بھاوجیں آئیں گی مگر اماں جان نے ہر ارمان مٹا ڈالا۔ آپ کو بھی افسوس ہوا ناں بھیا؟“ خرم نے سکھ کی ایک لمبی سانس لی اور وہیں اس کی مسہری پر لیٹ کر بولا۔

”چلو جاؤ بھاگ جاؤ اب تم...... مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔“ معصومہ بیچاری مغموم، مغموم سے انداز میں بھائی کو تکتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کے خرم بھائی کو متوقع شادی کے رک جانے کا ملال ہوا ہے اس لیے اسے بھگا دیا۔

معصومہ کے کمرے میں لیٹ کر خرم سچ مچ سو گیا اور ایسی گہری، پُرسکون اور میٹھی نیند سویا کہ بابر اٹھ بیٹھے، سارا گھر جاگ گیا مگر وہ اطمینان سے سوتا رہا۔

اور جب سو کر اٹھا تو بالکل تازہ دم اور بے فکر سا ہو رہا تھا۔ جیسے بہت دنوں کی فکرات سے آزادی ملی ہو۔ بابر بھائی جان سے اپنا راز نہ کہنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ فی الحال خطرہ ٹل گیا تھا۔ اس نے سوچا۔ ”بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی تو جان بچی سو لاکھوں پائے۔“ ایک غایت درجے کا اطمینان اتر آیا تھا اس کے رگ و پے میں...... ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔

دو دن تک وہ بھی دیگر معاملات کو بھلائے بہن، بھائیوں کے درمیان خوب لطفِ زندگانی اٹھاتا رہا۔ روبی سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ شادی کی تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ دار بنا رہا تھا اور ہلا گلا کرتا رہا۔ پھر واپس، شادی سے قبل آنے کا کہہ کر چلا گیا۔

بچوں کی سرگرمیوں سے بے پروا نائمہ بیگم بیٹے کی شادی کی تیاریوں میں پوری طرح منہمک تھیں۔ کون کیا کر رہا ہے یا کہہ رہا ہے، انہیں معلوم تھا اور نہ وہ معلوم کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے اپنی ہی الگ نوعیت کے مطلق العنان حکمران کے سے مزاج کے طور طریقے سب سے جداگانہ تھے۔ کسی کو خاطر میں کب لاتی تھیں۔ دونوں لڑکیاں جس روز سے شرمین کے ہاں ہو کر آئی تھیں، اندر ہی اندر اس کے گُن گاتے نہ تھک رہی تھیں۔ شرمین کی شرافت اور نیک نفسی کی تو دل سے معترف ہو چکی تھیں مگر دادی اماں کی کہی ہوئی باتیں بھی انہیں بھلائے نہیں بھول رہی تھیں۔ روبی کو جب بھی ان کی کسمپرسی کا خیال آتا، اس کے دل کو اندر ہی اندر کچھ ہونے لگتا۔ ایک دن اس سے رہا نہیں گیا تو وہ شمسہ بیگم کے سامنے سب حال کہہ بیٹھی۔ معصومہ بھی موجود تھی۔

یہ سن کر کہ یہ دونوں خاور کے ساتھ چھپ کر شرمین کے گھر گئی تھیں، شمسہ بیگم دنگ رہ گئیں۔ ملامت آمیز لہجے میں بولیں۔

”ارے بیٹی! صد رحمت ہو تم پر، بلا ہمارے علم میں لائے تم اس نگوڑی ٹیوٹر کے گھر تک ہو آئیں؟ ایسی کیا مار پڑی تھی تم پر؟ اور خاور کو دیکھو! سوچے سمجھے بغیر بہنوں کو لے کر پہنچ بھی گئے۔ بجائے اس کے کہ سمجھاتے، منع کرتے...... اب جو نائمہ سنیں گی تو کیا سمجھتی ہو فضیحتہ کیے بغیر رہیں گی؟“ ان کی

طویل تقریر نے روبی کو چڑا دیا۔ وہ تو سمجھ رہی تھی امی جان ان کے اقدام کو سراہیں گی، ہمدردی کریں گی، بگڑ کر بولی۔

''مجھے تو آپ بھی ممانی جان کی ہمنوا لگتی ہیں امی جان۔ میرا تو خیال تھا کہ آپ ہماری حوصلہ افزائی کریں گی۔ بات کا صحیح رخ سمجھ کر اس مظلوم کی ضعیفہ دادی اماں کے لیے دلاسے کے چند بول بولنے خود چل کر ان کے پاس جائیں گی۔ معذرت کریں گی مگر آپ نے انصاف ہی کر ڈالا۔ واہ امی جان واہ......''

''ارے واہ لڑکی......! میں نے انہیں کیا...... کہہ دیا بھلا۔'' شمسہ بیگم نے قدرے تنک کر جواب دیا۔

''آپ نے نہیں تو۔'' روبی کہتے، کہتے جھجکی پھر کہتی چلی گئی۔

''آپ کی چہیتی بھاوج نے تو کہہ ڈالا......کون سا ایسا عیب ہے جو اس غریب لڑکی میں نہ نکالا ہوگا......اور کون سی گالی باقی چھوڑ دی ہوگی جو اس کی ذات کو نہ دی ہوگی۔''

''تو کیا...... نائمہ نے گالیاں دیں اس کو؟'' شمسہ بیگم نے حواس باختہ ہو کر پوچھا۔

''گالیوں سے بھی زیادہ بڑھ کر......معلوم نہیں کون ،کون سے الزامات دیے ہوں گے، دھمکیاں دی ہوں گی۔'' روبی نے جلے کٹے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا اس لڑکی نے......خود تم لوگوں کو یہ سب باتیں بتائی ہیں؟'' شمسہ بیگم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہمارے لیے انتہائی دکھ اور شرمندگی کی بات یہ ہے کہ اس......لڑکی......یعنی شرمین نے تو اپنی زبان سے ایک حرف بھی شکایت کا نہیں کہا ہے۔'' روبی نے دکھی ہو کر ایک ٹھنڈی سانس لی اور تاسف سے بولی۔ شمسہ بیگم نے حیران ہو کر اس کی بات کاٹ دی۔

''پھر......تم کس طرح کہہ سکتی ہو کہ نائمہ نے اسے گالیاں دیں...... دھمکیاں دیں...... اب بڑوں پر الزام بھی دھرنے لگیں تم؟''

''کاش! آپ اس کی ان زخمی نگاہوں کو دیکھ سکتیں جو ہم دیکھ کر آرہے ہیں...... سچ کہتی ہوں امی جان! یوں لگتا تھا گویا آنسو بھی ان آنکھوں میں پتھر کے بن گئے ہوں۔'' روبی نے رنجیدہ ہو کر جواب دیا۔

''ارے تو ایسا کیوں تمہیں لگا بیٹی......'' شمسہ بیگم نے متاثر ہو کر پوچھا۔

''وہ اس لیے امی جان کہ جب معصومہ نے اس سے ممانی جان کا حوالہ دے کر کہا کہ آپ نے اچانک آنا چھوڑ دیا تو ایک دن اچانک اماں جان نے خود ہی بتایا کہ میں نے اسے آنے سے منع کیا ہے، بس اس غیرت مند لڑکی کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ رنگت تو اس کی سفید پڑ چکی تھی مگر زبان بند تھی۔'' اب معصومہ نے بھی زبان کھولی اور کچھ یاد کر کے کہنے لگی۔

''پھوپی جان! ہم لوگ یہ سوچتے ہوئے گئے تھے کہ اماں جان نے اس کا ذکر جب ہم سب کے سامنے انتہائی گرے ہوئے الفاظ میں کیا ہے تو اس وقت غصے کے عالم میں معلوم نہیں کہ کس قدر سخت الفاظ استعمال کیے ہوں گے۔ اس لیے ہم جب ان کے سامنے جائیں گے تو یقیناً وہ بھی ضرور برا بھلا کہیں گی مگر مجال ہے کہ انہوں نے ایک لفظ بھی کہا ہو......اتنا تحمل، اتنا ضبط اور اس قدر بردباری سننے میں تو آسکتی ہے مگر روبرو دیکھنے میں کم ہی آتی ہوگی۔''

اس کے بعد روبی نے شرمین کی دادی اماں کے کہے ہوئے الفاظ ماں کے سامنے دُہرائے اور وضاحت کے ساتھ ان کے تاثرات سے آگاہ کیا کہ وہ شرمین کے مستقبل کے متعلق کس قدر فکر مند اور حواس باختہ تھیں۔ اب شمسہ بیگم کے تیور بالکل بدل چکے تھے۔ لڑکیوں نے اتنی تفصیل اور دل کی گہرائیوں کے ساتھ ان لوگوں کا تذکرہ کیا تھا کہ ان کا دل بھی تڑپ اٹھا تھا۔

''بھئی میں بھی لڑکی والی ہوں، روبی کی

شادی سے پہلے ضرور ان کے ہاں جا کر تلافی کرنے کی کوشش کروں گی۔'' بالآخر انہوں نے متاثر ہو کر کہہ ہی ڈالا۔

☆☆☆

بسنتی کی سیاہ بھونرا سی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور وہ گلوگیر آواز میں آہستہ، آہستہ بتارہی تھی۔

''جب ہم وہاں پہنچے تو جھونپڑی گر چکی تھی، جھونپڑی کی ہر چیز صحیح اور ثابت تھی حتیٰ کہ چائے کا ایک پیالہ تک نہ ٹوٹا تھا مگر...... رحمت بابا مر چکے تھے...... ان کی زندگی ختم ہو چکی تھی۔'' دادی اماں، ذکیہ خالہ اور پیاری بوا جو سانس روکے اس کا بیان سن رہی تھیں۔'' طویل سانس لے کر رہ گئیں۔ شرمین کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے تھے۔

شام کا وقت تھا، سب لوگ صحن میں چار پائیوں پر بیٹھے تھے۔ ذکیہ خالہ بھی اپنی طرف سے آ کر یہیں بیٹھ گئی تھیں۔ بسنتی کئی دنوں کی غیر حاضری کے بعد آج دوپہر ہی گاؤں سے واپس آئی تھی۔ اس باتونی لڑکی نے اپنی گاؤں کی سہیلی ریشم کا تعارف غائبانہ طور پر سارے گھر سے کروا رکھا تھا۔ اب جو اس کے گاؤں میں سانحہ پیش آیا تھا، اس کی تفصیل سب کے گوش گزار کر رہی تھی۔

''اصل میں چھت...... کمزور ہوگی جو ٹوٹ گری۔'' پیاری بوا عقلمندانہ انداز سے گردن ہلا کر بولیں، بسنتی نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

''چھت کی بیچ کی بلی ٹوٹ گئی تھی مگر حیرانی کی بات یہ تھی کہ جس جگہ رحمت بابا کی چار پائی پڑی تھی وہاں پہ چھت کا ملبہ ذرا سا بھی نہیں گرا تھا۔ سارے گاؤں والوں نے دیکھا وہ آرام کے ساتھ سیدھے، سیدھے لیٹے ہوئے تھے جیسے سو رہے ہوں۔''

''ایں...... اس کا کیا مطلب ہوا؟'' ذکیہ خالہ کے منہ سے کلمۂ حیرت سے نکلا۔

''ہاں موسی بڑی! میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔'' بسنتی بڑی سچائی سے یقین دلانے والے انداز میں بولی۔ ''ان کی چار پائی والے حصے پر چھت، لکڑیوں اور گھاس پھونس میں اٹکی رہ گئی تھی۔ اس لیے بابا کا بستر بالکل صاف ستھرا پڑا تھا۔ حد یہ ہے کہ چار پائی کے پاس رکھا ان کا حقہ بھی سلامت تھا۔ بس وہ بیچارے خود ہی باقی نہیں رہے۔''

چاروں طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ سب کے دل رنجیدہ ہو گئے تھے۔

''میرا خیال ہے وہ بیچارے چھت گرنے سے شاید پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔ چھت کے گرنے سے انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچی ورنہ ان کی ظاہری حالت کچھ دوسری ہی ہوتی۔'' تھوڑی دیر بعد دادی اماں بولیں۔

''بس بیگم...... یہ بھی قدرت کے انتظامات ہیں، مجھے تو اس لڑکی بیچاری کا دکھ ہو رہا ہے۔ ایک باپ تھا وہ بھی نہ رہا۔ آخر وقت میں کچھ کہہ سن بھی نہ سکے۔ وہ دکھیا مل جائے مجھے تو کلیجے سے لگا لوں۔'' پیاری بوا ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

''بڑی اماں...... گاؤں میں سبھی لوگ یہی کہہ رہے تھے کہ رحمت بابا پہلے ختم ہوئے ہیں، جھونپڑی بعد میں گری ہے، ورنہ وہ لکڑیوں کے نیچے دبے ہوئے نہ ہونے کی وجہ سے صاف بچ جاتے۔'' بسنتی نے دادی اماں کی بات پر چونک کر کہا۔

''بس بٹی جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے......اگر ان کی زندگی ہوتی تو آنے بہانے ضرور زندہ رہ جاتے۔ رہ، رہ کر ان کی لڑکی کا خیال آرہا ہے۔ بہت غمزدہ ہوگی غریب......'' ذکیہ خالہ نے ایک آہ بھر کر کہا۔ بسنتی نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

''ریشم کی بہت بری حالت ہے، روتے، روتے بیچاری ادھ موئی ہو چکی ہے، مجھے تو شہر آنے نہیں دے رہی تھی۔ اس کے جنگل بابو کی وہاں سے بدلی بھی ہو چکی ہے، میرے پتا جی نے تو ان کو صلاح دی تھی کہ یہاں ہمارے قریب شہر میں آ بسو، ایک دوجے کا سہارا رہے گا۔ وقت بہتر کٹ جائے گا۔''

"پھر انہوں نے کیا جواب دیا؟ مانے یا نہیں مانے؟" ذکیہ خالہ نے دلچسپی لے کر پوچھا۔

"بات تو ان کی سمجھ میں آ گئی تھی کیونکہ پتا جی ان کو آپ کے کرائے والے گھر کی بابت بتا رہے تھے۔" بسنتی نے قدرے مسکرا کر جواب دیا۔

"گھر تو ابھی تک خالی ہے، میں تو دل سے چاہتی ہوں وہ آ جائے بلا سے رونق ہی ہو جائے۔ جو ہم سے ہو سکا اس کے دکھ کا مداوا کریں گے۔ یہ تو ثواب کا کام ہے۔" ذکیہ خالہ نے پُرجوش ہو کر کہا۔

"بیچارے رحمت بابا کا گھر ہی ختم ہو جائے گا۔" شرمین نے پہلی بار زبان کھولی اور افسوس سے بولی۔

"ریشم اور جنگل بابو دونوں ہی بہت بڑے دل کے مالک ہیں، انہوں نے بابا کی جھونپڑی، باڑے بھیڑ بکریاں اور گھر گرہستی کا سامان اس لڑکے کو دے دیے ہیں جس نے آخر میں بابا کی خدمت کی تھی اور ان کے ڈھور ڈنگر چرانے جنگل لے جایا کرتا تھا۔" بسنتی نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"اللہ تعالیٰ مرنے والے پر اپنی رحمتیں برسائے گا۔ یہاں کے ایک وہاں کے ستر ملیں گے۔ بہت نیک دل معلوم ہوتے ہیں۔" پیاری بوا خوش ہو کر دعائیہ انداز میں گویا ہوئیں۔

تھوڑی دیر اسی نوعیت کی باتیں رہیں پھر ذکیہ خالہ اپنی طرف چلی گئیں اور دادی اماں کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ رہیں۔

"تم گاؤں دسہرے کی چھٹیاں منانے گئی تھیں زیادہ مزہ تو نہیں آیا ہوگا؟" شرمین نے بسنتی سے کہا۔

"سچ کہا شین دیدی تم نے ..... خاک مزہ نہ آیا، ریشم کے دکھ نے جی کاٹ کر رکھ دیا۔ سوچا کیا تھا ہو کیا گیا۔ میں اس کے لیے شہر سے سوغات لے کر گئی تھی مگر دینے کی ہمت ہی نہیں پڑی۔" بسنتی نے دلگیر ہو کر جواب دیا۔

"کیا لے گئی تھیں؟" شرمین نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ایک ریشمی پراندہ، چوڑیاں، ایک رنگین چنریا اور تھوڑا سا دنداسہ...... جنگل بابو کے لیے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا لے کر جاؤں۔ بڑے آدمی ہیں بھئی۔" بسنتی نے شرمیلے پن سے گردن جھکا کر جواب دیا۔

"چلو ان کی تو خیر ہے، مرد آدمی ہیں مگر ریشم کے لیے تم اچھی سوغات لے کر گئیں۔ اب بعد میں دے دینا۔"

اس گفتگو کے کوئی ہفتے کے بعد ریشم ان سب کی زندگیوں میں ایک خوب صورت اضافہ بن کر وارد ہوگئی۔ سب نے اسے بڑے پریم اور کھلے دل سے خوش آمدید کہا تھا۔ خان صاحب کا کرائے کا چھوٹا سا صاف ستھرا گھر ان دونوں میاں، بیوی کے لیے انتہائی موزوں اور مناسب تھا۔ خرم بھی اتنے سارے محبت کرنے والوں کو اردگرد پا کر مطمئن ہو گیا تھا۔ رحمت بابا کی اچانک جدائی اور ساتھ ہی ٹرانسفر کے مسئلے نے اسے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ ریشم کی تنہائی اور اپنی مجبوری سے وہ اندر ہی اندر سہم گیا تھا مگر دوسری جگہ ملازمت اور ڈیوٹی اب خصوصاً بسنتی کے گھرانے کی موجودگی اور دوسراہٹ کی وجہ سے آسان ہو گئی تھی۔ وہ ہر شام بہ آسانی اپنے گھر آ جایا کرتا تھا۔

یوں تو ریشم سے مل کر سبھی خوش ہوئے تھے لیکن اسے دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی حقیقت میں ذکیہ خالہ کو ہوئی تھی۔

ایک ماہ کے اندر، اندر یہ ہوا کہ وہ گویا ریشم کو دیکھ، دیکھ کر جینے لگیں۔ انہیں خوب اچھی طرح سے یقین ہو گیا کہ لڑکی بہت ہی معصوم اور انجان ہے بلکہ اپنی حالت سے بھی بے خبر ہے۔ لہٰذا انہوں نے راز داری سے دادی اماں سے تذکرہ کیا۔ اس دن کے بعد وہ دونوں ہی ریشم کا خصوصی خیال رکھنے لگیں۔ ذکیہ خالہ تو اس کی ناز برداری میں بچھ، بچھ جاتیں۔ خرم کے چلے جانے کے بعد گھر کے کام سے فراغت پا کر وہ ریشم کی طرف ہی آ بیٹھتیں۔

ان کی چٹ پٹی باتوں اور حکایتوں میں ریشم کا وقت چٹکیوں میں گزر جاتا۔ باتوں، باتوں میں اسے سو طرح کی نصیحتیں بھی کرتی جاتیں۔

یہی وجہ تھی کہ ریشم ان سے بہت مانوس ہوتی چلی گئی تھی۔ ان کی ہر بات کو دھیان دے، دے کر سنتی اور عمل کرنے کی کوشش کرتی۔ کبھی کبھی وہ دادی اماں کی طرف بھی آجاتی وہ اس سے بڑے پیار اور دلار سے پیش آتیں۔ بسنتی تو ہر روز ہی اس کے ہاں چکر لگا جاتی۔

ایک شام ...... جبکہ بادل چھائے ہوئے تھے، اندر باہر خوشگوار ہواؤں کے جھونکے چھیڑ چھاڑ کرتے پھر رہے تھے، ریشم اور بسنتی دادی اماں کی طرف آبیٹھیں۔ آج اتوار ہونے کی وجہ سے شرمین بھی فارغ تھی، یہ سب مل کر باتیں کرنے لگیں۔ ایسے میں اچانک معصومہ اور شمسہ بیگم غیر متوقع طور پر ملاقات کے لیے چلی آئیں۔

شرمین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس سے تو کچھ بولا ہی نہیں جاسکا۔ معصومہ نے خود ہی تعارف کرایا۔

''دادی جان! یہ میری پھوپی جان ہیں، روبی آپا کی امی جان...... جب سے ہم آپ سے مل کر گئے تھے، آپ کی تعریفیں کر کے ہماری زبانیں نہیں تھک رہی تھیں۔ لہٰذا انہیں بہت شوق تھا آپ سے ملنے کا۔''

''جیتی رہو، خوش رہو۔ میرا بھی دل بڑھ گیا تمہارے آنے سے جگ، جگ آؤ، اللہ تمہارا آنا مبارک کرے۔'' دادی اماں نے بڑھ کر انہیں گلے سے لگالیا اور خوش ہو کر بولیں۔

''لڑکیوں سے آپ کی تعریف سن، سن کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ پھوپی جان ان کے پُرخلوص اخلاق سے متاثر ہو کر کہنے لگیں۔ انہوں نے انہیں پیار سے اپنے قریب بٹھالیا اور اچھی، اچھی باتیں کرنے لگیں۔

پھوپی جان اس گھر کا رکھ رکھاؤ، ماحول میں رچا ہوا بے لوث بے ریا دوستانہ خلوص اور سچائیوں سے گندھی خوشبو محسوس کر کر کے حیران ہو رہی تھیں۔ شرمین کی جھکی، جھکی نگاہیں ان کے دل پر بار، بار دستک دے رہی تھیں اور اپنی بھاوج کی کم عقلی اور کم فہمی پر جی ہی جی میں کڑھ رہی تھیں۔ بہت متاسف تھیں۔

اس گھر میں آنے کا ان کا مقصد بھی شرمین کے دکھے دل پر پھایا رکھنا تھا۔ وہ خود بیٹی والی تھیں اپنی بیٹی کی وہ شادی کر رہی تھیں۔ ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ قدرت ...کو کوئی بات بری لگ جائے خدانخواستہ۔ دادی اماں نے ان کا تعارف ریشم اور بسنتی سے بھی کروایا۔ پھوپی جان کو ریشم بطور خاص بہت بھائی۔

''یہ دونوں آپ کی کرائے دار ہیں؟'' انہوں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بسنتی ہماری کرائے دار ہے۔ اپنے والدین کے ہمراہ رہتی ہے اور یہ ریشم...... پڑوس میں رہتی ہیں۔'' دادی اماں نے بتایا۔

''ان کے...... میاں کیا کام کرتے ہیں؟'' پھوپی جان نے سادگی سے دریافت کیا۔

''وہ جنگل بابو ہیں جنگل بابو۔'' دادی اماں سے پہلے بسنتی بول پڑی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پھوپی جان نے اس کی طرف دیکھا۔ اب شرمین نے دخل دینا ضروری سمجھا اور معصومہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

''فاریسٹ آفیسر کو یہ جنگل بابو کہہ رہی ہے۔''

''اوہ...... اچھا، اچھا۔'' پھوپی جان اس کا مطلب سمجھ کر مسکرائیں۔

''میرے بھی ایک بھائی...... فاریسٹ آفیسر ہیں۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' معصومہ نے خوش ہو کر کہا۔

☆☆☆

نائمہ بیگم کے ہاں کا دھوم دھڑکا دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ دولھا والی تھیں۔ ان کی گہما گہمی اور مصروفیات کا کچھ ٹھکانا نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا کسی ملک کی فتح کا سہرا دولھا کے سر بندھنے کو ہے۔ باہر سے اندر تک ہر بشر کی باچھیں خوشی سے کھلی جارہی تھیں۔

خاندان اور دوست احباب میں کون تھا جسے نائمہ بیگم نے اس یادگار موقع پر فراموش کیا ہو...... ماشاء اللہ سب کو بلایا تھا اور سبھی آئے تھے ان کے ہاں کی پہلی خوشی پر۔

متین احمد اور پھوپی شمسہ بیگم اپنی فیملی کے ساتھ شہر کے دوسرے حصے میں اٹھ گئے تھے مگر مہمانوں کی افراتفری اور بارات کی تیاریوں میں ان لوگوں کی کمی زیادہ محسوس نہیں ہورہی تھی۔ اور یوں بھی یہ جدائی بالکل عارضی اور ایک بڑی خوشی کو منعقد کرنے کے لیے عائد کی گئی تھی اس لیے کوئی اس دوری کو خاطر میں لارہا تھا نہ فکر و تردد کی کوئی بات تھی۔

جوں، جوں بارات کا دن آرہا تھا، نائمہ بیگم کے پاؤں زمین پر نہ لگ رہے تھے۔ وہ دل کھول کر اپنے ارمان پورے کررہی تھیں۔ وہ فطری طور پر ایک آزاد اور خودمختار خاتون تھیں۔ مزاج میں حاکمیت اور بڑائی کا غرور تھا۔ تمام انتظامات، خریداری اور تیاریاں اپنی حسبِ مرضی اور حسبِ خواہش رکھے تھے۔ مجال نہیں تھا کہ پرندہ پر مار سکتا۔ حتیٰ کہ زیورات اور کپڑوں کی کٹائی سلائی میں بھی کسی کی رائے یا مشورے لینے کے بجائے اپنی سوجھ بوجھ اور پسند ناپسند کو مدنظر رکھا تھا۔

بالآخر مقررہ وقت پر بارات چڑھی اور شاندار بارات چڑھی، بابر نہایت کروفر اور شان و شوکت کے ساتھ روبینہ بنتِ متین احمد کو بیاہ لائے۔ رخصتی کا کام اور ہنگامہ ساتھ خیریت کے نمٹا۔

نائمہ بیگم نے ہر جگہ اپنی پسند اور مزاج کو فوقیت دی تھی۔ چنانچہ رخصتی کے بعد جب بارات ان کی کوٹھی کے بالکل قریب آپہنچی تو دلہن کو گاڑی سے اتار کر پالکی پر سوار کروایا گیا۔

دلہن کی پالکی گیٹ پر آگئی تو گھر میں ایک شور مچ گیا۔ ڈومینوں نے مبارک بادگانی شروع کردی۔ دلہن کو پالکی سے اتارنے سے پہلے اس کے پیروں کے انگوٹھے دودھ سے دھلا کر چاندی کی پازیب پہنائی گئی۔ اگر جو بابر کے والد باقر علی صاحب حیات

ہوتے تو خاندانی رواج کے مطابق وہی بہو کو گود میں لے کر کمرے میں لے جا کر بٹھاتے مگر اب مجبوری تھی مگر پھر نائمہ بیگم کے اصرار اور حکم پر خود بابر نے دلہن کو گود میں بھرا اور کمرے میں جا اتارا۔

لڑکیاں بالیاں پروانوں کے مانند دلہن کے گرد جمع ہو گئیں۔ معصومہ دلہن کے گھونگٹ میں منہ گھسائے بیٹھی تھی، آج مارے خوشی کے وہ کھلی جا رہی تھی۔ مدتوں پرانی آرزو پوری ہوئی تھی۔ مگر دلہن کے آنسو اب تک خشک نہیں ہوئے تھے۔ لڑکیاں اپنی، اپنی باتوں اور چکاروں میں مگن تھیں۔ کمرے میں اچھا خاصا شور اور گنگناہٹ مچی ہوئی تھی۔

''اے بھئی نندو تو دیکھو کیسے اپنے نمبر پر نمبر بڑھائے جا رہی ہے۔'' کسی نے باتوں کے دوران معصومہ کو چھیڑا۔ مگر معصومہ نے فقرہ کہنے والی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی کارروائی جاری رکھی اور رومال سے بھاوج کے آنسو خشک کر کے بولی۔

''اللہ روبی بھابی! اب تو رونا ترک کر دیجیے۔ آپ کون سے کسی غیر ٹھکانے پر ہیں، اپنے ہی گھر میں تو ہیں۔'' معصومہ کی معصوم اور محبت بھری آواز سے اس کو تقویت ملی۔ اتنے میں کسی نے کسی سے پکار کر دریافت کیا۔

''اے بہن! دلہن کے ساتھ بھوڑے کا کیا، کیا کھانا آیا ہے؟'' کسی رشتے دار خاتون نے لہک کر جواب دیا۔

''باقر خوانیاں، فرنی، بریانی، قورمہ، گاجر کا حلوا، زردہ، سادی روٹی اور شب دیگ۔''

ایسی ہی طرح، طرح کی بولیوں سے کمرا گونج رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں دستر خوان بچھا دیے گئے، کھانے کی پکار پڑتے ہی کمرے میں رش کا عالم ٹوٹ گیا اور معصومہ نے کلمۂ شکر ادا کیا۔

کھانے کے بعد زیادہ تر بیبیاں اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ اب کھیر کھلائی کی رسم کے لیے دولھا کو گھر کے اندر بلایا گیا۔ اس وقت لڑکوں کو بطورِ خاص دولھا کے ساتھ بلوایا گیا تھا۔ ڈاکٹر خاور اور خرم دولھا کے دونوں بھائی موجود تھے۔

آرسی مصحف کی طرح اس وقت بھی دولھا دلہن کو آمنے سامنے بٹھایا گیا۔ درمیان میں بڑے اہتمام سے کھیر رکھ دی گئی۔ یہ رسم بھی اس وقت کے رواج کے مطابق ڈومنی کروائی تھی۔ ایک طرف لڑکے کھیر اُچکنے کے لیے تیار کھڑے ہوتے...... سب سے پہلے دولھا کے ہاتھ سے سات مرتبہ دلہن کو کھیر کھلائی جاتی، دلہن تو خیر اس وقت کیا کھاتی ہے، قریب بیٹھنے والیاں رومال میں... لے لیتی ہیں۔ رشتے کی ایک سمجھدار اور تیز طرار چچی دلہن کے قریب بیٹھی تھیں۔ دولھا بابر اس وقت خوب چہک رہے تھے۔ تبھی خرم سے بولے۔

''یار چمچے تو منگواؤ، کھیر ہاتھ سے کیسے کھلائی جائے گی؟''

''میاں! یہ والی کھیر تو ہاتھ سے ہی کھلائی جاتی ہے۔'' ڈومنی نے صدا لگائی۔

''اچھا برائے مہربانی تم ذرا دور رہو، میں خود کھلا دوں گا۔'' بابر نے اطمینان سے جواب دیا۔

''اے میاں......آپ کے صدقے واری جاؤں، کچھ دیر تو شرم کر لیجیے۔'' ڈومنی نے دوبارہ ان کی بلائیں لے کر کہا۔

''ارے بھئی کھیر کیسے کھلائی جائے یہاں تو منہ رومال سے ڈھکا ہوا ہے۔'' بابر نے گھونگٹ میں جھانک کر دیکھا۔

''جلدی کرو جی، دلہن کو تنگ مت کرو پریشان ہو جائے گی۔'' رشتے کی ایک بہن گنگنائیں۔

''میرا کیا ہے، میں ایسے ہی کوشش کر ڈالتا ہوں مگر میرا ذمہ نہیں اگر منہ کے بجائے کھیر کان میں چلی جائے۔'' بابر نے مسکرا کر کہا۔

''لو...... اب کھلاؤ۔'' رشتے کی ایک بھاوج نے دلہن کا گھونگٹ درست کرتے ہوئے اس کے منہ سے ہٹا کر ہنستے ہوئے ترغیب دی۔

دلہن نے دوبارہ منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

لڑکوں نے زور سے شور مچایا، سب جھک، جھک کر دلہن کو دیکھ لینے کی کوشش میں تھے۔

''یہ سراسر دھاندلی ہے، ہم دولہا کی طرف سے پُرزور احتجاج کرتے ہیں۔'' خاور نے آواز بلند چلائے۔

''لیجیے جناب کھیر جاتی ہے ناک یا کان میں۔'' بابر نے کھیر والا ہاتھ دوبارہ بڑھاتے ہوئے وارننگ دی۔

''خبردار اگر کوئی بے ہودگی کرنے کی کوشش کی تو...... لو ہم رومال اور ہاتھ ہٹاتے ہیں، تم سیدھے سبھاؤ کھیر کھلاؤ۔'' بڑی چچی نے زور سے ڈانٹا۔ اتنے میں کسی نے ہاتھ بڑھا کر کھیر جھپٹ لی۔

''ایسے نہیں بھئی، پہلے دولہا کو سات بار کھلا لینے دو، جب وہ دلہن کو کھلا چکے تو دولہا کی دفعہ میں چھینا جھپٹی کرنا۔'' چچی نے دوبارہ سرزنش کی۔

شوروغل میں قدرے کمی آگئی۔

خدا، خدا کر کے دلہن کی کھیر چٹائی سات بار پوری ہوئی اور روبی نے دل ہی دل میں سکھ کی سانس لی۔

''دلہن بھابی کی طرف سے کھیر کھلوانے کے لیے کسی ہشیار سے بندے کو بٹھانا چاہیے تاکہ بھائی جان کو خوب تنگ کیا جائے۔'' معصومہ فکرمندی سے بولی۔

''تم فکر کیوں کرتی ہو، میں بابر کو کھیر کھانے ہی نہیں دوں گی۔ چچی جان نے بھی اطمینان دلایا۔ اب لڑکے سارے چاق و چوبند ہو کر کھڑے ہوگئے۔ چاروں طرف ایک محاذ آرائی کا سا ماحول بن گیا۔

چچی جان نے دلہن کا کھیر والا ہاتھ دولہا کو کھلانے کے لیے آگے بڑھایا۔ جیسے ہی دولہا نے کھیر کھانے کے لیے منہ کھولا۔ چچی جان نے نہایت چابکدستی سے دلہن کا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

لڑکیوں کی طرف سے زبردست غلغلا اٹھا۔ بابر کھسیا گئے، ہنس دیے۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ ہزار جتن کے باوجود ان کی دوسری کوشش بھی رائگاں گئی۔ ہر بار چچی کا داؤ کامیاب جا رہا تھا۔ جب تیسری بار بابر نے کھیر کھانے کے لیے منہ کھولا تو عین اسی وقت کسی لڑکی کا ہاتھ لپکا...... اور کھیر اچک لی گئی۔ اب تو لڑکیوں نے کمرا سر پر اٹھا لیا۔ وہ چڑا رہی تھیں اور لڑکے چڑ رہے تھے کھسیا رہے تھے، بابر کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

کسی قریبی عورت نے چچی جان کو ٹھوکا دیا اور جھک کر کان میں کوئی سرگوشی کی...... اتنے غل میں بھی بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ اور پھر ایسا ہوا کہ اس کوشش میں کھیر سیدھی بابر کے منہ میں اتر گئی۔ اگلی دو کوششوں میں بھی وہ کامیاب ہوتے چلے گئے۔ اب شور مچانے کی باری لڑکوں کی تھی۔ ان کی بے ڈھنگی آوازوں اور فقرے بازی سے کمرا گونجنے لگا حتیٰ کہ کسی نے باہر سے آ کر پھٹکارا، تب کہیں جا کر یہ طوفانِ بدتمیزی دھیما پڑا۔ لڑکے دولھا کو شہہ پر شہہ دے رہے تھے۔ کبھی دولہا دھوکا دے کر کھیر پر منہ مارنا چاہتا تو کوئی درمیان سے ہی جھپٹ لیتا۔ ہنسی کے فوارے چھوٹ پڑتے۔ بہت دیر تک یہی رنگ جما رہا۔ شور اور قہقہے امنڈتے رہے، حتیٰ کہ سات مرتبہ کا شگون پورا ہوا۔

لڑکے لڑکیوں کی دھما چوکڑی ختم ہوئی تو بڑے بوڑھوں نے سکون کی سانس لی۔

☆☆☆

اب یہاں خان صاحب کے کرائے والے گھر کے کمرے میں پڑے، پڑے ریشم کا دماغ کہیں سے کہیں چھلانگیں لگاتا جا پہنچتا۔ کبھی وہ اپنی بستی کے آس پاس بکھرے پھیلے جنگل میں وحشی بھولی بھالی ہرنی کی طرح چوکڑیاں لگاتی پھرتی، کبھی اپنی زندگی کے دیرینہ ساتھی جھونپڑے میں بیٹھی اپنے پیارے بابا سے میٹھی باتیں کر رہی ہوتی یا ان کے لیے روٹی پکا رہی ہوتی۔

ایسے میں وہ بھول جاتی کہ اس کے بابا تو اس سے بچھڑ چکے ہیں۔ اس کے خواب وخیال کی دنیا ماضی

کی نقرئی پگڈنڈیوں سے شروع ہو کر جب حال کی شہری زندگی میں پہنچتی تو وہ بے اختیار آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھتی اور خود کو یقین دلانے لگتی کہ وہ سب کچھ جس کا تعلق ماضی سے تھا، ختم ہو چکا ہے۔ اب اس کی زندگی ایک نئے دور میں داخل ہو چکی ہے۔

یہ تو اللہ رب العزت کے انتظامات تھے کہ یہاں شہر میں اسے اتنے چاہنے والوں کا ساتھ نصیب ہو گیا اور وقت کاٹنا آسان ہو گیا تھا۔ ورنہ خرم کے ڈیوٹی پر جانے کے بعد وہ بالکل تنہا رہ جاتی۔ دوسرے بستی کی موجودگی نے اس کے تنِ مردہ میں گویا جان ڈال رکھی تھی۔

شہر آنے کے بعد جس دن ذکیہ خالہ نے پہلی بار اس سے چند ذاتی نوعیت کے نئے نویلے سوالات پوچھے، اس دن سے اس کی زندگی میں عجیب سے رنگ بھر گئے تھے۔ وہ اپنی عمر میں پہلی دفعہ نئے، نئے احساسات سے آشنا ہوئی تھی۔ ذکیہ خالہ اور ثمرین کی دادی اماں نے اسے نئی، نئی طرح کی نصیحتیں کرنی شروع کر دی تھیں۔

اسے خوب اچھی طرح یاد تھا کہ مکرو فریب سے پاک اس کی بستی میں رہنے والے بھی اس کے سچے خیر خواہ اور ہمدرد تھے۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی، کئی عورتیں دس دفعہ اس سے خیر و عافیت معلوم کر چکی تھیں، کئی ایک نے تو کھلے، کھلے الفاظ میں پوچھ بھی لیا تھا مگر جب کوئی بات ہی نہیں تھی تو وہ کسی کو کیا بتاتی...... دراصل بابا کے علاوہ اور سب کو بھی ان دونوں کے بچوں کا بہت ارمان تھا۔ مگر خدا کی مرضی کے آگے مجبور تھے۔

خرم نے تو کبھی بھولے سے بھی اس محرومی کا ذکر یا فکر نہیں کی تھی۔ گرمی کی طویل اور سنسان دوپہروں میں جب سو، سو کر بھی طبیعت اوب جاتی اور کرنے کو کوئی کام باقی نہیں رہتا تو بے اختیار اس کا جی چاہتا کہ...... کاش...... کوئی ننھا سا وجود اس کو ستانے اور پل، پل پریشان کرنے والا ہوتا۔

بعض مصروفیات کس قدر انمول ہو جاتی ہیں۔

خرم سے ذکر کرتی تو وہ خوب دل کھول کر ہنستا، مذاق اڑاتا اور اسے احمق اور بے وقوف جیسے خطابات سے نوازتا اور اس کو چڑانے کے لیے بار بار کہتا۔

''عورت کی کھوپڑی واقعی الٹی ہوتی ہے...... آرام اور سکون اسے راس نہیں آتا۔'' لیکن جب کبھی وہ سنجیدہ اور رنجیدہ ہو کر روٹھنے لگتی تو اس کی جان پر بن جاتی اور اسے منانے کے لیے کہتا۔

''ارے بھئی...... میرا مطلب ہے کہ اتنی جلدی کیا ہے؟ عمر پڑی ہے ابھی ان ''لوازمات'' کے لیے۔'' اور لفظ لوازمات سن کر وہ روٹھنا بھول کر ہنس پڑتی۔

یہاں شہر میں آ کر ایک دن جب ذکیہ خالہ نے اس سے دو تین سوالات کیے تو وہ بوکھلا کر رہ گئی۔ بس اسی روز سے وہ اس کا بہت خیال رکھنے لگیں۔ دادی اماں بھی اس پر جان چھڑکتی تھیں۔

وہ آج کل خاصی دبلی اور کمزور سی ہو رہی تھی۔ چہرہ پہلے سے بھی زیادہ معصوم اور بھولا نظر آتا تھا۔ اس کی صورت دیکھ کر خود بخود انسان کے دل میں اس کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوتی تھی۔ پھر ایک دن دادی اماں کے کہنے پر ذکیہ خالہ نے خرم سے اجازت لی اور ریشم کو لے کر اسپتال میں ڈاکٹر شاکرہ کے پاس جا پہنچیں۔ چیک اپ کے بعد ڈاکٹر شاکرہ نے ذکیہ خالہ کے خیال کی تصدیق کر دی تھی اور کئی دوائیں بھی لکھ دی تھیں۔ ساتھ ہی ہر ماہ چیک اپ کراتے رہنے کی تاکید بھی کی تھی۔

ذکیہ خالہ تو اٹھتے بیٹھتے اللہ آمین کرنے لگی تھیں۔ کیا کوئی ساس کرتی ہوگی۔

وہ بیچاری اولاد سے محرومی کا دکھ اٹھائے ہوئے تھیں۔ اب ریشم کی صورت میں انہیں ایک بہت بڑی دلبستگی کا سامان نظر آ گیا تھا۔ اسے دیکھ، دیکھ کر نہال ہوئی جاتی تھیں۔ اس کی متوقع زچگی کی تمام تر ذمے داری انہوں نے از خود اپنے سر لے لی تھی۔

کبھی ننھے، منے کرتے پاجاموں کی کتر بیونت

میں مصروف نظر آتیں، کبھی آنے والے بچے کے گدے تکیے سی رہی ہیں۔ گویا دادی، نانی کے فرائض بیک وقت ادا کرنا چاہ رہی تھیں۔ ان سارے کاموں میں دادی اماں کے مشورے سرفہرست ہوتے۔

جس دن شمسہ بیگم، دادی اماں سے مل کر گئی تھیں۔ اس سے اگلے دن ریشم کی طبیعت کافی خراب ہوگئی۔

رات اس نے کرم کلہ اور آلو بنائے تھے، صبح ناشتے میں بھی کھالیے، خرم کے ڈیوٹی چلے جانے کے بعد گھر کا ایک آدھ کام نمٹایا، پہلے پہل تو گنگنا سا درد ہوتا رہا پھر وقت کے ساتھ بڑھنے لگا۔

حسبِ معمول ذکیہ خالہ چکر لگانے آئیں تو وہ تین دفعہ واش روم ہو کر آچکی تھی اور کافی نڈھال دکھائی دینے لگی تھی۔

''کیوں...... خیریت......؟'' انہوں نے گھبرا کر دریافت کیا۔

''پیٹ میں درد ہے۔'' اس نے سادگی سے بتایا۔

''درد ہے؟ رات کیا کھایا تھا؟''

''گوبھی اور آلو پکائے تھے، وہی کھایا خالہ۔''

''اچھا...... اسی سے درد ہوگا۔'' خالہ نے مطمئن ہو کر کہا۔ پھر وہیں برآمدے میں بیٹھ گئیں۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ آج وہ اس کے ہونے والے بچے کے لیے سلک کی پُھندنے والی ٹوپی سی رہی تھیں۔ مزے کی بات یہ تھی کہ وہ سلائی ٹکائی کا سارا کام ہاتھ کی سوئی اور دھاگے سے ہی کرتی تھیں۔ وہ اپنی مصروفیت میں مشغول ہوگئیں مگر ان کی ایک آنکھ ریشم کی نگراں تھی۔

تھوڑی دیر میں انہوں نے ریشم کی بے چینی کو محسوس کرلیا۔ وہ اسے بغور دیکھتی ہوئی جلدی سے دادی اماں کی طرف آئیں۔ انہیں جلدی، جلدی ریشم کی کیفیت سے آگاہ کیا۔

''لیکن...... میرے خیال میں تو ابھی وقت باقی ہے خیر سے۔'' وہ پریشانی کے لہجے میں بولیں۔ خالہ ذکیہ بھی پریشان ہو کر کہنے لگیں۔

''ہاں...... ابھی پچھلا مہینہ تو...... ان گنا مہینہ تھا۔'' دادی اماں سوچ میں پڑ گئیں، خالہ بولیں۔

''اب ماشاء اللہ نظر بھی زیادہ آنے لگی ہے، اسی لیے تو کل آپ کی مہمان نے پوچھا۔'' ان کے میاں کیا کرتے ہیں؟'' ورنہ ان کو کیا معلوم کہ شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ...... دبلی پتلی سی تو ہے۔''

''میرا خیال ہے تم ساری باتوں کو چھوڑو، لڑکی کو لے کر ڈاکٹر شاکرہ کے پاس ہو آؤ، ہم تم سے ڈاکٹر کی رائے کہیں بہتر رہے گی، لڑکی کم سن بھی ہے پہلے پہل کا موقع بھی ہے اور پھر کچھ بھی ہو ہے تو دوسرے گھر کی۔'' دادی اماں نے ان کی بات ان سنی کرتے ہوئے رائے دی۔

''اے ہاں...... سچ تو کہہ رہی آپ...... کھلائے کا نام نہیں ہوتا، رُلائے کا ہو جاتا ہے، دنیا واقعی بہت ظالم چیز ہے۔'' ذکیہ خالہ گھبرا کے بولیں۔

وہاں سے وہ برق کی طرح لہراتی ہوئی دوبارہ اپنے گھر آئیں، اپنا اجلا والا برقع سر پر ڈالا۔ دو پان لگا کر ڈبیا میں رکھے، ریشم کی طرف آئیں وہ پیٹ دبائے بیٹھی تھی۔ بسنتی اس کے قریب بیٹھی کمر سہلا رہی تھی۔

عجلت کے باوجود اُن کا دل نہ مانا جلدی سے سات سرخ مرچیں، لہسن، پیاز کے چھلکے، ذرا سا نمک دہلیز کی مٹی لے کر ریشم کی نظر اتار کر چولھے میں جھونکی، تانگا بلوایا پھر اسپتال کی طرف روانہ ہوئیں۔ راستے بھر کوچوان کو ہدایتیں دیتی ہوئی گئیں۔

''اے بھیا آہستہ...... ذرا اور آہستہ چلاؤ۔''

اسپتال پہنچ کر سیدھی زچہ بچہ وارڈ میں جا داخل ہوئیں۔ اتفاق سے پہلی ملاقات ڈاکٹر شاکرہ سے ہی ہوئی۔ انہوں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے تسلی دی۔ ابتدائی کارروائی کے بعد ریشم کا تفصیلی معائنہ کیا۔ پھر ریشم کو باہر بھیج کر انہوں نے ذکیہ خالہ کو اندر بلا کر کہا۔

''ابھی ڈلیوری میں چند دن باقی ہیں، پیٹ میں درد کسی اور وجہ سے ہے، میں دوا دے رہی ہوں مگر ایک بات سے آپ کو آگاہ کرنا بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ بچے کی پوزیشن قطعی آڑی ہے، دیکھتے ہیں الٹرا ساؤنڈ رپورٹ کیا بتاتی ہے لیکن جہاں تک میرا خیال اور میری معائنہ رپورٹ کا تعلق ہے، اس کے مطابق یہ ایک آپریشن کیس ہے۔''

''آپریشن...... بڑا آپریشن......؟'' ذکیہ خالہ کی تو چیخ نکل گئی۔ ''ڈاکٹر صاحبہ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ اتنی دھان پان سی تو ہے۔''

''اسی لیے تو یہ نوبت آئی ہے۔'' ڈاکٹر صاحبہ تسلی دینے والے انداز میں مسکرائیں۔ ''اگر چاہیں تو کسی دوسری جگہ معائنہ کروالیں۔ کچھ قدرتی طور پر ہڈی کا مسئلہ ہے جبکہ بی بی ماشاء اللہ خوب تندرست ہے اس لیے ڈلیوری آپریشن سے ہی ممکن ہے۔'' ذکیہ خالہ تو سناٹے میں رہ گئیں۔

دروازے کے قریب ہی کھڑی ریشم نے یہ گفتگو صاف، صاف سنی۔ وہ بے اختیار باہر بینچ پر بیٹھ کر رونے لگی۔ ڈر اور خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ کاریڈور سے گزرتے ہوئے ڈاکٹر خاور نے رک کر ہمدردی سے پوچھا۔

''کیا ہوگیا بی بی آپ کو؟ کیوں اس قدر رو رہی ہیں؟'' ریشم نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ بیک وقت دونوں کی زبان سے نکلا۔

''ارے......آپ؟'' فوراً ہی ڈاکٹر خاور نے سنبھل کر دریافت کیا۔

''آپ رحمت بابا کی بیٹی ہیں ناں......؟ مگر...... یہاں کیسے؟''

آپ...... ''ان'' کے دوست ہیں ناں......؟'' ریشم کے منہ سے بھی سرسراتی سی آواز نکلی۔ خاور نے لفظ ''ان'' پر غور کیے بغیر دوبارہ پوچھا۔

''رحمت بابا کہاں ہیں؟ سب خیریت ہے ناں؟''

''بابا......'' ریشم کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔ ''وہ تو جنگل بابو سے میرا بیاہ کر کے چل بسے تھے......''

''آپ کی شادی...... جنگل بابو سے؟'' ڈاکٹر خاور نے لمحہ بھر غور کیا پھر بدحواس ہو کر پوچھا۔

''جی ہاں......'' اس نے معصومیت سے آنکھیں پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ آپ کے دوست تھے ناں جنگل بابو......ان سے......'' اسی وقت ذکیہ خالہ اندر سے برآمد ہوئیں، اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔

''چلو بیٹی گھر...... اب ان ڈاکٹرنی صاحب سے تو تمہارے میاں ہی آکر بات کریں گے۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑے سیدھی باہر نکلتی چلی گئیں۔

ڈاکٹر خاور سکتے کے عالم میں کھڑے رہ گئے۔ کچھ لمحوں کے بعد ان کو ہوش آیا تو وہ تیزی سے اندر کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں ڈاکٹر شاکرہ چند کاغذات میں مستغرق بیٹھی تھیں۔

''خیریت......؟'' انہوں نے سر اٹھا کر پوچھا۔

''کس کی تلاش میں آئے ہو؟'' ڈاکٹر خاور نے لمحہ بھر غور کیا، کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''ابھی میری ایک عزیزہ آپ کے روم سے باہر نکلی ہیں۔ بہت زیادہ پریشان لگ رہی تھیں۔ مجھے بھی نہیں پہچانا یونہی چلتی چلی گئیں۔ ان کے ساتھ کی لڑکی رو رہی تھی۔''

''اوہ......'' ڈاکٹر شاکرہ نے ایک طویل سانس لی۔ ''ابھی عام نہیں ہوا۔ اس لیے لوگ آپریشن کو ایک بہت بڑا ہوّا سمجھتے ہیں۔ لڑکی کا ڈلیوری کیس ہے۔'' خاور سن تو رہے تھے کہ ان کی ساتھی ڈاکٹر کیا کہہ رہی ہے مگر ان کی نگاہیں ایک کاغذ پر جمی ہوئی تھیں جس پر لکھا تھا۔

''ریشم خرم......''

(باقی آئندہ)

چراغ تلے اندھیرا

نظیر فاطمہ

اس نے جلدی، جلدی روٹی توے پر ڈال کر کلاک کی طرف دیکھا۔ رات کے سات بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ اس کے پاس بیس منٹ تھے۔ جن میں اُسے چاول ابالنے تھے اور دال کو بگھار لگانا تھا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے ٹی وی پر اس کا پسندیدہ پروگرام ''حقوقِ نسواں اور ہم'' ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا اور کچھ بھی ہو جاتا بدھ کی رات ساڑھے سات بجے وہ ٹی وی



کے سامنے براجمان ہوتی تھی۔ اب بھی وہ اپنا کام ختم کر کے سیدھی ٹی وی لاؤنج میں پہنچی جہاں امی کوئی ڈراما دیکھ رہی تھیں۔

''امی لائیں ریموٹ دیجیے۔ میرے فیورٹ پروگرام کا وقت ہوگیا ہے۔'' وہ دھم سے ان کے قریب بیٹھ گئی۔ امی نے اسے قدرے ناگواری سے دیکھا مگر خاموشی سے ریموٹ اس کے ہاتھ میں تھما کر اٹھ گئیں۔

☆☆☆

''واہ، واہ! آج فاروق صدیقی نے خواتین کے حقوق کے بارے میں کیا باتیں کی ہیں۔ قسم سے دل خوش ہوگیا اُن کی باتیں سن کر.....'' رات کو وہ اپنی بڑی بہن عینی کو بتا رہی تھی۔ عینی نے اسے مسکرا کر دیکھا اور سر ہلا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ وہ ایک مشہور اخبار میں کام کرتی تھی۔ ابھی وہ ایک بہت اہم آرٹیکل فائنل کر رہی تھی جو اسے کل ہر صورت جمع کروانا تھا۔ اسے اپنی طرف متوجہ نہ دیکھ کر زیب منہ بسور کر رہ گئی۔ عینی اپنا کام مکمل کر کے اٹھی تو زیب کو ہینڈ فری کانوں میں ٹھونسے گانے سنتے پایا۔

''ہاں، اب بتاؤ، آج کے پروگرام میں فاروق صدیقی نے کیا کمال کیا ہے؟'' عینی نے اس کے کانوں سے ہینڈ فری نکال دیا۔ زیب خوشی، خوشی اسے آج کے پروگرام کی روداد سنانے لگی۔

''ہائے کاش! میں بھی فاروق صدیقی سے مل سکتی۔'' زیب نے حسرت سے کہا۔ عینی، فاروق صدیقی کو پسند کرنے کے حوالے سے اس کے جنون سے واقف تھی اور وہ اسے اکثر سمجھاتی تھی کہ کسی بھی معاملے میں حد سے بڑھنا نقصان دہ ہوتا ہے۔

''دیکھو زیب! یہ جو اس طرح کے مشہور و معروف لوگ ہوتے ہیں ناں ان کو پاگل پن کی حد تک آئیڈیلائز نہیں کرنا چاہیے۔ بے شک فاروق صدیقی خواتین کے حقوق پر بہت باا‌ثر طریقے سے بات کرتا ہے اور خواتین کی بہبود کے لیے respect for women کے نام سے ایک این جی او بھی چلا رہا ہے۔ مگر ہے تو وہ بھی ایک انسان ہی اور ایک مرد بھی اور کوئی بھی انسان خامیوں سے مبّرا نہیں ہوتا۔'' عینی نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی۔

''بس آپ کو تو فاروق صدیقی کے خلاف بولنے کا موقع چاہیے ہوتا ہے۔'' اس نے سر جھٹک کر منہ پھلالیا۔

''اچھا بابا! جیسے تم خوش، میں کچھ نہیں کہتی۔'' عینی اپنی جگہ پلٹ گئی۔

زیب، فاروق صدیقی کو اس لیے آئیڈیلائز کرتی تھی کہ وہ معاشرے کی مظلوم خواتین کے حقوق کی جنگ لڑ رہا تھا۔ وہ ہر ہفتے اپنے پروگرام میں کسی خاتون کا مسئلہ سب کے سامنے لا کر اسے حل کرتا تھا۔ اس کا یہ پروگرام خواتین خصوصاً نوجوان لڑکیوں میں بہت مقبول تھا۔ کچھ بھی تھا، اس کے بولنے کا انداز واقعی سحر زدہ کر دیتا تھا۔ معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے والے افراد کو پسند کرنا یا سراہنا غلط نہیں ہے مگر مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب آپ اپنی پسندیدگی میں اتنا آگے نکل جائیں کہ اپنے پسندیدہ شخص کو انسانیت کے دائرے سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کر دیں اور اس کے خلاف کوئی بات نہ سن سکیں۔ بلکہ اگر کوئی اس کی مخالفت میں کوئی بات کہہ دے تو آپ لڑنے مرنے کو تیار ہو جائیں۔ زیب بھی آج کل فاروق صدیقی کے حوالے سے انہی جذبات کا شکار تھی۔ سب گھر والوں کے سمجھانے پر بھی کوئی اثر نہ ہوا تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

☆☆☆

''زیب...... زیب!'' عینی اسے پکارتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

''جی......'' زیب کتابیں سامنے پھیلائے

بیٹھی تھی۔

''تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔'' عینی نے اپنا لیپ ٹاپ بیگ میز پر رکھا اور اپنا شولڈر بیگ الماری میں۔

''کیا؟'' زیب ذرا متاثر نہ ہوئی۔

''پہلے ایک کپ چائے پلاؤ پھر بتاؤں گی۔'' عینی پھیل گئی۔

''چائے تو پلا دیتی ہوں لیکن میں جانتی ہوں آپ کی خوش خبری کو...... ابھی کہیں گی زیب میرا فلاں آرٹیکل بہت ہٹ گیا ہے۔ آج سر نے میری بہت تعریف کی...... ہوں'' زیب، عینی کی نقل اتار کر چائے بنانے چلی گئی۔ عینی اس کے انداز پر دل کھول کر مسکرا دی۔

''یہ لیں چائے۔'' زیب نے کپ عینی کی طرف بڑھایا۔ اُس نے سیدھے ہو کر کپ تھام لیا۔ زیب دوبارہ اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔

''زیب! اگر میں فاروق صدیقی سے تمہاری ملاقات کروادوں تو......؟'' عینی نے چائے کا ایک گھونٹ حلق سے اتارا اور قصداً بات ادھوری چھوڑ دی۔

''کیا......آپ سچ کہہ رہی ہیں؟'' وہ کتابیں سائڈ پر کر کے اس کے قریب آگئی پھر اسے دیکھتے ہوئے مزید بولی۔ ''آپ کہیں مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہیں۔'' وہ مشکوک تھی۔

''ارے نہیں بابا! پندرہ دن بعد مجھے اپنے اخبار کے سنڈے میگزین کے لیے فاروق صدیقی کا انٹرویو کرنا ہے۔ میں نے سوچا تمہیں ساتھ لے جاؤں گی تاکہ تمہاری خواہش پوری ہو جائے۔ ٹھیک......!'' عینی نے اس کا سر تھپکا تو وہ خوشی سے بے قابو ہو کر ناچ اٹھی۔

☆☆☆

اگلے روز سے ہی اس نے فاروق صدیقی سے ملاقات کی تیاریاں شروع کر دیں۔

غزل

چاند رات میں سکھی چاند ہی چمکتا ہے
زندگی کی دیوی پر خوب روپ چڑھتا ہے

ساون میں بادل جب مست گیت گاتے ہیں
وسعتِ بیاباں میں ایک پھول کھلتا ہے

چوڑیاں کھنکتی ہیں دل کے تار ہلتے ہیں
پیرہن کی خوشبو سے سارا گھر مہکتا ہے

سنگ سنگ برکھا کے، بزمِ حسن مہکا کے
ملگجے سویروں میں کون رنگ بھرتا ہے

سرمئی شفق میں ہے خونِ دل کی آمیزش
اس اداس منظر میں دن غریب ڈھلتا ہے

شاعرہ: نیر رانی شفق، ڈی جی خان

''یہ کپڑے پہنوں یا یہ...... اُف کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' وہ وارڈروب کا حشر بگاڑ دیتی۔

''میں اُن سے جو سوالات کرنا چاہتی ہوں انہیں لکھ لیتی ہوں۔ عینی آپ اپنا انٹرویو جلدی ختم کر لینا تاکہ مجھے بھی ان سے بات کرنے کا موقع مل سکے۔'' وہ ہر روز عینی کو یاد دہانی کرواتی۔

☆☆☆

ٹھیک پندرھویں روز وہ دونوں فاروق صدیقی کے گھر جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ عینی کو آج گھر سے سیدھے فاروق صدیقی کی طرف جانا تھا۔ پریس کے باقی عملے کو دفتر سے وہاں پہنچنا تھا۔ انٹرویو کا ٹائم ساڑھے گیارہ بجے تھا۔ لیکن وہ دونوں گیارہ بجے فاروق پیلس پہنچ چکی تھیں۔ باقی عملہ دس پندرہ منٹ تک پہنچنے والا تھا۔ چوکیدار نے عینی کا کارڈ وغیرہ دیکھ کر انہیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ یقیناً

اسے پہلے سے اطلاع تھی کہ آج پریس سے کچھ لوگ آئیں گے۔
گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی دونوں مبہوت رہ گئیں۔ کیا شاندار اور وسیع لان تھا۔ عینی نے تو جلد ہی خود پر قابو پالیا مگر زیب کو ہوش میں لانے کے لیے عینی نے اس کا بازو زور سے ہلایا تھا۔
''جیسے خود شاندار ہیں ویسا ہی شاندار گھر ہے۔ یقیناً ایسے ہی گھر فاروق صدیقی جیسے لوگوں کے رہنے کے قابل ہوتے ہیں۔'' زیب حسبِ سابق ان کی تعریفوں میں رطب اللسان ہو چکی تھی۔
''آپ لوگ بیٹھیں، میں اندر اطلاع کرتا ہوں۔'' ملازم نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔
ڈرائنگ روم کی آرائش قابلِ دید تھی اور زیب کا شوق حد سے سوا...... ڈرائنگ روم کا لاؤنج کی طرف کھلنے والا دروازہ آدھے سے زیادہ کھلا ہوا تھا۔ جہاں سے چلتے پھرتے لوگوں کی آوازیں صاف آرہی تھیں۔ ملازم اسی طرف سے اندر گیا تھا۔
''جاہل عورت! کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ میرے کپڑوں سے دور رہا کرو۔ یہ...یہ پہنوں گا میں انٹرویو دیتے وقت، تمہاری عقل کیا گھاس چرنے گئی ہوئی ہے۔ جاؤ دفعہ ہو جاؤ اب...... اور اپنا تھوبڑا ٹھیک کرو جا کر، ابھی پریس والے پہنچ جائیں گے ان کے سامنے کوئی گڑبڑ مت کر دینا۔ نہ جانے میرے نصیب میں تم جیسی پھوہڑ اور بدسلیقہ عورت ہی کیوں لکھی گئی۔...'' فاروق صدیقی کی دہاڑتی ہوئی آواز ڈرائنگ روم تک آرہی تھی۔ انہیں شاید پریس والوں کے پہنچنے کی اطلاع ابھی نہیں ملی تھی اس لیے وہ اپنی بیوی کو بے نقط سنا رہے تھے۔ زیب نے گھبرا کر عینی کو دیکھا اس نے افسوس سے کندھے اچکا دیے۔ یہ سب سن کر زیب کو تو جیسے صدمے سے سکتہ ہو گیا۔ وہ آواز پہچان کر بھی نفی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''زیب......!'' عینی نے اس کا کندھا ہلایا۔
''اُف، اتنا کھلا تضاد، عینی میں نے اس شخص کو ہمیشہ فرشتہ سمجھا۔ میں سوچتی تھی کہ جو شخص دوسری عورتوں کے حقوق کی جنگ لڑتا ہے، ان کی تکلیفیں دور کرتا ہے، وہ شخص اپنے گھر کی عورتوں خصوصاً اپنی بیوی کے لیے کتنا کیئرنگ ہوگا۔ میں اس کی بیوی کو خوش قسمت ترین سمجھ کر ہمیشہ اس پر رشک کرتی رہی۔ مگر یہ کیا...... پرائی عورتوں سے عزت و احترام سے بات کرنے والا اس عورت کے حقوق سے کیوں نابلد ہے جسے خود اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو گواہ بنا کر اپنی ذمے داری بنایا...... میرے آئیڈیل کا بت تو چور، چور ہو گیا۔'' زیب کے چہرے پر دکھ رقم تھا۔
''زیب ڈیئر......! بے شک بت تو ٹوٹنے کے لیے ہوتے ہیں۔'' عینی نے بہت گہری بات کی۔ زیب ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔
''چراغ تلے اندھیرا سنا اور پڑھا تو تھا آج دیکھ بھی لیا۔'' زیب اپنا بیگ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔
''کہاں جا رہی ہو؟'' عینی نے اس کا بازو پکڑا۔
''میں باہر تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ اس دوغلے اور منافق شخص کی باتیں سننا آپ کی مجبوری ہوگی، مجھے ایسی کوئی مجبوری نہیں......'' وہ دروازے کی طرف بڑھی۔
''مگر وہ تمہاری پسندیدگی......'' عینی نے ابرو اچکائی۔
''یہ اس صوفے پر چھوڑ کر جا رہی ہوں ناں......'' اس نے آرام سے اس صوفے کی طرف اشارہ کیا جہاں کچھ دیر پہلے وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ عینی نے صوفے کی طرف یوں دیکھا جیسے واقعی وہاں کچھ رکھا ہو۔ زیب باہر نکل گئی اور عینی صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر فاروق صدیقی کی جھوٹی باتیں سننے کے لیے اس کا انتظار کرنے لگی۔

بات ہی ایسی تھی بستر میں دبکی عدینہ کے کان کھڑے ہوگئے تھے اور سانس رک گئی تھی۔

''کیا کہا تم نے ...... تمہیں فون پہ کسی سے محبت ہوگئی......؟'' رباب کی بات سن کر ایمان بھونچکا ہی تو رہ گئی تھی۔ رباب اس کی حیرانی سے نظر چرا کر تیز، تیز اثبات میں سر ہلانے لگی تو ایمان کی حیرت' غصے میں بدلنے لگی۔

''تم پاگل تو نہیں ہوگئیں رباب۔'' بے حد

احمق چڑیا

نادیہ جہانگیر



غصے کی وجہ سے اس کی آواز پھٹ سی گئی۔

''ہاں میں ہوگئی ہوں پاگل، عرفان نے کردیا ہے مجھے پاگل......'' رباب اپنی جگہ بے بس سی جبھی لہجہ گلوگیر ہوگیا، اپنے بستر پر لیٹی عدینہ کا دل کسی نے مٹھی میں لیا تھا۔

''عرفان ......!'' وہ چونکی...... ''تو اس کا نام عرفان ہے۔''

''ہاں......'' وہ زور، زور سے اثبات میں سر ہلانے لگی۔

''یقین مانو ایمان، عرفان بھی مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے، بہت چاہتا ہے وہ مجھے۔'' اس کے لہجے میں عرفان کی محبت اُبلی پڑ رہی تھی۔

''اوہ......یعنی کہ یہ معاملہ یک طرفہ نہیں ہے۔'' اسے جیسے کچھ سمجھ آیا۔

''نہیں......'' وہ زور، زور سے نفی میں گردن ہلانے لگی۔ ''وہ تو مجھ سے بھی زیادہ مجھے چاہتا ہے...... میرے لیے بے چین و بے قرار رہتا ہے۔''

''یعنی محبت میں شدت آچکی ہے۔''

''تو اور کیا...... وہ میرے بنا رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔'' اس کے روم، روم سے عرفان کے لیے محبت چھلکی پڑ رہی تھی۔ ایمان اسے دیکھ کر رہ گئی جبکہ عدینہ سن کر......

''کہاں رہتا ہے وہ؟'' اسے کی بار ایمان کا لہجہ ذرا کمزور تھا کہ مقابل کے لفظ، لفظ سے چھلکتی محبت کی شدت محسوس ہو رہی تھی۔

''میرے دل میں......'' جواب برجستہ تھا۔ ایمان اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی، جہاں عشق کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن تھا۔ عدینہ کی مٹھیوں میں پسینہ آگیا۔

''آئی مین وہ کس علاقے میں رہتا ہے؟'' اس کی سنجیدگی پہ رباب کھل کر مسکرائی۔

''جہلم......''

''جہلم......؟'' ایمان کی حیرت کے مارے چیخ تو نکلی ہی تھی، ساتھ آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ عدینہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ سر سے ذرا سا کمبل کھسکا کر رباب کو دیکھا اس کا انگ، انگ خوشی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''ہاں، وہ جہلم میں رہتا ہے۔'' وہ بتاتے ہوئے بھی بہت خوش نظر آرہی تھی۔

''اتنی دور......؟''

''تو کیا ہوا...... دل تو قریب ہیں ناں...... دلوں میں تو فاصلے نہیں......'' عدینہ اش اش کر اٹھی۔

''مگر رباب تم کراچی...... وہ جہلم......؟'' اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے اس سے یہ بات ہضم نہیں ہو پا رہی۔

''محبت میں یہ دوریاں، یہ فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے ایمان......محبت تو دلوں کو قریب لاتی ہے، فاصلے مٹاتی ہے، محبت کے راستے میں فاصلے آ بھی جائیں تو اس کی کسی کو پروا نہیں ہوتی۔'' رباب کے اندر تو اس کا عرفان بول رہا تھا جو اس سے اس کے اندر کے جذبات، احساسات اگلوا رہا تھا۔ عدینہ اس کی اس بہادری پہ دل ہی دل میں اسے داد دیے بغیر نہیں رہ سکی۔

''تم کیسے اس راہ پر آن پڑیں رباب؟ تم نے کیسے یہ راستہ چن لیا، کیا تم نہیں جانتیں کہ یہ راہ کس قدر پُرخار ہے، اسے پار کرنا کتنا مشکل ہے، انسان اس پر چلنے لگے تو فاصلہ مٹتا ہی نہیں...... منزل دور سے دور ہوتی چلی جاتی ہے۔''

''میں کیا کروں ایمان......محبت نے مجھے پوری طرح اپنی آغوش میں لے لیا ہے...... وہ مجھ پر ہر طرح سے حاکم ہوگئی ہے، اب میں اس سے نکلنا بھی چاہوں تو ناممکن لگتا ہے، محبت نے میرے اندر تک پنجے گاڑھ لیے ہیں۔'' رباب کا بھیگا لہجہ اس کے اندر کا غماز تھا کہ واقعی محبت نے اس پر بہت کاری وار کردیا تھا

اور اسے ہر طرح سے بے بس کیے جا رہی تھی۔
''مگر رباب محبت کی کوئی واضح شکل صورت بھی تو ہو، کوئی حقیقت بھی تو ہو۔''
''یہ کیا کہہ رہی ہو تم ایمان؟ محبت، محبت ہوتی ہے اس کی شکل صورت تو سوائے محبت کے اور بھلا کیا ہو سکتی ہے؟'' وہ ایمان کی بات پر جیسے ناراض ہوئی تھی۔ اس کے جواب پر عدینہ نے بھی زور، زور سے اثبات میں سر ہلایا تو ساتھ والے پلنگ پر ہلتا کمبل محسوس کر کے ایمان چونک پڑی۔
''ہش..... آہستہ عدینہ جاگ نہ جائے۔''
''چھوڑو یار، تم ہمارا کچھ کرو، ہمارا ملن کیسے ہو، ہم کیسے ایک ہوں، یہ سوچو۔'' رباب کے انداز میں بے تحاشا بے تابی تھی۔ وہ صرف عرفان کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس سے اس قدر دور تھا کہ کراچی سے جہلم جاتے ہوئے بھی دن رات ایک کردو تو تب بھی سفر ختم نہ ہو مگر جو محبت ہوتی ہے وہ یہ فاصلہ نہیں دیکھتی..... ابھی محسوس کیا اور معشوق سانسوں سے بھی قریب آ گیا۔ یوں آنکھیں موندیں اور وہ پاس آن بیٹھا..... محبت احساس ہی کا تو نام ہے، جبھی تو رباب بھی اس قدر نڈر ہو رہی تھی۔ دنیاوی دوریوں اور فاصلوں سے قطع نظر..... وہ صرف اپنی محبت کو دیکھ رہی تھی۔
''فار گاڈ سیک رباب..... کچھ تو خیال کرو..... کہاں وہ..... کہاں تم؟'' ایمان کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھائے۔
''وہ پاکستان سے باہر تو نہیں رہتا..... اور نہ اس دنیا سے دور کہ وہ نہ مل سکے۔'' نڈر بنی رباب کا سخت لہجہ اسے بوکھلا گیا۔
''مم، میرا مطلب یہ نہیں ہے رباب..... میں تو''
''تم وہ کرو، جو میں نے کہا ہے۔''
''مگر کیسے..... چاچو، چاچی تو بات کی تہ تک جائیں گے کہ عرفان کون ہے، کیسے جانتی ہو، وغیرہ وغیرہ..... اور اس کا تم سے کانٹیکٹ ہوا کیسے؟''
''یہی تو مسئلہ حل کرانے کے لیے میں تمہارے پاس مدد کے لیے آئی ہوں۔''
''مگر یار رباب تم سمجھنے کی کوشش کرو، یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔''
''جو بھی ہے..... میں نے عرفان سے شادی کرنی ہے اور بس.....''
''پاگل لڑکی..... یہ سب کچھ اتنی تیزی سے، یوں چٹکیوں میں تو نہیں ہو سکتا ناں..... اس کے لیے تو وقت چاہیے۔''
''نہیں.....'' اس نے تیز، تیز نفی میں گردن ہلائی۔ ''وقت نہیں ہے ایمان..... میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی..... اس کے بنا رہنا میرے لیے دوبھر ہوتا جا رہا ہے..... میرے لیے تو یہ دن رات بھی گزارنا بہت مشکل ہو رہے ہیں..... ایمان! اب میں نہیں رہ سکتی، عرفان کے بغیر.....'' اس کے لفظ، لفظ سے عرفان کے لیے بے قراری اور بے تابی جھلک رہی تھی۔ ایمان اسے دیکھ کر رہ گئی، عدینہ کے ماتھے پر پانی چمکنے لگا۔
''کیا اس قدر محبت ہو گئی ہے تمہیں اس سے؟''
''بہت، بہت زیادہ..... ایمان تم نہیں جانتیں' میری نس، نس میں عرفان بس گیا ہے۔ میری ایک' ایک دھڑکن میں عرفان دھڑکتا ہے۔''
''یار اتنی دور دل کیوں لگا لیا؟'' ایمان اس کی دوست تھی جبھی روہانسی ہو گئی۔
''دل کو ان فاصلوں کی کوئی پروا نہیں ہوتی ایمان..... دل تو پاگل ہوتا ہے..... ہر لحظہ، ہر لمحہ اپنے عاشق، اپنے معشوق کا کلمہ پڑھتا رہتا ہے، اسے فاصلوں سے کیا لینا دینا.....'' رباب کا میٹھا لہجہ محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔
''مگر یار، خاندان میں یہ بات کسی سے بھی ہضم نہیں ہو گی کہ تم ایک انجان شہر کے انجان لڑکے

سے شادی کرنا چاہتی ہو۔'' وہ اسے حقیقت سمجھانا چاہ رہی تھی مگر وہ کچھ بھی سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔

''مجھے لوگوں کی کوئی پروا نہیں......''

''مگر لوگوں کو تو تمہاری ہے۔''

''میں نے نہیں کہا کہ وہ میری پروا کریں۔''

''تم سمجھنے کی کوشش کرو رباب...... فون پر ہونے والی محبت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی...... لوگ اس محبت کو نہیں مانتے۔'' ایمان کی بات پر عدینہ کا دل ڈوبنے لگا۔

''کیوں نہیں مانتے بھلا...... محبت صرف محبت ہوتی ہے ایمان۔'' اس نے تیزی سے اسے ٹوکا تو وہ بغور اسے دیکھنے لگی۔

''محبت صرف محبت نہیں ہوتی رباب...... فراڈ بھی ہو سکتی ہے۔''

''مگر عرفان فراڈی نہیں ہے۔''

''تم یہ کس بل بوتے پر کہہ رہی ہو؟''

''کیا مطلب......؟''

''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ عرفان فراڈی نہیں ہے؟''

''کیسے...... کیسے کا کیا مطلب...... وہ مجھ سے محبت کرتا ہے...... مجھے چاہتا ہے...... مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے......'' وہ اپنی جون میں تیزی سے بول رہی تھی مگر ایمان نے ٹوک دیا۔

''تمہیں اس کے گھر کا پتا معلوم ہے۔''

''گھر کا پتا......'' وہ سٹپٹائی...... ''گھر کا پتا تو نہیں ہے مگر عرفان کیوں مجھ سے فراڈ کرے گا۔ مجھے دھوکا دے کر اسے کیا ملے گا؟''

''اس کے ماں، باپ حیات ہیں یا نہیں...... کیا تمہیں سچائی کا علم ہے......؟ اس کے اور کتنے بہن، بھائی ہیں...... خاندان والے کیسے ہیں...... کون ہیں...... کہاں رہتے ہیں...... وغیرہ وغیرہ تمہیں مکمل معلومات ہیں؟'' ایمان سوال پر سوال کیے جا رہی تھی اور رباب چپ کی چپ رہ گئی کہ ان سوالوں کا تو اس کے پاس کوئی جواب ہی نہیں تھا۔

عرفان جب بھی کال کرتا تھا صرف اپنی کہتا تھا۔ اپنی بے چینیاں، اپنی بے تابیاں اور بے قراریاں بتائے جاتا تھا۔ کبھی یہ نہیں بتاتا تھا کہ میرا بھائی یہ کر رہا ہے، میری بہن وہ کر رہی ہے، میرے اتنے بھائی ہیں یا کتنی بہنیں ہیں، وہ صرف اپنی کہتا تھا اور اپنی ہی سناتا تھا۔ اور وہ اسے سننے کی ایسی عادی تھی کہ بس اسے ہی سنے جاتی تھی۔

''اب چپ کیوں ہو گئیں...... بولو...... بتاؤ تم اس کے بارے میں اور کتنا جانتی ہو؟'' ایمان یقیناً بے حد حقیقت پسند تھی جبھی تو اسے بھی حقیقت کا آئینہ دکھانا چاہتی تھی مگر وہ اپنے پیار میں ایسی اندھی تھی کہ سوائے عرفان کے کچھ بھی اور دیکھنے کو تیار نہیں تھی۔

''کچھ بھی نہیں پتا ناں...... پھر تمہارا کہنا ہے کہ تم اسے مکمل جانتی ہو؟'' ایمان تاسف سے مسکرائی۔ ''تو پھر تمہیں اس کی محبت کیسے سچی محبت لگنے لگی...... اس کے جذبات کیسے صادق لگنے لگے؟''

''ایمان تم تو......''

''میں کچھ بھی غلط نہیں کہہ رہی رباب...... صرف تمہیں حقیقی آئینہ دکھانا چاہ رہی ہوں، یہ جو فون کی محبت ہوتی ہے ناں سوائے تباہی، گمراہی کے اور کچھ نہیں...... نہ تو اس کی حقیقت ہے اور نہ ہی وجود...... یہ سوائے انسان کو تباہ و برباد کرنے کے اور کچھ بھی نہیں کرتی۔ صرف وقت گزاری...... محبت کے جھانسے دے کر لڑکیوں کو گھر والوں سے بدظن کر دینا اور پھر انہیں بھاگنے پر مجبور کرنا...... غریب ماں، باپ کی عزت کی پامالی کے ساتھ، ساتھ ان کی ساری زندگی کی جمع پونجی بھی لے کر غائب ہو جانا۔ یہی اصل حقیقت ہے اس نام نہاد محبت کی......'' ایمان سانس لینے کو اِک پل کو رکی۔

''اور آخر میں کیا ہوتا ہے کہ عورت کے پاس...... نہ ماں، باپ، بہن، بھائی اور سگے رشتے

رہتے ہیں اور نہ ہی وہ عزت جو عورت کا اصل زیور ہوتی ہے اور جب عورت اپنا سب کچھ کھو دیتی ہے تو مقام سوائے ٹھوکروں اور ٹھڈوں کے اور کہیں نہیں ہوتا۔'' ایمان اِک دردناک حقیقت اگل رہی تھی۔

رباب کا چہرہ زرد پڑ گیا...... جبکہ کمبل میں لپٹی عدینہ کا بھی حال اس سے مختلف نہیں تھا۔

''تم مجھے ڈرا رہی ہو؟'' لب و لہجے کے ساتھ انداز بھی سہما، سہما تھا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟''

''مجھے تو عرفان میں کبھی کوئی خامی نظر نہیں آتی۔''

''سچ...... تم بھی ایک احمق چڑیا ہو رباب...... جسے اپنے بنائے گئے خوب صورت آشیانے سے پیارا کوّے کا گھونسلا لگتا ہے، تمہارا کوئی حل یا علاج نہیں......'' ایمان بجز افسوس کرنے کے اور کچھ بھی نہیں کرسکی کہ اتنا سمجھانے کے بعد بھی رباب کا دل عرفان کی طرف مائل تھا۔

''مجھے لگتا ہے تم میرا یہ مسئلہ کبھی حل نہیں کرو گی، مجھے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔'' رباب مایوس ہو کر وہاں سے اٹھ گئی تو ایمان کے ہونٹوں پر اِک زخمی سی مسکراہٹ آ کر معدوم ہو گئی تھی۔ تبھی عدینہ کے سیل فون کی رِنگ ٹون بج اٹھی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر بستر سے نکلی۔

''ارے کیا ہوا......؟'' ایمان نے چونک کر اسے دیکھا۔

''وہ آمنہ کا فون ہے، ہسٹری کا صبح ٹیسٹ ہے اسی سلسلے میں بات کرنا ہوگی۔'' عدینہ نے گڑبڑا کر جھوٹی وضاحت کی۔

''تو تم یہیں بات کرلو، باہر جانے کی کیا ضرورت ہے اور ویسے بھی تم نیند میں ہو۔''

''آپ آرام کریں، مجھے آمنہ سے لمبی بات کرنی ہے۔ خواہ مخواہ آپ ڈسٹرب ہوں گی۔'' ٹون ایک بار بند ہو کے دوسری بار پھر بج اٹھی۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی اور دروازے سے باہر نکلتے ہی گرین بٹن پریس کیا۔

''ہائے اسماعیل کتنی بار کہا ہے کہ رات کو کال مت کیا کرو، ایمان باجی پاس ہی ہوتی ہیں، کسی دن انہیں شک ہو گیا ناں تو شامت آ جانی ہے میری......''

دوسری طرف سے آواز سنتے ہی وہ دہاڑی تھی۔

''اچھا، چھوڑو یہ بتاؤ تمہارے سوات کا موسم کیسا ہے، یہاں کراچی میں تو سردی آتی ہی نہیں......'' وہ باہر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر

فون پر اسماعیل سے سوات کے موسم کے ساتھ ساتھ اس کے دل کے موسم کے بارے میں بھی سننے لگی تھی۔

''ہائے کاش میں بھی اس وقت تمہارے ساتھ وہاں ہوتی......'' اس نے بہت حسرت سے کہا پھر خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ ''مگر تم مجھے سوات لے جانے کی کوشش کرو تب ناں......'' کھنکتے لہجے میں روہانسا پن بھی تھا۔

''ہاں یہ تو ہے اگر تم اچانک سے رشتہ بھیجو تو سب لوگ کھٹک جائیں گے کہ تم ہو کون......اور میرا ہی رشتہ کیوں مانگا......لیکن اسماعیل سچ تو یہ ہے کہ اب میں تمہارے بنا رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ہمیں ہر حال میں ایک ہونا ہے، کیا ہوا جو شہروں میں فاصلے ہیں...... ہمارے دل تو قریب ہیں ناں......'' عدینہ کے اندر...تپش دیتے جذبات ابل، ابل پڑ رہے تھے۔ وہ بہت بے تابی سے اپنے اندر کا حال دور سوات کے ایک ٹھڑے پہ بیٹھے اسماعیل کے گوش گزار کر رہی تھی جو آج ایک لمبی رقم لے کر جوا ہار گیا تھا اور آج پھر عدینہ سے دس ہزار کے ایزی پیسہ کا کہنے لگا تھا۔ مگر ہر بار کی طرح ڈھیروں چکنی چپڑی باتوں کے بعد......

''میں جانتی ہوں، سب جانتی ہوں اسماعیل کہ تم مجھ سے زیادہ میرے لیے بے تاب ہو......تم نہ بھی کہو تو میں سمجھتی ہوں سب......'' محبت سے لبریز آواز میں بولتی وہ یہ دیکھنا بھول گئی تھی کہ اس کے اچانک فون آنے پر دوڑ کے باہر آنے پہ ایمان کھٹک گئی تھی اور اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اپنی بہن کو یوں کسی کے ساتھ باتوں میں مصروف پا کر وہ اندر سے ہل کر رہ گئی تھی تبھی اس کے موبائل کی زور دار بیل بج اٹھی۔ اسماعیل سے باتوں میں گم عدینہ نے چونک کر اپنے پیچھے دیکھا تو اس کا رنگ فق ہو گیا......ایمان تاسف سے پہلے اسے اور پھر فون پر چمکتے نمبر کو دیکھتی اندر آ گئی۔

''جی مسٹر رمیز، کہیے اپنی صفائی میں اب کیا کہنا ہے......جس بچے نے میری کال اٹھائی تھی وہ آپ کا بچہ نہیں تھا یا جس عورت نے رات مجھے گالیاں دے کر تمہیں دوبارہ فون نہ کرنے پر دھمکایا ہے وہ آپ کی بیوی نہیں ہے؟'' بے حد ترشی سے اس نے کال ریسیو کرتے ہی کہا تو دوسری سائڈ پر ذرا سی دیر کو خاموشی چھا گئی۔

''آئی ایم سوری مسٹر رمیز...... ہم بے وقوف لڑکیاں یہ بھول جاتی ہیں کہ ہم تو اپنے کمرے میں کنڈی لگائے اکیلے کسی لڑکے سے بات کر کے دل بہلا رہی ہوتی ہیں مگر اگلا لڑکا کتنے لوگوں میں، کتنے رش میں ا۔ کتنے عیاش دوستوں کے درمیان بیٹھا ہمارا مذاق اڑا رہا ہوتا ہے، ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا لیکن مجھے اب سمجھ آ گیا ہے کہ ہم اپنے، اپنے ماں، باپ اور بہن بھائیوں کی عزت پل میں خاک میں ملا کر چل پڑتی ہیں، یہ جانے بغیر کہ سامنے والا عزت دینے والا ہے یا عزت کو تار، تار کرنے والا......آپ نے تین ماہ مجھ سے بات کی، مجھے اپنی باتوں میں پھنسا لیا۔ پھر اپنی محبت کا جھانسا دے کر مجھے اس حد تک اپنے قریب کر لیا کہ میں آپ کے بغیر رہنے کا سوچ کر ہی کانپنے لگتی، میرا دل بیٹھنے لگتا...... مجھے ایسا لگتا جیسے آپ کے بنا میری جان نکل جائے گی ......مگر پھر کیا ہوا، مجھے آپ کی حقیقت معلوم ہو گئی، میں نے آپ کے نمبر پہ کال کی تو خوش قسمتی سے آپ کا بیٹا آپ کے موبائل پر کوئی گیم کھیل رہا تھا، اس نے فون ریسیو کر کے مجھے بتایا کہ آپ اس کے پاپا ہیں، ہو سکتا ہے میں جھوٹ سمجھتی مگر جب اگلے ہی روز آپ کی وائف نے مجھے فون کر کے گالیاں دیں، بری طرح انسلٹ کی اور آپ سے دور رہنے کا کہا تو میں جان گئی کہ حقیقت کیا ہے......اور میں اب شکر ادا کر رہی ہوں کہ وقت سے پہلے مجھے عقل آ گئی، ٹھوکر لگنے سے پہلے ہی میں سنبھل گئی۔ میں نے آپ کی باتوں میں آ کے شاید اپنے اور اپنے والدین کے ساتھ بہت برا کر جانا تھا مگر یہ میرے والدین کی دعائیں تھیں

جنہوں نے مجھے بھٹکنے سے بچالیا اور ایسے میں، میں اپنے رب کی بہت شکر گزار ہوں جس نے مجھے اپنی ہی نظروں میں گرنے سے بچالیا۔'' اس نے اِک گہری سانس لے کر تشکر سے اوپر دیکھا۔

''میں آج سے آپ کا نمبر ڈیلیٹ کر رہی ہوں......اور میں چاہوں گی کہ آئندہ آپ بھی میرا نمبر ٹرائی نہ کیجیے گا۔ خدا حافظ ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے......'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے فون آف کر دیا۔

''ایمان......'' جیسے ہی اس نے رمیز کا نمبر کاٹا پیچھے سے رباب کی آواز نے اسے چونکا ڈالا۔ اس نے سرعت سے گردن پیچھے موڑی تھی۔

''جس طرح تم نے رمیز کا نمبر ڈیلیٹ کیا ہے میں بھی اسی طرح سے عرفان کا نمبر ڈیلیٹ کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا تو وہ حیران رہ گئی۔

''کیا......؟''

''ایمان ہم واقعی احمق چڑیاں ہیں، جنہیں اپنے آشیانوں سے زیادہ کوّے کا گھونسلا اچھا لگتا ہے، یہ جانے بغیر کہ کوّا کبھی بھی چڑیا کو اپنا گھونسلا نہیں دیتا۔ عرفان اور رمیز بھی وہی کوّے ہیں جو صرف دوسروں کے گھونسلے ہتھیانا جانتے ہیں......''

''یہ تو بہت اچھا ہوا رباب جو بروقت تمہارے قدم بھی ڈگمگانے سے رک گئے۔ تم بھی سنبھل گئیں۔'' ایمان نے ذرا سا مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ سر اثبات میں ہلانے لگی۔

''اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ایمان، تم جو اگر مجھے حقیقت کا آئینہ نہ دکھاتی، یہ نہ سمجھاتیں کہ عرفان کو میں ہی کیوں اچھی لگی، اس نے مجھے ہی شادی کے لیے کیوں چنا۔ اپنے رشتے داروں میں اور اپنے علاقے میں اسے کیوں کوئی اور لڑکی اچھی نہیں لگی جس سے وہ شادی کرتا...... اصل میں ایمان عرفان بھی ایک جھانسا دینے والا ہوشیار، چالاک شخص ہے، لڑکیوں کو فون پر پھانسنا ان سے کارڈز، تحفے کے علاوہ پیسے تک بٹور لینا اس کا شیوہ ہے، ہم جیسی احمق لڑکیاں جو فون پر مرمٹنے کو تیار ہوجاتی ہیں، ایسے مردوں کی آواز اور لہجے پر قربان ہوجاتی ہیں، نہیں جانتیں کہ ''فون محبت'' کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذریعے کتنے گھر تباہ ہوسکتے ہیں، ہمیں اندازہ ہی نہیں ہوتا۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو رباب......''

''ایمان میں نے فیصلہ کرلیا ہے میں صرف عرفان کا نمبر سیل سے نہیں ڈیلیٹ کروں گی بلکہ میں اب موبائل کا استعمال ہی نہیں کروں گی...... ہم نے انتہائی ضرورت کی چیزوں کو بھی سستی اور گھٹیا تفریح کا ذریعہ بنالیا ہے، میں اسے توڑ دوں گی۔'' وہ اِک عزم سے بولی تھی۔ ایمان نے ستائش سے اسے دیکھا تو اس نے اپنا موبائل ایمان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''یہ لو، ایمان تم اسے اپنے ہاتھ سے توڑ ڈالو......'' ایمان نے سر ہلا کر اپنا اور اس کا موبائل اپنے سامنے کیا۔

''ان کا توڑ دینا ہی ہمارا مستقبل محفوظ کرسکتا ہے، چلو آؤ توڑ دیں۔'' وہ دونوں کسی بھاری چیز کی تلاش میں دائیں، بائیں دیکھنے لگیں۔

''یہ لیں باجی...... اس اینٹ سے توڑ ڈالیں ان کو۔'' اچانک ہی پیچھے سے عدینہ آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھاری اینٹ تھی۔ ایمان نے سر ہلا کر اینٹ پکڑی تو عدینہ نے اپنا دوسرا ہاتھ ایمان کے سامنے کر دیا جس میں اس کا نازک سا موبائل تھا۔

''سب سے پہلے اسے توڑ دیں باجی...... میں بھی تباہ نہیں ہونا چاہتی۔'' اس نے آہستہ سے کہہ کر موبائل آگے بڑھا دیا تو ایمان اور رباب کے ہونٹوں پر ایک ساتھ مسکراہٹ ابھری جس میں عدینہ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔





چادر اور چار دیواری

بشریٰ باجوہ

موسم نے یک دم ہی اپنا رنگ بدل لیا تھا۔ دن کو دھوپ کی تمازت میں اضافہ ہو چکا تھا جبکہ راتیں ابھی تک کچھ، کچھ ٹھنڈی تھیں۔ کھیتوں میں گندم کے سبز خوشے سنہری ہو چکے تھے، کٹائی شروع ہو چکی تھی۔ نیم کے گھنے سایہ دار درخت پر مختلف پرندوں نے شور مچایا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی اس نے امردو، انار اور لیموں کے پیڑوں کو پانی دیا تھا اور پائپ سے انہیں دھو دیا تھا۔ سبز پتوں سے ٹپکتا پانی مٹی میں جذب

ہو رہا تھا۔ گیلی مٹی اور پودوں کی ملی جلی باس صحن میں چکرا رہی تھی۔ گھنے نیم کے نیچے چارپائی پر عبدالرحیم لیٹا ہوا تھا وہ ان کا سر ہلکے، ہلکے دبا رہی تھی۔

''پتر اپنے دوپٹے کا دھیان کیا کر۔'' رحیم نے گود میں پڑے دوپٹے کی جانب اس کی توجہ دلائی۔

''اچھا بابا۔'' خوب صورت اور سنہری رنگت والی سجل نے جلدی سے دوپٹا سر پر ڈال لیا۔ اس کا دھیان تو اندر پڑے سیل فون پر تھا۔ شازل کی کال آنے والی تھی۔

''پتا نہیں ابا کب جائیں گے کھیتوں میں؟'' وہ دل میں سوچتے ہوئے فکرمند ہو رہی تھی۔

ابا اِدھر اُدھر کی باتیں سنا رہے تھے بظاہر دھیان سے سنتی ہوئی اس کا ذہن بار بار بھٹک رہا تھا۔ دوپٹا پھر سے ڈھلک کر گود میں آن گرا۔ دھیان دوپٹے کی طرف ہوا تو اس نے جلدی سے سر پر جمالیا۔ بابا رحیم یہ دیکھ کر شفقت سے مسکرا دیے۔

''سجل دھی! ایک بات یاد رکھنا ہمیشہ چادر اور چار دیواری میں ہی عورت محفوظ ہوتی ہے اور اس کی عزت ہوتی ہے۔ جب وہ بے پردہ ہو کر چار دیواری سے باہر نکلتی ہے تو طرح، طرح کی نظروں اور جملوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور چادر ہی تو عورت کی محافظ ہوتی ہے۔ پردہ تحفظ کا احساس دلاتا ہے اور رب سوہنے کا بھی یہی حکم ہے اور رب سوہنے کے ہر حکم میں حکمت اور دانائی ہوتی ہے۔'' عبدالرحیم نے پیار سے بیٹی کو سمجھایا۔ ''اچھا پتر چلتا ہوں دروازے کی کنڈی لگا لینا شام تک تیری ماں بھی واپس آجائے گی۔''

''اچھا بابا۔'' دل ہی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے سجل نے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ جلدی سے اندر جاتے ہی فون اٹھا کر چیک کیا۔ پانچ مسڈ کالز آچکی تھیں شازل کی۔ اس نے جلدی سے مس کال دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی سیل گنگنا اٹھا۔ اس نے جلدی سے آن کیا۔

''کیا حال ہیں میری جان کدھر تھیں میم صاحبہ؟''

''ابا گھر پر تھے ابھی گئے ہیں۔'' سجل نے جواب دیا۔

''تمہیں پتا ہے سجو میں ہر وقت تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ ہر آن، ہر گھڑی تمہاری یاد میرے ہمراہ ہوتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ہر وقت تمہارا رہوں تاکہ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے اور میں صرف تمہیں ہی سوچتا رہوں۔ میری زندگی میں بس دو ہی عورتیں اہم ہیں جو مجھے پیاری ہیں...... پتا ہے وہ کون ہیں؟'' سجل جو اس کے مسحور کن اور خوب صورت لہجے میں کھوئی ہوئی تھی چونک کر پوچھنے لگی۔

''کون ہیں؟''

''اِک تم اور ایک میری ماں۔''

''اچھا۔'' فخر و انبساط سے اس کی گردن تن گئی۔ دل مغرور ہوئے جا رہا تھا کہ اتنا شاندار اور مال دار شخص اس پر مرمٹا ہے۔ وہ اس کی خوب صورت اور دلکش باتوں میں کھوسی جاتی۔ لمبی لمبی کالز کرنے کے باوجود وہ سیر نہ ہوتی۔ محبت جیسے خوب صورت جذبے نے اسے اپنا اسیر کرلیا تھا۔

☆☆☆

اسے آج بھی یاد تھا۔ وہ ایک عام سا دن تھا جب وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر پرندوں کے پنجرے میں انہیں دانہ ڈال رہی تھی۔ اماں ساتھ والے گھر میلاد میں گئی ہوئی تھیں۔ یک دم اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے جلدی سے بقایا دانہ پنجرے میں ڈال کر اسکرین پر نظر ڈالی کسی اجنبی نمبر سے کال آرہی تھی۔

''کون ہوسکتا ہے؟'' دل میں سوچتے ہوئے اس نے فون کانوں سے لگالیا۔

''ہیلو السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام۔'' دوسری جانب سے مہذب انداز میں جواب آیا۔

''جی کس سے بات کرنی ہے؟'' ڈرتے، ڈرتے سجل نے پوچھا۔

''آپ سے۔'' دلربا انداز میں جواب موصول ہوا۔ اس نے جلدی سے کال کاٹ دی فوراً ہی میسج آ گیا۔

''پلیز میم صاحبہ بات کریں مجھ سے۔'' میسج ڈیلیٹ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سیل دوبارہ گنگنانے لگا اس نے جلدی سے سائلنٹ پر لگا دیا۔ کئی کالز آئیں اور ایس ایم ایس بھی۔ تین چار دن تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ محبت بھرے میسج پڑھ کر اب وہ لطف اندوز ہونے لگی۔ لاشعوری طور پر وہ ایس ایم ایس کا انتظار کرنے لگی۔ ایک دن جی کڑا کر کے اس نے کال بھی اٹینڈ کر لی۔

''شکر ہے کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے میم صاحبہ۔ نمبر ملاتے، ملاتے میری تو انگلیاں بھی شل ہو گئیں ہیں۔'' دوسری جانب سے خوشی اور شکوے کا اظہار ایک ساتھ ہوا۔

''آپ کون ہیں اور مجھے کیوں تنگ کر رہے ہیں؟'' سجل نے بیزاری سے پوچھا۔

''میں تمہارا دیوانہ ہوں سجل۔ میرا نام شازل ملک ہے، تمہارے ہی قصبے میں رہتا ہوں تمہارا نمبر بڑی مشکل سے حاصل کیا ہے۔ ایک دن بازار میں تمہیں دیکھا تھا تب سے آج تک تمہارا اسیر ہوں۔ تمہیں بے پناہ چاہتا ہوں۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے صرف تمہیں سوچا ہے...... پلیز میرا دل مت توڑنا ورنہ شاید میری سانس ٹوٹ جائے۔''

''اللہ نہ کرے۔'' بے ساختہ اس کے لب سے یہ الفاظ ادا ہو گئے بعد میں وہ فوراً شرمندہ ہو گئی۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے...... شکریہ سجل مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم نے میرے جذبوں کو پزیرائی بخشی ہے۔'' شازل نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

''نہیں وہ ......دراصل......'' سجل کو کوئی بہانہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ دل ہی دل میں تو اس کے متعلق وہ

غزل

مل ہی جائے گا کہیں دل کو یقیں رہتا ہے
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے

اِک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اب یہاں کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے

جس کی سانسوں سے معطر تھے در و دیوار تیرے
اے مکاں بول کہاں اب وہ مکیں رہتا ہے

روز ملنے پہ بھی لگتا ہے برس بیت گئے
عشق میں وقت کا کیا ساتھ کہیں رہتا ہے

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کر اس کو محسن
عمر بھر کون جواں، کون حسیں رہتا ہے

پسند: مہوش جواد، لیہ

سوچتی رہتی تھی پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ محبت کا بیج جو اس نے اپنے دل کی سرزمین پر بویا تھا وہ ایک تناور درخت بن چکا تھا جس کی جڑیں اس کے اندر پھیل چکی تھیں۔ شازل کی خوب صورت، دل نشیں باتیں اسے اپنا اسیر کر چکی تھیں۔ وہ بے تحاشا اپنی محبتوں کا اظہار کرتا اور وہ تو بن پیے ہی مدہوش سی ہو جاتی۔ ڈھیروں باتیں کر کے بھی اِک تشنگی سی رہ جاتی جس دن بات نہ ہوتی وہ سارا دن بولائی، بولائی سی پھرتی۔ شازل کے اصرار پر وہ ایک دوسرے کو دور سے دیکھ بھی چکے تھے۔ شازل اس کے خوابوں کے شہزادے جیسا تھا۔ قد آور، ہینڈسم...... شازل نے کئی بار اکیلے ملنے کے لیے بھی اصرار کیا لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی ٹال جاتی۔

☆☆☆

''آپا زینب اپنے بیٹے شاہ زمان کے لیے سجل کا رشتہ مانگنا چاہتی ہیں۔'' خدیجہ بیگم نے حقہ پیتے

ہوئے رحیم کو خوشی و مسرت سے بتایا۔

''سجل کی ماں! یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔شاہ زمان پڑھا لکھا مہذب اور برسرِ روزگار ہے اور کیا چاہیے ہمیں...... پھر بیٹی اپنوں میں جائے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی کی بات ہے ہمارے لیے۔'' عبدالرحیم تکیہ سیدھا کرتے ہوئے چارپائی پر لیٹ گیا۔

''شکر اے رب سوہنے دا...... پہلے بھی عائشہ اور لیلیٰ بڑی دو بیٹیاں اپنوں میں گئی ہیں اور سکھ، سکون سے اپنے گھر آباد ہیں۔'' خدیجہ نے روٹی کے چھوٹے، چھوٹے ٹکڑے پرندوں کو ڈالے اور ہاتھ دھونے کے لیے نلکے کی طرف چل دی۔ آٹا گوندھتی سجل جیسے سن ہو کر رہ گئی۔

''مجھے جلد ہی شازل سے بات کرنی ہوگی ورنہ یہ نہ ہو کہ شاہ زمان میرا مقدر بن جائے اور میں شازل کو ہمیشہ کے لیے کھودوں۔'' وہ جلدی، جلدی آٹے میں مکیاں مارنے لگی۔

☆☆☆

ساری بات سن کر شازل جیسے کسی سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا ہوا...... خاموش کیوں ہوگئے؟'' اس نے پریشان سے لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں میری جان! اِدھر میری ماں میری شادی اپنی بھانجی سے کرنا چاہتی ہیں اُدھر تمہاری امی تمہاری شادی اپنے بھانجے سے کرنا چاہتی ہیں۔ ہمارا کیا ہوگا...... میرے والدین بہت ضدی ہیں وہ کبھی رشتے کے لیے غیر برادری میں نہیں جائیں گے۔''

''اب کیا ہوگا شازل ہمارا؟'' وہ فکرمندی سے گویا ہوئی۔

''میری بات غور سے سنو اور ٹھنڈے دل سے اس بات کو سوچنا۔ اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے میرے پاس۔ ہم مل بھی جائیں گے اور ہمارے گھر والے بھی رضامند ہو جائیں گے۔''

''کیا ہے حل جلدی بتاؤ۔'' وہ بے تابی سے بولی۔

''ہم دونوں خفیہ نکاح کر لیتے ہیں۔ جب مناسب وقت آیا تو ظاہر کر دیں گے...... مطلب جب تمہارا رشتہ ہونے لگے تم بتا دینا۔ وقتی طور پر وہ ہم سے ناراض ہوں گے لیکن آخر ہمارے والدین ہیں مان ہی جائیں گے اور میرے گھر والے بھی کب تک ناراض رہیں گے بیٹا ہوں آخر میں ان کا۔''

''لیکن میں ایسا نہیں کرسکتی...... یہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔''

''رہ لو گی میرے بغیر تم؟ لیکن تم یہ سوچ لو سجل میں نہیں جی پاؤں گا تمہارے بغیر......تم میری یہ بات یاد رکھنا اِک دن تم اپنے فیصلے پر بہت پچھتاؤ گی، جان دے دوں گا میں اپنی ہاں۔'' وہ فوراً جذباتی ہوا۔

''پلیز شازل ایسی باتیں مت کرو، میرے دل کی دھڑکن رک جائے گی تمہاری ایسی باتوں سے۔'' سجل نے بے اختیار ٹوکا۔

''تم اچھی طرح سوچ لو میں پھر بات کروں گا تم سے۔'' شازل نے گینداس کے کورٹ میں پھینک دی۔

وہ محبت میں جس راستے پر قدم رکھ چکی تھی نہایت کٹھن اور دشوار تھا مگر پلٹنا ناممکن تھا...... پلٹ جاتی تو اپنی محبت ہار جاتی اور محبت ہارتی تو شاید اپنی جان بھی ہار جاتی۔ دل و دماغ میں جنگ جاری تھی لیکن کب تک شازل نے اسے اپنی محبت کے واسطے دے کر قائل کر ہی لیا۔

☆☆☆

شام ڈھل رہی تھی عجب حبس سا چھایا ہوا تھا دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر گھنے بادل چھا گئے اور ہوا چلنے لگی۔ رات ہونے تک موسم مزید خراب ہو چکا تھا۔ بادلوں کی گھن گرج سے اس کا دل سہما جا رہا تھا لیکن آج کی رات کٹھن فیصلے کی رات تھی۔ آج رات

ہی وہ ہمیشہ کے لیے شازل کی ہونے جارہی تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق رات گیارہ بجے اسے لال چوک میں شازل کے پاس پہنچنا تھا۔ وہاں سے شازل اسے اپنے ڈیرے پر لے جاتا جہاں نکاح کا سارا انتظام ہو چکا تھا۔ نکاح کے بعد وہ اسے دوبارہ گھر چھوڑ جاتا۔ اماں، ابا کب کے اپنے کمرے میں سو چکے تھے۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ چادر کو اپنے ارد گرد لپیٹتے ہوئے وہ کمرے کی پچھلی کھڑکی سے باہر کے صحن میں اتر گئی اور وہاں لگے چھوٹے دروازے کو آہستگی سے کھول کر باہر گلی میں آگئی۔ بڑے گیٹ پر تالا تھا اور چابیاں عبدالرحیم کے پاس تھیں۔ اتنا بڑا قدم اٹھاتے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ یک دم بجلی چمکی اس کے منہ سے چیخ نکلتے، نکلتے رہ گئی۔ تیز، تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہ گلی عبور کر کے چوک میں آگئی۔ مطلوبہ جگہ پر شازل کو موجود نہ پا کر اس کے حواس جاتے رہے۔ ہوا میں بھی یک دم تیزی آگئی تھی۔ رات کالی سیاہ اور وقفے وقفے سے گرجتے بادل، سیاہ اندھیری رات جو اپنی تاریکی میں بہت سے گناہوں کو چھپا لیتی ہے۔ اب اسے ہولا رہی تھی مگر محبت کے حسین خوابوں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ نادانی میں وہ گھر کی دہلیز پار کر چکی تھی۔ وہ بار، بار شازل کو کال ملاتی رہی مگر کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔

''اب کیا کروں، کیا واپس چلی جاؤں پر وہ آیا کیوں نہیں...... فون بھی آف ہے۔'' طرح، طرح کے وسوسے اس کے ذہن میں سر ابھارنے لگے۔ ''مجھے خود جانا چاہیے اس کے پاس...... اللہ کرے وہ خیریت سے ہو۔'' اس کی حویلی چند منٹ کی مسافت پر تھی۔ اس نے اپنے قدموں کو اسی راستے پر ڈال دیا۔ بادلوں نے برسنا شروع کر دیا تھا بہ مشکل پندرہ منٹ کا فاصلہ طے کر کے وہ حویلی کے قریب پہنچ چکی تھی۔ باہر گیٹ پر ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ یک دم گیٹ کھلا اور سائرن بجاتی پولیس وین برآمد ہوئی۔ وہ جلدی سے دیوار کی اوٹ میں ہوگئی پھر اس کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا اس نے اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری کر دی۔ وین میں شازل اور اس کے دو دوست ہتھکڑیاں پہنے بیٹھے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ گاڑی کے اندر جلتی لائٹ میں وہ انہیں دیکھ چکی تھی۔ گاڑی سائرن بجاتی اس کے پاس سے گزر گئی۔ بادل یک دم زور سے گرجا وہ وہیں زمین بوس ہوگئی۔

''یا اللہ! مجھے معاف کر دے، یہ میں نے کیا کر دیا۔ اُف اللہ اب کیا کروں۔'' خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے بہ مشکل تمام حوصلوں کو اکٹھا کر کے وہ جلدی سے اٹھی اور واپسی کے راستے پر دوڑتی چلی گئی...... بارش تیز تر ہو چکی تھی مگر اس کی آنکھوں سے برسنے والی بارش اس سے بھی زیادہ تیز تھی۔

☆☆☆

''اللہ معاف کرے اور سب کی اولاد کو نیک بنائے، ہدایت دے۔'' خدیجہ بیگم اخبار پڑھتے شوہر کی طرف دیکھ کر بولیں جس نے ابھی ابھی یہ خبر سنائی تھی کہ ''شہباز ملک کا بیٹا شازل اور اس کے ساتھی نشے کی حالت میں گرفتار ہوئے ہیں۔ سنا ہے وہ غلط سرگرمیوں میں ملوث تھے اور لڑکیوں کو بہانے سے اپنے ڈیرے پر بلاتے تھے۔'' سجل کی آنکھوں میں گویا مرچیں بھر گئی تھیں۔ اس کا سر بری طرح گھوم رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر آرہی تھی کہ ماں کی آواز آئی۔ وہ برآمدے میں رکھے پیڑے پر ڈھے گئی۔

''اس دفعہ فصل اچھی ہوئی ہے۔ خدیجہ تو زینب کو بلا لے اپنی امانت کو آکر لے جائے بس ایک دو ماہ تک...... میری نیک اور خدمت گزار دھی اب اپنے گھر جا کر آرام کرے۔'' عبدالرحیم خوشی، خوشی اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا اور وہ اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔



قسط 6

رنگِ خلش

رفاقت جاوید

کتنی عجیب بات ہے کہ ہماری زندگی کے حسین لمحے
بھی خلش کی نذر ہو جاتے ہیں اور ہم جوں جوں اس احساس کو من کے
اندر گہرائیوں میں دفن کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو خلش کے بے حساب رنگوں
کی پردہ کشائی ہمیں مضطرب کرنے لگتی ہے اور مکافاتِ عمل کا کبھی نہ ختم ہونے والا
سلسلہ شروع ہو جاتا ہے . . . گناہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا . . . سزا تو لازم و ملزوم ہے۔ اس
کے باوجود امیدِ شجر سے گہرا ربط و تعلق رکھنا دوا بھی ہے اور عبادت
وریاضت بھی ہے، نشاطِ وصل بھی اور وجدان بھی ہے۔

ممکن ہے ایسا وقت ہو ترتیبِ وقت میں
دستک کو تیرا ہاتھ بڑھے میرا در نہ ہو



”عالیہ! تم ذہنی طور پر نارمل نہیں لگ رہی ہو۔ خدا کی بندی عقل سے کام لو۔ بیٹی کی زندگی کا معاملہ ہے، تم نے تو تمام مراحل آن کی آن میں ہی طے کر ڈالے۔ میری بات پلّے باندھ لو۔ نمرا جیسی شریف، پاکباز اور نیک خصلت بچی والدین کے لیے کبھی بھاری نہیں ہوتی۔ میں تمام عمر اسے اپنے سینے سے لگا کر رکھ سکتا ہوں لیکن رشتے میں جلد بازی نہیں کروں گا۔ چھلنی میں چھان لوں گا اسے پھر فیصلہ ہوگا۔“

”میں بھی تو کسی کی بیٹی ہی تھی۔ مجھے کیسے تنگ بنا کر کوئلوں پر الٹ پلٹ کیا ہے آپ نے۔ نہ حق مہر رکھا، نہ ڈھنگ کی بری تھی۔ اور ذرا اپنے ذہن پر زور ڈالیں کہ میرا رشتہ حاصل کرنے میں کیسی ہٹ دھرمی دکھائی تھی۔ دعائے خیر کہنے کی دیر تھی کہ بیاہ رچانے کی جلدی پڑ گئی تھی۔ اب اپنی بیٹی کے لیے دل میں کیسا درد اٹھا ہے۔“ وہ درشت لہجے میں بولی۔

”بیگم ہر وقت تمہیں کسی سانپ یا بچھو نے کاٹ کر بری طرح زہریلا کیا ہوتا ہے اور وہ بھی فقط میرے لیے...... آج تک کوئی شوہر، بیوی کو خوش بھی رکھ سکا ہے، ناممکن...... ہم نے بھی شادی کر کے کیا حاصل کیا۔ اپنی آزادی بھی گئی اور دنیا جہاں کی ذمے داریوں نے کمر بھی خوب دوہری کر ڈالی۔ نہ سانس اپنی اور نہ ہی جیب اپنی...... تم پھر بھی خوش نہ ہوئیں۔ اگر حرام کے رزق سے محل خرید دیتا، بیسیوں نوکر تمہارے آگے پیچھے بیگم صاحبہ، بیگم صاحبہ پکارتے نہ تھکتے تم پھر بھی راضی اور خوش نہ ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب عورت ذات کو بنانے کے لیے مٹی کی پتلی بنائی تو اس میں یقیناً ناخوشی، بے چینی اور حسد و عناد، ناشکری اور بے صبری کی آمیزش کر ڈالی تھی اب جو تحفہ تمہیں اس پاک ذات کی طرف سے سونپا گیا ہے میں اسے تمہارے وجود سے کیسے نکال سکتا ہوں؟ اس لیے میرا رزق حلال کمانے کا فیصلہ درست تھا۔ تمہارے لیے آسائشات کا سامان کرتا اور اپنا بستر انگاروں سے بھر لیتا، تم پھر بھی خوش نہ ہوتیں۔ سننے کو یہی ملتا کہ یوں کر لیتے تو بہتر ہوتا، ووں کر لیتے تو بہتر ہوتا۔“ وہ جل بھن کر بولے۔ ”اسی لیے تو ہمارے پیارے نبی ﷺ نے دوزخ میں عورت کی موجودگی بے حساب دیکھی تھی۔“ انہیں کسی قدر دکھ ہوا تھا یہ کہتے ہوئے۔

”بہت اچھے اور بولیں...... اور زور و شور سے بولیں۔ محلے کو بھی سنائیں کہ نااہلوں کے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے۔ بیٹی کا رشتہ کیا آیا آپ کو تو پنکھ لگ گئے ہیں۔ ہاتھ ہی نہیں آ رہے آپ۔ نہ کچھ سننا چاہتے ہیں نہ کچھ ماننے کا ارادہ ہے۔“ وہ بھی تنک کر بولی۔

”عالیہ! کیا ہم عقلمند لوگوں کی طرح تسلی و تشفی سے ایک دوسرے سے مشورہ نہیں کر سکتے؟ تم بالکل سچ کہہ رہی ہو، بیٹی کا رشتہ آنا دراصل تمہیں انہونا لگ رہا ہے۔ میرے لیے تو نارمل ہے۔ گڑ پر مکھیاں نہیں بھنبھنائیں گی تو کیا زہر پر آئیں گی۔ بس ذرا اپنے دل کو قابو میں رکھو۔ اس رشتے پر غور کیا جا سکتا ہے۔ مانا کہ رشتہ ہماری حیثیت سے بڑھ کر ہے پھر بھی احتیاط اور انویسٹی گیشن لازم ہے۔ اگر میں دولت کا پجاری ہوتا تو آج دولت میرے گھر کی لونڈی ہوتی اور میں بھی ٹرینکولائزر لے کر سوتا۔ یہ گہری اور میٹھی نیند مجھ سے خفا ہو گئی ہوتی۔ اس لیے میں ان کی دولت کو خاص الخاص اہمیت دے کر اپنے اصولوں کو قربان نہیں کروں گا۔“ وہ دھیمے پڑ گئے اور نرمی سے اسے سمجھانے لگے۔

”مجھے کب انکار ہے آپ کی باتوں کا۔ آپ کا فیصلہ درست ہی ہوگا۔ ذرا نمرا کی ہر بات مان کر چلنے سے پرہیز کیجیے گا۔“ وہ بھی دھیمے لہجے میں بولی۔ ”وہ کچھ نہیں جانتی۔“

”رشتے والدین کی رضامندی سے طے ہوتے ہیں لیکن میں اولاد کی پسندیدگی اور رضامندی کے حق میں بھی ہوں۔ نمرا بہت سمجھدار ہے، باشعور ہے، عادل کی اسٹوڈنٹ ہے، جتنا وہ اسے جانتی ہوگی ہم کوشش کے باوجود وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں اس کی بات کو اوّلیت دوں گا۔“ وہ سنجیدگی سے بولے۔

”اس سے میں نے منع کب کیا ہے جی...... میں بھی نمرا کی رضامندی کو اولیت دیتی ہوں لیکن بعض اوقات

بچیاں کم عمری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے گہرائی میں نہیں جاتیں۔ بہت سطحی سوچ ہوتی ہے ان کی...... اور دل بس ایک آئیڈیل کا متلاشی رہنے لگتا ہے۔ رحمان جی! بھلا کبھی آئیڈیل بھی ملتے ہیں ؟''

''تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو۔ بعض خامیاں درگزر کرنے کے قابل ہوتی ہیں اور کچھ ایسی بھیانک، خوفناک اور جان لیوا ہوتی ہیں کہ ان سے چشم پوشی کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اللہ کرے کہ اس بچے میں ایسی کوئی برائی نہیں ہو کہ ہضم نہ ہو سکے۔ مجھے بھی اپنی بیٹی کو کسی بڑے گھر کی بہو بنانے کی آرزو ہے..... مگر اس کے ساتھ شرط ہے کہ اخلاقیات بھی اعلیٰ درجے کی ہوں۔'' وہ اِک لمبی آہ بھر کر بولے۔

''فی زمانہ اعلیٰ اخلاقیات تو مفقود ہو چکی ہیں۔ جب آپ ڈھونڈنے نکلیں گے تو ہو سکتا ہے کہ کامیابی آپ کو خوش آمدید کہے۔ ڈھونڈنے سے خدا مل سکتا ہے جو یکتا ہے، واحد ہے تو ان بے حساب انسانوں میں کوئی تو آپ کو اپنا من پسند لڑکا بھی مل ہی جائے گا۔ ہاں تلاش جاری رکھنا پڑے گی۔'' وہ امید و بیم سے بھرے لہجے میں بولی۔

''ایک بار آپ عادل سے بھی مل لیجیے گا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے دل کو وہ بھا جائے۔''

''کیوں نہیں، میں انکاری نہیں..... مگر اقرار بھی نہیں..... اس لیے تم بھی اپنے ذہن کو کھلا رکھو۔ تصویر کے دونوں رخ مدِنظر رکھ کر سوچو۔'' وہ نصیحت آمیز لہجے میں بولے۔

''آپ کی نصیحت سر آنکھوں پر..... میں آپ کے فیصلے کے خلاف ہرگز اپنی رائے نہیں دوں گی۔ سعود کو بھیجنے کا فیصلہ میرا ہی تو تھا۔ آپ کا بازو مروڑ کر بات منوانے کا انجام دیکھ لیا ہے۔ اتنی ہی دور اندیش ہوتی تو اس کی خوشی کے بجائے اس کی ہمیشگی کی بہتری کو فوقیت دیتی۔ ماماتا کے پیار نے مجھے تو چغد ہی بنا ڈالا۔ اپنی نظروں میں ہی زیر ہو گئی ہوں۔'' وہ روہانسی ہو کر خود پر قابو پانے لگی۔

''قصور تمہارا نہیں..... تم ماماتا کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ اس نے ضد اور دھمکیوں سے تمہیں جیت لیا۔ سعود تمہاری کمزوریوں کو خوب جانتا تھا، فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو گیا..... مگر رہا خسارے میں ہی..... ایسے ہی ہوتا ہے۔ خود کو ہر وقت لعنت ملامت کرنا چھوڑو۔ اب ہمیں نمرا کے لیے مل جل کر فیصلہ کرنا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو پریشرائز نہیں کریں گے۔'' وہ اسے تسلی دینے لگے۔

''آپ مطمئن رہیں..... ایسے ہی ہوگا۔ بیٹی کی خوشحال زندگی کا سوال ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا مددگار ہو..... کاش آج سعود بھی آپ کے شانہ بشانہ کھڑا ہوتا تو.....'' وہ آنسو پیتی ہوئی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ رحمان کا دل بھی جیسے کٹ کر رہ گیا۔ جوان بیٹے کا خفگی میں غائب ہو جانے کا دکھ..... کرب و اذیت، ہر خوشی اور غمی میں ان کے ہوش و خرد پر چھا جایا کرتا تھا اور وہ پٹری سے اتر کر کسی اور طرف نکل جایا کرتے۔ اس پر ان کا اختیار تھا، نہ کوئی بس تھا، اصل گفتگو کا مقصد پسِ پردہ چلا جاتا۔

☆☆☆

''بیٹا تم کہاں جا رہی ہو؟'' نمرا تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آئی تو عالیہ نے ڈسٹنگ چھوڑ کر اسے حیرت سے دیکھا اور بے اختیار ہو کر پوچھا۔

''امی......! آپ کو بتایا تو تھا۔ شاید آپ نے سنا نہیں..... آج گروپ اسٹڈی کے لیے سب حمیرا کے گھر جمع ہو رہے ہیں۔ وہ مجھے لینے آ رہی ہے۔'' ایک دم سے ہارن کی آواز پر وہ ہلکا سا مسکرائی۔ ''وہ تو پہنچ بھی گئی۔ وقت کی پابندی تو کوئی اس سے سیکھے۔ امی جی میں چلتی ہوں۔ اگر ابو جی کا اس طرف چکر لگا تو مجھے پک کر لیں۔ نہیں تو حمیرا ہی ڈراپ کر دے گی۔''

''تم بھول گئی ہو..... آج شام کی چائے پر عادل اور اس کی ممی تشریف لا رہے ہیں۔ تمہارا گھر پر رہنا بہت ضروری

ہے۔اس کی ماں نے تو تمہیں دیکھا بھی نہیں...... بہت ہی عجیب لگے گا اگر تم چلی گئیں۔'' وہ اچنبھے سے بولی۔

''اوہ......آئی ایم سوری امی...... یہ بات بھولنے والی تو نہیں تھی۔خوب یاد ہے کہ سر عادل آپ سے ملنے آرہے ہیں۔امی اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا......'' اس نے افسردہ اور ندامت سے بھرپور نگاہ سے ماں کی طرف دیکھ کر کہا جو ڈسٹر کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے رنجیدہ و پژمردہ کھڑی تھی۔نمرا نے ماں کے گلے میں بانہیں حمائل کر کے پیار کیا۔

''امی زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......تمام قسمت کی باتیں ہیں، ویسے بھی میں نے اپنے خیالات اور سر عادل کی پرسنالٹی و خصلتوں کے بارے میں آپ کو تفصیلاً بتا دیا ہے۔اب فیصلہ آپ کا اور ابو جی کا ہے۔اس کی اماں سے بھی ملاقات ہو ہی جائے گی۔آج نہ سہی تو کل سہی......'' وہ بے بسی سے بولی۔

وہ ماں سے لپٹی مؤدبانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔اور عالیہ تو جیسے پتھر کا بت بن گئی ہو۔

''میری اتنی تابعدار بیٹی کے لیے تو آکاش سے فرشتہ اتر کر اس کی مانگ ستاروں سے سجا دیتا۔عادل تو زمینی مخلوق ہے۔پستیوں اور گہرائیوں کا باشندہ......'' عالیہ نے اسے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

''اگر اجازت ہو تو جاؤں؟'' وہ ماں کے سینے سے لگی ملائمت سے بولی۔

''ہاں میرے بیٹے تم جاؤ،حمیرا کب سے باہر کھڑی ہے۔اپنا دھیان رکھنا اور ٹائم سے واپس آجانا۔'' عالیہ نے آہستگی سے کہا تو نمرا کے دل کی گہرائیوں میں اضطراری کیفیت نمودار ہوئی اور بے چینی و بے سکونی ہلکورے لینے لگی۔اسی اثنا حمیرا گاڑی کی چابی گھماتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ماحول میں ایک عجیب سی اداسی کو محسوس کرتے ہوئے وہ دونوں کی طرف دیکھنے لگی تو عالیہ مسکرا دی۔اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنائیت سے بولی۔

''بیٹھو بیٹا...... تمہیں اپنے ہاتھ کے تیار کردہ گلاب جامن کھلاتی ہوں۔بہت خستہ بنے ہیں۔''

''آنٹی......! ہمیں جلدی نکلنا چاہیے۔'' وہ عالیہ کے پیچھے چلتی ہوئی کچن میں پہنچ گئی۔عالیہ نے ڈونگے سے گلاب جامن نکال کر پیالے میں ڈال کر حمیرا کی طرف بڑھایا تو اس نے آدھا گلاب جامن نمرا کے منہ میں ڈالا اور آدھا اپنے منہ میں ڈال کر ہوں، ہوں کرتی سر ہلاتی رہ گئی۔ادا پُرستائش تھی۔

''آنٹی آج کوئی خاص بات ہے؟ جو کچن مزے دار لوازمات سے بھرا ہوا ہے۔'' وہ نمرا کی طرف دیکھ کر بولی۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی جگہ ایک طویل آہ نے لے لی......''تم کچھ کھوئی، کھوئی سی لگ رہی ہو۔کیا بات ہے،کون آرہا ہے؟'' حمیرا نے اشتیاق و بے قراری سے پوچھا۔

''بات تو خاص ہے،تمہارے سر عادل چائے پر مدعو ہیں...... تمہیں نمرا نے نہیں بتایا؟ حیرت کی بات ہے کہ بہن جیسی دوست سے بے خبر کیوں ہے؟'' عالیہ حیرت و تجسس سے بولی اور دونوں کو دیکھنے لگی۔

''اچھا تو یہ بات ہے......اب سمجھی۔نمرا کی بچی......تم نے اتنی بڑی خبر ہضم کیسے کر لی؟'' وہ نمرا کی طرف دیکھ کر خفگی سے چیخی۔''حد کر دی تم نے تو کم از کم بتا ہی دیا ہوتا۔آج کی گروپ اسٹڈی کا ٹائم آگے پیچھے ایڈجسٹ کر لیتے۔''

''میرے لیے یہ خبر نہ تو بڑی تھی نہ ہی اہم...... تو کیا بتاتی؟'' وہ آہستگی سے بولی۔

''یہ خوب رہی...... دولھا میاں تشریف لا رہے ہیں اور دلہنیا کو ان کا آنا عام لگ رہا ہے۔ویسے تم جیسی بونگی اور احمق لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔تم بس گھر میں ٹک کر بیٹھو۔'' حمیرا نے ناگواری سے کہا تو وہ خاموشی سے اپنے لب دانتوں تلے دبانے لگی۔

عالیہ انہیں وہیں کھڑا چھوڑ کر باہر نکل گئی۔

''نمرا جس کام کی شروعات خوشی اور مثبت طریقے سے کی جائے، اس کا انجام بہت خوش آئند ہوتا ہے۔وہ

سادہ مزاج اور معصومیت سے بھرپور طبیعت کا مالک ہے۔ تم سے والہانہ محبت اس کے سادہ پن کی دلیل ہے۔ ایسے مرد شوہر کے رشتے میں بے مثال ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے چہرے کی بیچارگی، گریہ وزاری، ماتمی اور مریضانہ کیفیت پر شائستگی اور طمانیت کی مہر ثبت کر کے دیکھو...... دل اور دماغ کی تمام سوچیں مثبت ہو جائیں گی۔ اور سرعادل کی تمام خوبیاں ابھر کر تمہارے روبرو کھڑی ہو جائیں گی۔ کوشش کر کے تو دیکھو...... ہمارے ہر ایکشن کا بہت گہرا رشتہ قلب وذہن سے ہوتا ہے۔'' وہ اسے آج نرا کو نہیں سنجیدگی سے سمجھا رہی تھی۔

''یعنی چہرے پر منافقت کا رنگ چڑھا دوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ اس لیے تو تمہارے گھر جانا چاہ رہی ہوں۔ میرے نصیب میں جو بھی لکھا ہے، وہ تو اَن مٹ ہے۔ اس لیے فیصلہ ابو اور امی پر چھوڑ کر خود بری الذمہ رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ انکار کی صورت میں بھی سرعادل کے سامنے سرخرو ہو جاؤں گی اور یونیورسٹی سے نکالنے کا پروگرام کینسل ہو جائے گا بی......'' اس وقت نمرا کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔ بے بسی اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ حمیرا نے اسے مزید سمجھانا مناسب نہ سمجھا۔

''حمیرا میں یہ سوچ کر غصے اور افسوس میں کھول کر رہ گئی ہوں کہ سرعادل ہی غیر مناسب انسان نہیں...... میرے اپنے اس سے چار ہاتھ آگے نکلے...... میں جان ہلکان کروں یا شور شرابا کروں۔ کچھ فائدہ ہونے والا نہیں...... میں نے تو اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ جو بھی کرے گا اس میں میرے لیے ضرور بہتری ہوگی۔'' وہ بے دم سی ہو کر بولی۔

''یعنی بے بسی کو صبر کا نام دینا اور پھر اللہ تعالیٰ کے حضور دعا مانگنے کے بجائے راضی برضا ہو جانا۔ سخت بزدلی ہے۔ بے وقوف اگر تمہارا دل نہیں ٹھک رہا تو اللہ تعالیٰ سے فریاد کرو...... واویلا کرو تا کہ تمہاری اس پُرپیچ مسئلے سے جاں خلاصی ہو جائے۔ اس وقت میرے گھر جانے سے تمہارے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ بہادر اور دلیر بنو اور اس مسئلے کو فیس کرنے کی کوشش کرو۔ پھر غیبی مدد آنے کے امکان ہیں۔ ورنہ عمر بھر ٹوٹ کر بکھرنا اور بکھرنے کے بعد پھر جڑنا...... یہی عمل تمہارے لیے عذابِ الٰہی ہوگا۔'' حمیرا تشویش بھرے انداز میں بولی۔ اور اس کے فق اور بے رونق چہرے پر اچٹتی نگاہ ڈال کر باہر نکل گئی۔ وہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ پاؤں منوں بھاری ہو گئے تھے۔ حالات سے فرار مسئلے کا حل نہیں تھا۔ وہ سوچتی ہوئی کچن سے باہر نکلی تو حمیرا جا چکی تھی اور عالیہ ابھی تک ڈسٹنگ کرنے میں مصروف تھی۔ نمرا محویت سے ماں کو دیکھے چلی گئی۔

☆☆☆

مین ڈور کی بیل پر دونوں چونک کر کھڑے ہو گئے۔ عالیہ نے آج ماسی صغرا کو دو گھنٹے کے لیے گھر بلا لیا تھا۔ تا کہ وہ خود عادل کی ممی کو کمپنی دے سکے۔ دوسرے لاشعوری طور پر اپنا امپریشن بھی بہتر رکھنا ضروری سمجھا تھا۔

''صغرا...... دروازہ کھولو۔ مہمان آ گئے ہیں...... انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ بس ہم بھی آتے ہیں۔'' عالیہ نے کچن میں کام کرتی ہوئی ماسی صغرا کو نہایت نرمی سے کہا تو وہ مسکراتی ہوئی مین ڈور کی طرف چل دی۔ تھوڑے توقف کے بعد رحمان اور عالیہ ڈرائنگ روم کی طرف چل دیے۔

عادل اکیلا ہی سامنے صوفے پر بیٹھا چھوٹے سے ڈرائنگ روم کا انہماک سے جائزہ لے رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر فوراً احتراماً کھڑا ہو گیا۔ رسماً علیک سلیک کے بعد تینوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ صغرا ماسی فوراً کولڈ ڈرنک لے کر حاضر ہوئی تو عادل نے گلاس اٹھا کر رحمان کی جانب بڑھایا۔

''آپ لیں پلیز......!'' رحمان نے مروتاً شکریہ کہا اور گلاس اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا جبکہ دوسرا گلاس عادل کو بڑھایا۔

''آپ غالباً اپنی ممی کے ہمراہ آنے والے تھے؟'' رحمان نے ذرا سا مسکرا کر کہا تو وہ قدرے جھینپ سا گیا۔

گلاس پکڑے ہوئے ہاتھوں میں لرزش ہوئی۔
"وہ......وہ......دراصل شہر سے باہر گئی ہوئی ہیں۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔
"نیور مائنڈ......پھر کبھی ان سے ملاقات ہوجائے گی۔" رحمان نے بے پروائی سے کہا۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں چل نکلیں۔ عادل کی نگاہیں بار بار دروازے کی جانب اٹھ کر تھوڑی دیر کے لیے رک جاتیں۔ عالیہ نے اس کی نگاہوں کے اشتیاق کا بخوبی مطالعہ کرلیا تھا۔ اگر اس کی ماں اس کے ساتھ موجود ہوتی تو نمرا کو اس کا سامنا کرنے میں قطعاً اعتراض نہیں ہوتا مگر اس سچویشن میں یہ ناممکن تھا اور عادل کیا جانے کہ مڈل کلاس میں رشتے کیسے طے کیے جاتے ہیں۔ ان کی ویلیوز کیا ہیں؟ ان کے رکھ رکھاؤ اور دنیاداری کے اصول کیا ہیں؟ اس کی مثال تو ایسی تھی جیسے مرغی کے پروں تلے محفوظ چوزہ ابھی ابھی باہر نکل کر ہراساں و پریشاں اِدھر اُدھر بھاگ رہا ہو......بہترین چائے اور گھر کے بنے ہوئے مزیدار لوازمات کھا کر اسے اپنے گھر کے کھانے یاد آگئے۔ جن میں ایسی لذت نہ تھی۔ خانساماں جو بھی، جیسا بھی پکا دیتا تھا سب اسی پر اکتفا کرکے شکر ادا کیا کرتے تھے۔ پہلے تو ممی نے اسی پر اپنا کوالٹی... ٹائم لگایا تھا پھر وہ اپنی جاب اور اپنی سہیلیوں میں مصروف پائی گئیں۔ اس لیے کچن ان کی فرسٹ چوائس نہیں بن پایا۔ حسنات بھی کھانے پینے کے زیادہ شوقین نہیں تھے۔ گوشت ان کی کمزوری تھا جو بلاناغہ پکنا لازمی تھا۔ اس لیے کچن کا مالک ایک چھوڑ دو خانساماں تھے۔

"آنٹی بہت مزہ آیا چائے کا اور خاص کر چیز سموسے اور گلاب جامن کا۔ کیا پوچھنے کی گستاخی کرسکتا ہوں کہ یہ سب ملازمہ نے بنایا ہے کہ آپ نے؟" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"سب کچھ میں نے اپنے ہاتھوں سے آپ کے لیے بنایا ہے۔" عالیہ مسکرا کر بولی تو وہ تشکرانہ انداز سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"نمرا بھی یہ سب کچھ بنالیتی ہوگی؟"

"کہاں بیٹا؟ اسے پڑھائی سے فرصت ملے تو کچھ گھرداری، سلیقہ شعاری، کوکنگ وغیرہ سکھا پاؤں۔" عالیہ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ "ہمارے وقتوں میں پڑھائی کا پریشر تو تھا نہیں......ایف اے، بی اے کی ڈگری کو بہت سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے کھانا پکانا تو ہر لڑکی کو ہی سیکھنا پڑتا تھا۔ وقت کی کمی جو نہیں تھی۔ اب بچیاں صبح نو بجے گھر سے نکلتی ہیں۔ گھر واپس پہنچتے شام ہوچکی ہوتی ہے۔ تھکی ماندی آئے گی تو کچن کا کام کیسے سیکھ پائے گی؟ مائیں بھی ان سے کام کرانا نہیں چاہتیں۔ یہ بات بھی سچ ہے۔" وہ عالیہ کی بات پر بے وجہ ہی ہنسنے لگا اور جلد ہی جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ وہ دونوں بھی ساتھ ہی کھڑے ہوگئے اور چند الوداعی جملے کہہ کر وہ رخصت ہوگیا۔ اس کی کالے رنگ کی بیش قیمت کار کو دور تک جاتے ہوئے دیکھ کر ایک نادیدہ سی خوشی عالیہ کے من میں سرائیت کرگئی جبکہ رحمان کو اِک عجیب سی بے سکونی اور بے قراری نے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ عادل کی کچھ باتیں دل کو ٹھاکر کے لگی تھیں۔ بعض میں پرلے درجے کی ایبنارملٹی تھی۔ اس کی طبیعت میں اضطرار تھا۔ اس کے ہاتھوں کو چین نہیں تھا۔ وہ ہر بات شروع کرنے سے پہلے آنکھوں کو میچ لیتا تھا۔ مدعا سمجھنے میں اسے دیر لگتی تھی۔ اپنی ہر بات کو بار، بار دُہراتا تھا اور پھر اپنے جن خیالات پر اُڑ جاتا اس سے ایک انچ آگے پیچھے نہ کھسکتا...... ان حرکات وسکنات کا عالیہ نے نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔ اس لیے وہ خاصی مطمئن نظر آرہی تھی۔ رحمان کا ردِعمل اس کے برعکس تھا۔ وہ خاموش تھے۔ عالیہ میں بھی اپنی خوشی وطمانیت کا اظہار کرنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ بھی خاموشی سے رحمان کے فیصلے کی منتظر تھی۔

نمرا نے ڈنر پر دونوں کو خاموش دیکھ کر اندازہ لگایا کہ شاید وہ عادل کے پنجرے میں تاحیات قید ہونے سے بچ گئی ہے۔ یہی سچائی اور حقیقت وہ ماں کی زبان سے سننے کے لیے بے تاب تھی۔ ذہن میں ہر طرح کی منفی اور مثبت

سوچوں نے اپنے ڈیرے جما لیے تھے اور وہ رات بھر اپنے کمرے میں تھکے ہوئے ذہن اور ناتواں دل کی قربت میں آہستہ، آہستہ چلتی رہی۔ جب ٹانگیں بھی تھکن کا اعلان کرنے لگیں تو اس نے کمرے کی لائٹ آف کی اور بستر پر آڑی ترچھی لیٹ کر بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی نہ جانے کب گہری نیند میں چلی گئی۔

☆☆☆

''حسنات! میں نے یونیورسٹی سے اینول لیو لے لی ہے۔ اس وقت میرا آپ کے پاس موجود رہنا بہت ضروری ہے۔'' سائرہ نے اسٹڈی میں سیریل کا پیالہ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''آج کے بعد دوا بھی میں خود اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گی۔ اللہ نہ کرے ایسی جان لیوا بیماری تو ہے نہیں کہ آپ ٹھیک ہی نہیں ہو رہے۔''

''میں ٹھیک ٹھاک ہوں...... خدا کے لیے مجھے مریض مت سمجھو...... میں تمہارے اس رویّے سے کبھی صحت یاب نہیں ہوں گا۔ تم یونیورسٹی جاؤ...... اپنا کام کرو، پلیز لیو می الون......'' وہ مشتعل ہو کر بولے۔

''ایسی دل جلانے والی باتیں کرنا تو آپ کی عادت ہے۔ اب مجھے اس کی قطعاً پروا نہیں...... اس وقت مجھے آپ کی صحت کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ آپ عمر سے دس سال بڑے لگنے لگے ہیں۔ آپ کو توجہ...... کیئر اور آرام کی اشد ضرورت ہے۔ خدا کے لیے دوپہر کو ایک گھنٹے کا نیپ لینا شروع کر دیں۔ آپ کی طبیعت ہلکی پھلکی ہو جائے گی۔ پلیز اپنی نیند کو تھوڑا بڑھائیں اور کھانا وقت پر لیں اور کچھ مہینوں کے لیے گوشت کو خیرباد کہہ دیں۔ آپ کا معدہ گوشت قبول کرنے سے انکار کر رہا ہے مگر آپ کچھ سنتے ہی نہیں۔'' سائرہ ان کے قریب بیٹھ کر ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

''میں جب سے بیمار ہوا ہوں، تم کچھ زیادہ ہی باتیں کرنے لگی ہو...... ہمدردی جتا کر رعب جھاڑنے کی کوشش کرتی ہو اور پیار کی مار دے کر خوب ڈانٹ ڈپٹ کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہو...... پلیز سائرہ...... مجھے معاف کر دو اور یہاں سے جاؤ۔ مجھے گھٹن ہوتی ہے، تمہاری موجودگی میں۔'' وہ زہر آلود لہجے میں بولے۔ ''مجھے کسی کا ساتھ نہیں چاہیے۔ تم مجھے اپنا احسان مند کیوں کرنا چاہتی ہو۔''

''او مائی گاڈ......!'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ''جوانی کا پرائم ٹائم میں نے آپ کے بغیر گزار لیا۔ راتوں کی تاریکی اور تنہائی کو اپنا ہم سفر بنا لیا۔ دن کے اجالوں میں ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ سجا کر اپنی ازدواجی زندگی کے پیچ در پیچ حالات کی پردہ داری رکھی، نہ تو آپ سے گلہ کیا نہ ہی اپنے حقوق کے حصول کی خاطر واویلا کیا...... عادل سے ہی دل بہلانے لگی۔ جس کے لیے میں ماں بھی تھی اور باپ بھی...... پھر بھی آپ کے ظلم کی شرکت کر کے اس وقت بھی آپ کا ساتھ دیا۔ میں نے آپ کی خاطر اپنا لختِ جگر چھوڑ دیا۔ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ دکھی اور رنجیدہ ہو چکا ہے، میں تو آپ کی ان وانٹڈ بیوی نہیں تھی...... ہاں عادل آپ کا اَن وانٹڈ چائلڈ تھا پھر ہم دونوں سے دوری رکھنے کا مقصد کیا تھا، گلو خلاصی یا آپ فطرتاً ہی خود غرض انسان ہیں؟ میں تو آپ کو در گزر کر سکتی ہوں مگر عادل...... اس اکیلے کو ہر قدم پر دہراتا ہے، روتا ہے، بلکتا ہے۔ میں اسے سہارا دے کر... بہلا پھسلا لیا کرتی تھی۔ اب وہ اکیلا کیا کرتا ہوگا۔ اسے تنہا سانس لینا نہیں آتی۔ میں ہی اس کی کل کائنات تھی، اپنی زندگی کے الجھاؤ کو سلجھانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں نے اسے اس گھر سے جانے دیا...... اور آپ کس قدر کٹھور دل باپ ہیں کیا مجال کہ ایک بار اس کا نام آپ کی زبان پر آیا ہو۔'' وہ رو... دینے کو تھی۔ ''آج مجھے دھتکار رہے ہیں، میں اپنے بیٹے کے پاس جا سکتی ہوں۔ وہ میرا منتظر ہوگا...... میں جانتی ہوں لیکن میں نہیں جاؤں گی، میں ایک مشرقی عورت ہوں۔ مشرق کی بیٹی اور مشرق کی قدردان ہوں، آپ کے پاس رہنا میری مجبوری ہے، شوق نہیں...... میں نے یہ فیصلہ بغیر سوچے سمجھے نہیں کیا تھا۔ ہوشمندی سے کیا تھا۔'' وہ خود اعتمادی سے بولی۔

''تم نے کبھی یہ سوچا کہ تم اپنے بچے کے ساتھ مجھ پر مسلط ہو کر مجھے ہر پل اذیت پہنچاتی رہی ہو۔ تم میری زندگی سے نکل جاتیں تو یہ احساسِ اسیری تمہارے ساتھ ہی رخصت ہو گیا ہوتا۔ میری زندگی بھی بہترین ہوتی اور تم بھی کسی اور کے ساتھ ایڈجسٹ ہو گئی ہوتیں۔'' وہ عجیب نفرت آگیں لہجے میں بولے۔

''میرے پاس ان بے تکی باتوں کا جواب نہیں ہے پر یہ ضرور کہوں گی کہ شوہر بدلنے سے کبھی قسمتیں نہیں بدلتیں۔ وہ اپنی جگہ برا جمان رہتی ہیں۔ میرے رب نے میرے لیے آپ کو چُنا...... میں اسی قابل تھی، یہی سوچ کر راضی بہ رضا رہی کہ اسی پاک ذات نے میری تقدیر میں بھلا ضرور لکھا ہوگا۔ وہ مجھے آزما رہا ہے، شاید میں ابھی تک اس کی آزمائش پر پوری نہیں اتر پائی۔'' وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں میں لال ڈورے پھیل گئے تھے اور وہ عمر کے اس حصے میں بھی بے حد حسین لگ رہی تھی۔ حسنات نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور دیکھتا چلا گیا۔

☆☆☆

''عادل کا فون آیا ہے۔ وہ ہمیں اپنے گھر کھانے پر بلانا چاہ رہا ہے۔'' عالیہ بیڈشیٹ بدلتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ جواب نہ پا کر اس نے کرسی پر بیٹھے ہوئے شوہر کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات، تیوروں میں نمایاں طور پر نظر آرہے تھے۔ ایک دم سے زبان کو بریک لگی اور ہاتھ بھی کام سے رک گئے۔

''رشتے طے کرنے کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ تم جانتی ہو میں اصولوں پر کمپرومائز کرنے والا انسان نہیں ہوں۔ اسے بولو کہ اپنے ماں، باپ کو لے کر آئے۔ ان کی موجودگی کے بغیر بات آگے نہیں بڑھے گی۔ کیونکہ عادل حد درجے کا شریف النفس سہی لیکن پرورش میں کچھ گڑبڑ ہے، ہی از ناٹ آنارمل پرسن......'' وہ سنجیدگی اور سختی سے بولے۔

''اب سمجھی کہ آپ دو دن سے خاموش کیوں ہیں۔ میں نے آپ کی خاموشی کو رضامندی جانا...... کتنی نافہم عورت ہوں، اتنے سال آپ کے ساتھ گزارنے کے باوجود آپ کو سمجھ نہ سکی۔'' وہ افسوس ناک لہجے میں بولی۔

''ابھی تو پسندیدگی اور رضامندی کی اسٹیج سے ہم بہت دور ہیں، ذرا ماضی میں جھانکو کہ جب میں تمہارے گھر گیا تھا تو اس کے بعد تمہارے ابا نے اتنے چکر لگوائے تھے کہ تلوے گھس گئے تھے۔ پھر ہمیں چکی میں پیسنے کے بعد چھلنی میں ڈال کر خوب چھان کر بھی انکار کر گئے تھے۔ اسی لیے تو دعائے خیر کے ساتھ ہی رخصتی کی ڈیٹ فکس کرنا پڑی کہ کہیں آپ کے بزرگوار پینترا ہی نہ بدل لیں۔'' وہ تنک کر بولے۔

''اتنی مین میخ نکالنے کے باوجود بھی آپ کیا نکلے؟ ذرا ملاحظہ فرمائیں۔ رحمان جی......! انسان خود کو بہت دانا اور کامل سمجھتا ہے، اوپر والا خوب ہنستا ہوگا ہم پر۔ اپنے معاملات اس کے حوالے کر کے پُرسکون ہو جانا عظیم انعام ہے۔ آپ میرے ابا کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش مت کریں۔ ان کی چاروں بیٹیوں کی زندگی کا تجزیہ کریں۔ ایک کا شوہر دولت مند ہے لیکن بیوی کی اس کی نظروں میں عزت نام کی کوئی چیز نہیں...... ہر طرف منہ ماری کرتا ہے میری بہن کے سامنے۔ وہ ایک لفظ بول نہیں سکتی، دوسری بہن کا میاں گورنمنٹ سرونٹ تھا۔ بیوی پر جان چھڑکتا تھا۔ چار بچوں کا تحفہ دے کر خود ہارٹ اٹیک کا شکار ہو گیا۔ تیسری کا شوہر دیکھنے میں کیا بھلا مانس اور اپنے کام سے مطلب رکھنے والا اور گھر بار بنانے والا معلوم ہوتا تھا۔ پرلے درجے کا ناکارہ نکلا۔ میری بہن کے تمام زیورات جوئے میں ہار آیا۔ گھر گروی رکھ کر قرض لیا بزنس کے لیے...... وہ پیسہ بھی نشے کی نذر ہو گیا۔ اور میری زندگی آپ کے سامنے ہے، کون سی ڈھکی چھپی ہے۔'' وہ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

''تم درست کہہ رہی ہو مگر اللہ تعالیٰ کے فرمان کو نظر انداز کرنا بھی تو گناہ ہے، اللہ تعالیٰ یہ ہرگز نہیں فرماتا کہ سامنے کنواں نظر آرہا ہو اور اس میں کود جاؤ۔ اس نے ہمیں شعور دے کر ہم پر غور و خوض کرنے کی ذمّے داری ڈالی

ہے۔ ورنہ ہمیں جوابدہ ہونا پڑے گا۔ آگے تقدیر کے کیا فیصلے ہیں، یہ بھید تو وہی جانتا ہے۔ انسانی عقل اور سمجھ کے مطابق ہماری کوشش جاری وساری رہنے کا عمل فرائض کے زمرے میں آتا ہے۔ اسی سے ہمارا ذہنی سکون اور دلی اطمینان وابستہ ہے۔'' وہ قدرے نرمی سے بولے۔

''رحمان جی...... ! میرا دل بھی چاہتا ہے کہ میری بچی کی زندگی آسان اور سہل ہو، میری جیسی تنگ ودو سے اللہ تعالیٰ اسے محفوظ رکھے...... کاش میں اپنی زندگی میں ہی اولاد کی طرف سے خوشخبریاں سنوں اور ان کا ہر لمحہ کامرانیوں سے منسلک ہو۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''انشاء اللہ ایسے ہی ہوگا۔ تم ذرا اپنی فکرات کو کم اور دعاؤں کی کثرت کرو۔ سب ٹھیک ٹھاک ہی ہوگا۔'' وہ زبردستی مسکرا کر بولے...... کیونکہ باتیں تو وہ درست کررہی تھی۔

''میں آج ہی عادل کو کہے دیتی ہوں کہ پہلے اپنے پیرنٹس کو تو ہمارے غریب خانے پر لائے۔ بھلا ہم لڑکے کے کہنے پر اس کے گھر منہ اٹھائے کیوں چل پڑیں؟ آپ نے اصول کی بات کی ہے۔ اس لیے انکار اور اعتراض نہیں کروں گی۔'' شوہر کو مسکراتا دیکھ کر وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''اور نمرا میری بیٹی ہے، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ وہ مجھے پیاری نہیں کہ جھٹ پٹ فیصلہ کرلوں گی؟''

''بس اتنی سی بات تو سمجھانے کی کوشش کررہا تھا۔'' وہ پھر مسکرائے تھے۔ اور عالیہ نے اگلے دن عادل کا فون آنے پر اسے باور کرادیا تھا کہ تمہارے پیرنٹس گھر آنے کا عندیہ خود ہمیں دیں گے تو پھر ہم آگے بڑھیں گے اور وہ جی اچھا کہہ کر خاموش ہوگیا تھا۔



سائرہ نے موبائل کی رِنگ پر فوراً فون اٹھالیا۔ اس کی چھٹی حس نے عادل کا ہی نام پکارا تھا۔ اور فون بھی عادل کا ہی تھا۔ شاید ماں اور... اولاد میں ٹیلی پیتھی کی حس ایک عام رشتے سے بڑھ کر ہوتی ہے کہ کوسوں دور بیٹھے ہوئے بھی نزدیکی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ وہ خوشی سے عادل کی آواز سن کر چہکنے لگی۔

''بہت دنوں بعد ماں کا خیال کیسے آ گیا؟ بہت انتظار کرایا تم نے بیٹا۔'' وہ بے اختیاری سے بولی۔

''ممی میں بہت مصروف رہا...... اس لیے فون نہ کرسکا۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''یعنی مطلب پر یاد آئی ہوں...... بولو کیا کام ہے، جس میں میری ضرورت محسوس ہوئی۔ تم تو اپنا ہر کام بذاتِ خود کرنا چاہتے ہو، آج چکر کیا ہے؟'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ممی! وہی رشتے کا مسئلہ ہے، میں نے آپ کو بتایا تو تھا اور لڑکی بھی آپ نے میرے آفس میں دیکھ ہی لی تھی۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''ہاں بیٹا! تمہارا فیصلہ ہے تو بہترین ہی ہوگا۔'' وہ اسے تھپکی دینے کے انداز میں بولی۔

''آپ کو میرے ساتھ ان کے گھر جانا ہوگا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''عجیب لوگ ہیں آپ کے بغیر نہ تو اپنے گھر آنے دیتے ہیں، نہ میرے گھر آنا چاہتے ہیں۔''

''ضرور، ضرور کیوں نہیں، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔'' وہ شگفتہ لہجے میں بولی۔ ''لڑکی والے بزرگوں کی گارنٹی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ یہ تو سب نارمل ہے۔''

''ممی یو آر سو گریٹ...... میری ممی جیسی ماں اس دنیا میں کوئی نہیں اور نہ ہی آئندہ ہوگی۔'' وہ خوشامدی لہجے میں بولا۔ ''ممی میں آپ کو بھولا نہیں...... آپ کو ایسا خیال نیند میں بھی نہیں آنا چاہیے۔''

''مسکا مت لگاؤ، پکڑے جاتے ہو صاف، مطلبی نہیں کے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''اتنے دن تو یہ پیاری اور اکلوتی ماں یاد نہ آئی۔ ویسے میں نے نوٹ کیا ہے جب سے یہاں سے گئے ہو چالاکیاں اور ہوشیاریاں سیکھ گئے ہو، رشتہ بھی ڈھونڈ لیا اور بات بھی ہوگئی گڈ شو۔'' تو عادل نے بچوں کی طرح قہقہہ لگایا۔

''بولو کب بیٹے کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں؟'' وہ مسرت آگیں لہجے میں بولی۔ ''مجھے اسی مبارک دن کا کس شدت سے انتظار تھا۔ دیکھو خدا کتنا مہربان ہے، ہم پر۔''

''کل سے ویک اینڈ شروع ہے، آپ کی بھی یونیورسٹی سے چھٹی ہے۔'' وہ بھی خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ پروگرام بتائیں۔ بندہ تیار ملے گا۔''

''میں تو آج کل گھر پر ہی ہوں، تمہارے ڈیڈی کے پاس...... بدپرہیزی اور بے پروائی کی وجہ سے ان کی طبیعت روز بروز بگڑتی جا رہی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا ویل ایجوکیٹڈ بندہ ذہنی طور پر اتنا جاہل، ان پڑھ اور احمق نہیں دیکھا۔ نہ اپنی پروا نہ ہی دوسروں سے کسی قسم کی غرض اور مطلب ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنی صحت کا بیڑا غرق کرلیا ہے۔ مجھ سے ان کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ تمہارا دل تو ایسا پتھر کبھی نہیں تھا۔ جو یوں خونی رشتے سے کنارہ کشی اختیار کر کے خوش و خرم بیٹھے ہو۔'' لہجے میں ہلکے سے شکوے کی رمق نہ چاہتے ہوئے بھی آ گئی تھی۔ حالانکہ پچھتاوا فوراً ہی ہونے لگا تھا۔

''کن خونی رشتوں کی بات کرتی ہیں آپ؟ اس ضمن میں پہل کس کی طرف سے ہونی چاہیے تھی۔ کیا میں ان کا خون نہیں تھا؟ جو آپ کی غلطی کی سزا مجھے سنا ڈالی۔ میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' وہ زہر آگیں لہجے میں بولا۔

''تم بھی حق بجانب ہو بیٹا...... لیکن عفو و درگزر کا مقام بہت اونچا ہے۔ اس کا فائدہ معاف کرنے والے کو ہوتا

ہے کیونکہ اس عظیم ردِعمل سے اس کی روح پرتسکین اور دل و دماغ میں سوائے طمانیت کے کسی کرب و اذیت، غصے اور نفرت کا گزر ہی نہیں ہوتا۔ اور یہی اصل خوشی اور کامیابی ہے انسان کی...... میں حسنات کو پہلے دن سے معاف نہ کرتی تو یقین جانو آج میں ڈپریشن کا شکار ہو چکی ہوتی اور میری زندگی اور تمہارا فیوچر کس قدر عبرت ناک ہوتا...... یہ انہیں معاف کرنے کے ہی رزلٹ ہیں کہ ہم زندہ ہیں۔'' وہ سنجیدہ سی ہوگئی۔

''ممی......! اب میں آپ کی کسی نصیحت کو اہمیت دینے والا نہیں۔ آئی ایم ایکسٹریملی سوری...... کسی باظرف انسان کے لیے اپنی انا، غیرت اور خودداری کا قتال کرنا دل کو برا نہیں لگتا ہے۔ میں نے زندگی کے بے شمار سال آپ کی ہر بات پر سرِ تسلیم خم کرنے کا ایسا کون سا ایوارڈ حاصل کرلیا ہے جو اب انکار کرنے پر مجھ سے چھن جائے گا۔ ممی آج کے بعد ہماری گفتگو میں ڈیڈی کا ذکر نہیں آنا چاہیے۔ اچھا بھلا موڈ خراب کردیا آپ نے۔'' وہ ناگواری سے بولا۔

''ٹھیک ہے بھئی...... بیٹا جوان ہو کر زور آور نہیں ہوگا...... اپنی طاقتوری، ہٹ دھرمی اور ضدی پن نہیں دکھائے گا تو کیا بوڑھے والدین دکھانے کی جرأت کریں گے؟'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''سب وقت، وقت کی بات ہے، آج تم بہت اسٹرانگ ہوناں......''

''ممی......! مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے۔ کہ کل آپ اپنے شوہرِ نامدار کو چند گھنٹوں کے لیے اکیلا چھوڑ سکتی ہیں کہ نہیں؟'' وہ بھی طنزیہ انداز میں بولا۔

''چھوڑ سکتی ہوں بھئی۔'' اس نے زوردار لہجے میں کہا۔ ''کتنی دفعہ کہوں...... بولو! خدا کے لیے ایک ہی بات پر رگڑا مت ڈالا کرو، سن لیا کرو کہ دوسرا کیا کہہ رہا ہے۔''

''تھینک یو...... میں کل چار بجے آپ کو لینے پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے بھی لفظوں کو چبا کر کہا۔ ''آپ کی نصیحتوں کی عادت نہ گئی۔ ممی پلیز...... نمرا کے سامنے نصیحتوں کی فہرست مت کھولیے گا۔ دودھ پیتے بچے کو کوئی بھی بیٹی دینے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ آپ تو جانتی ہیں ناں......'' فون بند ہوگیا تو وہ مسکرادی۔

''مائی گاڈ...... مقابلہ کرنا اور فیصلہ کرنا تو سیکھا...... باتوں میں خود اعتمادی ہے، لہجے میں ڈر اور خوف بھی نہیں...... اللہ تیرا لاکھ، لاکھ شکر ہے۔'' وہ خود کلامی کرتی ہوئی حسنات کی اسٹڈی کی طرف چل دی۔ جو کاؤچ پر لیٹے مطالعہ کرنے میں مصروف تھے۔ جبکہ تھوڑی دیر پہلے بخار 101 ڈگری تھا۔

☆☆☆

ہارن کی آواز پر سائرہ نے ملازم کو مٹھائی کا سجا ہوا ٹوکرا اٹھانے کو کہا اور خود گلاب کے پھولوں کا بُکے اٹھا کر سرعت سے مین ڈور کھولنے لگی۔ گیٹ سے باہر ہی عادل کی گاڑی کھڑی تھی۔ گارڈ نے اسے دیکھ کر گیٹ کھولا اور سائرہ باہر نکل گئی۔ عادل گاڑی سے باہر نکل کر ماں سے بغلگیر ہوا۔ اس نے دعا دینے کے بعد ڈکی کھولنے کا کہا اور بُکے پچھلی سیٹ پر احتیاط سے رکھ کر عادل کے بائیں طرف بیٹھ گئی۔

ملازم نے ڈکی میں مٹھائی کا ٹوکرا رکھتے ہوئے عادل کو مبارک باد دی تو وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''چاچا دعا کرنا۔''

''ممی مٹھائی اور پھولوں کی کیا ضرورت تھی بھلا؟'' وہ ماں کی طرف حیرت سے دیکھ کر بولا تو وہ اس کی معصومیت اور بھولے پن پر ہنس دی۔

''کسی کے گھر فرسٹ ٹائم رشتے کے لیے جا رہے ہو، خالی ہاتھ جاؤ گے کیا؟''

''ممی میں خالی ہاتھ تو چکر لگا چکا ہوں۔ اب سمجھ آیا کہ مجھے ان کی جانب سے لفٹ کیوں نہیں کرائی گئی؟'' وہ گاڑی ریورس کرتے ہوئے بولا۔

''وہ لوگ کہتے ہوں گے کیسا ہونق اور بونگا لڑکا ہے، جو دنیا داری کے کسی اصول سے آشنا نہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ لڑکے اسی طرح کے ہوتے ہیں، بے پروا اور لا ابالی سے۔'' وہ اس کی شرمندگی کو مٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ کیونکہ اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں خاصی لرزش تھی اور جبڑے سختی مائل تھے۔

''اس لیے تو عموماً لڑکے کے ساتھ والدین کا جانا ضروری سمجھا جاتا ہے، خیر پریشانی یا فکرمندی کی کوئی بات نہیں..... آج کل ماڈرن دور ہے، سب کچھ چلتا ہے۔'' وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی لیکن اس کی ٹینشن میں کمی واقع نہ ہوئی۔ مسلسل پریشان رہا۔

نمرا کے گھر پہنچ کر سائرہ نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ بالشت بھر لان کو جس خوب صورتی سے پودوں سے مزین کیا گیا تھا، اس میں خاتونِ خانہ کی دلچسپی جھلک رہی تھی۔ پورچ میں منی پلانٹس کی بیلیں نہایت قرینے سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اسے ایسے گمان ہوا جیسے انگلینڈ کے چھوٹے سے ڈبل اسٹوری گھر کے سامنے کھڑی ہو۔

ایک بڑے بینک میں وائس پریزیڈنٹ ہونے کے ناتے عنایت کی ہوئی نئے ماڈل کی سلور کلر میں ٹیوٹا کرولا پورچ میں کھڑی تھی۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی سلیقہ مندی نے انہیں خوش آمدید کہا۔ گو کہ سامان ان کی حیثیت کے مطابق تھا۔ لیکن انتخاب بہترین تھا۔ یہ دیکھ کر وہ امپریس ہوئے بغیر نہیں رہی۔ عالیہ اور رحمان نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ سائرہ نے پاس کھڑی صغرا ماسی کو گاڑی سے مٹھائی نکالنے کا آہستگی سے کہا اور ٹوکرے عالیہ کی طرف بڑھا دیا۔

''آپ نے تکلف کیوں کیا.....؟'' عالیہ نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

''بہن کے گھر خالی ہاتھ کون آتا ہے؟'' وہ خوشگوار لہجے میں بولی۔ ''شیرینی سے اس نیک کام کو شروع کریں گے تو انجام بھی مٹھاس سے لبریز ہوگا۔''

''سب اوپر والے کے فیصلے ہیں، ہم تو ناتواں اور بے دم لوگ ہیں۔'' کاریڈور سے ملحقہ ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے عالیہ نے انکساری سے کہا۔

''اللہ تعالیٰ بہتری کرے گا۔'' سائرہ نے بھی دعائیہ انداز میں کہا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ہمیں بھائی صاحب کا بھی انتظار تھا۔'' رحمان نے کھڑے، کھڑے کہا۔

''وہ بھی آپ سے ملنا چاہ رہے تھے لیکن پچھلے دو مہینوں سے ان کی طبیعت خاصی خراب ہے، جونہی صحت یاب ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔'' سائرہ نے سوچتے ہوئے معقول اور سچا بہانہ فٹ کر دیا۔ عادل نے ماں کی طرف پُرستائش نگاہوں سے دیکھا اور دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی رحمان بھی بیٹھ گئے۔ دو گھنٹوں کی طویل گفتگو کے بعد بھی انہیں عادل کے گھریلو حالات کا علم نہ ہو سکا۔ لیکن عادل کی ابنارملٹی ان سے نہ چُھپ سکی۔ جس کا رحمان کو پہلی ملاقات میں ہی شک ہوا تھا۔ آج یقین ہو چلا..... مگر پھر بھی سائرہ کی باتوں کا ایسا فسوں تھا کہ وہ متذبذب ہو کر کبھی سائرہ کو بغور دیکھتے تو کبھی عالیہ کا جائزہ لینے لگتے۔ سائرہ کی خواہش کو مدِنظر رکھتے ہوئے عالیہ اسے لاؤنج میں لے آئی۔ سائرہ فوراً نمرا کو پہچان گئی۔ آگے بڑھ کر اس نے اسے محبت سے مغلوب ہو کر گلے لگا لیا۔ حسن و جمال میں وہ سائرہ سے کم نہ تھی بلکہ دو ہاتھ آگے ہی تھی۔ بیٹے کی پسند کی دل ہی دل میں داد دیتے ہوئے اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ نمرا نے بھی سائرہ کی باتوں میں خاصی میچورٹی محسوس کرتے ہوئے سوچا۔

''ان خاتون کی گود میں پل کر جوان ہونے والا بچہ عادل جیسا نہیں ہو سکتا۔ اس کی پرسنالٹی میں اس ماں کی تربیت کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ شادی تو عادل سے ہوگی نہ کہ اس کی ماں سے.....'' وہ متذبذب نظروں سے سائرہ کو دیکھنے لگی۔ ''ماں تو دل کی گہرائیوں سے قابلِ قبول ہے مگر بیٹا سطحی اور عارضی طور پر ایک لمحے کے لیے

بھی نا قابلِ برداشت ہے۔ نہ جانے ابو جی اسے کتنا سمجھ پائے ہیں۔ کیا فیصلہ کرنے والے ہیں، ای تو بن سوچے سمجھے ہی آسمان کی وسعتوں میں اپنے سپنوں کے گھوڑے دوڑا رہی ہوں گی۔'' وہ سوچتی رہی۔

☆☆☆

لینڈ لائن پر مسلسل بیل بج رہی تھی۔ رحمان لنچ کے بعد قیلولہ فرما رہے تھے۔ عالیہ لنچ کے بعد چھوٹی بہن کے گھر اس کے بیٹے کی اے لیول میں کامیابی پر مبارک باد دینے گئی ہوئی تھی اور ساتھ ہی سعود کی مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا بھی مقصود تھا۔ وہ کسی سے مقابلے میں کم کیوں رہتی! پھر بیٹی کے رشتے کی خبر بھی گوش گزار نا اور مشورہ لینا بھی ضروری تھا۔ وہ اسی خوشی اور غمی کے عالم میں باتوں میں مصروف تھی۔ بیل پر اس نے رحمان کا نمبر دیکھ کر فون آن کیا۔ رحمان کی آواز غنودگی اور فکرمندی کی آمیزش میں عجیب سی لگ رہی تھی۔ وہ ایک دم پریشان کن لہجے میں بولی۔

''رحمان جی سب خیریت تو ہے ناں...... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے، نمرا کہاں ہے؟ سعود کی طرف سے کوئی اطلاع ہے کیا؟ جلدی سے بولیں، ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔''

''بھئی کیا تمہیں فون سوائے پریشانی کے نہیں کرسکتا۔ حد کرتی ہو، میں پوچھنا چاہ رہا تھا کہ واپس کب آرہی ہو؟ نمرا اپنے کمرے میں بند ایگزام کی تیاری میں مصروف ہے، گھر میں اتنی خاموشی ہے کہ کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے، بس تم جلدی سے گھر آجاؤ، چائے کی بھی حاجت ہورہی ہے۔'' وہ اپنی فکرمندی پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

''آپ نے تو مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ آپ کی آواز درست نہیں تھی۔ رحمان جی......! اگر آپ مجھے اجازت دیں تو ڈنر کے بعد آجاؤں۔ آج بڑے دنوں بعد چاروں بہنوں کا ایک گھر میں جمع ہونا خوب مزہ دے رہا ہے۔ کچھ دکھ سکھ ایک دوسرے سے شیئر کرنا اچھا لگ رہا ہے۔ لاؤنج میں کونے والی ٹیبل پر الیکٹرک کیٹل مع پانی کے رکھی ہے، پتی چینی دودھ کے جارز بھی ٹرے میں رکھے ہیں، آج چائے دم کرنے میں آپ کو خوب لگے گا کہ یہ کام کتنا آسان کردیا ہے میں نے۔'' وہ شگفتہ لہجے میں بولی۔

''او کے، ڈنر کے بعد آجاؤ، اس میں اجازت نامے کی ضرورت نہیں یار...... خوب انجوائے کرو۔ ہم باپ بیٹی بھی ڈنر کافٹ سا پروگرام بناتے ہیں۔'' وہ بناوٹی خوش دلی سے بولے۔

''تو پھر یوں کیجیے گا کہ مجھے یہاں سے پک کر لیجیے گا۔ اپنی فیملی کے ساتھ تو مزہ ہی اور ہے۔'' اس نے فوراً اپنا پروگرام بدل ڈالا تو رحمان نے آہ کو دباتے ہوئے ایک مردہ سا قہقہہ لگایا اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔

''تم کیا جانو کہ سعود کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ بُرے کاموں کے نتائج بھی عبرت اور دردناک ہی ہوتے ہیں۔ تمہیں یہ جان لیوا خبر سنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہنوں میں خوش بیٹھی ہو، یہ سن کر مجھے سہارا یا تسلی دینے سے پہلے ہی تم مرجاؤ گی۔ میں تمہیں مزید دکھ نہیں دینا چاہتا۔ اس تمام سچویشن کو خود ہی ہینڈل کرنے کی کوشش کروں گا۔ میرا خیال ہے یہی بہتر ہے۔ مجھے ابھی صرف سعود کا غم مارے جارہا ہے، ایسا نہ ہو کہ تمہیں اور نمرا کو سنبھالنا میرے بس میں نہ رہے۔'' وہ دیر تک بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے سر دونوں ہاتھوں میں تھامے سوچتے رہے۔ چاروں طرف سوچ کے گھوڑے دوڑانے کے بعد اپنے کولیگ مختار راجا کا خیال آگیا۔ جو چند سال قبل گولڈن شیک ہینڈ لینے کے بعد اپنی فیملی کو لے کر لندن چلے گئے تھے۔ ان کے ساتھ وقتاً فوقتاً رابطہ رہتا تھا۔ اس وقت وہ انہیں کسی فرشتے سے کم نہیں لگے۔

''مختار راجا کو اپنے بیٹے کے حالات بتاتے ہوئے سبکی تو محسوس ہوگی۔ مگر کیا، کیا جائے؟ مجبوری ہے ورنہ وہ نامراد جیل میں ہی گل سڑ جائے گا۔ اور اس کی لاش سے بھی محروم ہی رہیں گے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بیڈ سے اٹھے اور اپنی ٹیلیفون ڈائری لے کر لاؤنج میں آگئے۔ مختار راجا کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے وہ کئی بار رکے...... اور آخر طوعاً و

کرہا۔یہ زہر کا پیالہ منہ کو لگانے میں ہی مصلحت سمجھی۔
دوسری طرف سے فون فوراً اٹھالیا گیا۔ رحمان نے اٹک، اٹک کر تمام حالات اسے سنا دیے اور سردی کے باوجود وہ عرقِ ندامت سے سرتاپا نہا گئے تھے۔
''رحمان ! فکر کیوں کرتے ہو یار...... کسی کو کیونکر بتاؤں گا۔ میں بھی اولاد والا ہوں، توبہ استغفار پڑھنی چاہیے۔ ایسے حالات کا شکار ہو جانا یہاں عام سی بات ہے۔ بس دل مضبوط رکھو، انشاء اللہ بہت جلد تمہارا بیٹا تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔'' وہ تسلی دیتے ہوئے بولے۔
''تھینک یو مختار! مجھے ایسا گمان ہونے لگا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے نیک کام لینا تھا جو تم اس وقت وہاں موجود ہو، ورنہ ہمارے لیے بہت مشکل ہو جاتی۔'' وہ تشکرانہ لہجے میں بولے اور آنکھوں میں نمی آگئی۔ خدا حافظ کہنے کے بعد وہ نمرا کے کمرے میں آگئے۔ وہ ابھی تک کتابوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ انہیں دیکھ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
''ابو جی...... جب بھی آپ کا امی سے جھگڑا ہوتا ہے تو میرے کمرے کو عزت افزائی بخشی جاتی ہے، آج لڑائی کی وجہ کیا تھی؟'' وہ چھیڑتے ہوئے بولی۔
''بیٹا تمہیں کیا بتاؤں؟ جب دل پریشان ہوتا ہے تو سہارے کا متلاشی ہو کر مجھے کمزور، مجبور اور بے بس ہونے کا احساس دلاتا ہے پھر مجھے تم سے بہتر ہمدرد اور مخلص کوئی اور نظر نہیں آتا تو سیدھا تمہارے پاس چلا آتا ہوں۔'' وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر پژمردہ لہجے میں بولے۔
''ابو جی! آپ بہت پریشان نظر آ رہے ہیں، کیا آج امی سے پٹائی ہوگئی ہے اگر زخم یا چوٹ آگئی ہے تو مرہم پٹی میں کیے دیتی ہوں۔'' وہ قہقہہ لگا کر مذاق میں بولی۔
''وہ بیچاری میری پٹائی کیوں کرے گی؟ بذاتِ خود ہی ہر وقت دکھوں اور غموں میں گھری رہتی ہے، افسوس کہ میں اسے آرام دہ اور سجل زندگی نہ دے سکا۔ جبکہ میرے ہی کولیگز کی بیگمات کی شان و شوکت دیکھو...... عالیہ سچ ہی تو تپی رہتی ہے مجھ پر......'' لہجہ بجھا بجھا ہوا تھا۔ نمرا ان کے قریب قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔
''امی پر آج بے تحاشا رحم و ترس بھی آ رہا ہے، پیار بھی انڈے جا رہا ہے، ابو جی بات کیا ہے؟ ہوں لگتا ہے ممی گھر پر موجود نہیں...... میرا اندازہ درست ہے ناں......؟ جو اُن کی غیر موجودگی میں ان پر پیار آنے لگا ہے۔'' وہ محبت آمیز لہجے میں بولی۔
''بالکل درست ہے۔'' وہ اپنی پریشانی اسے بتانا نہیں چاہتے تھے فوراً ہنسنے لگے۔ ''بیٹا جب انسان اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو پھر اس کی قدر و قیمت کا، حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے، شکر ہے مجھے تمہاری ماں کی ضرورت کا احساس اس کی زندگی میں ہی وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔'' وہ آہ کو دباتے ہوئے بولے۔
''آپ کی جوڑی بے مثال ہے ابو جی...... جس گھر میں میاں، بیوی کی نوک جھونک نہ ہو وہاں رونق، گہما گہمی کیسے آسکتی ہے؟ جامد ہوتے ہیں وہ گھر جہاں ہر وقت آپ جناب کو تکیہ کلام بنالیا جائے۔'' وہ شگفتہ لہجے میں بولی۔
''چلو اٹھو تیار ہو جاؤ، آج ڈنر کے لیے باہر چلتے ہیں۔ فرمائش کرو، چائنیز کھانا پسند کرو گی کہ دیسی؟'' وہ مسکرا کر بولے۔
''ابو جی! اس کی ضرورت نہیں، خواہ مخواہ آپ کی جیب پر زیادتی ہو جائے گی۔ امی کے ہاتھ کا کھانا فائیو اسٹار ہوٹلوں کے کھانے کو بھی مات دیتا ہے۔'' وہ پُرستائش لہجے میں بولی۔ ''میری امی کا جواب نہیں۔''
''جانتا ہوں تمہاری امی کو...... جلد بازی اور بے صبری میں بے مثال ہے، پل بھر میں ٹیبل بھر ڈالتی ہے اور یہی خوبی بعض اوقات خامی بن جاتی ہے۔'' وہ تمسخرانہ انداز میں بولے۔

''ایک دم سے جذباتی اور جھٹ پٹ فیصلہ کرنے والی...... مجھے آپ کی جج منٹ سے اتفاق ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''ابو جی ہوسکتا ہے، جسے ہم خامی سمجھ رہے ہیں وہی ان کے لیے ڈھال ہو، ان کے بچاؤ کا سامان ہو؟''

''تم نے کروڑوں کی بات کی ہے۔'' وہ اسے بوسہ دے کر بولے اور باہر نکل گئے۔ وہ بھی وہاں سے اٹھی اور وارڈروب میں ہینگرز کو آگے پیچھے کر کے ڈریس کا انتخاب کرنے لگی۔

☆☆☆

''انکل......! میں پاکستان واپس نہیں جاؤں گا۔ مجھے کسی اور ملک بھیج دیں۔ جہاں ویزے کی ڈیمانڈ نہیں کی جاتی۔ میں والدین کو اپنی منحوس شکل نہیں دکھانا چاہتا۔ انہیں مجھ سے شدید نفرت ہے۔'' سعود نے التجائیہ لہجے میں مختار راجا سے کہا۔

''بیٹا! رحمان بہت پریشان ہے، تم ان سے فون پر بات ہی کر لیتے۔ انہیں قدرے تسلی ہو جاتی۔'' وہ پیار بھرے لہجے میں بولے اور گہری سوچ میں کھو گئے۔ ''ایک زندگی تباہ ہونے سے کیسے بچائی جائے؟''

''انکل! آپ میری بات کا جواب دیں۔'' وہ بے قراری سے بولا۔ ''آپ چپ کیوں ہیں؟''

''ہوں......'' وہ سر ہلا کر بولے۔ ''ویسے میں نے محسوس کیا ہے کہ تم برے نہیں ہو، یہاں کے ماحول کے اثرات تم پر چسپاں ہوئے ہیں مگر جب تم اپنی اندرونی جبلت پر حاوی ہو جاؤ گے تو پھر خود کو بدلنا قطعاً مشکل نہیں لگے گا۔ بنیادی طور پر تم ایک شریف اور محنتی باپ کی اولاد ہو، یہی فخر کم نہیں ہونا چاہیے۔''

''انکل، آپ میرا مذاق تو نہ اڑائیں، آئی ایم ناٹ آ گڈ گائے۔'' لہجے میں پشیمانی تھی۔

''یہ تم کہہ رہے ہو ناں...... تمہاری آنٹی بھی تو تمہیں پسند کرتی ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولے۔

''انکل مجھے یقین نہیں آرہا، یہ کیسے ممکن ہے؟ جس بچے کو والدین نے دھتکار دیا ہو، وہ قابلِ تحسین کیسے ہوسکتا ہے؟'' اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

''تمہارا حلیہ ذرا سا درست ہو جائے تو کیا ہی بات ہے تمہاری؟'' وہ پیار بھرے لہجے میں بولے۔ ''ظاہرانہ پن نیکو کاروں کو عیاش اور گناہ گار کے پاکباز ہونے کی دلیل بن جاتا ہے۔ بس تم یہاں مار کھا گئے۔ اپنا تجزیہ کرو...... اور میری بات پر غور و فکر کرو...... اصل رستہ پا لو گے۔''

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے انکل...... کہ میں اپنے والدین کے لیے قابلِ فخر اور قابلِ آفرین بن جاؤں۔ آئی ڈونٹ نو انکل...... پلیز ہیلپ می......'' وہ ان کے قریب ہو کر بیٹھ گیا اور وہ اسے تسلی دینے کے سے انداز میں تھپکنے لگے۔

''دیکھو بیٹا یہ جو ہمارا پہناوا ہوتا ہے انسانی فطرت، مذہب، خاندان اور ملک کی شناخت ہوتا ہے اگر اپنی شخصیت پر لیبل ہی ہپی یا کاؤ بوائے کا لگا لیا تو اپنی پہچان تو ختم ہو گئی ناں۔'' وہ ذرا جھجک کر بولے تو اس کا ہاتھ بے اختیار کانوں کی بالیوں کو چھونے لگا اور پھر انگلیاں لمبے الجھے ہوئے بالوں کو سلجھانے میں الجھتی چلی گئیں۔ اپنے لباس پر نظر دوڑائی تو پھر اس کی نظریں ایسی زمین بوس ہوئیں کہ اٹھ نہ سکیں۔ زبان پر جیسے تالے پڑ گئے اور ذہن جو سالوں سے خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا آناً فاناً بیدار ہوا اور روح بے قرار ہو کر تڑپی...... دل پہلے ہی پشیمان، حسرت زدہ اور المناک تھا۔ اب خون کے آنسو بہانے لگا۔ مختار راجا نے اس کے ماتھے پر ابھرتی لکیروں اور پلکوں کے جھکاؤ میں اِک داستان پڑھ لی تھی۔ نہایت اپنائیت سے بولے۔

''بیٹا ابھی جا کر آرام کرو پھر تمہیں ایک فیصلہ کرنا ہوگا۔'' اس وقت لوہا گرم تھا، وہ ان قیمتی لمحات کو ضائع نہیں کرنا.... چاہتے تھے کیونکہ ایسے لمحات زندگی میں فقط ایک بار ہی آتے ہیں۔ دانشمند لوگ پہچان کر فائدہ اٹھا جاتے ہیں۔

”کیسا فیصلہ انکل؟“

”میں کل سے تمہیں اپنے ہوٹل میں بیرا گیری کی جاب دے کر تمہارے ویزے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں، اگر تمہیں میری یہ آفر منظور ہوئی تو صبح مجھے انفارم کر دینا۔ میں تم پر اپنا حکم صادر نہیں کرنا چاہتا، نہ ہی اپنے اصول لاگو کرنے کا ارادہ ہے، نہ ہی تم پر کسی قسم کا جبر اور زبردستی ہے، نہ ہی میرا تم پر زور ہے نہ ہی کوئی اختیار...... اپنی زندگی کے فیصلوں کے صرف حقدار تم ہو، کوئی دوسرا، تیسرا نہیں۔ اب چلو بیٹا جا کر سو جاؤ اور میری صرف ایک خواہش اگر تمہارا دل اجازت دے تو پوری کرنے کی کوشش ضرور کرنا...... دو نفل حاجت کے پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے راہِ مستقیم کی بھیک ضرور مانگ لینا۔ وہ تمہاری خالی اور تار، تار جھولی کو اپنی رحمتوں اور نوازشات سے لبریز کر دے گا۔ بس میری فقط ایک ہی التجا ہے، عرض ہے...... اگر تم غور وفکر کرو تو راہ سجھائی دے جائے گی۔“ وہ دھیمے اور نرم لہجے میں بول رہے تھے اور وہ نظریں اور سر جھکائے ان کے ایک، ایک لفظ پر غور کر رہا تھا۔ سامنے ہی ان ہی کا اپنا بیٹا مشرقی لباس پہنے کیسا مہذب اور باعزت لگ رہا تھا۔ اذان کی آواز پر وہ وہاں سے اٹھ گیا۔ سعود بھی وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ دیوار پر آویزاں قدِ آدم آئینے میں اپنا جائزہ لے کر نفرت وگھن سے خود پر ہی تھوک دیا۔

”میں ایک مسلم خاندان کا پروردہ ہوں، اپنے پہناوے، اپنی خصلتوں، اپنے کردار اور اپنے رہن سہن سے نہ مسلمان دِکھتا ہوں نہ ہی پاکستانی لگتا ہوں۔ حیف ہے مجھ پر، میرے امی، ابو کی پریشانی، ناراضی اور غصہ بجا تھا۔ اگر ان کی جگہ پر میں ہوتا تو اپنے مرتد بیٹے کو اپنے ہاتھوں قتل کر کے آخرت کے دن سرخرو ہو کر جنت کے اعلیٰ درجے کو حاصل کر چکا ہوتا۔ انہوں نے میری جان بخشی کر کے ایک دفعہ پھر سے تمام تکالیف سہہ کر مجھے دوسرا جنم دیا تھا۔ میں ان کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا اور ان کے تمام خواب پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ضرور کوشش کروں گا۔ چاہے مجھے بیرا گیری کے بجائے باتھ روم صاف کرنے کی نوکری ہی کیوں نہیں کرنی پڑے۔“ وہ خود کلامی کرتے ہوئے، زارو قطار رو رہا تھا۔ نیند اس سے کوسوں دور تھی، تہجد کی اذان کی آواز پر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور چپکے سے آواز کا پیچھا کرتا ہوا مسجد تک جا پہنچا۔ جو گھر کے بہت قریب ہی تھی۔ مسجد خالی تھی، مولانا صاحب اذان سے فارغ ہو کر جانماز پر بیٹھ گئے تھے۔ سعود آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک دم.... اچنبھے سے اسے دیکھنے لگے۔

”اِدھر بیٹھو، عیسائی ہو، یہودی ہو یا ہندو، مذہب کون سا ہے؟“ انہوں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر نرمی سے پوچھا کیونکہ اس کا حلیہ کسی بھی مذہب کی نشاندہی نہیں کر رہا تھا۔

”مسلمان.... لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ سعود نے خود اعتمادی سے بلند آواز میں کلمہ پڑھا اور ان کے قدموں پر دونوں ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔

”یہاں ماں، باپ کے ساتھ رہتے ہو کہ پڑھنے آئے ہو، یعنی دنیاوی اعلیٰ تعلیم سے فیض یاب ہونے آئے ہو؟“ لہجے میں بلا کی نرمی تھی۔

”تعلیم کے لیے آیا تھا...... لیکن وہ زیادہ دن جاری نہ رکھ سکا۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”اگر تمہیں مناسب لگے تو وجہ بتا دو۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے تو وہ آنسوؤں کے سیلاب پر بند نہ باندھ سکا اور تمام روداد سنا ڈالی۔

”اب میرا بچہ کیا چاہتا ہے؟“ وہ اسے اپنے ساتھ لگا کر بولے۔

”مجھ ناپاک گناہ گار کو پاک کر دیجیے۔“ وہ گڑبڑا کر بولا۔

”تم نے یہ سوچ لیا تو سمجھو کہ تم مجھ سے بھی اونچے اور اعلیٰ مقام پر کھڑے ہو، اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو اپنے پرہیزگاروں سے زیادہ پسند کرتا ہے، تم تو اس مالک کی پسندیدہ ہستی بن گئے ہو۔“ وہ خوش الحانی سے بولے۔

موٹاپا کم کرنے کی مشقیں

کچھ پولیس والوں نے گھڑسواری سے پیٹ کم کرنے کی کوششیں کی ہیں جن سے پیٹ کم ہونا شروع ہوا ہے مگر گھوڑے کا...... پولیس والے دو تین بار سلمنگ سینٹر چلے جائیں تو کئی پونڈ وزن کم ہو جاتا ہے۔ جی ہاں سلمنگ سینٹر کے مالک کا...... موٹاپا ایک بیماری ہے، جس میں تھانیدار مبتلا نہیں ہوتے بلکہ بیماری ان میں مبتلا ہوتی ہے۔ ہمارے ایک ڈائریکٹ حوالدار دوست کہتے ہیں رزقِ حلال کھانے سے پیٹ نہیں بڑھتا حالانکہ کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ رزقِ حلال کھانے سے پیٹ نہیں بھرتا۔ ہمارے یہ دوست کہتے ہیں کہ میں ہمیشہ رزقِ حلال کھاتا ہوں مگر کبھی، کبھی اپنے گھر سے بھی کھانا منگوالیتا ہوں۔ وہ کھانا کھا کر انھیں تو کبھی یہ نہیں کہتے۔ ''بس پیٹ بھر گیا۔'' یہی کہیں گے۔ ''بس اب میں تھک گیا۔'' ویسے پولیس والوں کو پیٹ کم کرنے کا ایک نسخہ ہم بھی بتا دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب بھی مرغن کھانا کھائیں بل اپنی جیب سے دیں۔

اقتباس: از مزاحیات' تحریر: ڈاکٹر یونس بٹ، پسند: نوبیہ ظہور ضلع اٹک

''یہ کیسے ممکن ہے؟ میرا کردار نا قابلِ معافی ہے، میرے اعمال قابلِ سزا ہیں، میرا یہ حلیہ قابلِ نفرت ہے مولانا صاحب۔'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

''سوچ لو میرے بچے...... اپنا حلیہ بدل کر واپسی کے تمام رستے بند ہو جائیں گے۔ توبہ کرنے کے بعد پھر سے گناہ اور غلطی کا سرزد ہو جانا سراسر تباہی ہے، عذابِ الٰہی ہے اور جہنم کی آگ ہے۔'' وہ اپنائیت سے بولے۔

''تباہی کے وہ تمام رستے، تمام تعلق، تمام رشتے ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہتا ہوں جو مجھے دوزخ کی جانب دھکیل رہے ہیں۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولا تو مولانا صاحب نے اسے گلے لگالیا۔

☆☆☆

''او مائی گاڈ...... واٹ آ سرپرائز...... حمیرا میرا جی پی اے ہے، 4.1 یعنی کلاس میں ٹاپ...... پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا، معجزاتی طور پر یہ کیسے ہوگیا۔'' نمرا نے خوشی سے مغلوب ہو کر کہا۔

''تمہاری طرف سے کی جانے والی مہربانیوں کے نتائج ہیں بھئی، اس میں ذہانت و لیاقت کا کوئی کمال نہیں۔'' حمیرا نے جل بھن کر کہا۔ ''یہ سخت ناانصافی ہے، ویسے سر عادل بہت عجیب انسان ہیں۔''

''میری طرف سے مہربانیاں؟ کیسی گھٹیا سوچ ہے تمہاری...... میرا اس سے سامنا ہی نہیں ہوا۔ نہ گھر میں نہ ہی یہاں...... تھینک گاڈ کہ وہ مجھے سمجھ گیا ہے اور اب رابطہ امی سے ہی ہے۔'' وہ پُرتسکین سانس لے کر بولی۔

''میرا خیال ہے تم نے جی پی اے کی امپرُوومنٹ کا گُر سیکھ ہی لیا ہے۔ ویری گڈ...... یونیورسٹی سے نکلتے ہی اسے ایسی کِک لگانا کہ عمر بھر اٹھ نہ سکے۔ کیوں نمرا؟ تم نے یہی پلان بنا رکھا ہے ناں؟'' حمیرا نے آہستگی سے کہا۔

''تم مجھے اتنے سالوں میں سمجھ ہی نہیں سکیں، کتنے افسوس کی بات ہے، میں ایسی چالباز لڑکی نہیں ہوں، اسے دھوکے میں نہیں رکھوں گی، تمام معاملہ اپنے امی، ابو پر چھوڑ دیا ہے۔'' وہ تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''اچھا تو بتاؤ کہ بات کہاں تک پہنچی؟'' وہ کریدنے کے انداز میں بولی۔

''بات وہیں رکی ہوئی ہے جبکہ سر عادل کی ممی ہمارے گھر کے تین چکر لگا چکی ہیں اور ہر روز امی سے فون پر بات بھی کرتی ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''تو پھر مسئلہ کیا ہے؟ فیصلہ تو ہو جانا چاہیے تھا۔'' حمیرا نے حیرت سے کہا۔
''میں کچھ نہیں جانتی کیونکہ ابھی تک ابو نے مجھ سے کچھ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی البتہ امی میرے خیالات جان چکی ہیں۔ وہ بھی فی الحال خاموش ہیں۔'' وہ سوچتے ہوئے بولی۔
''تم بہت صابر بلکہ نہایت سست اور کاہل لڑکی ہو، میں تمہاری جگہ ہوتی تو پتا ہے کیا کرتی...... قسم سے ماما اور پاپا کو اپنا فیصلہ سناتی اور ایک دن میں معاملہ آر یا پار ہو جاتا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے، دولت بھی نسلوں سے چلی آرہی ہے، فیصلہ کرنا میرے لیے مشکل نہ ہوتا کیونکہ ایسے رشتے ہی تو لاجواب سمجھے جاتے ہیں۔'' وہ اسے رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
''یہ تمہارے گھر کے اصول ہیں، میرا خاندان ابھی تک پرانے خیالات اور اخلاقیات میں مقیّد ہے، ہمارے گھروں میں ابھی تک لڑکی کی رضامندی نہیں لی جاتی۔ بس خانہ پری کے لیے صرف بتا دیا جاتا ہے۔ رشتہ والدین کی پسند کو مدِنظر رکھ کر طے کیا جاتا ہے، میری بات پر غور ضرور کرنا اس وقت تو تم اتفاق نہیں کرو گی، دولت اور وہ بھی وافر مقدار میں حاصل کردہ انسان کے مزاج کو بدلنے میں بہترین رول ادا کرتی ہے، حالات بدلتے ہیں تو خیالات میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ اس کے بعد اخلاقیات و کردار میں اس کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ انسان اپنی سوچ کے مطابق خود کو بہت طاقت ور سمجھتا ہے جبکہ ایسا نہیں ہے، اس کی حیثیت ایک تنکے سے بڑھ کر نہیں، بہت کمزور ہے، فطرتاً بہت بے صبرا، جلد باز اور عاقبت نا اندیش واقع ہوا ہے۔ تجوری بھرتے ہی ماضی کو بھلا دیتا ہے، پیسے کی جھنکار میں بہرہ اور اس کی چمک دمک میں اپنی بینائی کھو کر آسائشات کا غلام، اہمیت کا محتاج اور بڑے پن کے نشے میں سرشار رہنا فطرت میں سما جاتا ہے۔ نامعلوم اور اَن دیکھی خوشی، کامیابی اور فتح مندی کے احساس کو ہمیشگی کا روپ دے کر بتدریج کبر و پندار کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس بات سے بے خبر کہ دولت، شان و شوکت، جاہ جلال کی معیاد بہت کم ہوتی ہے، یہ آج تمہاری لونڈی تو کل کسی اور کی خدمتگار اس پر بھلا کیا مان کرنا۔ اس لیے میں سر عادل کی دولت سے تو کم از کم بالکل امپریس نہیں ہوں، مجھے اپنے جیسا اِک مڈل کلاس کا حسنِ اخلاق و بلند کرداری سے بھرپور لڑکے کی تلاش ہے، جس کی سوچ میری سوچ سے مشابہت رکھتی ہے، اس لیے آج کے بعد چالبازی کے گُروں کا طعنہ مت دینا۔'' وہ لمبی چوڑی تمہید کے بعد ذرا سا مسکرا کر بولی۔
''ٹھیک ہے بھئی، کل ہی اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دینا لازم ہو گیا ہے۔ مگر ایک بات ضرور سمجھاؤں گی تمہیں...... دیکھو نمرا! پیسے کے بغیر زندگی میں بہت اسٹرگل ہے، تم اپنے ان خیالات کے بھنور سے باہر نکل کر دیکھو، ایک خوش آئند، آسان و سہل اور بجل و روشن مستقبل تمہیں ویلکم کہنے کو تیار کھڑا ہے، اس وقت کو اپنی گرفت میں مضبوطی سے پکڑو، میری بات مان جاؤ، ورنہ عمر بھر پچھتاؤ گی۔'' حمیرا نے اسے سمجھاتے ہوئے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔
''مجھے ایسی نظروں سے مت دیکھو حمیرا، اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بہت فضل ہے کہ مجھے حرص و لالچ سے محفوظ رکھا ہے۔'' وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔ اور مجھے سر عادل کی یہ حرکت قابلِ مذمت لگی ہے...... اخلاقیات سے بے بہرہ کہ میں 4.1 جی پی اے والی اسٹوڈنٹ نہیں ہوں، مجھ پر یہ فیور کرنے کا مقصد؟''
''تمہیں احسان مند کرنا، تمہاری نظروں کو نیچا کرنا، تمہاری زبان کو مقفل کرنا اور تمہاری سوچ پر پہرے بٹھا دینا اور تمہارے خیالات کا سودا کر ڈالنا، مقصد تو واضح ہے، تم ہی نہ سمجھو اور فائدہ اٹھانے کا نہ سوچو تو اس بیچارے مجنوں کا کیا بنے گا؟'' وہ الفاظ چبا، چبا کر بولی۔ نمرا کی طرف سے رسپانس نہ ملنے پر وہ بینچ سے اٹھ گئی۔ ''سخت بور اور ہونق دوست سے پالا پڑا ہے، چلو خیر جو بھی ہو جیسی بھی ہو، ہو تو میری دوست ہی ناں اور بہت اچھی بہن بھی ہو۔''
''مگر ہوں اِک اُلجھی ہوئی پہیلی ہی۔'' وہ بھی مسکرا کر کھڑی ہوگئی۔

''جسے حمیرا چوہدری کے سوا کوئی بھی بُوجھ نہیں سکا..... سر عادل بیچارے نے کس کٹھن چکر کا انجانے میں سودا کر ڈالا ہے، ویری سیڈ.....'' حمیرا ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر کیفے ٹیریا کی طرف چل دی اور نہایت اپنائیت سے بولی۔ ''کافی پکڑتے ہیں اور کلاس روم کی طرف چلتے ہیں۔''

''تم جانتی ہو، کافی مجھے کڑوی لگتی ہے، مجھے قطعاً پسند نہیں۔'' نمرا الجھ کر بولی۔

''قسم سے نری پینڈو ہو، نہ تمہیں کافی پسند ہے نہ چاکلیٹ..... بولو کیا پسند ہے، بدھو نہ ہو تو، نئے ذائقے کے لیے آہستہ آہستہ ٹیسٹ ڈیولپ کرنا پڑتا ہے، محبت و عشق میں یہی رول اپلائی کرنا ضروری ہے۔'' وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔

''بہت بے ہودہ ہو..... تمہارا تو اللہ ہی نگہبان ہے ورنہ تو کوئی حال نہیں تمہارا، ویسے سر عادل کی طرح کافی چھچھوری واقع ہوئی ہو اور تھوڑی سی کھسکی ہوئی بھی۔'' نمرا نے اسے پیار سے ہلکی سی چپت لگائی اور دونوں ہنستی ہوئی قلانچیں بھرتی کیفے ٹیریا پہنچ گئیں۔ سامنے کی ٹیبل پر سر عادل کو دیکھ کر نمرا جھینپ سی گئی۔ لیکن حمیرا اسی موڈ میں ہنستے ہوئے بولی۔

''چلو بھئی، تمہیں تو گوتم بدھ بن کر بیٹھنے کا سنہری موقع مل گیا۔ ہاتھ سے جانے مت دینا یہ گولڈن چانس۔'' نمرا نے اسے بیزاری و کوفت بھری نظروں سے دیکھا اور سائڈ پر رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ پشت سر عادل کی طرف تھی۔ وہ حمیرا کی طرف معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھنے لگا۔

☆☆☆

عادل ایک مرتبہ پھر گھر سے نکل آنے والے واقعے کے بارے میں سوچنے لگا..... اس روز جب وہ باپ کے بلانے پر ان کے پاس گیا تھا۔

''بیٹھو.....'' لہجہ تحکمانہ اور روکھا تھا۔

وہ صوفے کے کنارے پر معمولی سا ٹک کر بیٹھ گیا تھا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ حسنات نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہی ماضی میں کہے گئے الفاظ دُہرائے تھے۔

''میری زندگی کے تجربات و مشاہدات کا نچوڑ اس میں موجود ہے، تم تک پہنچانا میرے فرائض کے زمرے میں آتا ہے، اسے بائے ہارٹ یاد کر لینا۔''

اس نے کھڑے ہو کر نخوت سے بھرپور نظر باپ پر ڈالی اور لفافے کو پکڑے بغیر واپس مڑا ہی تھا کہ گرجدار آواز پر رک گیا۔

''اسے پڑھ لیتے تو اس میں تمہارا ہی فائدہ تھا۔ خیر جاؤ اور ماں کو میری طرف بھیجو۔ جس نے تمہاری یہ ٹریننگ کی ہے، اولاد کو پروان چڑھانا فل کمٹ منٹ ہے اس نے جیسے مذاق سمجھ لیا تھا۔'' عادل نے آگے بڑھ کر لفافہ پکڑ لیا اور سرعت سے باہر نکل گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے لفافہ کھولا اور پہلا فقرہ پڑھ کر دہل گیا۔

''کل یعنی بروز جمعہ تمہارا نکاح عصمت پھپو کے گھر وردہ سے کرنے کا پروگرام اور اس کے فوراً بعد رخصتی ہے۔ اگر اس پر عمل کرنے سے قاصر ہو تو اسی وقت یہ گھر چھوڑ دو۔'' اس سے آگے پڑھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ ''ایسی بے انصافی اور دھاندلی تو زمانۂ جاہلیت میں بھی کبھی کسی اولاد پر نہیں ہوئی ہوگی۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا لاؤنج میں ماں کے پاس آ کھڑا ہوا۔ بے بس، لاچار اور بالکل بے دم..... تھوڑے توقف کے بعد اس نے لفافہ ماں کی طرف پھینکا۔

''ممی یہ پڑھیں......اور میں ابھی اور اسی لمحے یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ یہ جہنم آپ کو ہی مبارک ہو۔ آج سے آپ کا بیٹا اِک کمزور، ڈرپوک اور بدنصیب ماں کے لیے مر گیا۔'' وہ نخوت سے بولا اور کمرے کی طرف چلا گیا۔ سائرہ لفافہ ہاتھ میں پکڑے خالی الذہنی سے وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

عادل نے نوکر کو آواز دی تو سائرہ نے جنبش کی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلنے کی کوشش کرتی۔ عادل نے ملازم کے ساتھ مل کر اپنا تمام ذاتی سامان اٹھایا اور اپنی گاڑی کے ہر کونے میں ٹھونسا اور آناً فاناً غائب ہو گیا۔ سائرہ سکتے کے عالم میں وہیں صوفے پر ڈھے گئی۔ ملازم نے اسے آواز دے کر جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھایا تو وہ چکراتے ہوئے سر اور دھڑکتے ہوئے دل کی شوریدگی میں اٹھ کر بیٹھ گئی...... پر جوس کا گلاس پکڑتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''بیگم صاحبہ اگر آپ اجازت دیں تو کل سے اپنی بیوی کو آپ کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے لے آؤں۔ آپ کے سونے تک وہ آپ کے ساتھ ہی رہے گی۔'' ملازم نے ہمدردانہ لہجے میں کہا جسے سن کر سائرہ نے اثبات میں سر ہلایا اور جوس پینے لگی۔

''حسنات ......حسنات!'' جسمانی قوت کو بحال کرتے ہوئے وہ صوفے سے اٹھی۔ اس وقت وہ اپنے حواسوں میں واپس آ چکی تھی۔ بھاگنے کے انداز میں حسنات کو پکارتی ہوئی اسٹڈی کی جانب بڑھ گئی۔

''کیا ہوا؟'' حسنات نے استحقاق سے دروازہ کھلنے پر مصالحانہ انداز میں کہا تو وہ ان کے قریب ہی قالین پر بیٹھ گئی اور سر جھکا کر آنسوؤں پر ضبط کرنے لگی۔

''پریشانی کس بات کی ہے؟ کچھ بولو تو معلوم بھی ہو۔'' لہجے میں پھر سے درشتگی عود کر آئی تھی۔ وہ فوراً قالین سے اٹھ کر صوفے پر مربیانہ انداز میں بیٹھ کر بولی۔

''آپ کو بتانے آئی ہوں، آپ کا بیٹا گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اسے واپس لانے کا سوچیں۔''

''اپنی مرضی سے گیا ہے تو جانے دو......'' وہ بے پروائی سے بولے۔

''جوان بچہ...... پلا پلایا بچہ گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے......آپ کو ن کر دکھ نہیں ہوا؟'' وہ حیران و پریشان ہو کر بولی۔

''حیرت کس بات کی اور دکھ کس لیے......؟ دو دن میں واپس آ جائے گا۔ کیا تم نے اسے اکیلے رہنے کا ادراک دیا تھا۔ آج تک تمہاری آغوش میں سوتا آیا ہے۔ بھلا اس سے دور کیسے رہ سکتا ہے؟'' وہ ہذیانی انداز میں بولے تو وہ حق دق انہیں دیکھنے لگی۔

''فکر کی کوئی بات نہیں، جوانی میں ایسی نازیبا حرکتیں اور فیصلے نہ ہوں تو وہ جوانی تو نہ ہوئی ناں...... مجھے آج یقین ہو چلا ہے کہ تمہارا بیٹا آخر کار جوان ہو ہی گیا۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولے تو اسے ان کی یہ بات گھٹیا اور ادب سے بے بہرہ لگی۔

''آپ سے بات کرنا فضول ہے......سراسر نادانی اور احمقانہ پن ہے۔'' وہ اپنی قوتِ ارادی کو مجتمع کرتے ہوئے بولی۔ ''سوری......! آئندہ ایسی غلطی سرزد نہیں ہو گی۔ اپنی بدنصیبی کو کبھی کبھار فراموش کر دیتی ہوں اور آپ کے پاس چلی آتی ہوں۔ یاد دہانی کا شکریہ حسنات......!'' وہ اپنے اندر برپا تلاطم پر قابو پا کر وہاں سے اٹھ گئی۔ حسنات نے اسی کٹھور پن سے اپنی نظریں سامنے کھلی کتاب پر گاڑ دیں۔

وہ عادل کے کمرے میں اس کے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ بیڈ شیٹ اور تکیے سے اس کی مخصوص خوشبو سے چونک کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''میرے بچے تم نے اس جہنم کو بر وقت الوداع کہہ کر بہت عقلمندی کی ہے، میں بہت لیٹ ہو گئی ہوں، تم نے مجھے بالکل درست طعنہ دیا ہے کہ میں ایک ڈرپوک، کمزور اور تمہاری بدنصیب ماں ہوں۔ بھلا تمہارے نصیب کو کیسے چمکا سکتی تھی؟ میرے بچے مجھے معاف کر دینا۔ تم تو میرے جسم کے انگ، انگ میں بستے ہو، میری بدنصیبی کی چھاپ

سے تم کیسے محفوظ رہ سکتے تھے؟ میرے بچے میں تمہاری تقدیر کو کسی تدبیر سے نہ بدل سکی۔ آئی ایم ریئلی سوری! عادل میری جان اس گھر میں میرا قیام بھی بیکار لگنے لگا ہے۔'' وہ سسک اٹھی تھی۔

☆☆☆

''نمرا......! تم بہت چھپی رستم نکلیں...... یار کوئی لمبا چوڑا چکر ہے، جو سر تم پر روز بروز مہربان ہوتے جا رہے ہیں۔ بات کیا ہے؟ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ؟'' حمیرا استفسارانہ لہجے میں بولی۔

''کوئی خاص بات ہو تو بتاؤں......'' وہ لان میں اگی گھاس کو آہستہ، آہستہ توڑتے ہوئے بولی۔

''کچھ چھپایا جا رہا ہے...... یاد رکھو جب آگ جلائی جاتی ہے تو اس سے پہلے ہی دھواں چار سو پھیل جایا کرتا ہے۔ مجھے تو دال میں کالا بے حساب لگ رہا ہے۔ یار بتاؤ ناں...... کچھ ہماری بھی حوصلہ افزائی ہو۔'' وہ اس کے قریب ہو کر راز داری سے بولی۔ ''اپنی بہن حمیرا کو خود سے الگ سمجھتی ہو، ویری سیڈ......!''

''میں نے کہا ناں کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں...... معاف کر دو یار۔'' وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

''وہ تو بہت مشکل ہے، کبھی لائبریری میں جلوہ گری تو کبھی کیفے ٹیریا میں...... عنایات نچھاور کرتے ہوئے سر عادل کسی کی نظروں سے کیسے چھپ سکتے ہیں۔ اب آفس میں بلاوا...... فنٹاسٹک!'' حمیرا نے خوش دلی سے کہا۔ ''بتا دو یار...... فری مشورے کی کوئی قدر و قیمت تو نہیں ہوتی پھر بھی مخلصانہ و مربیانہ مشورہ دوں گی۔ وہ بھی کروڑوں کا۔''

''اگر میں سیریس ہوتی تو پھر مشورے کی نوبت ضرور آتی۔ وہ کم بخت نامراد ہے، ہی سرے سے نفسیاتی مریض اور سر پھرا۔'' وہ زہر خند سے بولی۔

''کہتا کیا ہے؟ یار کچھ تو بتاؤ۔'' حمیرا نے راز داری سے کہا۔

''وہی گھسے پٹے ڈائیلاگ...... پاگل کہیں کا۔'' وہ نخوت سے بولی۔ ''خوب جملے رٹے ہیں مجھے امپریس کرنے کے لیے...... اِدھر بھی نمرا ہے، کوئی الو نہیں۔''

''تمہارے ساتھ ڈیٹ پر جانا مانگتا ہے، تو یار جاؤ۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کے لیے جانا، کہیں کسی ڈھابے پر نہ چل پڑنا...... اس کے بعد اسے دکھانا ٹھینگا اور غائب ہو جانا۔ ایسے پاگلوں کا یہی علاج ہے، آئندہ قریب نہیں پھٹکے گا۔'' حمیرا نے ہنستے ہوئے کہا۔ موبائل کی بیپ پر وہ دونوں چونکیں۔

''حمیرا سر کا فون ہے، نہ جانے پھر کیا اول فول بکے گا۔'' نمرا نے نمبر دیکھا تو اسے ایسے لگا جیسے دل میں پھانس چبھ گئی ہو۔ وہ ہکلائی۔

''چلو اٹینڈ کرو۔'' حمیرا سنجیدگی سے بولی۔

''میں کیوں اٹینڈ کروں؟ تمہیں شوق ہے تو یہ لو بات کرو۔'' نمرا نے موبائل اس کی طرف بڑھایا تو حمیرا ایسے اچھلی جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

''کیوں بھئی، میں دور ہی بھلی......'' تھوڑی دیر کے بعد اس کا ایس ایم ایس آ گیا۔ پر آشوب تحریر پڑھ کر وہ بینچ سے اٹھی اور آفس کی طرف چل دی۔ اسے ایسے گمان ہوا جیسے یونیورسٹی کا ہر اسٹوڈنٹ اس پر قہقہے لگا رہا ہے اور وہ شرمندگی و خجالت سے پانی، پانی ہو کر زمین پر بہہ جائے گی۔ اس نے پورے استحقاق کے ساتھ آفس کا دروازہ کھولا تو عادل فوراً کھڑا ہو گیا۔ نمرا نے سرسری نگاہ اس پر ڈالی مگر اس کے چہرے سے اس کی نظروں نے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ عادل کی غلافی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی تھی۔ پیشانی کی لکیروں میں کرب ہویدا تھا۔ بال قدرے الجھے ہوئے تھے اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔

''نائس ٹو سی یو ہیر ہیو آ سیٹ......'' اس نے لہجے کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔

''تھینک یوسر۔'' وہ کرسی پراس انداز میں بیٹھی تھی جیسے ابھی بھاگنے کے لیے تیار ہو۔
نمرا اس دن کوکوس رہی تھی جب عادل کے بلانے پر وہ اس کے آفس گئی تھی۔
''نمرا بسا اوقات دل کی بات زبان پر آنا مشکل ہو جاتی ہے۔'' وہ تمہید باندھنے لگا تھا۔
''سر بات کیجیے اور جلدی ختم کرنے کی کوشش کریں۔ میری کلاس فیلوز باہر میرا انتظار کر رہی ہیں۔'' وہ برہمی سے بولی۔
''آئی ایم ایکسٹریملی سوری نمرا...... !تمہیں پریشان کرنا میرا منصب ہرگز نہیں ہے۔'' وہ کھڑکی سے باہر گھورتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں گوشۂ عافیت چاہیے، یہاں تم کچھ نہیں سمجھو گی، گتھی سلجھنے کے بجائے الجھتی چلی جائے گی۔''
''سر! یہ تو ناممکن ہے، آپ خود مرکزیت کا شکار ہو چکے ہیں، میری نسوانی عزت و وقار کی آپ کو رتی بھر بھی پروا نہیں۔ کس قدر بے حس اور خود غرض انسان ہیں آپ۔ میرا خیال ہے آپ کے گھر میں بہن نہیں...... ورنہ آپ کو ایک لڑکی کی عزت وتحریم کی نزاکت کا احساس ضرور ہوتا۔ شاید ایلیٹ کلاس کے لوگ آپ جیسے ہی ہوتے ہوں گے۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں مڈل کلاس فیملی کی لڑکی ہوں۔ جسے اپنی روایات کی حفاظت کرنے کی ٹریننگ میں کبھی بے پروائی نہیں برتی جاتی۔'' وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔
''تم میرے پروپوزل پر غور وخوض کرنے کا عہد کرو، بی لیومی، تمہیں اپنے آفس میں کبھی نہیں بلاؤں گا۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں، آئی ایم سیریس...... جیسے زندگی میں شادی کو خاصی اہمیت حاصل ہے، پسندیدگی کی بھی اپنی ہی وقعت ہے۔'' عادل کے لہجے میں اضطراب کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے نمرا قدرے مدھم پڑ گئی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔
''آپ نے درست فرمایا ہے، ایگریڈ...... سر شادی تو آپ کسی بھی لڑکی سے کر سکتے ہیں، یہ اتنا بڑا مسئلہ تو ہے نہیں۔ ہمارے معاشرے میں من پسند لڑکیوں کی کمی نہیں...... پہلی شادی تو والدین کے ہنسی مذاق میں ہی ہو جاتی ہے۔ دوسری شوقیہ طور پر اور تیسری اِک اہم ضرورت کے تحت، چوتھی شریعت کے قوانین کو پورا کرنے کے لیے بغیر کسی حیل وحجت کے ہو جاتی ہے۔ پھر پریشانی کیسی؟ چار شادیاں شرعی طور پر آپ کے حقوق میں شامل ہیں، آپ کو کون روک سکتا ہے؟'' وہ عجیب انداز میں کہہ رہی تھی۔
''اور جب چار کمپلیٹ ہو جائیں تو پھر یہ ناچیز آپ کو مبارک باد دینے آئے گی ویسے ایک عرض کرنے کی جسارت کرتی ہوں، معاف کیجیے گا۔ سر! اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی تو پسندیدگی اور رضامندی کا حق سونپا ہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟'' وہ طنزیہ مگر دھیمے لہجے میں بول رہی تھی۔
''مجھے کیا کسی کو بھی ریجیکٹ کرنے کا تمہیں حق حاصل ہے لیکن یہ سوچ لو تمہارا انکار میری موت ہے، تمہارا اقرار میری حیات ہے۔'' اس کے لہجے میں بے بسی عود آئی تھی۔
''سر! میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔ اس میں سوائے پریشانیوں کے اور رکھا ہی کیا ہے۔ چند لمحوں کی خوشیاں کشید کرنے کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنا مجھے احمقانہ پن لگتا ہے۔ پلیز سر گستاخی معاف...... !میرے خیال کو ذہن سے کھرچ کر نکال پھینکیں۔'' اس نے معذرت طلب انداز میں ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔
''یہ نہیں ہو سکتا۔ نمرا میں نے زندگی میں ہر کام دوسروں کو خوش کرنے کے لیے کیا ہے۔ اس بار اپنی خوشی کی خاطر تمہیں حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جیسے خالصتاً خدائی فیصلے نہیں ٹلتے...... سورج کا طلوع ہونا اور مقررہ وقت پر غروب ہونا آگے پیچھے نہیں ہو سکتا...... یوں سمجھو کہ واقعتاً اسی طرح میرا فیصلہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ اسے مذاق مت سمجھو، میں ٹین ایجر بچہ نہیں کہ تمہارے حسن پر فدا ہو گیا ہوں۔ یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ بچار کے بعد کیا

ہے۔'' وہ اسے منانے پر مصر رہا...... وہ خاموش ہوگئی تھی۔ اس کے لفظوں میں سو فیصدی صداقت تھی مگر وہ اس دل کا کیا کرتی؟ جس نے اس کی خواہش کو رد کر دیا، اس کے پاس کوئی دلیل نہ تھی۔ کوئی جواب نہ تھا۔ پسندیدگی ہوتی تو ہر خامی پس پردہ جا چھپتی۔ اس نے اپنے دل کو پھر ٹٹولا بدقسمتی سے عادل کے نام کی بازگشت نہ ہوئی تھی۔

''کیا تمہاری خاموشی کو رضامندی کا نام دے سکتا ہوں؟'' وہ اس کے قریب ہوکر خوشی اور سرشاری سے بولا۔ تو اس کے منہ کی عجیب سی سڑاند نے اسے چونکا دیا۔ یہی سڑاند اس نے پہلی بار اپنے ہی بھائی سعود کے منہ سے سونگھی تھی۔ اس نے سراسیمگی میں اس کی طرف دیکھا۔ سچائی کا اپنا ہی تحیر خیز جذبہ اس کے چہرے پر عیاں تھا۔

''ہرگز نہیں......'' وہ بے اختیار بولی۔ ''آپ اور میں ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے ہیں سر! ذہنی مطابقت کے بغیر تو زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ آپ اچھے بھلے سمجھدار مرد ہیں، یہ نہیں ہوسکتا، یہ میرا فیصلہ ہے۔ آخری اور حتمی...... فیصلے کرنے کا اختیار صرف آپ کو ہی حاصل نہیں...... بااختیار اور حقدار میں بھی ہوں۔ میں بھی آخر ایک جیتی، جاگتی، عقل و شعور رکھنے والی انسان ہوں۔''

''کچھ بھی ہو اپنی ذاتی خوشی کی خاطر تمہیں حاصل کر کے رہوں گا...... ہر قیمت اور ہر صورت میں۔'' اس نے دل میں جارحانہ اور طفلانہ سرگوشی کی۔

اسی اثنا آفس کا دروازہ کھلا اور سائرہ اندر داخل ہوئی۔ نمرا کو سر سے پاؤں تک ایک ہی نظر میں دیکھ کر معاملہ بھانپ گئی۔ اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکان پھیل گئی تھی۔

''ممی! یہ نمرا......'' وہ ہکلاتے ہوئے اتنا ہی کہہ پایا۔ اس سے پہلے کہ نمرا کسی اور مصیبت میں گرفتار ہوتی وہ سرعت سے باہر نکل گئی۔ اس گل افشانی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ مریضانہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

''تمہیں علم ہے کہ میں رات بھر سو نہیں پائی۔'' سائرہ شکایتی انداز میں بولی۔

''سب جانتا ہوں...... مگر ممی میں آپ کی خوشی کی خاطر آپ کے ساتھ جانے سے تو رہا۔ ممی آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟ میں نے کل آپ کو کیا کہا تھا یاد ہے ناں۔ میں آپ کے لیے مر گیا ہوں، ممی پلیز یہاں سے چلی جائیں۔ مردے بے زبان ہوتے ہیں اگر وہ بول پڑیں تو کفن پھاڑتے ہیں، مجھے گناہ گار مت کریں۔'' وہ ماں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا کر بولا۔

''ممی مجھے اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے کی ہمت چاہیے، آپ میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ ماں ہیں، ہر رشتے پر حاوی۔'' اس نے نرم لہجے میں احتجاج کیا اور ماں کو سینے سے لگا لیا۔ ماں دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ اسے بیٹے کی جدائی، دوری اور خفگی کا دکھ، ہر دکھ، درد اور اذیت سے اتنا بھاری لگا تھا کہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

''ممی! خدا کے لیے میرا حوصلہ بڑھائیں۔ مجھے اپنے قدموں پر چلنے کی تلقین کریں۔ مجھے اپنے ارادوں میں ثابت قدم رہنے کی دعا دیں۔'' عادل نے مؤدبانہ انداز میں التجا کی تو سائرہ کے آنسو ایک دم رک گئے تھے۔

''تم ٹھیک رستے پر ہو، درست سوچ ہے تمہاری...... کیا کروں؟ کمرا کھانے کو دوڑتا ہے، تمہیں پکارتا ہے، میری جان مجھے بھول تو نہ جاؤ گے۔ تمہاری ماں تمہارے بن زندہ نہیں رہے گی۔''

عادل آج بھی وہی کچھ سوچے جا رہا تھا۔



''نہ جانے پی ایچ ڈی کیسے کر گیا؟ کم بخت پاگل کہیں کا۔'' نمرا نے سہیلیوں سے حیرت و تجسس میں کہا۔ ''آئی کیو لیول زیرو ہے، وہ اِک سمپل اور معمولی سی بات سمجھنے سے قاصر ہے، بھئی میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی اور اگر اتنی

بڑی غلطی سرزد ہو بھی گئی تو کیا ہی شرابی میرے لیے رہ گیا ہے۔ ایسے رشتے سے تو عمر بھر کنواری رہنا بہتر ہے۔'' وہ جز بز ہونے لگی۔

''یار ہینڈسم تو بہت ہے، جس جگہ کھڑا ہو وہ جگہ بھی بولنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ تم خواہ مخواہ ہی زیادہ بن رہی ہو، میرا اس سے تعارف کرادو۔ بیچارہ مسکین شادی کی ڈیمانڈ کر رہا ہے۔ کون سا تم سے فلرٹ کرنے کے چکروں میں ہے، یقین مانو یہ سب معجزاتی عمل ہے، اس کے بارے میں صدقِ دل سے سوچو...... ایسا رشتہ پھر نہیں آئے گا۔'' حمیرا نے رحم لانہ انداز میں کہا۔

''ہاں، ہاں جاؤ کر لو اس سے شادی۔ اس رویے کے پس پردہ کتنی علتیں چھپی ہوئی ہیں، کیا جانتی ہو تم؟ بس میں نے اسے ایکسکیوز کر دیا ہے۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''تم بھی کچھ نہیں جانتیں۔ اس میں برائی ہی کیا ہے؟ آج کل اس سے کلاس کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ مجھ سے پوچھو اور کون سی انفارمیشن چاہیے۔'' حمیرا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس رشتے کو ریجیکٹ کر کے تم بہت پچھتاؤ گی۔ نمرا اچھا عالیہ آنٹی کیا کہتی ہیں، وہ بہت عقلمند خاتون ہیں۔ ان کا فیصلہ سر عادل کے حق میں ہی ہوگا۔ پھر تو تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے کیونکہ والدین سے بڑھ کر نہ تو کوئی ہمارا ہمدرد ہے نہ مسیحا۔ ان کا مشورہ بہترین اور فیصلہ بے مثال ہوتا ہے۔''

''بھئی یہ بندہ جب مجھے ہی پسند نہیں تو وہ لوگ کیونکر مانیں گے؟'' وہ اسے تنبیہی نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔

''تمہاری آئندہ زندگی میں وہ تمہارا بہترین، سچا اور وفادار ساتھی ہوگا۔ میرا اندازہ غلط نہیں۔'' حمیرا نے اس کی طرف مضطربانہ طور پر دیکھ کر کہا۔ ''نمرا، جذباتی مت بنو، غور و فکر کرو...... ویسے میں تمہیں خاصا عقلمند سمجھتی تھی مگر تم تو کم عقل نکلیں...... مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔''

''تو پھر ایسا کرو، محترمہ کہ تم خوش تدبیری سے کام لو اور اس پاگل اور سائیکو انسان کے ساتھ ایک مثالی زندگی گزارو، تم نے اسے قریب سے نہیں دیکھا۔ اس کے ہر ایکشن میں ابنارملٹی ہے لیک آف کانفیڈنس ہے، وہ میرا محافظ اور پاسبان کیسے بن سکتا ہے؟ جو ذہنی طور پر ہی اس قدر ویک ہے۔'' وہ معاندانہ انداز میں بھویں چڑھا کر بولی۔ ''شراب انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی...... نہ جانے یہ کب سے اس عادت خبیثہ میں ملوث ہے۔''

''ایلیٹ کلاس میں یہ سب جائز اور لازم ہے...... مڈل کلاس مورلٹی کے یہ تمام قصیے ہیں جو تم سوچ رہی ہو، تم ان بکھیڑوں کو خیر باد کہہ کر ماڈرن دور کی ری کوائرمنٹس کو پورا کرو۔ مجھے تو اس پرپوزل میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ تم سنجیدگی سے سوچو تو اس کے بارے میں۔'' حمیرا نے طویل تمہید باندھنی چاہی۔

''کیسی عجیب، ناقابلِ فہم باتیں کر رہی ہو، اک انجان، اجنبی، ناشناسا مرد فقط میری صورت دیکھ کر مجھے پسند کرنے لگا ہے۔ پسندیدگی کے بعد دل کی گہرائیوں سے مجھے پیار کرنے لگا ہے۔ اٹ از آ بگ جوک...... میں سولہ سال کی نادان اور احمق لڑکی ہرگز نہیں کہ ان گھسی پٹی فضول اور فرسودہ باتوں پر بھروسا کر کے ہواؤں کے سنگ اڑنے لگوں اور بہت جلد اپنے پر کٹوا کر منہ کے بل زمین پر آ گروں اور یہ دنیا والے مجھے پاؤں تلے روند ڈالیں۔ آئی ایم سوری، مجھے ہیروئن بننے کا قطعاً شوق نہیں۔'' نمرا نے تبصرہ کرتے ہوئے موبائل پر وقت دیکھا اور بینچ سے اٹھتے ہوئے ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولی۔

''ایڈونچر ہوا ختم...... اب چلتے ہیں کلاس روم میں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اور دونوں سہیلیاں قہقہے لگاتیں وہاں سے چل پڑیں۔ عادل آفس کی گلاس ونڈو سے انہیں شوخیوں اور شرارتوں سے محظوظ ہوتے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

جاری ہے



ہر دن نیا دن

بنتِ حوا

مچھلی گھر میں ایک ہلکی سنہری مچھلی باقی تھی۔ باقی کہاں چلی گئی تھیں ظاہر ہے ان کو اس مچھلی کے ساتھ لایا گیا تھا کیونکہ کوئی کبھی ایک مچھلی نہیں خریدتا...... کم از کم ایک جوڑا تو ضرور خریدتا ہے۔ میں نے بھی مچھلیوں کے جوڑے خریدے تھے۔ ایک نارنجی پھیلی ہوئی دم والی سنہری مچھلی تھی جس کی دم شہزادی کے لباس کی طرح پیچھے سے بہت پھیلی ہوئی تھی۔ تیرتے ہوئے وہ اس کے بالکل

ایسے ہی پیچھے آتی تھی جیسے شہزادی کا لباس اس کے پیچھے گھسٹتا رہتا ہے۔ چہرے کے بارے میں تو آپ سب ہی جانتے ہیں کہ اسے بھی کسی شہزادی کی شکل صورت سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ لیکن میرے خیال میں یہ بھی ایک بڑی بات ہے کہ کم از کم کسی ایک چیز کی تشبیہ تو دی جاسکتی ہے۔ انسان ہوتی تو باقی ظاہری حالت کو بھی کسی شہزادی کی شکل میں ڈھالنے کی جدوجہد میں لگ جاتی۔ نچوانے، کھنچوانے اور چھدوانے کے علاوہ بھی بہت سے باریک بین کاموں کے لیے خوب صورتی کی دکانوں کے چکر پر چکر لگانے کے لیے بے تاب و بے قرار رہتی۔ انسان نہیں تھی ناں...... لہٰذا مطمئن تھی۔

دوسری فیروزی چمکدار لڑاکا مچھلی تھی۔ دکاندار نے اس کا جوڑا... نہیں دیا تھا۔ کہتا تھا ایک مچھلی گھر میں یہ ایک ہی رکھی جاتی ہے اگر دوسری ڈال دیں تو آپس میں لڑ، لڑ کر مر جاتی ہیں، پتا نہیں ان کی افزائش نسل کیسے ہوتی ہوگی اب یہ سوال دکان دار سے تو پوچھا نہیں جاسکتا تھا بس سوچا جاسکتا تھا۔ لہٰذا بس سوچ کر ہی رہ گئی۔ معلومات نہ مل سکی۔

سوال، آدھا علم صحیح لیکن ہر سوال کرنے کا تو نہیں ہوتا ناں بلکہ یہ بھی کہ ہر سوال ہر کسی سے کرنے کا تو نہیں ہوتا ناں...... چلیں رہنے دیں اس بات کو...... میں تو آپ کو اپنے مچھلی گھر کی مچھلیوں کے بارے میں معلومات دے رہی تھی...... چلیں قصہ مختصر کرتے ہیں کہ بہت سے جوڑے لانے کے باوجود اب مچھلی گھر میں ایک مچھلی بچی تھی۔ ہلکے سنہرے رنگ کی...... جس کے ننھے، ننھے فلسے یوں چمکتے جیسے مون لائٹ جرسی کا کپڑا لائٹ کا رخ پڑتے ہی چمکتا ہے۔ دیکھنے والے کو مچھلی کی گول آنکھیں شفاف شیشے سے اپنے اوپر گڑی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، وہ اپنا رخ تبدیل بھی کرتی تو آنکھوں کا محض زاویہ ہی تبدیل ہوتا...... بغیر جھپکے اس کی آنکھیں سامنے والے کو اسی طرح گھور رہی ہوتیں۔

ہے ناں کتنی عجیب بات مچھلی کبھی اپنی آنکھیں ہی بند نہیں کرتی کیونکہ اس کی آنکھوں پر اللہ میاں نے پپوٹے ہی نہیں بنائے ہیں وہ تو سوتے ہوئے بھی اپنی آنکھیں کھلی رکھتی ہے...... ہے ناں عجیب...... ویسے یہ دنیا عجائبات سے بھری پڑی ہے بلکہ ہر دن ایک نئے اور عجیب طریقے سے کائنات پر طلوع ہوتا ہے...... اس دن کتنے عجائبات نئے ظہور پزیر ہوتے ہیں...... انسان کبھی نہیں سمجھ سکتا...... ہر صبح ایک نئے انداز سے سانس لیتی ہے اور ہر دن ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے۔

سو جس گھر میں، میں رہتی ہوں اس کا حال بھی ماضی سے مختلف ہی ہوتا ہے، مثلاً کل کی بات تھی کہ میں اس گھر میں بہو بن کر آئی تھی۔ بہو بھی اکلوتی اور لاڈلی...... دو نندیں شادی شدہ تھیں اپنے، اپنے گھر کی...... ایک بوڑھی ساس تھیں جن کی سانسیں اپنے پوتا، پوتی کھلانے کے لیے اٹکی ہوئی تھیں۔ بس اِدھر میرا بیٹا پیدا ہوا اُدھر ان کی بیماری اس قدر بڑھی کہ جان لے کر ہی ٹلی۔

بس اب گھر میں ایک سناٹا سا چھایا رہتا۔ دل اداس رہتا...... امی جان سے کس قدر رونق تھی، ان کے بعد اس بات کا احساس ہوا۔ سلمان بھی ماں کی جدائی سے انتہائی افسردہ تھے۔ امی جان کا انتقال ہوا تو غفران چھ مہینے کا تھا۔ اس کا نام بھی انہوں نے ہی رکھا تھا۔ غفران ہی تھا جس کی وجہ سے سلمان جلد بہل گئے۔ غفران ڈیڑھ سال کا ہوا تو طوبیٰ آگئی پھر سارہ اور نعمان، بچوں کی آمد سے زندگی ان کے ہی گرد گھومنے لگتی ہے۔ میرے ساتھ یہ سب نیا تو نہیں تھا۔ صبح ہوتی اور شام ہوتی...... ہفتے گزرتے اور مہینے سالوں میں بدلتے...... لو بچوں کو اسکول میں داخل کرانے کا وقت آگیا۔ سلمان کا شروع سے ارادہ تھا اچھے انگلش میڈیم اسکول میں بچوں کو داخل کرانا ہے

جہاں میٹرک نہیں؛ ڈیلونز ہو۔

''شانی مجھے شروع سے ارمان ہے میرے بچے خوب اچھے اسکول میں تعلیم حاصل کریں، تمہیں تو پتا ہے ناں آج کل نوکری بھی اسی بنیاد پر ملتی ہے ورنہ تو بس میری طرح قابلیت ہوتے ہوئے بھی ترقی کی دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائیں۔'' نام تو میرا شاہانہ تھا لیکن سلمان جب شانی کہتے تو ان کے منہ سے بہت اچھا لگتا تھا۔ سلمان کے شانی کہنے سے بچے بھی شانی کہنے لگے تھے بڑی مشکل سے انہیں تیار کیا کہ ممی کہو...... مجھے امی اور امی جان پسند نہیں تھا ممی میں جو زبردست بات ہے وہ امی میں کہاں؟

اچھا تو سلمان کی آرزو اور ارمان کے مطابق ہم نے بچوں کو باری، باری انگلش میڈیم اسکول میں داخل کرا دیا۔ ہر چیز میں کنجوسی کر، کر کے ہم نے بچوں کی تعلیم پر خرچ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

سلمان کی دونوں بہنیں باہر ہوتی تھیں، فون پر بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ تین چار سالوں میں ایک دفعہ چکر لگا لیتی تھیں۔ بڑی والی صبیحہ باجی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی اور چھوٹی صباحت کی تین بیٹیاں...... جب بھی آتی تھیں یہاں کے امن و امان کی صورتِ حال کی وجہ سے گھبرائی، گھبرائی رہتیں...... مگر پھر ہفتہ دس دن بعد کیا ہوتا...... ذرا دل ٹھہرتا...... اور پھر بازار اور بازار...... ربڑ کی چپل سے لے کر چادریں، تولیے تک گھر کی پوری خریداری کی جاتی۔

''وہاں تو ہر چیز بہت مہنگی ہے۔ یہ تو لیا دیکھو وہاں اس قیمت میں ایک ملتا اور یہاں چار آ گئے۔''

واقعی ڈالر اور روپے کا مقابلہ تھا۔

باجی صبیحہ سب سے زیادہ پریشان وہاں کی اس بات سے تھیں کہ سارے کام خود کرنے پڑتے تھے، ماسی رکھنا آسان نہیں...... کہتی تھیں۔

''شاہانہ تم تو واقعی شاہانہ انداز میں بس حکم چلاتی رہتی ہو ماسی پر...... ماسی برتن دھو لو، ماسی غسل

اس برس

اس برس کچھ کہہ دو تم بھی
اس برس کچھ سوچو تم بھی
جیون کی تجارت میں
کیا اور خسارا بھی دو گے
تم لفظوں کے سوداگر تھے
میٹھے جذبوں کے پیامبر تھے
کچھ لفظ اب ہم کو دان کرو
اس ہجر سے اب آزاد کرو

شاعرہ: ظل شاہین، رحیم یار خان

خانے صاف کر لو...... ہمیں دیکھو ہر کام خود کرنا پڑتا ہے۔'' میں ان کی اس بات پر مسکرا کر رہ جاتی...... اگر انہیں یہ زندگی شاہانہ لگتی ہے تو کیوں نہیں واپس آ جاتیں...... ظاہر ہے وہاں کی آسائشات تو یہاں میسر نہیں...... اور نہ ہی پھر وہ اس طرح سوٹ کیس بھر، بھر کر خریداری کر سکتیں...... خیر...... وہ میرے میاں کی بہنیں تھیں۔ مجھے ان کی آمد پر رہائش پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں حتی الامکان کوشش کرتی کہ ان کی مہمانداری میں کوئی کسر نہیں رہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے اثرات ہمارے بجٹ پر پڑتے تھے۔ بعد میں، میں دل ہی دل میں شکر کرتی تھی کہ وہ لوگ ہر سال نہیں آتے۔

جاتے ہوئے دونوں بہنیں آبدیدہ ہو جاتیں اور سلمان سے کہتیں کہ وہ بھی باہر ہی منتقل ہو جائے، کئی دفعہ اس معاملے میں ہماری طویل گفتگو ہوئی تھی لیکن آخر میں ہم دونوں ہی اس بات پر اتفاق کرتے کہ بچوں کی ہی وجہ سے ہم باہر نہیں جائیں گے۔

''کتنا مشکل ہے انہیں تربیت دینا...... باہر کا ماحول جس قدر کھلا ڈلا ہے صبیحہ باجی اور صباحت کے

بچوں کو دیکھ کر اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔'' لہٰذا ہم دونوں کی رائے اس بارے میں ایک ہی ہوتی...... البتہ تعلیمی اخراجات اب بہت بڑھ گئے تھے او لیول کی فیس پھر دو سال بعد جب فائنل امتحان ہوں گے تو ہر پرچے کی علیٰحدہ، علیٰحدہ فیس دینا ہوگی۔ کل ملا کر اس ماہ ہمیں فیسوں کی مد میں ایک لاکھ تک ادا کرنے تھے...... میں بہت فکر مند تھی۔ یہ ادائیگی کیسے اور کیوں کر ہوگی؟ میری سمجھ میں تو نہیں آرہا تھا۔ ابھی ایک مہینہ باقی تھا...... شاید سلمان کے ذہن میں کوئی راستہ ہو...... لیکن میں دیکھ رہی تھی کہ ان کے چہرے سے بھی فکرمندی جھلک رہی تھی۔

ابھی ہماری اس سلسلے میں باقاعدہ بیٹھ کر سوچ بچار اور مشورے کی نشست ہوئی تھی...... اپنی، اپنی جگہ پر ہم دونوں ہی اس مسئلے کے لیے پریشان تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ شاید اس دفعہ فیس کی ادائیگی کے لیے مجھے اپنے کسی زیور کی قربانی دینی پڑے...... اُف کتنی مشکل سے اب تک اس کی نوبت نہ آنے دی تھی...... لیکن اب شاید یہ ہی کرنا پڑے...... ظاہر ہے ایک لاکھ کی رقم معمولی تو نہیں تھی...... لیکن دوسری طرف بچوں کا مستقبل کہ جس کے لیے سارے والدین خواب دیکھتے ہیں آخر ہم نے خواب دیکھا اور اس کی تعبیر بھی چاہی تو کون سا انوکھا کام کیا......؟

میں گویا اپنے آپ کو ہی سمجھاتی رہتی تھی...... آپ کو تو پتا ہے عورت کے لیے زیورات کتنی اہمیت رکھتے ہیں...... لیکن بچے اور ان کا مستقبل تو ان سے بڑھ کر ہے...... میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو انہیں خرچ کرنے کے لیے تیار کر رہی تھی۔

آج سلمان آفس سے آٹھ بجے آگئے تھے ورنہ انہیں آتے آتے دس تو لازمی بج آتے...... لہٰذا میں نے سوچا کہ رات کے کھانے کے بعد ان سے اس مسئلے کے حل پر بات کی جائے۔

''صبیحہ باجی اور صباحت آرہی ہیں اگلے مہینے......'' کھانے کے درمیان سلمان نے خبر سنائی۔

''اچھا...... دونوں ساتھ آرہی ہیں؟''

''ہاں...... دونوں ساتھ ہی آرہی ہیں...... ایک خاص مسئلے پر انہیں بات کرنی ہے۔''

''آخر ایسا کون سا خاص مسئلہ ہے؟'' میں نے سلمان کو حیرانی سے دیکھا۔ کسی بھی مسئلے پر فون پر ہی بات کی جا سکتی تھی...... اتنا خرچ کر کے آنا ضروری تھا...... یہ بات میں نے دل ہی دل میں سوچی ان سے کہنا تو ظاہر ہے مناسب نہیں تھا۔

''ان دونوں کا کہنا ہے کہ انہیں رقم کی ضرورت ہے...... کاروبار میں نقصان ہوگیا ہے...... اور جاب بھی چھوٹ گئی ہے۔ دراصل انہیں اس گھر میں اپنا حصہ چاہیے۔''

''گھر میں سے حصہ......؟''

''ہاں یہ گھر صرف ہمارا تو نہیں ہے ناں...... امی جان کی وراثت ہے اب تک تو وہ لوگ باہر ہی تھے لہٰذا اس مسئلے کو اٹھایا نہیں گیا۔'' سلمان نے آہستہ، آہستہ بات واضح کی۔ میرا بڑھا ہوا ہاتھ میز پر ٹک گیا۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی روٹی میں نے پلیٹ میں رکھ دی۔ مارے حیرانی کے منہ کے نوالے کو چبائے بغیر نگل گئی۔

''یا اللہ...... اب کیا ہوگا؟ میں تو آپ سے بچوں کی فیس کے معاملے پر بات کرنے کا سوچ رہی تھی۔ یہ تو ایک نیا ہی مسئلہ کھڑا ہوگیا۔''

''اچھا اب زیادہ پریشان نہ ہو اللہ ہے ناں مسبب الاسباب...... وہ کوئی راستہ دکھائے گا۔'' انہوں نے میرے فق ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر تسلی دی۔ ورنہ وہ خود بے حد پریشان لگ رہے تھے۔ اس رات نہ انہیں ٹھیک سے نیند آئی نہ مجھے...... ہم دونوں ہی اس مسئلے پر فکر مند تھے۔

بالآخر میری آنکھ لگی تو خواب میں بھی میں پریشان ہی تھی۔ سلمان تہجد کے لیے اٹھ کر جانماز پر تھے...... فجر

کی نماز کے لیے مجھے اور بچوں کو اٹھا کر وہ بستر پر لیٹے تو پھر سو گئے...... میں نے بھی انہیں نہیں اٹھایا۔ اگلے دن ہفتہ تھا، بچوں کی تو چھٹی تھی، سلمان کو کبھی ہفتے کو بھی آفس جانا ہوتا تھا...... لیکن آج انہیں بھی نہیں جانا تھا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ ناشتے کی تیاری کر کے بچوں کو ناشتا کرایا اور شور نہ کرنے کی ہدایت کی اور اپنے کاموں میں لگ گئی۔

گیارہ بجے تک سلمان اٹھ گئے تھے۔ خوب تازہ دم سے تھے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا...... پریشانیوں کا حل نکالنے والا تو اللہ ہی ہے...... پھر بلاوجہ پریشان ہو کر کیوں چھٹی خراب کی جائے۔ یہ سلمان کا ہی فلسفہ تھا جسے میں نے بھی دل و جان سے قبول کر لیا۔

''شانی میں نے سوچ لیا ہے مسئلے کا حل......'' سلمان ناشتے کے درمیان بولے۔

''اچھا کیا سوچا ہے؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''ہم دونوں بہنوں کو ان کا حق گھر فروخت کر کے دے دیں گے اور اتنے پیسوں سے کوئی چھوٹا گھر یا فلیٹ لے لیں گے۔ باقی رہا فیسوں کا مسئلہ تو اس کا بھی بہت آسان حل ہے، اب تک بچوں کے اسکول اور اس کی فیسیں ہم نے تنگی ترشی سہہ کر ادا کی ہیں، یہ ہی سوچ کر کہ اچھی تعلیم، اچھے مستقبل کے لیے ضروری ہے لیکن اچھا مستقبل کیا ہے، کبھی اس کے بارے میں سوچا ہے؟ اچھا مستقبل، اچھی تربیت میں چھپا ہوتا ہے، اپنی روایات، اخلاق اور تہذیبی قدروں میں...... نصاب اگر غیروں کا ہوتا ہے تو روایات، رسوم اور تہذیب بھی ان کی ہی رچتی بستی ہے...... ہم اپنے بچوں کو اپنی چادر کے اندر رہ کر بھی اچھی تعلیم دلا سکتے ہیں۔ البتہ ایک کام اہم ہے...... ہم دونوں کو ان کی تعلیم اور تربیت کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی اور محنت کرنی ہوگی۔ بھرپور توجہ کے ساتھ۔'' سلمان کے چہرے پر کھلی مسکراہٹ ضمانت دے رہی تھی کہ مسائل کے حل پر انہیں پکا یقین ہے۔

اگلے مہینے صبیحہ باجی اور صباحت دونوں ساتھ آئیں چونکہ اسکول تبدیل کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا لہٰذا فیسوں کی مد میں رقم نہیں نکلی اور مہمان داری بہت اچھی طرح ہو گئی۔ سلمان نے ایک دن دونوں بہنوں کو بٹھا کر وراثت کا مسئلہ حل کرنے کا طریقہ سمجھا دیا۔

لیکن دونوں مسئلے کے اس حل سے مطمئن نہیں تھیں بلکہ تھوڑا خاموش اور اداس تھیں۔ انہوں نے سلمان کی بات غور سے سنی اور اگلے دو، تین دن میں سوچ کر جواب دینے کو کہا۔

''بھلا اور کیا ہو سکتا ہے؟ سوچ کر کیا جواب دیں گی؟'' میں نے بعد میں سلمان سے حیرت سے پوچھا۔

سلمان نے کندھے اچکا کر لاعلمی ظاہر کی۔ کہا تو دو تین دن کا تھا لیکن اگلے دن ہی صبیحہ باجی نے گھر بیچنے کا حل مسترد کر دیا۔

''بھائی ہمارا مسئلہ کسی نہ کسی طرح حل ہو ہی جائے گا...... لیکن یہ گھر اور اس سے لپٹی امی جان اور ابا جان کی خوشبو اور یادیں ہم کسی بھی طرح حاصل نہیں کر سکتے...... آپ اور شانی ہمارے لیے ہمارا میکا ہیں...... اور یہ گھر ہماری یادوں کا امین۔'' صبیحہ باجی اور صباحت ایک ماہ رہ کر خوشی خوشی واپس چلی گئی تھیں۔ وہ اس بات پر بھی بڑی خوش تھیں کہ سلمان ان کا حق اتنی آسانی سے دینے پر رضا مند ہو گئے تھے۔

سلمان کا کہنا ہے کہ حق تو دینا ہی ہے، لہٰذا اب اسکولوں کی بھاری فیسوں کے بجائے سلمان چھوٹے موٹے کاروبار کے لیے پیسے جمع کر رہے ہیں تاکہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حق دار کے حق کی ادائیگی کے لیے جمع کی جا سکے...... اور میں اپنی پہلی بچت سے مچھلی گھر کی شہزادی کے لیے چند سہیلیاں لے آئی ہوں...... سچ ہے کائنات کا ہر دن اپنے پہلے دن سے مختلف ہوتا ہے، کیوں ٹھیک ہے ناں......!



محبت جذبہ دل

سلمیٰ غزل

Lums یونیورسٹی میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوچکی تھیں اور اپنی امی کے بے حد اصرار پر اسے گھر جانا پڑ رہا تھا۔ اس کا دل اداس تھا اس نے بے دلی اور بوجھل پن سے سامان پیک کیا اور یونیورسٹی کا ایک چکر لگایا۔ یہاں سے جاتے ہوئے وہ ہمیشہ اسی طرح غمگین ہوجاتا تھا۔ یہ تعلیمی ادارہ اس کے لیے ماں کی طرح تھا اس کا دل بھر آیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے مڑ کر دیکھا تو سب لڑکے، لڑکیاں کھڑے

ہاتھ ہلا رہے تھے اس کا دل اور بھی بوجھل ہوگیا اور آنسو باہر نکلنے کو بے تاب......

''بھلا کبھی مرد بھی روتے ہیں؟'' اس نے خود کو سرزنش کی۔

''ہونہہ!'' ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ ''کیا مردوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا یا چوٹ لگنے کی تکلیف نہیں ہوتی۔ وہ چوٹ جو روح تک کو زخمی کردے۔'' کار اونچی نیچی سڑکوں پر بھاگتی جا رہی تھی اور اس کا دل اسی تیزی سے ماضی کی طرف لوٹ رہا تھا اور کتنے ہی سالوں کا غبار پھیل کر سامنے آگیا تھا۔

☆☆☆

شادی کے پانچ سال بعد جب بڑی منتوں مرادوں کے بعد شاہزل نے اس دنیا میں قدم رکھا تو ماں باپ کے علاوہ ننھیال میں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ددھیال میں تو کوئی تھا نہیں اور ننھیال بھی صرف نانی، ماموں اور مامی پر مشتمل تھا۔ وہ اپنی ماں حفصہ کی آنکھوں کا تارا تو باپ کے جینے کا سہارا تھا۔ وہ قدرتی حسن کا شاہکار تھا اور کیوں نہ ہوتا، بنانے والا جو عظیم تھا مگر خوشیوں کی زندگی بہت مختصر تھی جب باپ ایک ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہوگیا اور ماں بیوہ ہوکر کھلے آسمان تلے آگئی۔

حفصہ کی ماں کو کینسر تھا اسی لیے اس کے لیے لیول کرتے ہی کم عمری میں ہی اس کی ماں نے شادی کردی تھی اور اب جب شوہر کا ساتھ بھی چھوٹ گیا تو مجبور اور بے بس ہوکر اسے بھائی، بھابی کے در پر آنا پڑا جو اپنے چار بچوں کے ساتھ اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھ رہے تھے۔ حفصہ نے سب سے پہلے ہمت کرکے مونٹیسوری کی ٹریننگ لی اور پھر اسے ایک بہترین انگلش اسکول میں جاب مل گئی جہاں پرنسپل نے اس کے حالات دیکھتے ہوئے شاہزل کی فیس بھی آدھی کردی۔ حفصہ کی پوری، پوری کوشش ہوتی کہ مالی اور جسمانی طور پر بھابی پر ذمے داریوں کا بوجھ کم سے کم ڈالے مگر ان کی تیوریوں کے بل کم ہی نہیں ہوتے تھے۔ مہنگائی کے عفریت نے خون کے رشتوں میں بھی دوریاں پیدا کردی تھیں۔ شاہزل اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار، حساس اور زود رنج تھا۔ اسے اپنی ماں کی بے بسی کا احساس تھا اس لیے جب ماموں کے بچے ضدیں اور فرمائشیں کرتے تو وہ ٹکر ٹکر انہیں دیکھا کرتا تھا کبھی کبھار ماموں کو خیال آجاتا تو وہ اسے بھی بلالیتے۔

''آؤ بیٹا دور کیوں کھڑے ہو، تم بھی اپنی پسند کی چیز آکر لے لو۔'' اور اس وقت ممانی چیل کی طرح جھپٹ کر اپنے دوپٹے میں سمیٹ لیتیں اور کمرے میں گم ہوجاتیں اور ماموں کھسیانے ہوکر اسے پیار کرنے لگتے مگر جب ماں رات کو اس کے پاس لیٹ کر بے شمار باتیں کرتیں اور بانہوں میں لے کر خوب چومتیں تو پیار کی تشنگی کا احساس مندمل ہوجاتا کیونکہ ماں اس کو بے حد چاہتی تھی، یہی پیار اس کے جینے کا سہارا تھا۔

☆☆☆

جب وہ پانچویں جماعت میں تھا تو قسمت نے اسے ایک اور طوفان کے حوالے کردیا۔ ماموں اور بچوں کا کینیڈا امیگریشن ہوگیا تھا اور انہیں باہر جانے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ گھر بیچنا تھا حفصہ ہراساں تھی کہ وہ ایک معصوم بچے کے ساتھ کہاں جائے گی کبھی اس کا دل چاہتا کہ بھائی کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑ ڈالے اور پوچھے۔

''میں بھی تو تمہاری ماں جائی ہوں، کیا بیوی بچوں کے آگے سب رشتے ماند پڑجاتے ہیں۔ خون سفید ہوجاتا ہے؟'' مگر وہ سوائے رونے کے کچھ نہ کہہ سکی کہ یہی اس کے بس میں تھا۔

اسکول میں اس کی واحد دوست وریشہ اس کے حالات سے واقف تھی۔ اسے پریشان دیکھ کر بڑی

اپنائیت سے بولی۔

''دیکھو شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپانے سے طوفان تو نہیں ٹل جاتا، تم اس مسئلے کا کوئی حل سوچو۔''

''کیا سوچوں...... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا؟'' حفصہ بے بسی اور بے چارگی سے بولی۔

''ایک حل ہے میرے پاس اگر تم برا نہ مانو۔'' وریشہ جھجکتے ہوئے بولی پھر اس کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں گویا ہوئی۔ ''شادی کرلو۔''

حفصہ اس طرح اچھل پڑی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''پاگل ہوگئی ہو، ایک بچے کی ماں سے کوئی پاگل ہی ہوگا جو شادی کرے گا۔ دوسرے میں اپنے بچے پر سوتیلا باپ مسلط نہیں کروں گی، کیا شادی کرکے اسے ماں سے بھی محروم کردوں؟'' حفصہ نے صاف منع کردیا۔

''تم پہلے سن تو لو پھر شور کرنا۔'' وریشہ نے سمجھانا چاہا مگر وہ سخت اور قطعی لہجے میں منع کرتی کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

رات کو اپنے کمرے میں جاتے ہوئے بھیا، بھابی کے کمرے سے اپنا نام سن کر وہ لاشعوری طور پر رک گئی۔

''دیکھو حمزہ، میں تمہیں صاف بتارہی ہوں کہ تمہاری بہن کی وجہ سے میں اپنے بچوں کا مستقبل تاریک نہیں کروں گی۔ ایک اچھا چانس مل رہا ہے تو تم بہن کے لیے جذباتی ہورہے ہو۔ کیا ہم نے ان دونوں کا ساری زندگی کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ میں نے تمہیں کئی رشتے بتائے ہیں مگر تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آرہے۔''

''بس رہنے دو تمہارے رشتے!'' حمزہ نے دُرشتگی سے جواب دیا۔ ''جولاہے، بنجارے، قسائی...... کیا میری پڑھی لکھی بہن کے لیے یہی رشتے رہ گئے ہیں؟''

''سوچ لو...... ایسا نہ ہو بیوہ کو ایسے رشتے بھی نہ ملیں۔'' اس سے زیادہ سننے کی حفصہ میں ہمت نہ تھی وہ کمرے میں آکر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

صبح اسکول میں اس کی اجڑی شکل دیکھ کر وریشہ کے پوچھنے پر اس نے من وعن بھائی اور بھابی کی گفتگو سنادی۔

''اسی لیے کہتی ہوں شادی کرلو ثوبان بھائی سے۔ میرے شوہر کے دوست ہیں، بے حد نیک اور شریف انسان ہیں۔ شیخوپورہ میں گھر ہے اور لاہور میں بینک میں ملازمت کرتے ہیں۔ بچی کی پیدائش پر بیوی کی ڈیتھ ہوگئی تھی ننھیال کوئی ہے نہیں۔ اب بچی ددھیال میں پل رہی ہے۔ شاہزل سے کچھ چھوٹی ہے۔ پھپیاں شادی شدہ اور دادا، دادی ضعیف۔ وہ بچی کی طرف سے سخت پریشان ہیں اور مجھے یقین ہے تمہارے لیے راضی ہوجائیں گے کیونکہ میں جانتی ہوں تم ماں تو بن سکتی ہو مگر سوتیلی ماں نہیں۔'' پھر وریشہ اور اس کے شوہر کی پُرخلوص کوششیں رنگ لائیں اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کے تحت چند مہینوں میں سب کچھ ہوگیا۔ حمزہ نے بھی بہن کے ساتھ ناانصافی نہیں کی اور اس کے شرعی حق کے علاوہ ایک خطیر رقم اپنی طرف سے یہ کہہ کر دے دی کہ یہ شاہزل کی تعلیم کے لیے ہے۔

حفصہ کا خیال تھا کہ شادی کے بعد ثوبان اپنی بٹی بسمہ اور شاہزل کے ساتھ لاہور میں رہیں گے لیکن انہوں نے اپنی پرانی روٹین برقرار رکھی صبح لاہور جانا اور رات گئے واپس آنا۔

☆☆☆

حفصہ کے لیے آزمائشوں کا ایک نیا دور شروع ہوگیا ملازمت تو وہ پہلے ہی چھوڑ چکی تھی اب اسے رشتوں میں توازن قائم کرنا تھا بسمہ ایک بگڑی ہوئی

بچی تھی۔ ماں کی کمی اور بے جا لاڈ پیار نے اسے ضدی اور خود سر بنا دیا تھا۔ بھرا پرا خاندان اور لوگوں کی طنزیہ اور چبھتی ہوئی نگاہیں۔ حفصہ کی زندگی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آ گئی تھی اسے اس گھر میں اپنا ایک مقام بنانا تھا اور اپنے ماتھے سے سوتیلی ماں کا کلنک مٹانا تھا اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوگئی مگر شاہزل کو نظر انداز کر کے کیونکہ بسمہ اب اپنا ہر کام حفصہ سے کرواتی تھی ورنہ زمین آسمان ایک کر دیتی پھر حفصہ کو شاہزل کو سمجھانا پڑتا۔

''دیکھو بیٹا! بسمہ ابھی چھوٹی ہے، اسے میری زیادہ ضرورت ہے تم اپنا کام خود کرلیا کرو، آخر وہ بھی تمہاری بہن ہے۔'' تو شاہزل غصے میں چیخ پڑتا۔

''نہیں ہے وہ میری چھوٹی بہن، وہ صرف ثوبان انکل کی بیٹی ہے۔'' کیونکہ حفصہ کے کہنے پر جب اس نے ثوبان کو پاپا کہہ کر پکارا تو انہوں نے سختی سے منع کر دیا۔

''پاپا میں صرف اپنی بیٹی کا ہوں تم مجھے انکل کہا کرو۔''

☆☆☆

بسمہ بے حد ضدی، شوخ اور چنچل تھی۔ دادا کی وہ جان تھی اس لیے کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے آگے چوں بھی کرلے اور باوجود شاہزل کے دور بھاگنے کے وہ سب سے زیادہ اسی کو تنگ کرتی اور جھوٹی سچی شکایتیں لگا کر سب سے ڈانٹ پڑواتی۔ ثوبان کا بھی بیشتر وقت اس کے ناز نخرے اٹھانے میں گزرتا تھا گو انہوں نے شاہزل کو کبھی کچھ کہا نہیں تھا مگر اس کی اہمیت گاڑی کے ایک ناکارہ پرزے کی طرح تھی وہ اس گھر میں روٹی، کپڑے اور مکان کی بنیاد پر رہ رہا تھا۔ باقی اس کی تعلیم کا خرچہ اس رقم سے پورا ہو جاتا تھا جو ماں نے اس کے نام سے فکس ڈپازٹ کر دیا تھا۔ دادی، پھپیاں سب کی آنکھوں میں وہ خار کی طرح کھٹکتا تھا سوائے بسمہ کے دادا کے جو اس کے لیے سب سے بڑی ڈھال تھے وہ اکثر اسے اپنے پاس بٹھا کر اس کی تعلیمی سرگرمیوں کے بارے پوچھتے رہتے تھے جس سے حفصہ کو جینے کا حوصلہ ملتا اور شاہزل کو آگے بڑھنے کی ہمت۔

☆☆☆

وہ چھٹی کا دن تھا شاہزل کسی کام سے کچن میں گھسا تو بسمہ پہلے سے موجود تھی۔ اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شرارت ناچنے لگی۔ جونہی اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے اس نے ٹانگ آگے کر دی اور وہ سنبھلتے سنبھلتے بھی دھڑام سے نیچے گر گیا۔ میز سے سر ٹکرایا تو آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا اس کا خون کھول اٹھا اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ زور، زور سے ہنستی ہوئی بسمہ کی لمبی اور موٹی چٹیا کو پکڑ کر جھٹکا دیا اور ساتھ ہی ہاتھ موڑ کر پشت سے لگا دیا اور پھر جو بسمہ نے فیل مچایا تو اس کی چیخوں سے سارا گھر گونج اٹھا۔ سب سے پہلے ثوبان کچن میں داخل ہوئے اور بسمہ نے روتے ہوئے سہمے ہوئے شاہزل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پاپا شاہزل نے میرا ہاتھ موڑ دیا۔'' اور ثوبان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ انہوں نے بغیر کچھ پوچھے شاہزل پر ہاتھ اٹھالیا۔

''تیری اتنی جرأت کہ میری بیٹی پر ہاتھ اٹھاتا ہے، توڑ دوں گا تیرا ہاتھ۔ ہمارا ہی کھاتا ہے اور ہمی پر غراتا ہے۔'' اگر حفصہ بیچ میں نہ آجاتی تو شاید وہ اسے روئی کی طرح دُھنک دیتے۔ شور سن کر سب ہی آ گئے اور حقارت اور تمسخر سے تماشا دیکھنے لگے۔ دادی اور پھوپیوں نے بھی اپنا پورا، پورا حصہ ڈالا مگر شاہزل نے اپنی صفائی میں ایک لفظ نہیں کہا اور جب ماں نے پیار سے اسے گلے لگانا چاہا تو وہ ہاتھ چھڑا کر اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔ ماں کی تڑپ اور بے قراری اسے بناوٹی لگ رہی تھی اور اپنا وجود ایک کیڑے سے بھی بدتر۔

☆☆☆

دادا نے گھر آ کر جب بسمہ سے حقیقت پوچھی تو وہ اپنی شرارت بتاتے ہوئے شرمندہ ہوگئی۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کی یہ حرکت شاہزل کے لیے ذلت اور شرمندگی کا باعث ہوگی۔ جب دادا نے شاہزل کو بلا کر بسمہ کو اس سے معافی مانگنے کو کہا۔

''مجھے بسمہ سے کوئی شکایت نہیں پھر معافی کس بات کی۔'' اس نے سرد اور کاٹ دار لہجے میں جواب دیا۔

''بیٹا میرے لیے تم بسمہ سے کم نہیں۔ شروع، شروع میں ہم تمہاری ماں کی طرف سے مطمئن نہیں تھے مگر اس نے اپنے رویے سے ثابت کر دیا کہ وہ تمہاری ہی نہیں بسمہ کی بھی ماں ہے اور میں چاہتا ہوں اپنی صابر اور حوصلہ مند ماں کی طرح تم بھی ہر چیز بھلا کر صرف اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ معاشرے میں اپنا ایک مقام بناؤ تاکہ تمہارے مرحوم باپ کی روح کو بھی چین ملے۔ میری تمہیں صرف ایک ہی نصیحت ہے کہ ان چھوٹی موٹی دشواریوں کو راستے کا پتھر مت بنانا اور ہر مشکل اور رکاوٹ کو عزم صمیم سے کامیابی کی راہ دکھانا پھر یہ دنیا تمہیں جھک کر سلام کرے گی اور ہاں اپنی ماں سے کبھی بدگمان مت ہونا بلکہ اس کے صبر، حوصلے، استقامت اور قربانیوں کی قدر کرنا۔'' دادا اسے پاس بٹھاتے ہوئے پیار سے بولے۔

اس دن شاہزل نے خود سے عہد کیا تھا کہ اب وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھے گا۔ اس کے دن رات کی محنت رنگ لائی اور جب اس نے اے لیول میں پوری دنیا میں ریکارڈ بنایا تو Lums میں داخلے سے اسے کوئی نہ روک سکا۔ اب اسے کسی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا بلکہ اپنی دنیا خود بنانی تھی۔

☆☆☆

Lums میں چار سال پلک جھپکتے گزر گئے وہ عمر کے ساتھ ساتھ بے حد وجیہہ اور بلند قامت ہو گیا تھا۔ اس پر اس کی متانت اور سنجیدگی سونے پر سہاگا تھی۔ اس کی نظروں میں زندگی کا مقصد بہت واضح اور بلند تھا۔ ماں کی خواہش تھی کہ وہ ایم بی اے بھی اسی یونیورسٹی سے کر لے مگر اس نے اپنے ارادوں کی بھنک بھی نہ پڑنے دی اور ملازمت کے ساتھ ساتھ باہر ایم بی اے کے لیے اپلائی بھی کرتا رہا۔ اسے انتظار تھا کسی اچھی یونیورسٹی سے اسکالرشپ کی آفر کا۔ ملازمت کو دوسرا سال چل رہا تھا جب شیخوپورہ سے ماں کا بلاوا آ گیا۔ بسمہ کے دادا کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور وہ شاہزل کو یاد کر رہے تھے۔ یوں تو اس نے وہاں جانا تقریباً چھوڑ ہی دیا تھا مگر وہ دادا کی بات نہیں ٹال سکتا تھا جو ہمیشہ اس کے لیے مشعلِ راہ رہے۔ وہ آئی سی یو میں تھے۔ اس کو دیکھ کر سب کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

''منحوس یہاں بھی آ پہنچا نحوست پھیلانے۔'' دادی نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورتے ہوئے زیر لب کہا لیکن وہ سب کو نظر انداز کرتے ہوئے دادا کی طرف بڑھ گیا۔

''دادا! آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گے، میں آ گیا ہوں ناں۔'' ان کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی اور ہونٹوں پر نحیف مسکراہٹ۔ تب اس کی نظر دادا کا ہاتھ پکڑے اس لڑکی پر پڑی جو یقیناً بسمہ تھی مگر یہ وہ لڑکی تو نہیں تھی تنک چڑھی اور نٹ کھٹ۔ یہ تو کوئی آسمان سے اتری ہوئی حور تھی۔ سنہری چمپئی رنگت اور بڑی، بڑی سیاہ آنکھیں جو رونے سے اور بھی خوب صورت ہوگئی تھیں۔ اس کے بال پہلے سے بھی گھنے، دراز اور خوب صورت ہو گئے تھے۔

''ثوبان بیٹا میرے پاس وقت کم ہے۔'' انہوں نے سب کو کمرے سے نکلنے کا اشارہ کرتے ہوئے ثوبان سے کہا۔ سب منہ بناتے ہوئے باہر چلے گئے انہوں نے اشارے سے بسمہ اور شاہزل کو نزدیک بلایا پھر بہ مشکل گویا ہوئے۔ ''مجھے امید ہے تم بغیر چوں چرا میرے فیصلے کا احترام کرو گے جو میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو بسمہ

کا نکاح شاہزل سے کردو۔ رخصتی بسمہ کی تعلیم مکمل ہونے پر کردینا، مجھے یقین ہے مرتے ہوئے باپ کی یہ آخری خواہش تم ضرور پوری کرو گے۔'' یہ کہتے ہوئے ان کی سانس اکھڑنے لگی اور ڈاکٹر نے سب کو کمرے سے باہر نکال دیا اور پھر چند لمحوں بعد ڈاکٹر نے ان کی زندگی کا چراغ گل ہونے کی اندوہ ناک خبر سنادی اور بسمہ کی چیخوں سے کاریڈور گونج اٹھا۔

☆☆☆

دو چار دن تو تجہیز و تکفین کے بعد آنے جانے والوں کے ساتھ گزر گئے جو تعزیت کے لیے آرہے تھے پھر شاہزل نے سوچنا شروع کیا کہ کسی بھی لمحے بسمہ آئے گی اس پر چیخے گی، چلّائے گی، اس کو آئینہ دکھائے گی اور اس کو دل بھر کے بے عزت کرے گی پھر ثوبان انکل آئیں گے اسے اس کی اوقات یاد دلائیں گے اور ٹھڈے مار کر گھر سے نکال دیں گے مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور چالیسویں کے بعد نکاح کی تاریخ مقرر کردی گئی۔ ماں بے حد خوش تھی، بسمہ صدمے سے چور اور ثوبان انکل مصروف اور خوش، شاہزل اپنی فیلنگ سمجھنے سے قاصر تھا۔ وو دن میں دل ایک نئی دھڑکن سے آشنا ہوا تھا۔ ان گنت خوشیوں کے دیپ جل اٹھے تھے۔ اس کی نس، نس میں بسمہ کی محبت انگڑائی لے کر بیدار ہوچکی تھی اور نفرت کی آگ جانے کس طرح محبت کی پھوار میں بجھ چکی تھی۔

☆☆☆

اس دن وہ کچن میں پانی پینے جارہا تھا تو پھوپیوں کی آواز سن کر رک گیا۔

''حد کردی ابا مرحوم نے مرتے، مرتے بھی اس شاہزل منحوس کو ہمارے سینے پر مونگ دلنے کے لیے چھوڑ گئے، سمجھو اس کی تو لاٹری نکل آئی، کیا میرے اور تمہارے بیٹوں میں سے کوئی بھی بسمہ کے قابل نہیں تھا۔'' بڑی پھپو کی آواز میں غم اور غصہ تھا۔

''آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں۔'' چھوٹی پھپو نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''جسے ساری زندگی ہم نے منہ نہیں لگایا اور بھائی جان نے گھاس نہ ڈالی آج وہ اس گھر کا داماد بننے جارہا ہے۔''

''تم جانتی ہو خدا ترسی مجھ میں کوٹ، کوٹ کر بھری ہے میں نے سوچا تھا کہ یتیم ہے اپنی ربیعہ اس سے بیاہ دوں گی۔'' بڑی پھپو کم چالاک نہ تھیں۔

''ارے آپا ربیعہ سے تو وہ شاید چھوٹا ہی ہوگا لیکن میری شازیہ کے لیے بالکل مناسب تھا مگر ابا نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا مگر اب جلنے کڑھنے سے کیا فائدہ...... یقیناً ابا نے کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا کہ شاہزل ساری زندگی غلام ابنِ غلام بن کر بسمہ کے آگے سر جھکائے کھڑا رہے گا۔ وہ تو ہمیشہ ہی اس کی چھینٹی لگواتی رہی ہے، تگنی کا ناچ نچا دے گی اسے اور یہ بے غیرت شاہزل کس قدر میسنا ہے۔ پتا نہیں کس بے غیرت باپ کی اولاد ہے شرم تو جیسے نام کو نہیں۔ اس کی تو مانو لاٹری نکل آئی ہے پانچوں گھی میں...... وہ کیوں انکار کرے گا بھلا گھر آئی لکشمی کو کوئی لات مارتا ہے اتنی بڑی جائداد کا مالک بن رہا ہے اور بسمہ مفت میں۔'' دونوں بہنوں کی آواز میں نفرت کا زہر گھلا ہوا تھا اس سے زیادہ سننے کی شاہزل میں تاب نہیں تھی۔ باپ کی شفقت سے محروم بہن بھائیوں کی رفاقت سے بے بہرہ اور رشتے داروں کی ہمدردیوں سے ناآشنا لمبا چوڑا شاہزل بچوں کی طرح پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ خاموشی سے لاہور آگیا۔ امریکا روانگی کے لیے اس کا ہر کام مکمل تھا وہ چپ چاپ بغیر کسی کو بتائے امریکا پہنچ گیا اور خود کو پڑھائی میں مصروف کرلیا۔ وہ اپنے اذیت ناک ماضی کو بھول جانا چاہتا تھا لیکن رات کی تنہائیوں میں ماں کی یاد آتی تو اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا۔ ایم بی اے کے دوران ہی اسے جاب کی... آفر آگئی تھی اور وہ اپنی

زندگی سے کسی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔

ایک دن وہ مارکیٹ سے گروسری خرید رہا تھا جب اس کی نظر وریشہ آنٹی پر پڑی جو اسے دیکھ کر تیر کی طرح اس کی طرف دوڑی آئیں۔

''ارے کیسے ہو، کہاں ہو، کتنے چھوٹے تھے جب میں نے تمہیں دیکھا تھا پھر تو تصویریں ہی دیکھتی رہی'' وہ ہمیشہ کی طرح نان اسٹاپ شروع ہو چکی تھیں۔

''آپ اور یہاں؟''

''جی ہاں، میں تو دو تین سال سے یہیں ہوں لیکن تم کہاں ہو مجھے تمہاری گوشمالی کرنی ہے بغیر بتائے پاکستان سے آگئے یہ بھی نہ سوچا کہ ماں پر کیا گزرے گی؟ حفصہ سے میرا رابطہ مستقل ہے۔''

''ان کے نام خط چھوڑ کر آیا تھا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''ہاں تو کون سا احسان کیا تھا صرف اطلاع دی تھی، نہ پتا نہ خیر خبر...... بھلا جس کا ایک ہی ایک بیٹا ہو اور وہ یوں لاپتا ہو جائے تو ماں کے دل پر کیا گزرے گی۔'' وریشہ بگڑ کر چیخی۔

''آپ کچھ نہیں جانتیں آنٹی۔'' شاہزل کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی وریشہ نے بات کاٹ دی۔

''میں سب کچھ جانتی ہوں، تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا سن لو حفصہ سخت بیمار ہے ایسا نہ ہو معافی تلافی کا موقع نہ ملے اور تم تمام عمر پچھتاوؤں کی آگ میں جلتے رہو۔ اس لیے میری مانو تو جتنی جلدی ممکن ہو ماں کے پاس چلے جاؤ۔''

اور شاہزل کو لگا اسے کسی کے کہنے کا بہانہ چاہیے تھا۔ وریشہ آنٹی سے ماں کا سن کر اسے کچھ ہوا تھا۔ ایک کسک اور خلش ہمیشہ اس کا احاطہ کیے رہتی تھی۔ بسمہ کل بھی اس کے دل و دماغ میں تھی اور آج بھی اس کے خوابوں، خیالوں میں اس کی حکومت تھی اور آج وریشہ آنٹی نے اس دبی ہوئی چنگاری کو بھڑکتی ہوئی آگ میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس کے روم روم سے ماں کی صدائیں آ رہی تھیں اور بس نہیں تھا کہ اڑ کر ماں تک پہنچ جائے۔ ایمرجنسی میں اس نے جانے کا انتظام کیا اور اس سے پہلے وہ وریشہ آنٹی کو اطلاع دینے سے منع کر چکا تھا وہ اپنی ماں کو سرپرائز دے کر ان کے چہرے پر وہ سچی خوشی دیکھنا چاہتا تھا جس سے وہ کئی سال سے محروم تھا۔

☆☆☆

ایک تھکا دینے والے لمبے سفر کے بعد جب وہ ائرپورٹ پر اترا تو اسے معلوم تھا اس کا کوئی منتظر نہیں ہوگا ابھی وہ کیب لینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ آواز آئی۔

''شاہزل بیٹا!'' اس کے سامنے ثوبان انکل کھڑے تھے۔ اتنے سالوں بعد انہیں دیکھ کر شاہزل کا دل گداز ہو گیا انہوں نے بڑھ کر خود ہی اسے گلے لگا لیا۔

''میرا بیٹا، میری جان۔'' کتنی ہی دیر وہ اسے لپٹائے رہے تب ڈرائیور کی آواز نے ارتعاش پیدا کیا۔

''صاحب گاڑی میں سامان رکھ دوں؟''

گاڑی لاہور کی سڑکوں پر رواں دواں تھی۔

''انکل امی کیسی ہیں؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''انکل نہیں بیٹا، پاپا کہو تمہاری امی کافی بہتر ہیں۔'' اور اس نے کچھ نہیں سنا اس کا دل تو ابھی تک 'پاپا' کی گردان کر رہا تھا۔ جونہی گاڑی ڈیفنس کی طرف مڑی وہ حیران ہو گیا یہاں کا چپا چپا اس کا دیکھا بھالا تھا۔ لمس یونیورسٹی نے اس کو جینے کا حوصلہ دیا تھا اسے اس مقام تک پہنچایا تھا اس کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ وہ ڈیفنس شفٹ ہو گئے ہیں۔ جونہی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی وہ چھلانگ مار کر اترا اس کی جنت اس کے سامنے تھی یقیناً وریشہ آنٹی نے اس کے آنے کی اطلاع دے دی تھی مگر یہ

شکل اس کی ماں کی تو نہیں تھی، وہ تو انہیں ایک تروتازہ پھول کی طرح زندگی سے بھرپور چھوڑ کر گیا تھا مگر اب یہ پھول مرجھا گیا تھا...... شگفتگی ناپید تھی اور بدن کی عمارت کھنڈر بن چکی تھی۔ چہرے سے حزن و ملال ٹپک رہا تھا وہ بے قراری سے ان کی کھلی بانہوں میں سما گیا اب وہ بے آواز ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔ تب ثوبان انکل نے آ کر دونوں کو جدا کیا اور انہیں اپنی بانہوں میں لے کر اندر آ گئے۔

"ایک تو ویسے ہی لمبے سفر سے تھکا ہوا ہے اور تم مزید تھکا رہی ہو۔ یہ خوش ہونے کا وقت ہے کہ ہمارا بیٹا اپنے گھر پلٹ آیا ہے۔" وہ قدم، قدم پر چونک رہا تھا یہ وہ ثوبان انکل تو نہ تھے جو اس پر ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

"اب تم دونوں ماں بیٹا باتیں کرو میں ابھی آتا ہوں۔" تنہائی میسر آئی تو ماں نے ایک مرتبہ پھر گلے لگا کر رونا شروع کر دیا۔

"اماں اب بس بھی کریں آپ جانتی ہیں میں کس مجبوری سے گیا تھا۔" وہ ان کو چپ کروانے لگا۔

"جو بھی مجبوری تھی تم نے مجھے سب کے سامنے شرمندہ کیا اپنے دادا کی روح کو تکلیف پہنچائی۔ اس میں بیچاری بسمہ کا کیا قصور تھا تمہارے پاپا خاندان والوں کے سامنے کتنے شرمندہ ہوئے۔"

"خاندان والے؟ آپ کو پتا نہیں انہوں نے میرے بارے میں کیا کہا تھا؟" شاہزل کا لہجہ خودبخود تلخ ہو گیا۔

"مجھے معلوم ہے جو کچھ پھوپھیوں نے کہا وہ لفظ بہ لفظ بسمہ نے مجھے صبح بتا دیا تھا مگر بہت دیر ہو گئی تھی اور تم جا چکے تھے۔"

"اماں ویسے بھی کوئی فائدہ نہیں تھا اس شادی کا۔ بسمہ مجھے حقیر سمجھتی، نفرت کرتی تھی مجھ سے اور میں ساری زندگی اس کی نفرت سہہ کر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔" شاہزل نے مایوسی سے کہا۔

"نفرت کرتی تھی تم سے؟" اب حیران ہونے کی باری حفصہ کی تھی۔ "یہ تم سے کس نے کہا؟" پھر بتانا شروع کیا۔

"میں حسبِ معمول کاموں میں مصروف تھی جب ثوبان کے پاپا نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ میں پریشان ہو گئی میں اس گھر میں سب سے زیادہ تمہارے دادا کی عزت کرتی تھی بے حد حلیم الطبع، شفیق اور انصاف پسند۔ اس گھر میں مجھے اور میرے بیٹے کو عزت و مان انہی سے ملا اور میں اس کے لیے ان کی ممنون و مشکور تھی۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے اپنے نزدیک بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر شفقت سے بولے۔

"بیٹی آج میں نے تمہیں ایک خاص مقصد سے بلایا ہے امید ہے تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔"

"پاپا آپ حکم کریں۔" میں نے ادب سے جواب دیا۔

"بیٹی تم جانتی ہو ہمیں اپنی پوتی جی جان سے عزیز ہے۔ ہمیں اپنی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں اور ہم اس کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں دینا چاہتے ہیں، ہم اپنے بیٹے ثوبان کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ بیٹی سے لاکھ محبت کرنے کے باوجود اس کی اندرونی آنکھیں بند ہیں۔ ظاہری چیز ہی دیکھنے کی صلاحیت نہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم دونوں اولاد کی دوری کا دکھ سہو اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ بسمہ اور شاہزل کی شادی کر دی جائے، اس طرح دونوں تمہاری نظروں کے سامنے بھی رہیں گے اور ہمیں بھی اطمینان رہے گا کیونکہ شاہزل سے اچھا بسمہ کے لیے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" انہوں نے میری خاموشی سے کوئی اور ہی مطلب اخذ کیا۔

"نہیں پاپا۔" خوشی سے مجھ پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ "آپ نے جو مجھے اور میرے بیٹے کو اتنی محبت اور عزت دی اس کے لیے میرے پاس شکریے کے الفاظ تو بہت معمولی ہیں لیکن

پاپا مجھے ڈر ہے کہ آپ کا یہ فیصلہ ثوبان اور بسمہ کو شاید پسند نہ آئے۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ارے اس اُلّو کے چرخے ثوبان کی تو بات ہی مت کرو۔'' تمہارے دادا کو جوش آ گیا۔ ''غافل، بے وقوف، جاہل اور کم تو تم بھی نہیں ہو بسمہ کو بیٹی سمجھتی ہو اور کیسی ماں ہو اس کی مزاج آشنا نہیں۔ ہم سے زیادہ کون اپنی پوتی کو سمجھے گا، وہ کیا چاہتی ہے اس کی خواہش کیا ہے، ہم جانتے ہیں۔ بس شاہزل کی ذمے داری تم پر ہے۔'' پھر وہ دوبارہ گویا ہوئے۔ ''دراصل ہماری دونوں بیٹیاں اپنے بیٹوں کے لیے بسمہ کے رشتے کی طلب گار ہیں اور ہم کسی ایک کے حق میں فیصلہ کر کے خونی رشتوں میں دراڑ نہیں ڈالنا چاہتے۔ اللہ نے اولاد اور مال کو فتنہ قرار دیا ہے میں بسمہ کو تمہارے اور شاہزل کے سپرد کر کے اپنے بچوں کو آزمائش سے بچانا چاہتا ہوں۔''

ابھی یہ بات ہم دونوں تک ہی محدود تھی کہ پاپا کو ہارٹ اٹیک ہو گیا پھر تم چلے گئے یہ سوچے بغیر کہ ہم سب پر کیا گزرے گی۔ بسمہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا جو پھپھویوں نے تمہارے خلاف زہر اگلا تھا۔ گھر میں پورا خاندان جمع تھا میرا بس نہیں تھا کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ نکاح میں چند دن رہ گئے تھے اور تم غائب ہو گئے۔ ثوبان کا غصے سے برا حال تھا۔

''کہاں ہے وہ نمک حرام جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کیا۔ اس کی اوقات تھی کہ وہ میرا داماد بنے۔ نالی کا کیڑا نالی میں ہی خوش رہتا ہے عزت اس کو راس نہ آئی اور اس میں سارا قصور حفصہ کا ہے۔'' وہ غصے سے میری طرف بڑھے تو بسمہ بیچ میں آ گئی۔

''بس پاپا بس، آپ نے کہہ دیا اور میں نے سن لیا مگر اب اور نہیں۔ شاہزل کے بارے میں کچھ بھی کہنے سے پہلے آپ خود اپنا جائزہ تو لیں۔ پاپا چھوٹا منہ بڑی بات...... معاف کیجیے گا میری خوشیوں کو آگ لگانے میں سراسر آپ کا ہاتھ ہے۔ آپ میری خوشیوں کے قاتل ہیں۔ آپ باپ ہو کر مجھے سمجھ نہ سکے اور دادا نے جانا کہ شاہزل کی میری نظر میں کتنی اہمیت تھی۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''کیا بکواس کر رہی ہو، میں نے اس کا خیال رکھا، سر چھپانے کے لیے چھت دی۔ اچھا کھلایا اچھا پہنایا، یہ کیا کم احسان تھا جس کا اس نے مجھے یہ صلہ دیا۔'' ثوبان بری طرح چیخ پڑے۔ ''اس کو اس گھر سے محبت ملی حالانکہ وہ تو نفرت کے بھی قابل نہ تھا۔'' ثوبان کے لہجے میں حقارت تھی۔

''محبت......!'' بسمہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی۔ ''آپ جانتے ہیں محبت کسے کہتے ہیں۔ آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟ پاپا آپ تو میرے سگے باپ تھے میری سوتیلی ماں کے شوہر جس نے آپ کی بیٹی کو سگی ماں کی طرح چاہا اور اپنے بیٹے کو بھی نظر انداز کر دیا اور جواب میں آپ نے اس کے بیٹے کے ساتھ کیا کیا؟ وہ عورت جو آپ کی بیوی تھی، پاپا آپ پر تو دوہری ذمے داری تھی کیونکہ شاہزل یتیم تھے، آپ کو تو یہ سوچ کر ان کے سر پر دستِ شفقت رکھنا چاہیے تھا کہ قرآن میں بار بار یتیموں کی سرپرستی اور ان سے بہتر سلوک کی تاکید کی گئی ہے اور آپ نے اول دن سے اس یتیم سے مخاصمت باندھ لی تھی...... وہ یتیم جسے نہ آپ نے اپنا بیٹا سمجھا نہ اپنی بیوی کا۔ کیا یہ تھی آپ کی محبت؟ کتنا فرق ہے ایک عورت اور مرد کی فطرت میں۔ اس عورت نے جتنا آپ کی بیٹی کے لیے کیا آپ تو اس سے آدھا بھی اس کے بیٹے کے ساتھ نہ کر سکے۔ دل سے نہ سہی اپنی بیوی کی بے لوث خدمت، اطاعت اور فرمانبرداری کے بدلے ہی دان کر دیتے اس یتیم کو محبت۔''

''بالشت بھر کی چھوکری کس قدر بڑھ، بڑھ کر بول رہی ہے باپ کے آگے، چپ کر جا۔'' دادی

زور سے چلائیں مگر ثوبان نے روک دیا۔
''اماں اسے بولنے دیں، بیٹی ہے میری اس کا مجھ پر حق ہے۔''
''پاپا سب یہ سمجھتے رہے کہ میں شاہزل سے نفرت کرتی ہوں حالانکہ میں تو اسے اس کے خول سے باہر لانا چاہتی تھی۔ اسے اس گھر میں اس کا حق دلوانا چاہتی تھی کیونکہ مجھے میری ماں مل گئی تھی مگر اسے کیا ملا...... باپ کے ساتھ ماں کی محبت سے بھی محروم ہو گیا۔ سب سے زیادہ نقصان تو اسی کا ہوا ناں۔ آخر آزمائش کی بھٹی میں ہمیشہ عورت کو ہی کیوں ڈالا جاتا ہے۔ مرد کیوں اس آزمائش سے نہیں گزرتے۔ ماما کا بھائی اس وقت چھوڑ گیا جب انہیں ایک چھت کی ضرورت تھی اور اپنا گھر بچانے کے لیے انہوں نے اپنا بیٹا بھی گنوا دیا پاپا......!'' وہ روتے ہوئے بولی۔
''آپ محبت کا دعویٰ تو کرتے رہے لیکن دادا نے مجھے اور شاہزل کو پہچانا اگر وہ آج زندہ ہوتے تو شاہزل کبھی گھر چھوڑ کر نہ جاتا اور اس کی ذمے دار صرف آپ کی بہنیں ہیں۔'' اس نے نفرت سے دونوں پھوپیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''شاہزل میرے لائق نہیں تھا مگر آپ دونوں اسے اپنی بیٹیاں دینے کو تیار تھیں۔ وہ نالی کا کیڑا، بے غیرت باپ کی اولاد......تو پھر آپ کی بیٹیوں کے لیے اس میں چار چاند کیسے لگ گئے؟'' سب دم بخود تھے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو ثوبان اپنی جگہ نادم اور بسمہ کو جیسے اس دن سے چپ سی لگ گئی ہو ثوبان شرمندہ تھے مجھ سے، بسمہ سے اور خود سے پھر دادی کے انتقال کے بعد ثوبان، بسمہ کی خاطر لاہور شفٹ ہو گئے کیونکہ بسمہ کا بھی داخلہ لمس یونیورسٹی میں ہو گیا تھا اور شادی کے لیے کوشش کے باوجود اس کی نہ ہاں میں نہیں بدلی اور نہ تمہاری خبر ملی، تم نے پھوپیوں کے کیے کی سزا بسمہ کو کیوں دی؟'' شاہزل کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔
''اماں آخر بسمہ ہے کہاں؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔
''اپنے کمرے میں ہوگی۔''
''اماں وہ مجھ سے ناراض ہوگی؟'' شاہزل نے ڈرتے، ڈرتے سوال کیا اور حفصہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔
''ڈرتے ہو اس سے اب تک؟'' انہوں نے شرارت سے پوچھا۔
''خونخوار بلی سے کون نہیں ڈرتا۔ پتا نہیں کب پنجے نکال کر منہ نوچ لے۔'' وہ شوخی سے مسکرایا اور بسمہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ پھر ہمت کر کے دستک دیتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا جو اسے دیکھ کر گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور کمرے سے نکلنا چاہا مگر دروازے میں شاہزل چٹان کی طرح استادہ تھا۔ اس نے نرمی سے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا جو ہولے، ہولے کانپ رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔
''میری طرف دیکھو۔'' بسمہ نے نظر اٹھائی تو محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر شاہزل کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہا تھا۔
''بسمہ آخری مرتبہ اتنے آنسو بہاؤ کہ ساری تلخیاں، سارا دل کا غبار اور شکوے، شکایتیں ان میں بہہ جائیں اور کان کھول کر سن لو اب اگر تمہاری آنکھوں میں آنسو آئے تو......'' اس نے بسمہ کا ہاتھ موڑ کر کمر سے لگایا اور موٹی سی چٹیا ہاتھ میں لے کر پیار سے بولا۔ ''اب کس کو بلاؤ گی...... اب تو وہ میرے بھی پاپا ہیں۔'' بسمہ کو ہنسی آ گئی اور بے ساختہ اس کے شانے پر سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لیں، دونوں کی دھڑکنیں ایک مدھر تال پر ان کہی کہانیاں کہہ رہی تھیں۔



اسیری

سیما بنتِ عاصم



محلے کی مسجد سے جس وقت اللہ والی مائی کے انتقال کی خبر نشر کی گئی علاقے بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ ماحول پر اداسی و سوگواری کی دبیز چادر تن گئی۔ اللہ والی مائی کو کون نہیں جانتا تھا۔ ان کے اصل نام سے دنیا ناواقف تھی۔ ان کی صفت ہی ان کی پہچان بن گئی تھی۔ درویش صفت، عبادت گزار اور اعلیٰ مرتبت اللہ والی مائی کی روحانیت کے قصے دور، دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ جنہیں سن کر حاجت مند دور، دور کے علاقوں سے بھی آتے اور فیض یاب ہو کر جاتے۔ شفا کے طالب مریض کسمپرسی اور قرض داری کے شکار لوگ، بیٹوں اور بیٹیوں کے رشتوں کے طلبگار غرضیکہ سب غرض مند شامل ہوتے۔ ان کی دعا میں بڑی برکت تھی۔ جس کے اکثر لوگ معترف تھے۔ عمر کا بیشتر حصہ عبادت میں صرف کیا۔ حاجت مند عورتیں ان کی خدمت میں حاضری دیتیں، وہ آنکھیں بند کیے عبادت میں ہی مشغول نظر آتیں۔ ان کا نظر اٹھا کر دیکھنا بھی ضرورت مندوں کو ڈھارس بخش دیا کرتا تھا۔ دعائیں...... وظائف، روحانی علاج، ان کی کرامت کے قصے زبان زدِ عام تھے۔ ان کی وفات کی خبر پل بھر میں جنگل کی آگ کے مانند پھیلی تھی۔

رشیدہ نے ڈیوڑھی سے پردہ سرکا کر پڑوسن کو پکارنا چاہا تو وہ پہلے ہی دروازے میں کھڑی اِدھر اُدھر جھانک رہی تھی۔

”ارے صفیہ بہن کچھ سنا تم نے......؟“ اس نے

پڑوسن کو پکارا۔

''بالکل سنا...... بڑی بھاگوان تھیں اللہ والی مائی۔ دن بھی کیا خوب پایا...... جمعتہ المبارک اور وہ بھی ربیع الاول کا مہینہ۔''

''سچ ہے ان کے درجے، مرتبے سے کس کافر کو انکار ہے۔ دور، دور تک مشہور تھیں۔ جانے کہاں، کہاں سے عورتیں آتی تھیں ان کے پاس...... اللہ پاک ان کی دعاؤں کے وسیلے سے سن لیا کرتا تھا۔ مگر اللہ نے مشکل آسان کردی اللہ والی مائی کی...... آخر میں بڑی ہی اذیت میں دن گزارے۔ مسجدوں تک میں ان کی مشکل آسان ہوجانے کی دعائیں کروائی گئی تھیں۔ توبہ، توبہ ایسا مرض نہ دیکھا نہ سنا۔'' صفیہ نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

''کب تک چلنے کا ارادہ ہے؟ سب ساتھ ہی چلیں گے۔ رضیہ اور نگہت کو بھی کہہ دیتی ہوں۔''

''سنا نہیں کیا...... نماز جنازہ بعد نمازِ جمعہ پڑھائی جائے گی۔ میں تو سمجھو بس فارغ ہی ہوں۔''

''گڈو آنے والا ہے اسکول سے، چلتے وقت مجھے آواز دے لینا۔'' رشیدہ کہہ کر واپس گھر میں آئی اور معمول کے کام تیزی سے نمٹانے لگی۔

بڑی ہی کرامت والی تھیں اللہ والی مائی۔ خود کو انسانیت کی بھلائی اور خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ سنا تھا گاؤں میں بڑی زمینیں تھیں اسی کی آمدنی آتی تو غریب غربا میں تقسیم کردیتیں۔ علاقے کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس نے ان کی ذات سے فیض نہ پایا ہو، عبادت، خدمت اور دعا...... خود رشیدہ کا حمل دوبار ضائع ہوا۔ اگلی بار اللہ والی مائی سے دم درود کروایا۔ انہوں نے قمیص کے دامن پر آیت لکھ کردی۔ تعویذ بھی دیا سرہانے رکھنے کے لیے اور اللہ کے فضل و کرم اور اللہ والی مائی کی دعاؤں کی برکت سے ہنستا کھیلتا گڈو اور اس کے بعد منا، آج رشیدہ کی گود میں ہمک رہا تھا۔

اس کے گھریلو کام نمٹانے تک گڈو اسکول سے آچکا تھا۔ رشیدہ اس کے کپڑے بدلوا کر کھانا کھلانے کے بعد سائیکل مرمت کی دکان پر اس کے باپ کے پاس بٹھا کر صفیہ کے گھر پہنچی تو محلے کی اور بہت سی عورتیں بھی صفیہ کے گھر موجود تھیں۔ اللہ والی مائی کی کرامت کے قصے بیان کیے جارہے تھے۔ ان کی نیکی، پاکبازی، تقویٰ و فلاح...... بالآخر وہ سب قافلے کی صورت اللہ والی مائی کے مکان کی جانب چلیں...... مکان کا بیرونی حصہ آستانے کے لیے وقف تھا۔ جبکہ اندرونی حصے کی جانب جانے کی نوبت بیشتر لوگوں کے لیے پہلی بار آئی تھی۔ سکینہ کو غش پر غش آرہے تھے۔ دلاسے، صبر، ہمت کی تلقین کچھ کام نہیں آرہا تھا۔ اس کی آہ و بکا آسمان کو چھو کر لوٹ رہی تھی۔ اللہ والی مائی کے معتقدین عورتوں و مردوں کا ٹھٹھ لگا ہوا تھا۔ میت کی تجہیز و تکفین کے انتظامات کیے جارہے تھے۔ گھر کے باہر شامیانے میں مردوں کے سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ اندر کمرے میں عورتوں کے لیے سفید چاندنی کا فرش بچھایا گیا تھا جس پر بیشتر عورتیں تلاوتِ قرآن پاک میں مشغول تھیں۔ ماحول پرسوز تھا جو عورتیں قرآن پاک کی تعلیم سے بے بہرہ تھیں وہ تسبیح لے کر کلمہ پڑھنے لگیں یا پھر دانوں پر ورد کرنے لگیں۔ صفیہ بھی تسبیح لے کر رشیدہ کے پاس آبیٹھی۔

''آہ بیچاری سکینہ، صبر ہی نہیں آرہا غریب کو۔''

''خدمت بھی تو بہت کی اس نے اللہ والی مائی کی۔ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ دونوں کے درمیان نند بھاوج کا رشتہ تھا۔ اپنے آپ کو وقف کردیا تھا سکینہ نے اللہ والی مائی اور ان کی معتقدین عورتوں کی خدمت گزاری کے لیے۔ خود مائی کی بھی آخر تک پٹی نہ چھوڑی۔'' رشیدہ کے جواب پر صفیہ نے آہ بھری۔

''سچ ہے اللہ والی بے اولاد تھیں، نند کو اولاد ہی

کی طرح رکھا مگر آخر وقت بہت ہی کرب و اذیت میں گزارا۔ سارا دھڑ بیکار ہوگیا تھا۔ زبان تک گنگ ہوگئی تھی۔ پھر سارے جسم پر پھوڑے نکل آئے۔ جو ہر وقت رستے ہی رہتے تھے۔ ان کے چہرے سے ہی تکلیف و اذیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ اکثر آنکھوں سے آنسو جاری رہتے۔'' ایک اور عورت نے ان کی گفتگو میں حصہ لیا۔

''چار روز بخار ہوجائے تو انسان کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ ایسی تکلیف کرب و اذیت میں آخری وقت گزارنا بھی جنتی ہونے کی نشانی ہے۔'' رشیدہ نے کہا۔

''اللہ والی مائی تو یوں بھی اعلیٰ مرتبت تھیں۔ جس کے حق میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتیں، سمجھو اللہ کی رحمت کے در اس پر کھل گئے۔ برسوں سے گوشہ نشین تھیں...... کسی سے کلام بھی کم ہی کیا کرتی تھیں۔ دنیا سے گویا ان کا واسطہ ہی نہیں تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔ نند کو بھی لوگوں کے سامنے نہیں آنے دیتی تھیں، اس کی حفاظت کرتی تھیں ایسے میں ان کے لیے برا سوچنا بھی گناہ ہے۔'' صفیہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''مگر اللہ بڑا ہی نکتہ نواز ہے، کبھی معمولی سی غلطی، کوتاہی یا زیادتی بھی پکڑ میں آجاتی ہے۔ اور کبھی چھوٹی سی نیکی پر خوش ہوکر بڑے سے بڑے گناہ گار کو بھی بخش دیا کرتا ہے۔'' ایک اور عورت نے کہا۔

''اللہ تعالیٰ سب کے گناہِ کبیرہ وصغیرہ معاف فرمائے۔'' رشیدہ کہہ کر پھر تلاوتِ قرآن پاک میں مشغول ہوگئی۔ بالآخر مسجد سے جمعتہ المبارک کا خطبہ شروع ہوا اور پھر جنازہ اٹھنے کا وقت آگیا۔ سکینہ مچل مچل کر ایک عورت کی بانہوں سے نکلی جارہی تھی۔ اللہ والی مائی کی چارپائی کی پٹی سے سر پٹخ رہی تھی۔

''بھابی......اے بھابی......ہائے میں لٹ گئی۔'' صفیہ نے آگے بڑھ کر سکینہ کو قابو کیا۔ دو چار مرد میت اٹھانے کے لیے اندر آئے۔ عورتوں نے آنچلوں سے منہ ڈھانپ لیے۔ کلمۂ شہادت بلند ہوا۔ معتقدین عورتیں دہاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ سکینہ ایک چیخ مار کر صفیہ کی بانہوں سے نکلی۔ دو چار عورتوں نے آگے بڑھ کر اسے تھاما۔ وہ مزاحمت کرتے ہوئے سر پٹخنے لگی۔

''بھابی......اے بھابی، مجھے کس کے سہارے چھوڑ گئیں۔ میں تو کہیں کی نہیں رہی......'' وہ آہ و بکا کرتی بے ہوش ہوگئی۔ اس کا سر صفیہ کی گود میں لڑھک گیا۔ سر سے آنچل ڈھلکا اور اس ڈھلکے ہوئے آنچل نے بہت سے راز افشاں کردیے۔ بالوں میں چمکتے چاندی کے تاروں نے ڈھلتی عمر کا بھید کھول دیا۔ آج تک کوئی ... نہیں جان پایا تھا کہ سکینہ کس عمر کی ہے۔ سکینہ کے بین بے سبب نہ تھے۔ وہ سچ مچ بے سہارا رہ گئی تھی۔

''اب بیچاری سکینہ کا کیا بنے گا؟'' یہ سوال ایک ساتھ کئی لوگوں کے ذہنوں میں ابھرا تھا۔ ''مگر یہ فکر اللہ والی مائی نے کیوں نہیں کی؟'' وہ تو ہر حاجت مند کو حاجت پوری کرنے کے وظائف اور ورد بتاتی تھیں لیکن سکینہ اب تک کنواری کیوں......؟ یہ کوتاہی تھی یا چشم پوشی...... بے شک سزا و جزا...... نیکی و بدی کا معاملہ اللہ اور بندے کے مابین ہے۔''

''مگر کہیں......؟'' ایک ساتھ کئی نگاہیں آپس میں ٹکرائی تھیں۔

''اللہ ہی جانے......'' نگاہیں واپس پلٹی تھیں۔

بے شک سزا و جزا کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ معمولی سی کوتاہی کی پکڑ...... یا عظیم تر گناہ کی معافی...... بھلا انسان کیا کہہ سکتا ہے......؟



مکمل ناول

اسیرِ وفا

زمر نعیم



گھر میں گھستے ہی بکھری چیزوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ صبح آفس جاتے وقت بھی گھر کی حالت کچھ ایسی ہی تھی مگر اب مزید ابتر دکھائی دے رہی تھی۔ سنی، گولڈی کے کھلونے پورچ تک آوارہ گردی کرتے پھر رہے تھے، ڈائننگ ٹیبل اور کچن کی کتنی چیزیں اور برتن ٹی وی لاؤنج میں پڑے منہ چڑا رہے تھے، غصے کی ایک لہر اس کے تن بدن میں پھیل گئی۔ دن بھر آفس میں دماغ خرچ کرنے کے بعد گھر آ کر اس کی



بے ترتیبی دیکھنے کے بعد اس کا بے ساختہ غصے میں آنا بنتا تھا۔ وہ دندناتا ہوا بریف کیس ایک طرف پٹخ کر نانو جان کے کمرے میں گھستا چلا گیا۔ نانو جان بھی اپنی وہیل چیئر کے پہیے گھماتے ہوئے باہر آرہی تھیں۔

''عصمیٰ ...... عصمیٰ۔'' وہ ایک دم رک کر چھوٹی بہن کو زور، زور سے پکارنے لگا۔

''کیوں چلا رہے ہو؟ کیا ہوگیا ہے آخر؟'' نانو جان نے اپنی سنہری فریم والی عینک کو درست کرتے ہوئے انجان بن کر پوچھا۔

''کہاں ہیں سب......؟ یہ، یہ دیکھ رہی ہیں آپ ...... عصمیٰ......سنی۔'' وہ انہی چیزوں اور پھیلاوے کی طرف اشارے سے بتانے کے بعد پھر سے بہن کو پکارنے لگا تو عصمیٰ، سنی، گولڈی بھی آگے پیچھے سہمے ہوئے سے سامنے آگئے۔ چار سالہ سنی اور تین سالہ گولڈی کو اپنے چاچو کا چلانا حیران کررہا تھا۔

''یہ...... یہ سب کیا ہے؟ گھر ہے یا کباڑ خانہ، کوئی چیز بھی اپنی جگہ پر نہیں، ہر روز یہی منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ تم کیا کرتی رہتی ہو سارا دن، یہ چیزیں سمیٹ کر نہیں رکھ سکتیں۔'' آج جیسے اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔ اس کا رخ عصمیٰ کی طرف تھا۔ بچے اسے دیکھے جارہے تھے۔ نانو نے محسوس کرکے جواباً اسے ڈپٹا۔

''ثعلب...... بچی کو کیوں ڈانٹ رہے ہو، کیسے سنبھال سکتی ہے اکیلی وہ گھر کا نظام اور تم بھول رہے ہو، آج عصمیٰ کا کالج میں پہلا دن تھا۔''

''اوہ آئی سی......'' وہ ایک دم شرمندہ سا ہوگیا۔

''کالج سے آتے ہی بچوں کے ساتھ جان ہلکان کررہی ہے میری بچی...... یہ تمہاری سر چڑھائی آفت کی پرکالہ کی کارستانی ہے ساری...... میرے قابو میں آتے ہیں بھلا بچے......'' نانو نے مزید وضاحت دی تو وہ بالکل ہی ٹھنڈا ہوگیا۔

''نانو ملازم تو ہیں ناں گھر پر، آپ ان سے یہ کام کیوں نہیں کرواتیں۔ آخر انہیں کس لیے رکھا ہوا ہے، دیکھیں ناں کتنا برا لگ رہا ہے گھر کا حال۔'' اس کی نگاہ میں اِدھر اُدھر بکھرے کشن تھے۔

''مجھ میں اتنا دم خم کہاں کہ ان سے کام لے سکوں۔ اور پھر میری سنتا کون ہے، تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ شادی کرلو۔ آخر کب تک......؟''

''پلیز نانو جان، میں ابھی بے حد تھکا ہوا ہوں، آپ کی بات فریش ہوکر سنوں گا۔'' وہ بیزاری دکھاتا انہیں ٹالتا وہاں سے نکل گیا۔

''نہیں سنتا ہماری بات، روگ لگالیا ہے خود کو۔'' نانو جان بھی وہیل چیئر کے پہیے گھماتی لاؤنج میں آگئیں۔

☆☆☆

فریش ہوکر وہ خود چائے کی طلب میں کچن میں چلا آیا تھا۔ شہنی بوا، عصمیٰ کے کہنے پر پہلے ہی چائے تیار کرچکی تھیں۔ اسے چائے کا مگ تھماتے ہوئے بولیں۔

''بیٹا! بڑی بی بی ٹھیک ہی تو کہتی ہیں، اس گھر کو گھر والی کی ضرورت ہے۔'' بوا نے جھجکتے ہوئے مشورہ دیا تو وہ خلافِ توقع مسکرادیا۔

''اچھا! سبھی کو لگتا ہے، میری شادی ہر مسئلے کا حل ہے۔ ایک اور عورت یہاں آکر کیا تیر مارلے گی جبکہ آپ اور نانو کچھ نہیں کرسکتیں۔ مجھے مت پھنسائیں۔'' وہ چائے کا مگ لے کر لاؤنج میں آگیا۔ جہاں نانو کے ساتھ بچے بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی دونوں اس کی طرف لپکے۔

''چاچو، آپ کو اپنا پرامس یاد ہے ناں......آپ نے کہا تھا آج ہمیں آئس کریم کھلانے لے جائیں گے۔'' سنی نے اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھتے ہوئے یاد دلایا۔

''یاد ہے، یاد ہے میری جان ......بس ریڈی ہوجاؤ، ابھی چلتے ہیں، بعد میں مجھے کچھ کام ہے۔'' وہ چائے کا گھونٹ بھرتے، بھرتے سر ہلا کر بولا۔ سنی اور گولڈی جانے کا سنتے ہی کمرے کی طرف بھاگے اور عصمیٰ کو آوازیں دینے لگے۔ عصمیٰ، نانو کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔ ثعلب نے اسے دیکھتے ہی چلنے کے لیے کہا۔

''عصمیٰ تم بھی جلدی سے آجاؤ، پلیز آئس کریم

کے علاوہ کوئی فرمائش مت کرنا۔ اور ان دونوں شیطانوں کو بھی سنبھال لینا ، اوکے......'' وہ جلدی، جلدی چائے پینے لگا۔

''اس کا مطلب ہے اب تم فریش ہو۔ پھر تو مجھے میری بات کا جواب ملنا چاہیے، کیا سوچا ہے؟'' نانو نے اسے سنجیدگی سے گھورا تو وہ چونک کر بولا۔

''ابھی...... میں کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکوں گا نانو...... پھر سہی پلیز...... چلو، چلو بچو! آجاؤ ورنہ نانو پھر اپنا مشن شروع کردیں گی۔'' وہ مگ سائڈ ٹیبل پر رکھتا ایک دم اٹھا اور بچوں کو پکارتا وہاں سے نکل گیا۔ بچے اور عصمیٰ اس کے پیچھے، پیچھے لپکے...... نانو نے چشمہ درست کرتے ہوئے انہیں جاتے دیکھا......ان کے چہرے پر ...... بڑی گہری سنجیدگی تھی۔

آئس کریم پارلر میں بیٹھے وہ چاروں اپنے، اپنے پسندیدہ فلیور کھاتے ایک دوسرے سے چھین جھپٹ کرتے مستیاں بھی کررہے تھے۔ آخر ثعلب نے اپنا آئس کریم کپ گولڈی اور سنی کے حوالے کرکے اپنی جان چھڑائی۔

''بھائی! ایک بات کہوں؟'' عصمیٰ نے کچھ توقف سے بھائی کو مخاطب کیا۔

''کیا بات......؟ کالج میں تو کوئی پرابلم نہیں ہے؟'' بہن کی جھجک محسوس کرکے ثعلب نے ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرکے ایک طرف رکھتے ہوئے پوری توجہ اس کی طرف مبذول کی۔

''نہیں، وہاں کوئی پرابلم نہیں ہے۔ میں کہہ رہی تھی آپ آخر نانو جان اور آپی کی بات مان کیوں نہیں لیتے۔ بڑی بھابی تھیں تو ہمارے گھر میں کتنی رونق ہوتی تھی، ہر ایک خوش رہتا تھا مگر اب......'' وہ بولتے، بولتے اداس ہوگئی۔

''مگر اب کیا......؟ ڈونٹ وری میری بہن، آہستہ، آہستہ سب نارمل ہوجائے گا۔''

''خود سے کیسے نارمل ہوگا بھائی! کوشش کرنی ...... پڑے گی آپ کو، کوئی تبدیلی ضروری ہے ہمارے گھر کے لیے ورنہ ہماری اداسیاں مستقل ہونے والی ہیں۔'' وہ آزردگی سے بولے گئی۔ ثعلب نے اسے اس احساس سے نکالنے کے لیے چٹکی بجاکر مذاق سے چھیڑا۔

''واؤ...... مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ میری چھوٹی سی بہن عصمیٰ ہے، کالج میں جاتے ہی اتنی بڑی، بڑی باتیں......ایک دن میں اتنی ترقی...... خدا خیر کرے......'' عصمیٰ ذرا سا جھینپ کر مسکرائی تو سنی نے بھی آئس کریم سے توجہ ہٹائے بغیر بڑے پن سے مشورہ دیا۔

''چاچو، آپ شادی کرلیں ناں...... میں آپ کا شہ بالا بنوں گا۔'' چار سالہ سنی کی بات اسے حیران بھی کر گئی اور محظوظ بھی...... اس نے بڑھ کر اسے چپت لگائی۔

''بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ...... کس نے سکھائی یہ بات؟''

''مجھے کیا ضرورت ہے انہیں سکھانے کی، سارا دن تو گھر میں نانو یہی تذکرہ کرتی ہیں سو۔'' عصمیٰ نے فوراً پیش بندی کی۔

''باز آجاؤ عصمیٰ، تم لوگوں کو اپنے عیش پیارے نہیں ہیں کیا......؟ آنے والی نے سب سے پہلے تمہیں تڑی پار کرنا ہے پھر روتی رہ جاؤ گی۔'' ثعلب نے اسے ڈرانا چاہا۔

''یہ صرف آپ کے وہم ہیں۔ میں اپنی بھابی کو اپنا دوست بنالوں گی، بڑی بھابی نے بھی تو ہمیں کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ ہمیں اچھی امید رکھنی چاہیے بھائی۔'' عصمیٰ یک دم سنجیدگی سے بولی تو ثعلب بھی فوراً سنجیدہ ہوکر کھڑا ہوگیا۔

''تمکین بھابی جیسا نہ تو کوئی ہوسکتا ہے اور نہ ہی کوئی ان کی جگہ لے سکتا ہے۔ کسی اور سے ایسی امید مت رکھنا...... چلو بھئی۔'' اس نے گولڈی سے کپ لے کر میز پر رکھا اور اسے زبردستی گود میں لے کر بل ادا کرتا پارلر سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''ممی بھائی، آپ کو ایک اطلاع دینی ہے......

اگر آپ سننا چاہیں تو!'' عصمیٰ پیچھے بیٹھی ہوئی تھی، گولڈی اور سنی فرنٹ سیٹ پر، وہ عصمیٰ کو کالج اور سنی کو اسکول چھوڑنے جا رہا تھا کیونکہ آج دونوں کی وین نہیں آئی تھی۔

''اب صبح، صبح کوئی ایسی خبر مت سنا دینا جو میرا موڈ خراب کردے..... ویسے ہی کچھ دنوں سے ایک بات سن، سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔'' ثعلب نے خاصی بیزاری سے کہا۔

''ٹھیک ہے، آپ نہیں سننا چاہتے تو آپ کی مرضی..... بعد میں مت کہیے گا کہ ہم نے آپ کو بے خبر رکھا۔'' اس نے مصنوعی خفگی سے سسپنس پیدا کیا تو ثعلب ایک دم چونک کر پوچھنے لگا۔

''کیا..... مطلب.....؟ کیا خبر ہے، کیا بات ہے؟''

''ویک اینڈ پر آپی آرہی ہیں۔'' وہ اس کے اصرار پر بتانے لگی

''اُف.....آخر تم لوگ مجھ پر ترس کیوں نہیں کھاتے..... کیوں، مجھے بکرا بنانے پر تلے ہو۔'' وہ اِک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

''یہ تو آپ آپی سے ہی پوچھیں۔ سنا ہے، اس بار وہ اپنے اٹل ارادوں سمیت آرہی ہیں۔'' وہ بھائی کی حالتِ زار سے محظوظ ہوئی۔ ''بس آپ اپنی خیر منائیں۔''

''تم مذاق.....تو نہیں کر رہیں؟'' بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے اس نے جیسے خود کو تسلی دی۔

''میں نے آپ سے پہلے کبھی مذاق کیا ہے، نہیں یقین تو نانو سے پوچھ لیجیے گا۔ اس بار آپ کی جان چھوٹنی مشکل ہے، ہماری نہیں تو آپی کی بات تو مانیں گے ناں آپ۔'' عصمیٰ واقعی سنجیدہ تھی۔

''ماننے والی بات ہو تو دل مانے بھی۔ خیر آنے دو انہیں۔'' وہ جیسے خود کو سمجھانے، بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ انہیں چھوڑ کر وہ گولڈی کے ہمراہ واپس آکر آفس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ گولڈی ابھی اسکول نہیں جاتی تھی۔ تتلا کر باتیں کرتی تھی، ہر وقت اپنے چاچو کے گلے کا ہار بنی رہتی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ چاچو کے ساتھ آفس بھی چلی جائے۔

☆☆☆

وہ تیار ہو کر ناشتا کرنے بیٹھا تو نانو کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اسے سنانے کو تذکرتا بولنے لگیں۔

''کل فون آیا تھا صبحیٰ کا..... گھر کی حالت جان کر پریشان ہوگئی..... آرہی ہے پرسوں.....''

''مل گئی ہے خبر مجھے..... آپس کی بات ہے نانو.....ان کی سسرال والوں کو ہر دوسرے ہفتے ان کے یہاں آنے پر اعتراض نہیں ہوتا؟'' وہ غیر سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

''اچھا! انہیں کیوں اعتراض ہوگا، وہ ان سے اجازت لے کر آتی ہے اور اب وہ اس گھر کے مسئلے نہیں سمجھیں گے تو کون سمجھے گا۔'' نانو نے اسے گھور کر کہا۔

''افوہ..... آپ سبھی نے گھر کے مسائل کو ہوّا بنا دیا ہے۔ میں اب خود ہینڈل کرلوں گا۔'' وہ کچھ جھنجلا کر بولا اور پھر چائے پیتے، پیتے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب تک تو تم ہمارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اب ہینڈل کرلوگے..... سب کچھ تو مجھ بوڑھی جان کو سہنا پڑتا ہے۔'' وہ خفگی و بیچارگی سے بولتی ہوئی وہیل چیئر موڑ کر کمرے کی طرف جانے لگیں تو وہ کپ میز پر رکھ کر انہیں منانے بڑھا۔

''نانو.....پلیز..... آپ تو میرے جذبات سمجھیں۔ میرے لیے زندگی کا یہ فیصلہ ماننا اتنا آسان نہیں ہے۔''

''انسان اگر چاہے تو کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اپنے دل کو سمجھاؤ اور حقیقتوں کا سامنا کرو۔ پوری زندگی اس طرح نہیں گزرے گی۔'' نانو مزید سنجیدہ ہوگئیں۔

''نانو، آپ نے کیا فلسفۂ زندگی پر پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ قسم سے بڑی مشکل باتیں کرتی ہیں آپ، سارا دن سوچتا رہوں گا۔'' اب بھی اس نے مذاق میں انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔

''ہاں سوچو ضرور سوچو.....سوچنے سے راہیں نکلتی ہیں۔'' نانو نے اس کا ہاتھ تھپکا جو کہ اُن کے کندھے پر

دھرا تھا۔

''چاچو...... میں ریڈی (ریڈی) اوں آپ تے سات جاؤں دی......'' (آپ کے ساتھ جاؤں گی) گولڈی رنگ برنگے حلیے میں پکارتی ہوئی ڈائننگ روم میں آئی تو ثعلب نے بے بسی سے پہلے نانو کو اور پھر اسے دیکھا۔

''my sweet heart آج تو میں آفس نہیں جا رہا...... دیکھو ہم کل چلیں گے۔'' ثعلب نے بڑھ کر اسے گود میں لے کر بہلانے کی کوشش کی...... مگر اس کی سوئی ساتھ جانے پر ہی اٹکی ہوئی تھی۔ ثعلب مجبوراً اسے ساتھ لے کر نکلا...... کچھ دیر اِدھر اُدھر لے کر گھومتا رہا...... وہ اپنی پسند کی چاکلیٹ آئس کریم وغیرہ لے کر گھر جانے پر راضی ہوئی...... ثعلب کے لیے یہ روز کا مسئلہ تھا۔ سنی تو اسکول جانے سے بہل گیا تھا پر گولڈی کو منانا مشکل ہوتا تھا۔ زندگی نے اچانک اسے غیر متوقع حالات میں لا پھینکا تھا۔

وہ بڑے بھائی عاقب اور ان کی بیوی نگین کی اچانک حادثاتی موت کے بعد سے اپنا آپ بھلائے گھر کو بھی سنبھال رہا تھا اور رشتوں کو بھی...... بظاہر سبھی کچھ معمول پر تھا سوائے اس کے دل کے...... جو کسی طرح بھی زندگی کے سفر میں اپنے لیے نئے ہم سفر کو چننے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ ایک کسک اسے روکتی تھی۔

☆☆☆

''امی جی! میں دوپہر کی فلائٹ سے لاہور جا رہی ہوں۔ نانو کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، پرسوں واپس آ جاؤں گی۔'' صہبیٰ لاؤنج میں بیٹھی اپنی ساس کے لیے چائے لے کر آئی تو پاس بیٹھ کر انہیں اطلاع دی۔

''اچھا......!'' شہود نے اجازت دے دی؟''

سعیدہ خانم نے کچھ تردد سے پوچھا تو اس کے چہرے پر الجھن نظر آنے لگی۔

''جہ......ی...... وہ مگر آپ...... ! کوئی بات ہے امی جی؟'' ساس کی بات پر وہ ٹھٹک گئی تھی۔

''بات تو صاف ہے بیٹا! برا نہ ماننا، عورت کی غیر موجودگی مرد کو بھی پریشان کرتی ہے اور بچوں کو بھی۔ پچھلی بار تم گئی تھیں تو بچوں نے بہت تنگ کیا تھا۔'' سعیدہ خانم نے بلا جھجک اپنے رویّے کا جواز دیا تو صہبیٰ کی الجھن بھی رفع ہو گئی پھر وہ اپنی مجبوری کے احساس میں بولی۔

''مجھے احساس ہے امی جان...... مگر کیا کروں؟ میرے میکے پر غم کا پہاڑ ٹوٹا ہوا ہے، ایسے میں صرف میں ہی ان کا بوجھ کم کر سکتی ہوں۔''

''تمہارا احساس اپنی جگہ پر...... مگر بیٹا یہ بوجھ جس کے کندھوں کا ہے اسے ہی اٹھانا چاہیے ناں۔'' سعیدہ خانم نے اپنے مخصوص مدبرانہ انداز میں کہا تو صہبیٰ سمجھ کر بھی ناسمجھی سے پوچھنے لگی۔

''میں سمجھی نہیں امی جان؟''

''صہبیٰ اس میں نہ سمجھ میں آنے والی کیا بات ہے، اللہ بخشے تمہارے بڑے بھائی اور بھاوج کو...... انہوں نے ماں، باپ کی طرح تم سبھی کو سنبھال رکھا تھا۔ اب ثعلب اس کی جگہ پر ہے، اسے سمجھداری سے کام لے کر اپنی شادی کا فیصلہ کر لینا چاہیے، آخر تم بہنیں کب تک اپنا، اپنا گھر چھوڑ کر میکے کے مسائل حل کرتی رہو گی۔''

''امی جان...... آپ درست فرما رہی ہیں۔ میں بھی ثعلب کو سمجھا رہی ہوں مگر وہ مان ہی نہیں رہا۔ اس بار تو میں اسے منا کر ہی آؤں گی۔''

''ہاں اسے سمجھاؤ جو ہونا تھا ہو گیا...... اب زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے ماضی کو تو بھولنا پڑتا ہے۔''

''ہم سبھی اسے یہی سمجھاتے ہیں، خیر اس بار تو میرا ارادہ اٹل ہے، اسے منا کر دم لوں گی۔'' صہبیٰ نے بھی رسانیت سے تائید کی۔ ''امی...... آپ بھی دعا کیجیے گا...... وہ مان جائے۔''

''مان جائے گا بھئی...... پہلے تم اس کے لیے کوئی لڑکی تو دیکھو۔'' سعیدہ خانم نے خالی کپ سامنے رکھ دیا۔ صہبیٰ کچھ کہنا چاہتی تھی اسی لمحے سعیدہ خانم کی بھتیجی وانیہ بھی وہاں چلی آئی۔

''پھپھو جان...... بابا کا فون آیا ہے، وہ آج نہیں آئیں گے۔'' دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''طاہرہ (بھابی) سے اجازت نہیں ملی ہوگی، کریم سے مجھے یہ توقع نہیں تھی۔'' وہ افسوس سے بولتی، بولتی ایک دم خاموش ہوگئیں۔ ''صبحیٰ تم پھر جانے کی تیاری کرو۔ ابھی تو وانیہ ہے میرے پاس۔''

''ہاں...... ہاں بھابی، آپ بے فکر ہو کر جائیں۔'' وانیہ نے بھی اسے تسلی دی تو صبحیٰ پُرسوچ انداز میں وہاں سے اٹھی۔

☆☆☆

صبحیٰ اِدھر لاہور جانے کے لیے گھر سے نکلی، سعیدہ خانم نے اُدھر اپنے چھوٹے بھائی کریم احمد کو فون کر کے خوب سنائیں۔ ''حد ہے کریم تمہاری بزدلی کی، تمہیں طاہرہ کا پہلے خوف نہیں تھا۔ جب دوسری شادی چوری چھپے کرلی تھی۔''

''آپا......! بس ایک غلطی ہوگئی تھی، حالات سے تنگ آیا ہوا تھا۔ طاہرہ کے رویّوں نے عاجز کر دیا تھا تبھی......'' دوسری طرف سے اپنے فعل پر نہایت ندامت کے ساتھ کہا گیا تو سعیدہ خانم حیرت سے چیخ ہی اٹھیں۔

''غلطی......؟ کریم تم جانتے ہو کیا کہہ رہے ہو؟ اس کا مطلب ہے، وانیہ بیچاری صحیح سہمی ہوئی ہے، اس کا باپ اسے اپنی غلطی سمجھ کر بوجھ کی طرح یہاں ڈال گیا ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے آپا...... میں کوشش کر رہا ہوں کہ طاہرہ کا غصہ ٹھنڈا ہو تو میں اسے مناؤں اور......'' کریم احمد کی جھجک بتا رہی تھی کہ وہ اپنی کوشش میں ناکام ہوگیا ہے۔

''بس رہنے دو بھائی...... تم اور تمہاری کوششیں...... بن ماں کی بچی کو تم نے تماشا بنا دیا۔ باپ کے گھر میں اس کے لیے جگہ نہیں ہے۔ بتاؤ بھلا وہ کب تک تیرے میرے آسرے پر رہے گی۔''

''بس کچھ دن آپا...... اور پھر آپ غیر تو نہیں ہیں، ہماری بڑی ہیں...... آپ میری مجبوری نہیں سمجھیں گی تو کون سمجھے گا۔'' سعیدہ کی خفگی کے جواب میں بڑی منت سے کہا گیا تو وہ بھی کچھ ٹھنڈی ہو کر بولیں۔

''بے شک تم سبھی کے لیے میرے دل میں بڑی محبت ہے کریم...... پھر بھی حالات اور اپنی صحت سے گھبرا جاتی ہوں...... ایک بیٹی کی ذمے داری بہت بڑی ہوتی ہے۔ تم بس طاہرہ کو کسی طرح راضی کرو...... لڑکیاں اپنے باپ کے گھر میں ہی سجتی ہیں یا پھر شوہر کے...... یہاں وہ اپنا جی مار کے رہ رہی ہے، ڈرتی ہے، جھجکتی ہے، حق سے نہ رہتی ہے نہ کچھ مانگتی ہے، بس اسی لیے میں کڑھتی ہوں۔''

''میں...... میں بات کروں گا طاہرہ سے۔'' کریم احمد نے کمزور سے لہجے میں یقین دہانی کرائی تو سعیدہ خانم سر جھٹک کر رہ گئیں۔

☆☆☆

سعیدہ خانم نماز ظہر پڑھ کر کھانے کے لیے بیٹھیں تو وانیہ نے ڈرتے جھجکتے انہیں مخاطب کیا۔

''پھپھو، ایک بات کہوں......'' نظریں میز کی سطح پر جمائے وہ جیسے کسی فیصلے پر پہنچی ہوئی تھی۔ سعیدہ خانم نے چونک کر اسے دیکھا۔ اکیس سالہ وانیہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے مقابلے میں بے حد سنجیدہ اور سمجھ دار تھی۔

''آپ بابا کو میرے حوالے سے مجبور مت کریں، میں زبردستی ان کے گھر میں اپنے لیے جگہ نہیں چاہتی۔''

''زبردستی کیوں......؟ تم ان کی بیٹی ہو، حق ہے تمہارا...... اور پھر طاہرہ کے خوف سے تو وہ تمہیں بالکل ہی نظر انداز کرتا چلا جائے گا۔'' سعیدہ خانم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس کی پلکیں پھر بھیگ گئیں۔ اپنے بھرم کو قائم رکھنا کس قدر دشوار ہو جاتا ہے۔

''پھپھو، میرا یقین کریں، مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے، آپ مجھے یہیں رہنے دیں، میں کہیں جاب کرلوں گی۔ آپ بس بابا کو بار بار مت کہیں کہ مجھے اپنے گھر لے جائیں۔''

''کیسی باتیں کررہی ہو، وانیہ بچے تم ہم پر بوجھ نہیں ہو...... میں تو کریم کو اس کی ذمے داری کا احساس دلانے کے لیے ایسا کہتی ہوں......تم نے آج تو جاب کرنے کی بات کرلی آئندہ مت کہنا.....ورنہ۔'' سعیدہ خانم نے ایک دم تڑپ کراسے دیکھا۔

''پھپو......میں تو......'' پھپو کی خفگی پر وانیہ کی شرمندگی بڑھ گئی۔

''بس......اب اور کچھ نہیں، آرام سے کھانا کھاؤ، تم یہاں بیٹی بن کر آئی ہو، بیٹی بن کر رہو۔ فضول کی سوچیں دماغ سے نکال دو......رہا کریم اور میرا معاملہ......وہ میں جانوں اور وہ......'' انہوں نے دوٹوک انداز میں اسے سرزنش کر کے خاموش کروادیا۔ بظاہر تو وہ خاموش تھی مگر اس کے اندر عجیب سا طوفان اٹھ رہا تھا۔

☆☆☆

''شام کو جلدی گھر آجانا......صبحی دوپہر تک آجائے گی۔'' ثعلب صبح گھر سے نکلنے لگا تو نانو نے اسے یاددلایا۔

''اوہ...... واقعی آپی آرہی ہیں؟'' ثعلب نے مصنوعی بے یقینی سے کہا تو نانو نے فہمائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تو کیا ہم تمہارے ساتھ مذاق کررہے ہیں؟''

''میرے ساتھ تو مذاق ہی ہورہا ہے شاید۔'' وہ ہولے سے بڑبڑا کر پلٹا۔ ''آج میری اہم میٹنگ ہے، کوشش کروں گا کہ آجاؤں جلدی، پلیز بار، بار مجھے کال مت کروایئے گا۔'' وہ جیسے مزید سوالات سے بچ کر نکل بھاگا۔ نانو اس کے رویّوں سے آج کل پریشان سی رہنے لگی تھیں۔ اس کی گہری سنجیدگی سبھی کے لیے تشویش ناک تھی۔ چھ ماہ پہلے تو وہ بہت ہنس مکھ اور ہلا گلا کرنے والا تھا۔ ایک حادثے نے اسے اچانک بدل کر رکھ دیا تھا۔

صبحی، نانو اور عصمی بے چینی سے اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں انہوں نے ثعلب کے انتظار میں کھانا بھی دیر سے کھایا تھا۔ صبحی کو انتظار کی کوفت نے جھنجلانے پر مجبور کردیا تھا۔

''نانو کیا یہ روز ہی دیر سے آتا ہے؟''

''نہیں......کبھی، کبھی دیر سے آتا ہے، بتا کر گیا تھا کہ دیر سے آئے گا۔'' نانو نے قدرے نرمی سے طرفداری کی۔

''آج تو میری وجہ سے دیر سے ہی آئے گا؟''

''السلام علیکم......!'' جبھی ثعلب اچانک ہی لاؤنج میں داخل ہوا تو صبحی مزید بولتے بولتے چپ کرگئی۔

''کیا ہوا......؟ چپ کیوں ہیں آپ تینوں؟ یقیناً میری برائیاں ہورہی ہوں گی۔'' وہ سامنے آکر پوچھنے لگا۔

''ہاں، اس کے علاوہ ہمیں اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔'' صبحی نے اسے خفگی سے گھورا۔

''آپ تو خاصی ناراض ہیں مجھ سے...... واقعی میں، میں مصروف تھا۔'' وہ وضاحت دیتا سامنے بیٹھ کر مزید پوچھنے لگا۔ ''شہود بھائی اور بچے آئے نہیں آپ کے ساتھ؟''

''میرے علاوہ کوئی اتنا فارغ نہیں ہے۔'' صبحی نے ایک بار پھر خفگی سے جواب دیا۔

''اسی لیے آپ ہر دوسرے ہفتے اِدھر نظر آتی ہیں۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

''ثعلی......'' نانو نے فوراً اسے ٹوکا۔

''کہنے دیں نانو اسے......میں اچھی طرح جانتی ہوں، یہ چاہتا ہے میں اس کی باتیں سن کر آنا چھوڑ دوں تو ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر نانو کی طرف بڑھی...تو ثعلب معذرت کرنے لگا۔

''سوری آپی، میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''میں تمہارے سارے مطلب سمجھتی ہوں، تم ذرا جلدی سے فریش ہوکر نانو کے کمرے میں آؤ۔'' صبحی، نانو کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے رعب سے کہہ کر چلی گئی تو وہ منہ بنا کر کھڑا رہ گیا۔

''بھائی کھانا؟'' عصمی نے اسے متوجہ کر کے پوچھا تو نفی میں سر ہلانے کے بعد بولا۔

''نہیں...... بھوک نہیں ہے، شام کو کچھ کھالیا

تھا۔ تم آرام کرو۔'' عصمیٰ جانے لگی تو اسے ایک دم بچوں کا خیال آیا۔

''سنی، گولڈی تو سو گئے تھے آرام سے؟''

''کہاں بھائی! بڑی مشکل سے سلایا ہے، آپ نے انہیں اپنا عادی بنا کر اچھا نہیں کیا، گولڈی تو بہت تنگ کرتی ہے۔''

''آئندہ کوشش کروں گا کہ جلدی آ جاؤں...... اوکے تم جاؤ۔'' وہ بھی کچھ سوچتا ہوا پہلے بچوں کے کمرے میں چلا آیا جو اس کے کمرے سے ملحق تھا۔ دونوں بچے گہری نیند میں تھے۔ ثعلب نے جھک کر باری باری دونوں کو چوما...... اس لمحے اس کے دل میں صرف ان کے لیے محبت موجزن تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنا آپ ان پر نثار کر دے...... وہ فریش ہو کر نانو کے کمرے میں آیا تو وہ دونوں اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ نانو اپنے بستر پر تکیوں کے سہارے بیٹھی تھیں جبکہ صہبا انہی کے پاس تھی...... وہ آکر ہاتھ باندھ کر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے کوئی طالب علم اپنی سزا سننے کا منتظر ہو۔

''بیٹھ جاؤ، کیا کھڑے ہو کر میری بات سنو گے؟''

''صبح بات نہیں ہو سکتی۔ سچ میں بہت تھکا ہوا ہوں، بہت زور سے نیند آرہی ہے۔'' اس نے اداکاری کرتے ہوئے انگلیوں سے آنکھیں مسلیں...... تو وہ اسے پھر گھور کر رہ گئیں۔

''ثمی آخر ایسا کب تک چلے گا؟'' نانو اس کی اداکاری پر مسکرائے بنا نہ رہ سکیں۔

''ک...... کیا مطلب......؟ میں سمجھا نہیں۔''

''اس گھر کا نظام......'' وہ زچ ہو اٹھی۔ ''تم نے نانو جان کی صحت دیکھی ہے، یہ ان کے آرام کے دن ہیں اور یہ ہمارے لیے ہلکان ہوتی پھر رہی ہیں بلکہ تمہارے گھر کے لیے۔''

''جی......؟'' وہ اب بھی غیر سنجیدہ ہو کر بولا تو صہبا جھنجلا کر بولے گئی۔

''پلیز ثعلب...... ڈرامے بازی چھوڑ دو، اتنے ننھے نہیں ہو کہ میری بات کا مطلب نہ سمجھ سکو، بھابی یا عاقب بھائی زندہ ہوتے تو کیا گھر کا یہ حشر ہوتا؟ اور نانو اس طرح نوکروں کے پیچھے خوار ہوتیں؟''

''آپی...... کل ڈانٹا تو تھا سب کو...... آئی ہوپ وہ آئندہ کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔'' وہ اس بار کچھ سنجیدہ ہوا تو وہ نہ ماننے والے انداز میں کہنے لگی۔

''کوئی گارنٹی نہیں ہے، ایک دن ڈانٹ کھا کر وہ ایک دن صحیح کام کریں گے پھر وہی روٹین...... آخر تم نے سوچا کیا ہے۔'' آخر میں وہ اس سے پھر سوال کر رہی تھی۔ جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''میں...... میں کیا سوچوں......؟ میرا مطلب ہے ابھی ایک دم......! آہستہ، آہستہ ہی سب کچھ سیٹل ہو گا ناں۔'' وہ گڑبڑا کر وضاحت دینے لگا۔

''تم کچھ مت سوچو...... لیکن جو اَب ہم سوچ رہے ہیں تمہیں اس پر عمل کرنا ہو گا۔'' صہبا کا رعب دیکھ کر وہ اپنے لیے خطرہ محسوس کرنے لگا۔

''لیکن آپی......! وہ ......'' اسے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔

''تمہاری کوئی لیکن ویکن نہیں چلے گی، بہت موقع دیا ہے تمہیں مگر تم سمجھتے ہی نہیں ہو۔''

''پلیز نانو...... ہیلپ می......'' صہبا کے حتمی انداز پر اس نے نانو کو بچوں کی طرح مدد کے لیے پکارا تو وہ بھی صہبا کی تائید میں بولیں۔

''بیٹا...... صہبا ٹھیک کہہ رہی ہے۔''

''آپ بھی نانو ...... آپ بھی؟'' وہ غیر یقینی تاثر کے ساتھ دہائی دیتا صہبا کو مزید زچ کر گیا۔

''بی سیریس...... ثعلب! تم اب پریکٹیکل لائف میں قدم رکھ چکے ہو، کالج ٹائم کے کامیڈین نہیں کہ ہر بات مذاق میں اڑاؤ گے، تمہیں اب سنجیدگی سے شادی کے بارے میں فیصلہ کرنا ہو گا۔'' صہبا آپی کے حتمی انداز اور سنجیدہ رویے پر وہ بھی ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔

''میرے لیے یہ اتنا آسان نہیں ہے، سب کچھ

بھلانا بہت مشکل ہے آپی۔''

''کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا، خود کو سمجھانا ہو تو چند لمحے بھی کافی ہوتے ہیں، تم چھ مہینے میں خود کو نہیں سمجھا سکے۔'' صبحیٰ آپی نے نہ مانتے ہوئے تردید کی تو وہ انہیں دکھ بھرے تاثرات کے ساتھ دیکھے گیا۔

''آپ کو یہ عرصہ بہت زیادہ لگتا ہے جبکہ مجھے تو آج بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ ابھی چھ لمحے پہلے میں اس کرب، اس آزار سے گزرا ہوں...... میری وجہ سے...'' وہ بات مکمل نہ کرسکا، اس کے لہجے میں نمی اتر آئی تھی۔ صبحیٰ آپی نے اسے افسوس سے دیکھا اور ایک دم اٹھ کر اس کی جانب بڑھنے کے بعد حوصلہ دیتے ہوئے بچوں کی طرح اسے ساتھ لگایا۔

''قسمت کو یہی منظور تھا میرے بھائی۔ تمہارا کیا قصور...... آخر کب تک تم خود کو سزا دو گے؟''

''میری...... وجہ سے ہی اس گھر کی خوشیاں روٹھی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آئندہ بھی میرے حوالے سے مسائل پیدا ہوں، پلیز آپی مجھے مجبور مت کریں۔'' وہ بہت کرب و دکھ سے کہہ رہا تھا۔

''اس طرح سوچنے سے بھی تو مسئلے بڑھ رہے ہیں۔ اچھا...... تم جاؤ آرام کرو...... کل باتیں ہوں گی۔'' صبحیٰ نے اسے تھپتھپاتے ہوئے ایک دم جیسے سنبھلنے کا موقع دیا۔ آپی کے لچکدار رویے سے اس کے تنے ہوئے اعصاب بھی کچھ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ وہ کرسی سے اٹھ کر جانے لگا تو آپی نے پکار کر محبت بھری تاکید کی۔

''صبح میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی...... اچھی طرح خود کو سمجھا لو...... غور و فکر کرلو...... مجھے تمہارا مثبت جواب چاہیے۔'' اس نے بہت بے بسی سے باری، باری دونوں کو دیکھا۔ دونوں ہی اس سے نظریں چرا گئیں۔

☆☆☆

وہ پھپو سعیدہ کو بتا کر سونے کے لیے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ابھی اس نے نمازِ عشا کے لیے جا نماز

بچھائی تھی کہ اس کے سیل فون پر اس کے بابا کریم احمد کی کال آگئی۔
''کیسی ہو بیٹا......؟'' اس کے سلام کے جواب میں انہوں نے شفقت سے پوچھا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔
''ٹھیک ہوں، بابا آپ کیسے ہیں؟'' اس نے بہ مشکل لہجے کو نم ہونے سے بچایا۔
''کیا بتاؤں بیٹا... تم سے شرمندہ ہوں، پلٹ کر نہیں سکا۔ آپا تمہارا خیال تو رکھتی ہوں گی۔'' کریم احمد کا سرگوشیانہ لہجہ صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ چھپ کر ڈرتے ہوئے اسے فون کر رہے ہیں۔
''بہت زیادہ بابا......! آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں، یہاں بھی میرا خیال رکھتے ہیں۔ صہبا بھابی تو بالکل چھوٹی بہنوں کی طرح مجھ سے پیار کرتی ہیں۔ آپ میری خاطر اپنا سکون خراب مت کریں۔''
اس نے ایک بار پھر کوشش سے خود کو سنبھال کر اپنے بابا کو تسلی دی۔
''بیٹا! تم میری مجبوری سے سمجھوتا کر رہی ہو، میں طاہرہ کو بالآخر منا لوں گا، بس کچھ عرصہ صبر کر لو، مجھے اس بات کا حوصلہ ہے کہ تمہاری تربیت خدیجہ (وانیہ کی ماں) نے کی ہے، تم ہر حال میں گزارہ کر سکتی ہو، آپا کو بھی تمہارا دکھ ہے۔ طاہرہ سے ان کا شکوہ بجا ہے، بس حالات کی بہتری کا انتظار کرنا ہوگا۔'' کریم احمد کی آواز دکھ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وانیہ کا دل مزید دکھ سے بھر گیا۔
''با...... با...... پلیز آپ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں، آپ مجھے جہاں بھی رکھیں گے، میں رہ لوں گی، کبھی شکایت نہیں کروں گی...... بس آپ بھی مجھے تنہا نہیں چھوڑیے گا بابا!'' وہ ایک دم سسک اٹھی اور پھر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ ماں کے مرتے ہی زندگی اس کے لیے آزمائش بن گئی تھی۔ بابا نے اس کی امی سے جن حالات میں بھی شادی کی تھی ان کا ادراک اسے پہلے نہیں تھا یہ تو خدیجہ کی بیماری کے دنوں میں اس پر بہت سی حقیقتیں آشکار ہوئی تھیں۔ بابا کی پہلی شادی، ان کا ایک بڑا خاندان، ایک ہی شہر میں ان کے دو گھر، وہ تو بچپن سے جوانی تک یہی سمجھتی رہی کہ بابا دوسرے شہر میں کام کرتے ہیں اس لیے ان کے ساتھ ہفتے میں ایک دن ہی گزارتے ہیں۔ اسے خدیجہ نے بھی بے خبر رکھا تھا۔ اور پھر حالات کی کروٹ نے سارے بھرم کھول دیے تھے۔
بابا کی مجبوریاں و رامی کا خاموش صبر ان کے اندر غم کی بیل کی آبیاری کرتا چلا گیا تھا۔ محبت کی دھوپ اور قرب کی چھاؤں کی کمی کے باعث وقت اور موسموں کے بدلتے، بدلتے اس بیل نے پھلتے پھولتے وجود اور روح سے لپٹ کر آخر انہیں ایسا جکڑا تھا کہ وہ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ مرنے سے دو ماہ پہلے ہی ان کے مرض کی تشخیص ہوئی تھی۔ انہیں بلڈ کینسر تھا۔ پھر تو جیسے زندگی مٹھی میں بند ریت کی طرح پھسلتی چلی گئی۔ امی کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی اسے احساس ہوا تھا کہ وہ گھنی چھاؤں سے نکل کر تپتی دھوپ میں آ گئی ہے۔ بابا نے امی کی تدفین کے تیسرے دن ہی اسے پھپو سعیدہ کے گھر لا چھوڑا تھا...... اس وعدے کے ساتھ کہ وہ جلد ہی اپنی پہلی بیوی طاہرہ کو منا کر اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے مگر امی کے چہلم کی مدت بھی گزر گئی تھی۔ بابا اب تک طاہرہ کو منا نہیں سکے تھے۔ اور اسے آئندہ بھی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ بڑی امی کی ہنگامہ آرائیاں اسے بھی پتا چلتی رہی تھیں۔ اسی لیے اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بابا کے گھر میں ناپسندیدہ ہستی بن کر نہیں جائے گی۔ کچھ سوچ کر وہ اپنے بہتے اشک صاف کرتی دوپٹا صحیح طرح لپیٹتی جانماز پر کھڑی ہوگئی۔
☆☆☆
ثعلب کمرے میں آ کر عالم اضطراب میں ٹہلنے لگا تھا۔ ذہن الجھنوں میں الجھ گیا تھا۔ ماضی کے کئی لمحے اسے کرب میں مبتلا کر گئے تھے۔ اس اذیت کو کم کرنے کے لیے اس نے سگریٹ سلگا کر کمرے کی لائٹ بجھا دی اور خود بستر پر نیم دراز ہوتے ہوئے گہرے گہرے کش لینے لگا۔
''آپی آپ کہتی ہیں وہ سب بھلا کر زندگی کو نیا

آغاز دوں...... مگر کیسے بھول جاؤں؟ وہ اذیت آمیز لمحے، جن کی جلن سے میری روح تک فگار ہوگئی ہے، جن کا کرب آج بھی میرے دل میں اسی شدت سے کروٹیں لیتا ہے، جس طرح پہلے لیتا تھا۔'' سوچتے، سوچتے اس نے جلدی، جلدی سگریٹ کے کش لگا کر اس کا کثیف دھواں بھی اندر پھیپھڑوں میں اتارا جیسے یہ دھواں اس کے درد کو کم کردے گا۔

''نہیں بھول سکتا آپی...... میں کچھ بھی نہیں بھول سکتا۔'' اس نے سگریٹ کو راکھ دان میں بری طرح مسل کر نیا سگریٹ سلگالیا۔ وہ خود بھی سر تاپا سلگ رہا تھا۔ ماضی کی ریل اس کے ذہن میں چلنے لگی تھی۔

یہ گھر فاران والا شروع سے تو ایسا نہیں تھا، یہاں تو خوشیاں مجسم صورت میں قائم تھیں۔ بہار کے سارے رنگ اس گھر کے آنگن میں کھلتے تھے...... ان خوشیوں اور رنگوں کو برقرار رکھنے والی ایک ہی ہستی تھی۔

تمکین نیازی جو اس گھر میں عاقب بھائی کی نسبت سے آئی اور پھر پورے گھر کو جنت کا گہوارا بنادیا...... جس نے اس گھر کے روتے، بلکتے افراد کو اپنی مسکراہٹیں دے کر جینا سکھادیا تھا۔ عاقب بھائی نے بھی اس گھر اور اپنی بہنوں اور بھائی کے لیے اپنی محبت سے آزمائش مانگی تھی۔ ان کی محبت آزمائش میں پوری اتری تھی۔ تمکین بھابی نے ان کی تعمیر و تربیت کے لیے اپنے دن رات وار دیے تھے۔ ماں کی جدائی سے ڈرے سہمے صہبا، ثعلب اور عصمیٰ ان کے محبت بھرے رویے سے جلد ہی سنبھل کر زندگی کو نعمت سمجھ کر جینے لگے تھے۔

تمکین بھابی نے اپنی شادی کے کچھ عرصے بعد ہی صہبا آپی کی شادی جس ذمے داری سے کروائی تھی، وہ قابل رشک تھا۔ سبھی ان کے حسنِ سلوک سے متاثر تھے۔ ثعلب جو چھوٹا ہونے کی وجہ سے سبھی کا لاڈلا تھا اور لاڈ میں بگڑ چلا تھا۔ تمکین بھابی کی توجہ اور پیار نے اسے تراش خراش کر ہیرا بنادیا تھا۔ انہوں نے تو جیسے اپنی زندگی ان ہی بہن، بھائیوں کے لیے وقف کردی تھی۔ ان کی خوشیاں، ان کی ضروریات ان کے لیے مقدم تھیں۔ بنا کہے وہ ان کے دل کی بات سمجھ جاتی تھیں۔ اسے یاد تھا۔ اس کے دل کی چوری بھی انہوں نے ہی پکڑی تھی۔ نہ صرف پکڑی تھی بلکہ اس کی تائید و حمایت بھی کی تھی۔ جلتے سگریٹ سے اس کی انگلیاں جلنے لگی تھیں۔ وہ ایک دم چونک کر سگریٹ راکھ دان میں مسل کر بیڈ سے اٹھا اور کھڑکی میں آکھڑا ہوا۔ کھلی کھڑکی کے باہر تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹا گونج رہا تھا مگر اس کے اندر تو شور ہی شور تھا۔ وہ کھڑکی کے کھلے پٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ ماضی اسے پھر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس کی سوچیں متحرک تھیں اور وہ ساکت تھا۔

اسے ایک، ایک لمحہ یاد تھا۔ خصوصاً اپنی زندگی سے وابستہ وہ دلکش جذبہ اور اس کی بازیابی کے لیے کوشش...... یہ ان دنوں کی بات ہے جب اس کے دل میں صنفِ مخالف کی کشش نے الوہی جذبے کو جنم دیا تھا۔ شیریں پھپو کے مادی برتری سے چور رویّے کے باوجود اس کے دل میں ان کی اکلوتی بیٹی رومانہ کے لیے محبت پنپنے لگی تھی۔ اور ایسا رومانہ کی پیش قدمی پر ہی ہوا تھا۔ یونیورسٹی میں وہ اس سے جونیئر تھی۔ پھپو نے خصوصی طور پر اس کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔ وہ اتنی ہی اہمیت پر ہی نازاں سارومی پر نگاہ رکھتے، رکھتے اسے دل میں بسا گیا تھا۔ اس روز بھی یونیورسٹی سے آکر دوبارہ تیاری کے ساتھ گھر سے نکلنے لگا تو لاؤنج میں بیٹھی تمکین بھابی نے اسے خاص نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

''خیریت ہے، آج کل تم شیریں پھپو کی طرف زیادہ ہی جانے لگے ہو؟''

''آپ سے کس نے کہا؟ میں تو کئی دن پہلے آپ ہی کے ساتھ گیا تھا۔'' اس کی غلط بیانی پر انہوں نے اسے سنجیدگی سے گھور کر ٹوکا۔

''جھوٹ مت بولو، اس طرح روز، روز جانا اچھی بات ہے کیا؟ تمہارے فائنل سر پر ہیں، میں دیکھ رہی ہوں، تمہاری توجہ پڑھائی پر نہیں ہے۔''

''رات کو پڑھتا ہوں ناں...... اب آپ نیند میں

تو مجھے پڑھتے نہیں دیکھ سکتیں۔'' وہ تقریباً مکرتے ہوئے ان کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

''اس کا مطلب ہے شیریں پھپو کے گھر تم نہیں تمہارا بھوت جاتا ہے۔''

''ہوسکتا ہے۔'' اس نے نہ مانتے ہوئے ڈھٹائی سے تردید کی تھی۔

''بکواس نہیں کرو، تم کہیں رومانہ کے پیچھے۔ اس نے بھی تمہاری ہی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا ہے ناں؟'' وہ جیسے اس سے اگلوانا چاہتی تھیں۔

''تو...... کیا وہ پہلی لڑکی ہے جس نے وہاں ایڈمیشن لیا ہے؟ آپ خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہی ہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے انہیں ٹالنا چاہا۔

''تم مجھے سبق پڑھانے کی کوشش نہ کرو، مت بھولو، میں تمہیں پڑھا چکی ہوں۔'' تمکین بھابی نے اس کا کان پکڑ کر ہنستے ہوئے مروڑا تو وہ کراہ اٹھا۔

''اور...... گزشتہ آٹھ سالوں سے میرے ہی کان کھینچ رہی ہیں۔ میں اب آٹھویں کلاس کا بچہ نہیں ہوں، یونیورسٹی جاتا ہوں، پلیز اپنا attitude بدلیں۔'' اس نے زبردستی اپنا کان چھڑاتے ہوئے دہائی دی تھی۔ تمکین بھابی اس کی حالتِ زار پر ایک دم ہنس دی تھیں۔ پھر دوستانہ انداز میں پوچھنے لگیں۔

''اچھا...... پھر سچ، سچ بتاؤ...... شیریں پھپو کے گھر روز، روز جانے کا معاملہ کیا ہے؟ ویسے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں، اس سلسلے میں۔''

''ایویں اتنی دیر سے رعب جھاڑ رہی تھیں، آرام سے پوچھتیں تو میں بتا دیتا، کم از کم میرے کانوں کی لمبائی میں تو مزید اضافہ نہ ہوا ہوتا۔''

''اچھا! اب بات گھماؤ نہیں، میرا اندازہ درست ہے ناں کہ تم رومانہ میں انٹرسٹڈ ہو؟''

''بات اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ رومانہ مجھ میں انٹرسٹڈ ہے۔'' وہ شوخی سے چہکا۔

''اچھا...... تو نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے۔ پھر کیا ارادے ہیں...... جایا جائے پھپو کے پاس، کوئی ہلا گلا کیا جائے؟'' انہوں نے بھی خاصی دلچسپی سے پوچھا تھا۔ ثعلب کو یقین تھا اس کی خوشی سبھی کو عزیز ہوگی۔ وہ جب...... جس سے بھی شادی کرنا چاہے گا کوئی بھی اعتراض نہیں اٹھائے گا۔

''اتنی جلدی کیا ہے بھابی...... ابھی مجھے ذرا اپنی ویلیو بڑھانے دیں۔'' ذرا بے نیازی دکھاتا وہ اس وقت وہاں سے چلا گیا تھا۔

''بے وقوف......'' بھابی کی ہنسی اسے اپنی پشت پر سنائی دی تھی۔

☆☆☆

''سنو رومی...... بھابی جان کو ہمارے بارے میں معلوم ہوگیا ہے۔'' ثعلب نے فوراً ہی جا کر رومانہ کو اطلاع دی تھی۔

''تم نے خود بتایا انہیں...... ا تمہارے دل میں کوئی بات رہ سکتی ہے......؟'' رومانہ بوکھلا کر پوچھنے لگی۔ وہ اس کی بوکھلاہٹ و جھنجلاہٹ سے محظوظ ہوا تھا۔ بولڈ سی رومانہ اس وقت اچھی لگ رہی تھی۔

''دل میں تو تم رہتی ہو۔ اس لیے وہاں کوئی اور کیسے ٹک سکتی ہے۔'' وہ بے ساختہ ہنسا۔

''اس کا مطلب ہے تم نے انہیں یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ میں...... میں نے تم سے خود...... اظہار کیا......''

''ظاہر ہے، میں ان سے کچھ نہیں چھپا سکتا۔''

''انتہائی بے شرم انسان ہو تم...... کیا سوچا ہوگا انہوں نے میرے بارے میں...... !'' رومانہ نے اپنی ہائی پونی کا کیچر اتارا اور اس پر غصے میں اچھال دیا...... جسے اس نے خوب صورتی سے کیچ کر لیا۔

''یہی سوچا ہے جو تم نے سوچا ہے۔''

''کیا مطلب......؟'' ثعلب کا بڑھایا ہوا کیچر اس نے جھپٹ کر پکڑا۔

''وہ بھی تمہیں اپنی دیورانی بنانے کا سوچ رہی ہیں۔'' جواباً پہلے تو وہ اسے گھورے گئی۔

''ریئلی...... تم سچ کہہ رہے ہو؟'' ایک دم ہنس کر

شرمساری سے بولی۔
''ہنڈرڈ پرسنٹ۔''
''سنو تمی...... میں نے بھی مما کو بتادیا ہے کہ تمہارا پروپوزل آئے تو وہ فوراً accept کرلیں۔''
کچھ دن بعد رومانہ نے بھی اسے اپنی طرف سے یقین دلا کر اس کے خدشے دور کردیے۔
''تو پھوپو نے کیا کہا...... وہ راضی ہیں؟''
''ظاہر ہے وہ میری خوشی کے لیے اپنے ارادوں کو بھی بدل سکتی ہیں۔''
''پھوپو کے ارادے کیا ہیں؟'' برگر کھاتے ہوئے ثعلب نے الجھن سے پوچھا۔
''کہ...... کچھ نہیں...... بس پاپا کو راضی کرنا ہے ناں...... تم تمکین بھابی کو بھی تیار رکھنا، میں جب کہوں تم پروپوزل لے کر آجانا...... اوکے۔''
''ہم تو صبح آنے کے لیے تیار ہیں۔'' ثعلب نے شریر نظروں سے دیکھ کر چھیڑا۔
''ابھی نہیں...... پہلے پاپا سے تو بات کرنے دو۔'' رومانہ نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرا۔
''ذرا جلدی بات کرلینا...... ایسا نہ ہو کہ مجھے کوئی اور لے اڑے اور تم دیکھتی رہ جاؤ۔'' ثعلب نے مذاق سے چھیڑا تو اس نے بے اختیار ہی کولڈ ڈرنک کا گلاس اس پر اچھال دیا۔ ثعلب اس افتاد پر حیران پریشان سا دیکھتا رہ گیا۔
''خبردار جو تم نے کبھی ایسا سوچا بھی...... میں اس کے ساتھ، ساتھ تمہیں بھی مار دوں گی اور خود بھی مرجاؤں گی، یاد رکھنا......'' وہ غصے سے اٹھی اور کیفے ٹیریا سے باہر چلی گئی۔ ثعلب ٹشو پیپر سے منہ صاف کرتا فوراً اس کے پیچھے لپکا تھا۔

☆☆☆

کئی دن تک رومانہ اس سے ناراض رہی تھی۔ ثعلب کو لگا تھا کہ اس سے ساری دنیا ناراض ہوگئی ہے۔ تمکین بھابی سے بھی اس کی بے ترتیبی چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ اسے گھر میں ٹکے دیکھ کر حیرت سے پوچھنے لگیں۔

''کیا بات ہے۔ آج کل گھر پر نظر آرہے ہو...... رومی سے لڑائی چل رہی ہے؟'' بھابی کا انداز ایسا تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دیا۔
''آپ کو تو پامسٹ بن جانا چاہیے۔ آج کل ہر چینل پر بڑی ویلیو ہے ان لوگوں کی۔''
''بس تم تو شروع ہوجایا کرو...... مجھے سچ، سچ بتاؤ کیا بات ہے...... رومی بھی کئی دن سے نہیں آئی۔''
''مصروف ہوگئی ہے، آپ کو یاد آرہی ہے تو بلالیں۔'' ثعلب نے فوراً ہی سیل فون اُن کی طرف بڑھا دیا۔ سبزی بناتے ہوئے انہوں نے اسے جانچتی نظروں سے دیکھا۔
''مجھے یاد آرہی ہے یا...... تمہیں؟ کوئی جھگڑا ہے تو بتادو...... ہم صلح صفائی کروادیتے ہیں۔ بلکہ میں تو سوچ رہی ہوں کہ تمہارے دل کی مراد مانگنے پھپو کے پاس چلی ہی جاؤں۔''
''آپ کو یقین ہے کہ وہ آپ کے دیور کو اپنی بیٹی دینے پر تیار ہوجائیں گی؟'' وہ قدرے سنجیدگی سے پوچھنے لگا تھا جس پر بھابی نے فرطِ محبت سے جوش میں کہا۔
''سو بار...... میرا اتنا پیارا لائق، فائق ایک ہی تو بیٹا ہے یہ تو ان کی خوش نصیبی ہوگی کہ ان کی بیٹی کو ہم تمہارے لیے مانگیں گے۔''
''اوسوئٹ بھابی، اب مجھے اتنا بھی نہ چڑھائیں، کہیں میری لائقی، فائقی ہی آڑے نہ آجائے۔'' ثعلب نے ہنسی میں بات اڑائی تو وہ سنجیدہ ہوگئیں۔
''کیا مطلب...... تمہیں خود پر اعتماد نہیں ہے؟''
''اعتماد ہے...... لیکن ابھی رومانہ کے فائنل تک ایسا کوئی سلسلہ نہیں چلے گا۔ وہ ڈسٹرب ہوجائے گی۔ ابھی آپ چین کی بانسری بجائیں یا پھر اپنے پیارے، پیارے بچوں کو ٹائم دیں...... سنی کل مجھ سے شکایت کررہا تھا کہ اس کی ماما اس کے ساتھ نہیں کھیلتیں۔''
''تم بات گھمانے میں بہت ماہر ہو...... میں تمہاری شادی تو ابھی نہیں کررہی ......صرف چاہتی

ہوں کہ کوئی رسم ہو جائے...... ایسا نہ ہو کہ ہماری خاموشی ہمارے لیے ہی نقصان دہ بن جائے۔ اور پھر میرے بجائے تم چین کی بانسری بجاتے پھرو......'' بھابی نے رسانیت سے سمجھایا

''واقعی، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں ہے۔'' وہ بے ساختہ بولا۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' انہوں نے اسے چھیڑا تو وہ مصنوعی سنجیدگی سے سر جھکا کر بولا۔

''جو آپ کی مرضی...... میں تو آپ کا تابع و فرمانبردار ہوں۔''

''واہ، واہ جانتی ہوں تمہاری تابعداری ......'' اس کی اداکاری پر سبزی سمیٹتے ہوئے وہ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے بے ساختہ ہنستے ہوئے بولیں۔

''تو کیا آپ کو شک ہے کوئی...... آپ کہیں تو میں ابھی رومانہ کو بھلا دوں۔''

''بکواس نہیں کرو، میں کیوں کہوں کہ تمہیں اللہ تمہیں سارے جہان کی خوشیاں دے۔ جاؤ تم اسے فون کرو اور پوچھو کہ ہم کس دن آئیں......'' تمکین بھابی نے بڑھ کر اسے ایک چپت لگائی تو وہ ہنستا چلا گیا۔ اسے اپنی قسمت پر ناز تھا۔ وہ جو چاہتا تھا پا لیتا تھا۔

☆☆☆

ثعلب اگلے دن ہی یونیورسٹی اسے منانے پہنچ گیا تھا۔ اس نے رومانہ کو کوئی کلاس نہیں لینے دی تھی۔

''تم خود تو فارغ ہو چکے ہو، مجھے تو چین سے اپنا فائنل کمپلیٹ کرنے دو۔'' وہ ناراضی ظاہر کرتی بے دلی سے اس کے سامنے کیفے ٹیریا میں بیٹھی کہہ رہی تھی۔

''تمہارا فائنل کمپلیٹ ہونے سے پہلے میں اپنا مشن پورا کرنے جا رہا ہوں۔''

''کیہ.. سا... مشن......؟'' وہ اس کی سنجیدگی پر حیرانی ظاہر کیے بنا نہ رہ سکی۔ ممی نے کچھ عرصہ پہلے اس سے باہر جانے کا ذکر کیا تھا۔ وہ اپنے بزنس سے متعلق کوئی کورس کرنے باہر جانا چاہتا تھا۔

''میری لائف کا تو اب ایک ہی مشن ہے۔'' ثعلب نے اس کا تجسس بڑھایا تھا۔

''ہاں...... جاؤ اپنے مشن پورے کرو، یہاں چاہے میں کسی اور کے پلے بندھ کر مر کھپ جاؤں۔'' رومانہ ایک دم چڑ کر اٹھنے لگی تھی تو ممی نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر دوبارہ بٹھا لیا۔

''اسٹوپڈ...... اتنی بدگمان کیوں ہو رہی ہو مجھ سے...... میں ایسا کبھی ہونے نہیں دوں گا......! اور پھر کیا تم اتنی کمزور ہو جو آسانی سے کسی اور کے ساتھ بندھ جاؤ گی۔''

''تم کچھ نہیں کرو گے تو میں تو کمزور ہی پڑ جاؤں گی ناں......'' وہ کچھ آزردگی سے بولی۔

''تم نے خود ہی تو مجھے روکا ہوا تھا لیکن اب میں تمہاری نہیں مان رہا۔ بھابی جان اور آپی کچھ دنوں میں پھپھو کے پاس جا رہی ہیں۔ اپنے گھر میں سارا معاملہ تمہیں سیٹل کرنا ہے، اوکے......'' رومانہ تو سنتے ہی کھل اٹھی تھی۔ دونوں سارا دن ساتھ رہے.... اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے تھے۔

☆☆☆

سارا خاندان جانتا تھا کہ ثعلب اور رومانہ ایک دوسرے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی محبت شیریں پھپھو اور ایاز پھوپا سے بھی پوشیدہ نہیں تھی پر ایاز اکرم دل سے اس رشتے پر راضی نہیں تھے۔ وہ بیٹی کو اپنے سے بھی اونچے خاندان میں بیاہنے کے متمنی تھے مگر پھر بیٹی کی خواہش وضد کے آگے مجبور ہو کر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس طرح تمکین بھابی کی کوششوں سے ایک سادہ سی تقریب میں انہوں نے ثعلب کے نام کی انگوٹھی رومانہ کو پہنا کر جیسے ان کے رشتے کو ایک نام دے دیا تھا...... پھر تو جیسے دونوں کو ہی زندگی کی انمول خوشی مل گئی تھی۔ ثعلب نے عاقب بھائی کے ساتھ آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ رومانہ کے بھی فائنل سمسٹر ہو رہے تھے، بھابی جان اندر ہی اندر اس کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں، رومانہ کے فائنل سمسٹر ہوئے ہی تھے کہ اس کی پھپھو پندرہ سال بعد اپنے بیٹے روحیل کے

ساتھ کینیڈا سے چلی آئیں۔ ایاز اکرم تو بہن کو دیکھتے ہی نہال ہو گئے۔ شیریں پھپو بھی ان کے ٹھاٹھ باٹ سے متاثر و مرعوب ان کے آگے پیچھے بچھ گئیں۔ رومانہ کو پھپو کی وارفتگی اور روحیل کی بے تکلفی کھلی تو اس نے ماں سے شکایت کر ڈالی۔

''مما...... مجھے روحیل بھائی کی بے تکلفی اچھی نہیں لگتی، آپ نے پھپو کو بتا دیا ہے ناں کہ میں انگیجڈ ہوں ثمی کے ساتھ۔''

''نہیں...... اور تمہیں بھی کوئی ضرورت نہیں ہے......'' انہوں نے خاصی سنجیدگی سے اسے ٹوکا تو وہ حیران رہ گئی۔

''کیا...... مطلب؟ آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں ؟''

''تمہارے بابا کا خیال ہے کہ ہم نے تمہاری انگیجمنٹ کر کے جلد بازی سے کام لیا ہے۔'' ان کے تیور بدلے ہوئے تھے۔

''کیا......؟'' رومانہ کو دھچکا سا لگا تھا۔ ''میں غلط نہیں کہہ رہی ثمی کے پاس تمہارے لیے کیا ہے سوائے ذمے داریوں کے تم نے ساری زندگی اپنی مرضی سے گزاری ہے۔ وہاں جا کر تمکین کی جی حضوری کر سکو گی؟ اچھی طرح جانتی ہو وہاں اس کا ہولڈ ہے......''

مما نے اسے مزید حیران کر دیا تھا۔

''مما......! آپ نے پہلے تو یہ باتیں نہیں کی تھیں۔ ثمی کا پروپوزل accept کرتے وقت آپ کو ان باتوں کا خیال کیوں نہیں آیا...... اب یوں اچانک......'' رومانہ سے بات کرنا مشکل ہو رہی تھی۔

''اس وقت ہمارے پاس کوئی آپشن نہیں تھا۔ اب زبیدہ آپا نے آ کر روحیل کے لیے خود کہا ہے۔ تمہارے پاپا اپنی بہن کو مایوس نہیں کریں گے۔ بہتر ہے تم ثعلب کے بجائے روحیل میں دلچسپی لو...... یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔'' شیریں دو ٹوک انداز میں فیصلہ سنا کر اسے لاؤنج میں تنہا چھوڑ گئیں۔ وہ حیران پریشان ہو کر رونے لگی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے مما، پاپا ہی اس کے ارمانوں کا خون کرنے کے درپے ہو جائیں گے۔ انہوں نے ثمی کے ساتھ اپنا رویہ بالکل بدل لیا تھا۔ وہ آتا تو اسے رومانہ سے ملنے نہ دیا تھا یا پھر بتایا جاتا.... کہ وہ اپنے کزن کے ساتھ گھومنے پھرنے گئی ہوئی ہے...... ثعلب کا رومانہ کے ساتھ رابطہ ہوتا تو وہ چند باتیں کر کے معذرت کرتی فون بند کر دیتی۔ ثعلب کی بے چینیاں بڑھنے لگی تھیں۔ اڑتی، اڑتی کئی باتیں اس کے بھی کانوں میں پڑ رہی تھیں کہ شیریں پھپو اپنی طرف سے یہ رشتہ ختم کر چکی ہیں۔ ثعلب نے ایک دن رومانہ کو باہر ملنے پر زبردستی راضی کیا تو وہ ریسٹورنٹ میں اس کے سامنے بیٹھ کر رو پڑی تھی۔

''ثمی...... میں تمہارے علاوہ کسی اور کا نہیں سوچ سکتی۔ مجھے نہیں معلوم مما، پاپا اچانک کیوں بدل گئے۔ انہیں میرا...... میری خوشیوں کا کوئی خیال نہیں ہے۔ میں نے اپنی پھپو کو اپنے اور تمہارے بارے میں بتا بھی دیا ہے۔ پھر بھی کسی کو کوئی فرق نہیں پڑ رہا۔''

''کیوں فرق نہیں پڑ رہا...... ہماری انگیجمنٹ ہو چکی ہے۔ تم فکر نہ کرو رومی...... میں پھپو سے جا کر خود بات کرتا ہوں۔'' ثعلب نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے جیسے خود کو بھی ہمت دلائی تھی اور پھر وہ رومی کو گھر چھوڑنے آیا تو پھپو گھر پر تنہا تھیں اسے موقع مل گیا تھا۔

''پھپو آپ لوگ ہمارے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہیں کچھ احساس ہے آپ کو؟'' وہ ان کے گھر کے ڈرائنگ روم میں ان کے سامنے بیٹھا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی شیریں پھپو کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

''ہمیں احساس دلانے والے تم کون ہوتے ہو؟'' انہوں نے خاصی بدلحاظی سے الٹا اسی سے پوچھا تھا۔

''آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں کون ہوں؟ آپ رومی اور میرے ساتھ جو کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں آپ کو اس میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔'' ثمی نے انہی کے انداز میں بات کی تو وہ مارے غصے کے چلا اٹھیں۔

''ثعلب...... بہتر ہوگا...... تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ ورنہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔''

''کوئی حتمی فیصلہ کیے سنے بغیر تو میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ آپ اچانک بلاوجہ اس طرح کا کوئی اسٹیپ کیسے لے سکتی ہیں۔'' اس بار وہ قدرے تحمل سے بولا تھا۔

''ہم نے بلاوجہ کوئی فیصلہ نہیں بدلا...... ایاز تو پہلے ہی بڑی مشکل سے اس بے جوڑ رشتے کے لیے مانے تھے۔ صرف رومی کی ضد پر...... اب روحیل تم سے لاکھ درجے بہتر اس کے لیے خود خواہش مند ہے تو ہم اپنی بیٹی کے ساتھ دشمنی کیوں کریں؟ تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ بھائی کے دست نگر ہو...... اور گھر پر بھاوج کا سکہ چلتا ہے۔ رومانہ تو تمہارے ساتھ اپنی چھوٹی، چھوٹی خوشیوں کو بھی ترس جائے گی۔ اس کے پوری دنیا گھومنے کے خواب کون پورے کرے گا۔ تمہاری اتنی چادر ہے کہ تم شاید اسے اسلام آباد تک ہی لے جاؤ۔''

شیریں پھپھو تاک تاک کر اس کی عزتِ نفس پر وار کر کے اس کی خود داری کی دھجیاں بکھیر رہی تھیں۔ انہیں ان کی حیثیت سے بھی کم تر ثابت کرنے کے لیے وہ کیسے، کیسے جواز دے رہی تھیں۔ وہ حیران ہو رہا تھا۔ یہ اس کی سگی پھپھو تھیں۔

''یہ ساری خامیاں اور باتیں آپ کو اس وقت یاد کیوں نہیں آئی تھیں؟'' ثعلب نے بھی وہی بات، وہی سوال کیا جو رومانہ نے بھی کیا تھا۔ انداز میں البتہ فرق تھا۔ ثعلب افسوس و دکھ سے پوچھ رہا تھا۔

''سب کچھ یاد تھا...... مگر رومانہ کی ضد نے ہمیں مجبور کر دیا تھا۔ مگر اب ہم اس کی ضد پر اس کی زندگی برباد نہیں کریں گے۔ روحیل کے ساتھ اس کی زندگی آئیڈیل ہوگی۔ بس اب میرا دماغ مت چاٹو...... اور یہاں سے چلے جاؤ۔''

''پھپھو...... آپ اچھا نہیں کر رہی ہیں۔ میں آپ کو صاف بتا رہا ہوں کہ اگر آپ نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو میں رومی کو زبردستی یہاں سے لے جاؤں گا۔'' ثعلب جوش سے بولتا اٹھ کھڑا ہوا تو شیریں پھپھو بھی اس کے مقابل آ کر کافی غصے سے بھر کر بولیں۔

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو، تمہاری اتنی ..... جرأت!'' بولتے، بولتے انہوں نے اس کے گال پر طمانچہ بھی مار دیا۔ وہ ہکا بکا پہلے تو انہیں دیکھے گیا اور پھر پلٹ کر وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ رومانہ سہمی سی دروازے میں کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کی ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ ثعلب کو روکتی یا پھر اپنی مما سے جا لڑتی...... وہ جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھتی چلی گئی۔

☆☆☆

ثعلب کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے اور کیسے اس معاملے کو سلجھائے۔ پھپھو کے ارادے اٹل اور حتمی محسوس ہو رہے تھے۔ وہ اپنی پریشانی میں آفس جانے کے بجائے سیدھا گھر چلا آیا تھا۔ اسے بے وقت گھر آتے دیکھ کر تمکین بھابی کو تشویش ہونا لازمی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر آنکھوں پر بازو رکھے نیم دراز ہوا تھا کہ تمکین بھابی اس کے پیچھے چلی آئیں۔

''کیا ہوا؟ خیریت ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے؟ اس وقت گھر چلے آئے ہو......'' ان کی آواز سن کر اس نے فوراً آنکھوں سے بازو ہٹایا اور پھر سیدھا ہو کر بولا۔

''ڈونٹ وری...... میں ٹھیک ہوں، آج آفس میں بیٹھنے کا دل نہیں تھا...... سو جلدی آ گیا۔'' پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''اچھا...... کیا کہنے تمہارے دل کے...... مجھ سے جھوٹ بولنے سے پہلے پریکٹس تو کر لیتے...... سچی، سچی بتاؤ...... کیا پریشانی ہے، رومی کے ساتھ کوئی جھگڑا ہو گیا ہے؟ وہ بھی کافی دنوں سے اِدھر نہیں آئی۔'' تمکین بھابی نے اس کی چوری پکڑتے ہوئے اگلوانے کی کوشش کی تھی۔ جس پر وہ پھر مصنوعی طور پر مسکراتے ہوئے بہانہ بنا گیا۔

''آپ کو معلوم تو ہے کہ اس کی پھپھو وغیرہ ان کے گھر آئے ہوئے ہیں۔ اس لیے اسے اِدھر آنے کا

موقع نہیں مل رہا، میں تو روز ہی اس سے مل لیتا ہوں۔''
اس کے مصنوعی پن پر تمکین بھابی کے چہرے کا رنگ یک دم اُڑ گیا تھا۔

''ثمی......تم کیا چھپا رہے ہو مجھ سے......؟ مہمان تو اس گھر میں آتے ہی رہتے ہیں مگر رومی کی غیر حاضری پہلی بار ہوئی ہے......اور پھر کچھ باتیں میرے کانوں میں بھی پڑ رہی ہیں......کیا ہے وہ سب......؟''
اس کے چہرے پر پھیلتا دھواں انہیں بہت کچھ سمجھا گیا۔

''ہاں......وہ سب سچ ہے، پھپو کی نیت بدل گئی ہے اور ارادہ بھی......''

''کیا مطلب......؟ کون سا ارادہ......؟'' وہ الجھ کر پوچھ رہی تھیں۔

''رومی اور میری شادی کا......''

''کیا......؟'' غیر متوقع بات سن کر وہ جیسے چیخ ہی اٹھیں۔ اس وقت عصمی اور بچے اپنے، اپنے مشاغل میں مگن تھے۔ ورنہ بھابی کے اس ردِ عمل پر وہ بھی سہم جاتے۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں......میں خود اپنے کانوں سے یہ سب سن کر آرہا ہوں۔'' اس نے بھی اسی اذیت کو محسوس کر کے بات دُہرائی تو وہ اب بھی بے یقینی سے بولیں۔

'' وہ ایسا نہیں کرسکتیں۔ تم دونوں کی باقاعدہ انگیجمنٹ ہوئی ہے، سارا خاندان جانتا ہے میں خود جاؤں گی عاقب کے ساتھ......وہ ایسا ہرگز نہیں کرسکتیں......تم فکر نہیں کرو......ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ یہ کوئی کھیل تو نہیں ہے کہ جس کے اصول وہ اپنی مرضی سے بدل لیں گی......تم ریلیکس کرو...... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میں نانو کو بھی بلواتی ہوں......اوکے......؟'' تمکین بھابی نے اس کا سر سہلاتے ہوئے اسے مکمل طور پر مایوسی سے نکالنے کی کوشش کی تھی مگر ایک خوف رومی کو کھو دینے کا......اس کے اندر کنڈلی مار کے بیٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

''مما، مما! پلیز ایسا ظلم مت کریں......آپ اچھی طرح جانتی ہیں......میں ثمی سے محبت کرتی ہوں اگر......وہ مجھے نہ ملا تو مرجاؤں گی۔'' رومی ذرا سنبھلی تو روتے، روتے ماں کے قدموں میں آبیٹھی تھی۔

'' فضول کی باتیں مت کرو...... زندگی خالی' خولی محبت کے سہارے نہیں گزاری جاتی۔ کل کو ایک بھی ضرورت نہ پوری ہوئی تو تم ہمیں ہی الزام دوگی کہ ہم نے کیا سوچا تھا۔'' شیریں پھپو نے بیٹی کو کافی غصے سے ڈپٹا۔

''مما......مما......! میں آپ سے کبھی شکایت نہیں کروں گی، آپ پاپا کو سمجھائیں کہ میں صرف اور صرف ثمی کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔''

''ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ جاؤ اپنے کمرے میں، نوکروں کو تماشا مت دکھاؤ۔'' انہوں نے جس انداز میں اسے گھورا تھا اس پر رومانہ بھی حیران تھی، یہ اس کی وہی مما تھیں جو اس کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ دلبرداشتہ سی ہو کر اٹھی، تبھی شیریں نے اسے تنبیہ کی۔

''خبردار جو تم نے زوبی آپا اور روحیل کے سامنے اپنا رونا رویا، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے پھر میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی مگر یاد رکھیں میں زہر کھالوں گی مگر ثمی کے علاوہ کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔'' وہ انہیں دھمکاتی وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ شیریں پھپو کے ماتھے کے بل اور غصہ بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

رومی نے رونے دھونے سے فارغ ہو کر کچھ سوچتے ہوئے ثعلب کو فون کیا تو وہ بھی کافی حد تک خود کو سنبھال چکا تھا۔

''ثمی......! آئی ایم سوری......میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی مما تمہاری اس قدر انسلٹ کریں گی۔'' رومی کی معذرت ثمی کے دل کا ملال قدرے کم کر گئی تھی۔

''کوئی بات نہیں......میں ان کے رویّے

کا جواز جانتا ہوں.....انہیں صرف ڈالرز کی...
کرکڑاہٹ لبھارہی ہے، وہ بھول رہی ہیں پیسے سے خوشیاں حاصل نہیں ہوتیں۔"

"اور میری خوشیاں صرف تم سے وابستہ ہیں ممی......تم بس میرا یقین رکھنا، تمہارے سوا میں کسی اور کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔" رومی پھر سے رونے لگی تو ثعلب اس کی دلجوئی کرنے لگا تھا۔

"بے وقوف...... مجھے یقین ہے اور تم بے فکر رہو تمکین بھابی نے نانو کو بلایا ہے۔ وہ سب ہی پھپو کے پاس آکر ہماری شادی کی بات کریں گے...... پھر ہمیں کوئی جدا نہیں کرسکتا۔"

"مما کے ارادے بہت خطرناک ہیں ممی...... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے...... ہمارے ساتھ سارا خاندان ہے...... پھر بھی اگر وہ نہ مانیں تو ہم بھاگ کر شادی کرلیں گے۔" آخری بات ممی نے اسے چھیڑنے کے لیے کہی تھی مگر وہ سنجیدگی سے متفق ہوگئی تھی۔

"ہاں...... ہم بھاگ کر شادی کرلیں گے، اسی طرح مما، پاپا کو احساس ہوگا کہ انہوں نے......
بلادجہ" اچانک ہی رومی کے ہاتھ سے کسی نے سیل فون جھپٹا تھا۔ اسے خبر ہی نہیں ہوئی تھی کہ وہ دونوں کب کمرے میں داخل ہوئے اس نے چونک کر سر اٹھایا تو مما اور پاپا اس کے سر پر کھڑے تھے۔

"تو تم اس خبیث کے ساتھ مل کر ہمارے منہ پر کالک ملنے کا منصوبہ بنارہی ہو؟" ایاز اکرم ایک دم آگ بگولا ہوگئے۔ "شیریں دیکھی تم نے اپنے بھتیجے کی جرأت وہ ہماری بیٹی کو ہمارے خلاف ورغلا رہا ہے۔" غصے میں وہ بیوی سے بھی کرختگی سے مخاطب تھے۔
رومانہ پہلے تو سہم گئی تھی پھر نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آگئی تھی کہ وہ باپ کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔

"مجھے کوئی نہیں ورغلا رہا پاپا...... یہ جرأت آپ لوگوں نے مجھے دی ہے، میری زندگی کوئی کھیل ہے، جس کی بازی آپ اپنی مرضی سے کھیلیں گے؟" شیریں بھی ششدر سی کھڑی تھیں۔

"روما......نہ......!" وہ ایک دم آگے بڑھیں اور رومانہ کے منہ پر کس کے تھپڑ جڑ دیا۔ "تمہیں ساری تمیز بھول گئی ہے......ہم نے اس دن کے لیے تمہیں پروان چڑھایا تھا؟" رومی کو جیسے اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"کان کھول کر سن لو شیریں......آج کے بعد یہ اس لڑکے سے نہیں ملے گی۔ اس کا سیل فون لے لو...... میں زوبی آپی سے کہتا ہوں کہ وہ جلد از جلد نکاح کی تیاری کریں۔" رومانہ کو اس اچانک فیصلے نے مزید دھچکا لگایا۔

"پاپا...... آپ ایسا نہیں کرسکتے...... میں ممی کے بغیر مرجاؤں گی......خود کو شوٹ کرلوں گی۔" وہ پھر سے گڑگڑانے لگی۔ منت کرنے لگی جیسے اسے یقین ہو کہ اس کے مما، پاپا ہمیشہ کی طرح اس کی یہ خواہش مان لیں گے۔

"اگر تم نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی تو یاد رکھنا رومی......تم سے پہلے میں خود کو شوٹ کرلوں گا۔ میں اپنی بڑی بہن کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔ سمجھاؤ، شیریں اپنی بیٹی کو۔" وہ دھمکی دے کر وہاں سے نکلتے چلے گئے۔ ماں نے بیٹی کو ملامتی نظروں سے دیکھا۔

"سن لیا ہے ناں تم نے...... ثعلب تک جانے کے لیے تمہیں صرف اپنے باپ کی نہیں میری بھی لاش پر سے گزرنا ہوگا...... فیصلہ اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔"
شیریں بیگم رومی کا سیل فون لیے کمرے سے چلی گئیں۔ وہ پہلے تو وحشت بھری نظروں انہیں جاتا دیکھتی رہی پھر بیڈ پر گر کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

ثعلب کی بے قراری مزید بڑھ گئی تھی۔ اس کا وجدان کہہ رہا تھا۔ رومانہ مشکل میں ہے، جس طرح کال منقطع ہوئی تھی اور پھر رابطہ بحال نہیں ہو پا رہا تھا صاف لگتا تھا۔ کسی نے اس سے سیل فون لے لیا ہے، وہ جوشِ جذبات میں رومی کی مدد کے لیے کمرے سے نکل کر لاؤنج سے باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھا تو

کچن سے آتے ہوئے تمکین بھابی نے اسے پکارلیا۔
''ممی......! کہاں جارہے ہواس وقت؟''
''وہ......بس......ابھی آتا ہوں، ابھی مجھے مت روکیں پلیز......'' ممی نے عجلت دکھائی تھی۔ تمکین بھابی نے جیسے اس کا چہرہ پڑھا۔
''خیریت......رومی کی طرف جارہے ہو؟ کیا بات ہے؟'' وہ اس کی پریشانی بھانپ گئی تھیں۔ ممی نے نچلا لب بھینچا۔ ''ممی ......اب کیا ہوا ہے...... کچھ بتاؤ گے مجھے؟'' تمکین کوتشویش ہوئی تھی۔
''انہوں نے رومی پر پابندی لگادی ہے۔ وہ مجھ سے بات کررہی تھی مگر درمیان میں کال کسی نے کاٹ دی......اور میں بتارہا ہوں بھابی کہ وہ لوگ اچھا نہیں کررہے...... میں اب رومی کو وہاں پر ایک منٹ نہیں رہنے دوں گا۔'' وہ جذباتی ہورہا تھا۔
''ممی ......تمہارا اس وقت وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔'' تمکین بھابی نے پہلے اسے فکرمندی سے دیکھا پھر رسانیت سے سمجھانے لگیں۔
''کیوں مناسب نہیں ہے؟'' ہماری منگنی ہوئی ہے، انہوں نے خود یہ رشتہ قبول کیا تھا پھر اب یہ نیا شوشا......؟'' وہ جیسے زچ ہوا تھا۔
''دیکھو! ہم کل جارہے ہیں، میں نے عاقب سے بات کی ہے، نانو کی آمد پر ہم تاریخ طے کرآئیں گے ابھی ہم پھپو سے ان کا عندیہ تولے لیں کہ آخر اُن کے ارادے کیا ہیں؟ وہ کیوں تم بچوں کو پریشان کررہی ہیں۔'' تمکین بھابی نے اسے پھر سے سمجھایا۔
''ان کے ارادے بدل چکے ہیں، میں آپ کو بتا تو چکا ہوں۔''
''مگر ابھی انہوں نے ہمیں تو کچھ نہیں کہا ناں......ہمیں جانے دو......انشاء اللہ وہ رومی کی رخصتی کے لیے مان جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں اگلے ماہ ہی تمہاری شادی کردیں۔''
''آپ سمجھ نہیں رہیں بھابی......کیا میں آپ سے مذاق کررہا ہوں؟ پھپو نے خود مجھ سے کہا ہے کہ وہ رومی کی شادی روحیل سے کررہی ہیں اور......''
''وہ کچھ بھی نہیں کرسکتیں......سارا خاندان جانتا ہے کہ رومی ہماری ہے، بس تم کوئی وہم مت پالو......اور جا کر آرام کرو...... میں سب سنبھال لوں گی...... شاباش جاؤ۔'' تمکین بھابی کا مشفق رویہ اس کے قدم بڑھنے سے روک گیا تھا۔ دل دُہری کیفیت میں مبتلا تھا۔ کسی انہونی کا خوف بھی تھا اور امید کی حوصلہ افزائی بھی اسے سنبھالے ہوئی تھی۔ شیریں پھپو کا رویہ اسے کچھ گزرنے پر مجبور کررہا تھا جس کا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اگر بھابی اسے روک نہ لیتیں تو واقعی وہ کوئی انتہائی قدم اٹھالیتا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ کمرے سے ہی نہیں نکلا۔ بچے، عصمیٰ حتیٰ کہ تمکین بھابی نے بھی کئی بار آکر ناشتے اور کھانے کے لیے بلایا مگر وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے کسلمندی سے لیٹا رہا۔ تنگ آکر تمکین بھابی نے بوا کے ہاتھ اس کا ناشتا کمرے میں ہی پہنچادیا......مگر اس نے صرف چائے پینے کے علاوہ کسی چیز کو چکھا تک نہیں۔ اس کا دل ایک نئی کشمکش اور الجھن میں تھا۔ وہم، اندیشے، خوف سبھی نے اس کے اندر بے کلی بھردی تھی۔ سہ پہر کے بعد تمکین بھابی تیار ہوکر کمرے میں آئیں تو اسے دیکھ کر افسوس کرنے لگیں۔
''ممی......ایک دن میں ہی کیا حالت کرلی ہے۔ مجھے تم سے ایسی کم ہمتی کی امید نہیں تھی۔ اٹھو...... اور میری بات سنو۔'' ناشتے اور پھر کھانے کی ٹرے جوں کی توں دیکھ کر ان کے تاثرات مزید آزردہ ہوئے۔ وہ بے دلی سے بستر پر اٹھ بیٹھا۔ ''شکل دیکھو ذرا، ایک دن میں مجنوں کے گرو نظر آنے لگے ہو...... بےفکر رہو، وہ لیلیٰ تمہاری ہی ہے، عاقب بھی تیار ہیں، ہم ابھی جارہے ہیں۔ اٹھو فریش ہوکر کمرے سے نکلو اور بچوں کے پاس جا کر بیٹھو۔ میں کھانا گرم کرتی ہوں۔ ہم تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔'' تمکین بھابی نے دونوں ٹرے کی چیزیں ایک ہی جگہ سنبھالیں اور انہیں اٹھا کر

دروازے کی طرف بڑھتے، بڑھتے اسے تاکید کر کے نکل گئیں۔ بھابی کا مثبت طرزِ عمل اس کے اندر پھر سے آس جگا گیا تھا۔ وہ اٹھا اور آہستہ سے کمرے سے باہر آ گیا۔ بچے فوراً اس کی طرف لپکے تھے۔

☆☆☆

شیریں بیگم اور زوبی آپا رومانہ کے کمرے میں اسے سمجھانے آئی تھیں۔ گزشتہ رات سے اس نے بھی کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ زوبی آپا بھی سارے معاملے سے آگاہ تھیں۔ پھر بھی انہیں رومانہ کو اپنی بہو بنانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ تو اپنی ذہنی کشادگی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے سمجھا رہی تھیں۔

''سوئٹ ہارٹ مرد بھی تو اپنی لائف کو انجوائے کرنے کے لیے کئی لڑکیوں سے افیئرز چلاتا ہے، تم بھی اگر اپنے کزن کے ساتھ ٹائم پاس کر لیتی تھیں تو چلو کوئی بات نہیں۔'' رومانہ نے روتے، روتے بہت چونک کر اپنی پھپو کو دیکھا پھر کچھ تکلیف سے بولی۔

''پھپو..... ہمارا ریلیشن ایسا نہیں ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے اسے چاہتی ہوں..... میں ثمی کے علاوہ کسی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔ کوئی میری بات سمجھ کیوں نہیں رہا۔''

''ناسمجھ تو تم ہو روی..... تمہیں کسی بات کا ہوش نہیں ہے۔'' شیریں بیگم نے فوراً ہی گھور کر اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

''بولنے دو..... شیریں..... بچی ہے دل کا غبار ہمارے سامنے ہی تو نکالے گی..... میری جان، اس عمر کی محبت، پیار ویار سب بکواس ہوتا ہے، تمہیں معلوم ہے شادی سے پہلے میں نے بھی روحیل کے فادر کو ریجیکٹ کر دیا تھا۔ کیونکہ میں بھی تمہاری طرح اپنے ایک کزن کو پسند کرتی تھی۔ لیکن ابا یعنی تمہارے دادا کو وہ ناپسند تھا اور پھر انہوں نے آخر اپنی منوا کر میری شادی روحیل کے فادر سے کر دی۔ اور پھر میری لائف بہت اچھی گزری۔ مجھے اپنا وہ کزن یاد ہی نہیں رہا..... بائی گاڈ.......'' زوبی پھپو بول رہی تھیں اور وہ حیرت سے سن رہی تھی۔ اس کا دل و ذہن نفی کی تکرار کر رہا تھا ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اور ثمی کو بھول جائے، ا مرنے کے بعد ہو سکتا تھا مرنے سے پہلے نہیں......

''پھپو..... آپ کو اپنے کزن سے سچی محبت نہیں ہوگی مگر.....'' وہ خاصی تلخی سے بول رہی تھی شیریں نے اسے ٹوکا۔

''رومی..... تمہارے پاپا فیصلہ کر چکے ہیں اور جانتی ہو کہ تمہارا کوئی قدم کیا تباہی لائے گا، ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ ہم تمہیں آنے والی مشکلات سے بچا رہے ہیں۔'' شیریں نے نند کی موجودگی کا احساس کر کے اپنا لہجہ قدرے نرم رکھا..... رومانہ نے لبر آنکھوں سے انہیں دیکھ کر کچھ کہنا چاہا۔

''مما..... مشکل میں تو آپ لوگ مجھے.....'' ا کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ ملازمہ دستک دے کر ا آ کر اطلاع دینے لگی۔

''بیگم صاحبہ..... عاقب صاحب اور ان کی بیو آئی ہیں۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔'' شیریں بیگم کے ماتھے کے ساتھ لہجے میں بھی بل آ گیا۔

''اُف..... اب یہ پھر وہی رونا رونے آ ہوں گے۔'' دروازے کی طرف بڑھتے، بڑھتے رو کو تنبیہی انداز میں ڈپٹا..... ''خبردار جو تم کمرے سے باہر آئیں..... آج ان سے دوٹوک بات ہو ہی جا گی..... آپا آپ یہیں رہیے اور ہاں.....'' وہ ایک د پلٹ کر آئیں۔

''یہ رِنگ اتار کر مجھے دو.....'' ماں کے کرخت سپاٹ لہجے پر رومی نے پہلے انہیں دیکھا پھر اپنے ہاتھ کو..... ثعلب کی پہنائی انگوٹھی اس کی انگلی میں پھنسی تھی۔ رومانہ کا دم گھٹنے لگا۔ شیریں نے بیٹی کے احساسات کا کوئی خیال کیے بغیر زبردستی اس کی انگلی سے انگوٹھی کھینچی اور باہر نکل گئیں۔ ان کے جاتے ہی وہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ زوبی آپا اسے چمکار رہی تھیں۔ ان کی محبت اسے زہر لگ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا ساری دنیا کو تہس نہس کر دے۔ اس کے اپنے ماں،

باپ اس کی خوشیوں کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ اس کے اندر بغاوت سر ابھارنے لگی تھی۔

☆☆☆

انہیں بیٹھے کافی دیر ہوگئی تھی۔ ملازمہ انہیں جو بٹھا کر گئی تو پھر کسی نے پلٹ کر خبر تک نہیں لی تھی۔ تمکین بھابی آخر جز بز ہو کر بولیں۔

''ثمی ٹھیک ہی پریشان ہے، یہاں تو آثار کچھ اچھے نہیں ہیں۔''

''اب تم بھی وہم میں پڑ جاؤ، پھپو کسی کام میں مصروف ہوں گی، آجاتی ہیں، ذرا صبر سے بیٹھو۔'' عاقب نے بیوی کو سنجیدگی سے ٹوکا۔ کچھ دیر بعد شیریں بیگم کافی سنجیدہ تاثرات کے ساتھ.... ان کے سامنے آکر بیٹھ گئی تھیں۔ دونوں کے سلام کا جواب بھی بڑے روکھے پن سے دیا تھا۔ تمکین نے جتاتی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔ عاقب نے فوراً نظریں چرالیں۔ ملازمہ مشروب سرو کر کے گئی تو شیریں بیگم نے اسی درشت لہجے کے ساتھ استفسار کیا تھا۔

''بنا بتائے آئے ہو...... کوئی مسئلہ تھا؟'' اس بار عاقب کے چہرے پر بھی خجالت سی نظر آئی تھی۔

''مسئلہ...... مسئلہ کیا ہوگا پھپو، ہم دراصل چاہ رہے ہیں کہ ثمی کی اب شادی کر دیں۔ وہ ماشاء اللہ اب آفس جا رہا ہے اب اور کیا انتظار کرنا کون سا کسی اور دفتر میں نوکری ڈھونڈنی ہے۔'' تمکین نے فوراً ہی مدعا بیان کیا۔

''خیر......! کر تو وہ نوکری ہی رہا ہے عاقب کی...... عاقب نے یونیورسٹی سے نکلتے ہی اسے سب کچھ تو نہیں سونپ دیا ہوگا۔'' ان کا چبھتا لہجہ عیاں بھی تھا اور مبہم بھی۔

''پھپو......! آپ کہنا کیا چاہتی ہیں......؟ سب کچھ دونوں بھائیوں کا ہی تو ہے۔'' تمکین کو ان کی بات کا انداز کھٹک گیا تھا۔

''میں نے کیا کہنا ہے...... یہ تم لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے، اسے نوکر بنا کر رکھو یا......؟''

''پھپو......! وہ بھائی ہے میرا...... بیٹوں کی طرح میں نے اسے پالا ہے، آپ آج کیسی باتیں کر رہی ہیں۔'' عاقب کے تاثرات بھی یک دم بدل گئے تھے؟ تمکین کی باتیں ذہن میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

''باتیں تو میری سدا سے تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں۔ اس وقت بھی تم خاندان کے چند بڑے لے کر آگئے تھے تو مجھے اور ایاز کو مجبوراً ثعلب اور رومی کی منگنی کی ہامی بھرنی پڑی تھی۔ حالانکہ میری بیٹی سے اس کا کوئی جوڑ نہیں بنتا تھا۔ اس لیے......'' تمکین نے ششدر ہو کر انہیں ٹوکا تھا۔

''پھپو...... آپ کے کہنے کا مطلب کیا ہے آخر......؟''

''مطلب تو صاف ہے، ثعلب کی جو پوزیشن ہے اسے دیکھتے ہوئے ایاز نے فیصلہ کر لیا ہے، ہم اپنی بیٹی کو ساری زندگی ترستے، سسکتے نہیں دیکھ سکتے۔ آج سے یہ رشتہ ختم سمجھو......'' شیریں بیگم نے جیسے ہر رشتہ، ساری مروت بالائے طاق رکھ چھوڑی تھی۔

''پھپو...... پھپو......!'' دونوں کو ہی شدید دھچکا لگا تھا۔ بولنا دشوار ہو رہا تھا۔ تمکین نے ہی فوراً خود کو سنبھال کر انہیں احساس دلانے کی کوشش کی تھی۔

''پھپو......! یہ رشتہ اتنی آسانی سے کیسے ختم سمجھیں۔ دونوں بچے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور کسی نے کوئی زبردستی تو نہیں کی تھی۔ آپ لوگوں کی رضامندی سے طے ہوا تھا یہ رشتہ...... آپ کیسے؟''

''دیکھو تمکین...... میں کسی بحث اور جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتی، عزت اسی میں ہے کہ یہ انگوٹھی لو اور خاموشی سے چلے جاؤ۔ ہم لوگ فیصلہ بدل چکے ہیں...... کل ایاز کے بھانجے سے رومی کا نکاح ہے، تم لوگوں کو مٹھائی پہنچ جائے گی۔'' شیریں بیگم نے اٹھ کر ہاتھ میں پکڑی انگوٹھی عاقب اور تمکین کے سامنے تقریباً پٹخ کر رکھی۔ ''اور ہاں اپنے لاڈلے کو سمجھا دینا...... رومی کو ورغلانے یا اس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرے ورنہ...... میں ہی اسے سمجھا لوں گی۔ ویسے تو وہ تمہاری بات بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔''

شیریں بیگم کا طنزیہ لہجہ، دونوں کے جگر کے آر پار ہو رہا تھا۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ پھپو اس طرح بدل جائیں گی۔

''پھپو، پھپو! آپ ایسا نہیں کرسکتیں۔ کچھ تو بچوں کی خوشیوں کا خیال کریں...... وہ دونوں......'' تمکین بھابی منت سماجت کرنے لگیں۔

''اپنی بیٹی کی خوشیوں کا تو خیال ہے ہمیں...... تمہارے گھر میں تمہاری باندی بنا کر نہیں بھیج سکتی، میں اسے...... اپنے دیور کے لیے اپنے معیار کے مطابق لڑکی ڈھونڈو...... میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔'' وہ ان کے دل پر تیر برسا کر جس نخوت سے اندر آئی تھیں اسی نخوت سے چلی گئیں۔ عاقب کتنی دیر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ تمکین کی نگاہ انگوٹھی پر گڑی تھی...... بدقت اس نے میز سے انگوٹھی اٹھائی اور مٹھی میں جکڑ لی پھر دلبرداشتہ ہو کر بولی۔

''چلیں عاقب......'' عاقب بھی کسی معمول کی طرح اٹھا اور وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

''مما! آپ نے یہ اچھا نہیں کیا...... میں مر جاؤں گی...... مگر......'' شیریں بیگم ڈرائنگ روم سے لاؤنج میں آئیں تو رومانہ روتی گڑگڑاتی ان کے قدموں میں آبیٹھی تھی۔ شیریں بیگم کا زناٹے دار تھپڑ رومانہ کو یک دم خاموش کر گیا تھا۔

''بس بہت کرلیا تم نے تماشا...... کان کھول کر سن لو رومی...... تمہاری وجہ سے اگر تمہارے پاپا کو کچھ ہو گیا تو...... میں ہی تمہارا گلا گھونٹ دوں گی۔'' شیریں بیگم کا یہ روپ بالکل نیا تھا۔ رومی پھٹی، پھٹی آنکھوں سے دیکھتی جاتی تھی۔ وہ پورے جلال سے بول رہی تھیں۔ ''تم جیسی لڑکیوں کے سر سے چار دن میں عشق کا بخار اتر جاتا ہے، ساری زندگی اپنی مرضی کی ہے تم نے...... کرسکتی ہو جیٹھانی کی جی حضوری......؟ مجھے پتا ہے دو دن میں روتی ہوئی واپس آؤ گی، جب دیکھو گی کہ اس گھر پر اور تمہارے شوہر پر تمہاری جیٹھانی کا قبضہ ہے اور تمہیں سانس بھی اسی کی اجازت سے لینی ہے۔ شکر ادا کرو اللہ نے بروقت تمہاری پھپو کو بھیج دیا، روحیل کے ذریعے تمہاری ساری خواہشات پوری ہوں گی۔ دیکھنا وہ تمہیں کتنا خوش رکھے گا...... اپنی جائداد اور کاروبار کا وہ اکلوتا وارث ہے...... عیش کرو گی تم عیش......'' وہ بول رہی تھیں اور رومی کا دل دہائیاں دے رہا تھا۔ وہاں سے بھاگ جانے کی ترغیب دے رہا تھا۔ مگر ثعلب سے رابطہ بھی تو نہیں ہو پا رہا تھا۔

☆☆☆

سنی اور گولڈی کب سے اسے اپنے ساتھ کرکٹ کھیلنے کے لیے کہہ رہے تھے مگر وہ انہیں ٹال رہا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر آتو گیا تھا مگر اس کی غیر حاضر دماغی اور بے دلی واضح تھی۔ عصمی بھی کافی بار اسے متوجہ کر چکی تھی۔ مگر وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے لاؤنج کے کاؤچ پر نیم دراز خود کو سوتا ظاہر کر رہا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی اپنے موجودہ رویے پر پشیمان تھا لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو انجانے خوف میں مبتلا اسے کسی انہونی سے ہراساں کیے دے رہا تھا۔ انتظار تھا کہ ختم ہی نہیں ہونے میں آ رہا تھا۔ عصمی ایک بار پھر دہائی دیتی اندر آئی تھی۔

''بھائی! وہ دونوں مجھ سے نہیں سنبھل رہے، سنی نے گولڈی سے بیٹ چھین لیا ہے، وہ رو رہی ہے، آپ بس آجائیں یا پھر بھائی کو فون کریں...... وہ لوگ ابھی تک آئے کیوں نہیں...... کتنی دیر ہو گئی ہے؟'' عصمی جیسے خود بھی رو دینے کو تھی۔ ممی کو ایک دم احساس ہوا کہ وہ اپنی پریشانی میں یہ بھول گیا تھا کہ عصمی تو خود کافی ... ڈرپوک سی ہے، بے وقت بجی بیل اسے ہراساں کر دیتی ہے، تنہا بچوں کو سنبھالنا اس کے بس کا کام نہیں تھا۔

''ابھی آجائیں گے بھائی اور بھابی...... تم دونوں کو بلا کر لاؤ۔'' ممی نے جیسے خود کو بھی بہلایا۔ عصمی کے جانے کے بعد اس نے وقت کا تعین کیا، شام ڈھل چکی تھی۔ واقعی انہیں گئے ہوئے کافی گھنٹے گزر چکے تھے۔ ممی اٹھا اور کمرے سے اپنا سیل فون لینے چل دیا۔

☆☆☆

عاقب کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ پھپو کی باتیں گونج بن کر دل و جان کو دہکا رہی تھیں۔ تمکین تو گم صم سی مٹھی میں انگوٹھی جکڑے بیٹھی تھی۔

''مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ پھپو...... اس طرح بدل جائیں گی! انہیں رومی کی خوشی کا خیال ہے نہ ممی کا احساس...... ارے کیا کمی ہوگئی ہے اب ہم میں...... جو انہیں پہلے نظر نہیں آئی۔'' عاقب شدتِ غم سے چیخ ہی اٹھا تھا۔ جس پر تمکین بھی چونک اٹھی تھی۔ آج سے پہلے عاقب کو اتنے غصے میں دیکھا جو نہیں تھا۔

''سنی تو ہیں آپ نے ان کی باتیں...... ان کا خیال ہے، رومی ہمارے گھر میں اپنی چھوٹی، چھوٹی خوشیوں کو بھی ترسے گی یا خدانخواستہ ہم ممی کا حق غصب کرلیں گے۔''

''استغفراللہ...... ہم اپنے بھائی کا حق غصب کریں گے...... لعنت ہے ان کی سوچ اور خیال پر...... میں تو اپنا آپ قربان کر دوں اپنے بھائی بہنوں پر...... ممی کو سمجھانا...... اس کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے، پھپو کیا سمجھتی ہیں، ممی کو ریجیکٹ کر کے وہ خوش رہیں گی؟ میرے بھائی جیسا انہیں بھلا کہیں ملے گا؟... ہرگز نہیں......'' عاقب کا غصہ اور لہجہ دونوں ہی اونچے ہورہے تھے اور ساتھ ہی گاڑی کی رفتار بھی درجہ بدرجہ بڑھ رہی تھی۔ عاقب کا فشارِ خون بلند ہورہا تھا۔ وہ بھائی کی محبت اور اس کے دکھ میں بولتا جارہا تھا۔ اسی لیے اسے سامنے سے آکر مڑنے والے ٹرک کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ گاڑی کسی کھلونے کی طرح ٹکرا کر الٹ گئی تھی کچھ لوگوں کی نظروں نے یہ حادثہ دیکھ کر نظریں چرالی تھیں کچھ نے فوراً مدد کے لیے دوڑ لگائی تھی۔ ٹرک ڈرائیور لوگوں سے پہلے ہی چھلانگ لگا کر کہیں روپوش ہوگیا تھا۔ عجب دل دہلانے والا منظر تھا۔ دونوں نفوس موقع پر ہی چل بسے تھے۔ ونڈ اسکرین کا کانچ ٹوٹ کر دونوں کے چہرے، گلے اور سینے میں پیوست ہوگیا تھا۔ عاقب کے الفاظ...... ''میں اپنے بھائی، بہنوں پر اپنی جان قربان کردوں۔'' فضاؤں میں گردش کرتے بارگاہِ الٰہی میں جلد ہی مقبول ہوگئے تھے۔

☆☆☆

ثعلب کے دل کے ساتھ ہاتھ بھی لرز رہے تھے۔ وہ عاقب بھائی کا نمبر بار، بار ملا رہا تھا مگر دوسری طرف سے رابطہ ہی بحال نہیں ہورہا تھا۔ اس کے اندر کسی انہونی کے ہونے کا خوف مزید پختہ ہوگیا تھا۔ شیریں پھپو کے گھر میں بھی کئی دنوں سے اس کی کال ریسیو نہیں کی جارہی تھی۔ بچے بھی عصمیٰ کے ساتھ اس کے اردگرد آبیٹھے تھے اور اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی پر کچھ ہراساں دکھائی دے رہے تھے۔

''چا...... چو...... ماما، بابا ابھی تک کیوں نہیں آئے، کتنی دیر ہوگئی ہے، انہیں فون کریں...... مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا......'' سنی اس کا بازو ہلاتا متوجہ کر کے اپنے احساسات بتارہا تھا۔ تبھی ممی کو گھر کے فون کی گھنٹی بجنے کا احساس ہوا۔ تبھی اس طرح چونکے تھے جیسے انہیں اسی گھنٹی کا انتظار ہو۔ ممی فوراً اٹھ کر فون کی طرف لپکا...... ریسیور اٹھاتے ہی اس نے جو سنا وہ اس کے اوسان خطا کرنے کے لیے کافی تھا۔

''اس نمبر کی کار کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ دونوں کی ڈیڈ باڈیز اسپتال میں پڑی ہیں، ضروری کارروائی کے لیے آجائیں اور ڈیڈ باڈیز لے جائیں۔'' اسپتال کے عملے کی جانب سے فون تھا۔ یہ خبر کسی بڑے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ ثعلب دُہرے صدمے سے دوچار تھا۔ عاقب بھائی جیسے ماہر و محتاط ڈرائیور کا ایکسیڈنٹ ہونا اس کی دانست میں شیریں پھپو کا دیا کوئی ایسا ذہنی و جذباتی جھٹکا تھا جس نے انہیں اپنی ہی جان پر کھیلنے پر مجبور کردیا ہوگا۔ ان کے گھر میں کہرام مچ گیا تھا۔ ثعلب بڑی مشکل سے اسپتال سے اپنے ان دو پیاروں کی میتیں اٹھا کر لایا تھا جن کے بغیر وہ جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ صبحیٰ آپی بھی اطلاع ملتے ہی آگئی تھیں۔ تمکین بھابی کی میت کو غسل دیتے وقت ان کی بند مٹھی سے برآمد ہونے والی منگنی کی انگوٹھی نے تو سب کچھ عیاں کردیا تھا۔ گویا اسی صدمے نے انہیں

بے قابو کیا تھا۔ کہنے سننے کو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ شیریں پھپو اطلاع کے باوجود تدفین کے اگلے دن رسمی انداز میں آئیں اور ان پر نئی قیامت ڈھا گئیں۔

”اطلاع تو مجھے مل گئی تھی مگر کل میری بیٹی رومی کا نکاح تھا۔ میں کیسے آتی......“ نانو کے آبدیدہ شکوے پر انہوں نے جواباً جو پتھر مارا تھا وہ سیدھا ثعلب کے دل کو لہولہان کرتا اس کے جسم سے روح کھینچ کر لے گیا تھا۔ اس کی محبت اس طرح اس کے عظیم دکھ کی آڑ میں قربان ہو جائے گی وہ سوچتا رہ گیا۔ کیا وہ اس کی سگی پھپو تھیں جو اپنے سگے بھتیجے کی تدفین پر نہ آسکیں۔ وہ دُہرے غم سے نڈھال چور، چور دل کی کسک لیے بالکل خاموش ہو کر رہ گیا تھا۔ بچے اپنے ماں، باپ کے بعد اسی سے مانوس تھے۔ اس کی توجہ نہ پا کر وہ بھی بلک، بلک کر رو پڑے تھے۔ اپنے مما، بابا کو پکارتے...... ایسے میں صبحیٰ آپی اسے سمجھاتیں کہ وہ اپنے ساتھ بچوں کو بھی سنبھالے...... مگر وہ خود کو سمجھانے کی کوشش میں مزید بکھر جاتا۔

شیریں پھپو موقع سے اس طرح فائدہ اٹھائیں گی، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ انہیں اطلاع ملی تھی کہ شیریں پھپو بھی رومانہ اور اپنی نند کے ساتھ کینیڈا جانے کا پروگرام بنا رہی ہیں۔ کئی بار رابطے کی کوشش کے باوجود رومی سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ اسے دکھ تو رومی کے بدل جانے کا بھی تھا۔ جس نے کبھی ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ وہ دو لفظی معذرت بھی نہیں کر کے گئی تھی۔ اس نے بھی خاموشی سے سارے وعدے بھلا دیے تھے۔ پلٹ کر یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ کس حال میں ہے۔ وہ جو اس سے بات کیے بنا گھر سے نہیں نکلتا تھا۔ وہ اسے بتائے بغیر ملک ہی چھوڑ گئی تھی۔ اپنے غم کی شدتوں کے باوجود وہ رومی کی محبت کی کسک کو کسی صورت بھلا نہیں پا رہا تھا۔ ادھر صبحیٰ آپی اسے گھر اور بچوں کا احساس دلا کر اپنے گھر رخصت ہو چکی تھیں۔ آخر زندگی کا سفر تو رواں دواں رہتا ہے، کبھی اپنے دکھوں، خوشیوں اور سکھوں کا حصہ لے کر جینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ بھی بالآخر اپنوں کی خاطر آہستہ، آہستہ سنبھل گیا تھا۔ نانو مستقل ان کے گھر میں مقیم تھیں اور گاہے بگاہے وہ اپنی محبتوں اور نصیحتوں سے اسے سمجھاتی رہتی تھیں۔ سنی، گولڈی کی محبتیں، ان کی ذمے داری کا احساس بظاہر اسے زندگی کی طرف لے آیا تھا مگر وہ کچھ بھی بھولا نہیں تھا بھائی، بھابی کی بے وقت موت، نہ شیریں پھپو کا رویہ...... اور نہ ہی رومی کی بے وفائی ...... جو اس کے دل کو گھائل کر کے جسم و جان کو فگار رکھے ہوئے تھی۔ اسے آپی کی بات ماننے پر اسی لیے تو اعتراض تھا کہ وہ ابھی تک رومی اور اس کی محبت کو بھلا نہیں پایا تھا۔ اسے خود پر اعتبار تھا نہ اپنی زندگی میں شامل ہونے والی نئی ہستی پر...... اسے لگتا تھا کہ وہ اس کے حقوق دینے کے معاملے میں انصاف نہیں کر پائے گا اور وہ اس گھر کو صحیح معنوں میں اپنا نہیں بنا پائے گی۔ اس گھر کی بے ترتیبی، بے سکونی میں مزید اضافے کے خدشے اسے کسی قسم کا قدم اٹھانے سے روک دیتے تھے اب بھی وہ متزلزل تھا۔ سوچوں کے بھنور میں ڈوبتے ابھرتے، اپنے ماضی کی تلخیوں کو پیتے، سہتے کافی رات بیت گئی تھی۔ آخر اس نے سب کچھ وقت پر چھوڑ کر تھکے ہوئے ذہن کے ساتھ بستر میں پناہ لی۔ وہ اس قدر نڈھال تھا کہ پھر اسے خبر ہی نہیں ہوئی کہ کہاں ہے۔

☆☆☆

صبح وہ اپنے معمول سے نہیں اٹھا تو سبھی کو تشویش ہوئی۔ آپی نے آج خود سب کے لیے سب کی پسند کا ناشتا بنایا تھا۔ بچوں کی فرمائش حلوا پوری تھی۔ ثعلب کے انتظار میں پوریاں تلنا باقی تھیں۔ صبحیٰ آپی نے دونوں بچوں کو اسے جگانے بھیجا تو وہ کچھ دیر بعد دونوں کو گود میں لیے کچن میں چلا آیا۔ فریش ہونے کے باوجود اس کی آنکھوں کی لالی ختم نہیں ہوئی تھی۔

”آپی...... آپ نے میری نیند کے دشمنوں کو کیوں بھیج دیا تھا۔ ابھی مجھے مزید سونا تھا۔“ آپی نے اس کی بوجھل آواز پر اسے چونک کر دیکھا۔

”کیوں......؟ رات کو سوئے نہیں تھے؟“

''آپ نے پرانی یادیں چھیڑ دی تھیں، مجھے نیند کیسے آتی، میں سوچتا ہی رہا کہ یہ مسئلہ کیسے حل کروں۔''
دونوں کو گود سے اتار کر وہ خود کچن اسٹول پر ٹک گیا۔
''پھر......؟ مسئلہ تو حل کرنا ضروری ہے بھائی۔''
''آپی...... میں فیصلہ ہی نہیں کر پا رہا...... پلیز آپ ابھی کچھ ٹائم دیں......'' اس نے بوجھل لہجے میں کرب سے کہا۔
''اور کتنا ٹائم......؟'' صبحیٰ نے بھویں چڑھائیں پھر سر جھٹک کر بولی ۔
''او کے ابھی پہلے ناشتا کرو...... صبح سے بچے بھی بھوکے پھر رہے ہیں...... ہم بعد میں بات کرتے ہیں۔ بچو! چلو ڈائننگ روم میں، ناشتا ریڈی ہے، عصمیٰ آؤ ناشتے کی چیزیں لے جاؤ۔'' بچے بھی اپنی پسند کے ناشتے پر ایکسائٹڈ ہو رہے تھے۔
''چلیں چاچو......! پھپھو نے مزے کا ناشتا بنایا ہے۔'' دونوں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کھنچتا چلا گیا۔

☆☆☆

اس نے صبحیٰ آپی سے بچنے کی لاکھ کوشش کی تھی۔ سارا دن بچوں کے ساتھ ہلا گلا کرتے ان کی فرمائشیں پوری کرنے میں گزار دیا تھا۔ وہ بھی جیسے اسے آزما رہی تھیں۔ بچوں کے تھک کر سونے پر وہ ان کے کمرے سے ثعلب کو کان سے پکڑ کر نانو کے کمرے میں لے آئیں۔
''ارے، رے...... آپی...... چھوڑیں ناں...... میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا۔'' وہ مصنوعی طور پر کراہا۔
''تم صبح سے تو بھاگے ہی پھر رہے ہو...... اب یہاں آرام سے بیٹھو، اب تمہارا کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔'' انہوں نے اسے نانو کے بیڈ کے سامنے رکھی کرسی پر تقریباً دھکیل کر بٹھایا۔ نانو اس کی درگت بنتی دیکھ کر مسکرا رہی تھیں اور وہ مصنوعی لاچاری ظاہر کرتا منہ بنا رہا تھا۔
''ممی......! صبحیٰ اب تمہیں چھوڑنے والی

برتن بجنے لگے

ایک مرتبہ پریشر کُکر نے کڑاہی سے پوچھا۔
''تم اتنی کالی اور بدنما ہو، رنگ گورا کرنے کے لیے کوئی اچھی سی کریم کیوں نہیں استعمال کرتیں۔''
کڑاہی نے گھومتے اور لہراتے ہوئے چمک کر کہا۔
''میں جتنی بھی کالی ہوں...... سیٹیاں تو تم پھر بھی مارتے ہو۔''

از: سامعہ تبسم، ملتان

نہیں...... مان جاؤ اب اس کی بات۔''
''کون سی بات......؟'' وہ انجان بنا تو آپی نے اسے گھورا۔
''پھر وہی انداز...... اتنے ننھے نہیں ہو تم۔''
''واقعی مجھے نہیں پتا آپ کس بات کو ماننے کے لیے کہہ رہی ہیں۔ آپ کی نہ ماننے والی باتوں کی تو ایک لمبی لسٹ ہے۔'' وہ اپنی بات پر ڈٹا انہیں زچ کر گیا۔
''دیکھ رہی ہیں نانو اسے......'' انہوں نے جیسے دہائی دی۔
''نانو تو مجھے صبح شام ہی دیکھتی ہیں۔'' اس کی سنجیدگی میں بھی شوخی تھی۔
''دیکھو تم اس گھر کے اب سربراہ ہو...مگر بچوں کی طرح ہر بات ہنسی مذاق میں اڑا دیتے ہو۔''
''کبھی آپ کو میری سنجیدگی پر شکوہ ہے، کبھی ہنسی مذاق پر...... کیا کروں میں غریب......'' اس نے پھر سے مصنوعی آہ بھری تو صبحیٰ آپی جیسے ہار کر نانو کے پہلو میں بیٹھ گئیں۔
''میں ہی پاگل ہوں جو تمہیں سمجھانے یہاں چلی آئی ہوں۔''
''آپ کے پاگل پن کا یہاں آنے سے کیا تعلق ہے؟'' آج وہ عرصے بعد اپنی جُون میں لوٹا تھا۔ نانو

جان حیرت انگیز خوشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔
''تعلق ...... تعلق یہ ہے کہ تم میرے بھائی ہو ثمی...... تمہاری حالت اور اس گھر کی ویرانی مجھے...... بے چین رکھتی ہے، اس گھر سے خوشیاں روٹھ گئی ہیں...... تمہیں اور سب کو اس ہستی کی ضرورت ہے جو ہم سب کو اس سانحے کے اثر سے نکال لائے۔ تمہارے ان زخموں پر مرہم رکھ سکے جنہیں تم ناسور بنانے پر تُلے ہو۔'' صبحیٰ نے پُرزور انداز میں اسے احساس دلانے کی کوشش کی تو وہ یک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔
''پلیز آپی...... مجھے اپنے زخموں کے لیے کسی مسیحا کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جلد یا بدیر ہم بالآخر خود ہی نکل آئیں گے اپنے دکھوں کے اثر سے۔''
''نہیں نکل سکتے...... بچوں اور عصمی کو اس عمر میں ایک نگران کی ضرورت ہے، خصوصاً عصمی کے لیے رہنما کی ضرورت ہے۔ وہ ابھی بچپنے سے نہیں نکلی ہے، اسے اچھے برے کی تمیز سکھانے والا ہونا چاہیے۔ تم آخر کب تک بزنس کو چھوڑ کر ان سب کا دل بہلاؤ گے...... آخر تم حالات کا تقاضا سمجھ کیوں نہیں رہے ہو ثمی...... عاقب بھائی کے عمل کو بھول گئے ہو، انہوں نے تمکین بھابی کے ساتھ مل کر ہم سب کی تربیت کس طرح کی تھی، تمہیں بھی اچھی ہم سفر مل سکتی ہے، آخر تم خود کو رومی کے اثر سے نکال کیوں نہیں پا رہے۔ کب تک اس کا قبضہ رہے گا تمہاری ذات پر، فیصلے کا اختیار کیوں نہیں ہے تمہیں؟'' صبحیٰ آپی جذباتی ہو کر بولتے ،بولتے رونے لگیں تو وہ بے بسی سے پہلے انہیں دیکھے گیا پھر اٹھ کر ان کے قریب جا کر انہیں کندھوں سے تھام کر بولا۔
''آپ غلط سمجھ رہی ہیں آپی......! رومی میری زندگی میں ایک تلخ یاد کے سوا کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ میں تو بس یہی سوچ رہا ہوں کہ کہیں میری وجہ سے گھر کا سکون مزید خراب نہ ہو جائے۔'' وہ انہیں مطمئن کرنے کے لیے خود کو سنبھال کر بولا تو نانو نے فوراً اس کا حوصلہ بڑھایا۔
''ایسا کیوں سوچتے ہو بچے......؟ ہمارے نصیب میں ایسا ہی لکھا تھا۔''
''مگر نانو آئندہ نصیب میں کیا ہے، یہ بھی کسے معلوم ہے اگر مجھ سے شادی کر کے آنے والی لڑکی ہماری توقعات پر پوری نہ اتری تو یہ رسک ہی ہے ناں......''
''اللہ سے اچھی امید رکھو میری جان! گھر، محبت، وفا اور خلوص سے سنورتے اور بنتے ہیں، عورت کی تربیت اگر اچھی ہوئی ہے تو مرد کی مہیا کی گئی محبت، خلوص اور وفا وہ اپنے گھر میں سمیٹ کر پھیلانے میں تامل نہیں کرتی...... لیکن شرط ہے وفا اور محبت...... تم آنے والی کو اپنے دل میں جگہ دو گے تو وہ اس گھر کے ہر مکین کو دل میں بٹھالے گی۔ عورت کے ہنر و محبت کا کمال تو تم نے تمکین کے روپ میں دیکھا ہی ہے ناں میرے بچے......'' نانو اپنے انداز میں اسے رسانیت سے سمجھا رہی تھیں۔ اس کے لبوں پر تلخ سی مسکان آ کر معدوم ہو گئی۔
''نانو...... آپ پچھلی صدی کی عورت کا تجربہ رکھتی ہیں جبکہ زمانہ بدل گیا ہے، اب تو شیریں، پیو اور رومی جیسی عورتیں کامیاب ہیں جو ایک پل میں ہنستے بستے گھر...... دھڑکتے دل تک تباہ کر دیتی ہیں۔'' اس کے دل کا درد زبان پر آ گیا تھا۔ نانو اور آپی نے بیک وقت خفگی سے گھورا۔
''بھاڑ میں ڈالو انہیں، ہم تو اپنے تجربے پرکھتے ہیں اور انشاء اللہ صبحیٰ تمہارے لیے جسے بھی پسند کرے گی وہ بے مثال لڑکی ہی ہو گی۔ بس اب تم ذہنی طور پر خود کو تیار کر لو بیٹا۔''
''بالکل صحیح کہہ رہی ہیں نانو...... اگلی بار آؤں گی تو میں کسی خوشخبری کے ساتھ ہی آؤں گی۔'' صبحیٰ نے بھی تائید کی......
''آپ لوگ مجھے پھنسانے کا فیصلہ کر ہی چکے ہیں تو میں کیا کروں...... لیکن یاد رکھیں بعد میں مجھے کوئی کچھ نہ کہے......'' اس نے بہت بے دلی سے رضامندی دے دی۔ صبحیٰ کے لیے یہی کافی تھا۔

☆☆☆

صہبا کافی پُرسکون ہو کر گھر واپس آئی تھی۔ ناشتے کے
لاؤنج میں اپنی ساس کے ساتھ چائے پیتے ہوئے
ہ بھی خوشخبری سنائی تھی۔

"شکر ہے امی جان، ممی مان گیا ہے، میرے تو
سے بہت بڑا بوجھ اترا ہے۔"

"یہ تو اچھی خبر سنائی ہے تم نے...... بس اب دیر نہ
رنا۔ کوئی اچھی لڑکی دیکھو اور اپنا میکا آباد کرلو۔"

"سوچا تو ایسا ہی ہے امی جان، اللہ بہتر کرے۔"

"ہے کوئی لڑکی نظر میں...... یا کسی کو کہا
ہے...؟ خاندان میں بھی کافی لڑکیاں ہوں گی؟"
یدہ خانم نے رسان سے پوچھا۔

"خاندان کی کسی لڑکی سے تو وہ اب کبھی
ں مانے گا۔ البتہ میری نظر میں ایک لڑکی ہے،
سوچ رہی تھی کہ آپ سے پہلے مشورہ کرلوں......
بات منہ سے نکالوں۔" صہبا نے جھجکتے جھجکتے بات
ل کی۔

"مجھ سے......؟" سعیدہ خانم ایک دم چونک
ں۔ ہاتھ میں پکڑا کپ میز پر رکھ دیا۔ "کس
ے لیے؟"

"امی جان آپ سارے حالات جانتی ہیں، ممی
ے بھی واقف ہیں الحمدللہ وہ ذمے دار اور ہونہار ہے،
، چاہ رہی تھی کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ماموں
ن سے وانیہ کے لیے بات کریں۔" صہبا نے گویا
ں حیران کردیا۔ وہ خود بھی آج کل اسی نہج پر سوچ
ی تھیں۔ اللہ نے کیسی ان کی مشکل آسان کی تھی۔

"کریم سے کیا بات کروں...... جو کرنا ہے اب
ے ہی کو کرنا ہے، وہ تو طاہرہ کے قبضے میں ہے، بہرحال
اہتی تو میں بھی یہی ہوں کہ بچی کو اپنے گھر کا سکون
سیب ہو۔"

"پھر کیا خیال ہے امی جان؟" صہبا نے پُر
سید ہو کر پوچھا۔

"میرا خیال تو مثبت ہی ہے، پھر بھی پہلے وانیہ
سے بات کرنا اور مشورہ کرنا ضروری ہے، بچی کہیں یہ نہ
سمجھے کہ میں تنگ آکر اسے گلے سے اتار رہی ہوں۔"

"امی جان آپ ضرور بات کریں۔ اگر وانیہ کی
مرضی نہ ہوئی تو کوئی بات نہیں...... اللہ تعالیٰ نے جوڑ
لکھا ہوگا تو میل ہوجائے گا۔" صہبا نے مروت ومحبت
سے کہا تو وہ بھی سر ہلا کر تائید کرنے لگیں۔

"بالکل...... اللہ بہتر کرے گا۔" چائے ختم کر
کے صہبا دوپہر کے لیے کھانا بنانے کے لیے اٹھ کھڑی
ہوئی تھی۔

☆☆☆

وانیہ کو سعیدہ خانم نے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔
دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوکر صہبا اور بچے اپنے،
اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے۔ یہ ان کا
معمول تھا، عصر کی نماز سے پہلے سبھی اٹھ کر اپنے، اپنے
کاموں میں لگ جاتے۔ وانیہ جھجکتی ہوئی ان کے
کمرے میں داخل ہوئی۔

"جی پھپو، آپ نے مجھے بلایا ہے؟" اسے
دیکھتے ہی وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھیں۔

"ہاں، ہاں، آؤ بیٹا، اِدھر بیٹھو۔" انہوں نے
وانیہ کو اپنے سامنے بٹھایا۔ "کیا کررہی تھیں؟"

"کچھ نہیں...... بس ایسے ہی فارغ بیٹھی تھی۔
بھابی کچھ کرنے ہی نہیں دیتیں۔" گھنی پلکوں کو اٹھا کر
اس نے انہیں دیکھا تو وہ دل ہی دل میں اس کی بلائیں
لینے لگیں۔ گندمی رنگت میں بھی اس کا حسن کھلا، کھلا سا
لگتا تھا۔ سیاہ بادامی آنکھیں، گھنے لمبے بال، تیکھے نقوش،
کھڑی ناک، پنکھڑیوں سے ہونٹ...... وہ جاذب نظر
شخصیت کی مالک تھی۔ یقیناً اپنی ماں کا پرتو......

"ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں پھپو؟" وانیہ ان کی
توجہ خود پر مرکوز پاکر سٹپٹا سی گئی۔

"اللہ کی قدرت دیکھ رہی ہوں بیٹا...... اس نے
مجھے کتنی پیاری بیٹی عطا کی ہے، اللہ نظرِ بد سے بچائے۔"

"پھپو آپ تو مجھے غلط فہمی میں ڈال دیں گی۔ پتا
ہے امی تو مجھے آئینہ بھی نہیں دیکھنے دیتی تھیں۔ کہتی تھیں

لڑکیاں زیادہ آئینہ دیکھیں تو انہیں شیطان ورغلانے لگتا ہے کہ تم بہت حسین ہو.....لڑکیاں بہکاوے میں آجاتی ہیں۔''

''وہ بھی ٹھیک ہی کہتی تھی.....'' سعیدہ پھپو نے اس کی یاد کے سلسلے کو درمیان میں توڑ دیا.....کیونکہ ابھی وہ اس سے اس کے مستقبل کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھیں۔

''بچیوں کی تربیت اسی طرح کی جاتی ہے.....بہر حال میں نے تمہیں ایک خاص بات کے لیے بلایا تھا۔''

''ج.....ج.....ی.....کہیے پھپو!'' وہ ان کی سنجیدگی پر کچھ پریشان سی ہوگئی تھی۔ بابا اور بڑی امی کے حوالے سے اسے بہت خدشات رہتے تھے۔

''تمہاری ماں زندہ ہوتی تو وہی تم سے اس سلسلے میں بات کرتی۔تم مجھے بھی اپنی ماں ہی سمجھنا اور اپنے دل کی بات صاف، صاف کہنا۔'' پھپو کی تمہید اسے الجھن میں ڈال رہی تھی۔

''پھپو آپ میرے لیے امی کی جگہ پر ہی ہیں۔ آپ کہیے کیا بات ہے۔''

''بات دراصل یہ ہے بیٹا کہ صبحیٰ نے اپنے بھائی کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا ہے، بہت نیک اور سلجھا ہوا بچہ ہے۔ان کے ساتھ جو ہوا اس سے تم آگاہ تو ہو ہی چکی ہو۔تمہاری رضامندی اور مرضی کے بغیر میں صبحیٰ کو کوئی جواب نہیں دے پائی۔'' انہوں نے بالآخر اس کی الجھن ختم کی۔

''پھپو.....میری شادی.....؟ یہ تو بابا کو فیصلہ کرنا ہے، میں خود کیسے.....'' وہ شرم اور جھجک کے مارے بول نہیں پا رہی تھی۔

''نہیں..... یہ فیصلہ صرف تمہیں کرنا ہے بیٹا..... کوئی زبردستی نہیں ہے اگر تمہاری امی کی یا تمہاری کہیں اور مرضی تھی تو بھی تم مجھے بتادو اور بے فکر ہو جاؤ..... میں ماں بن کر ہی تمہیں رخصت کروں گی۔'' انہوں نے حوصلہ بڑھاتے انداز میں اسے تھپتھپایا تو اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''پھپو.....ایسی کوئی بات نہیں ہے، امی او میرے لیے جو فیصلہ کرتے میرے لیے وہی بہتر ہ آپ جو کہیں گی میں مانوں گی۔''

''پھر بھی بیٹا تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو..... گھر کو اور ثمی کو سنبھالنے اور سمیٹنے والی ہستی چاہیے بہت اچھا ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ بکھرا ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے پھپو..... آپ بابا سے ب کرلیں۔'' وہ نیم رضامندی دے کر وہاں سے اٹھ آ

☆☆☆

''آپا ان حالات میں وانیہ کی شادی کردی بہتر ہے۔ مجھے آپ پر بھروسا ہے، آپ نے اس لیے بہت اچھا فیصلہ کیا ہوگا۔'' دو دن بعد کریم احمد عجلت میں شام کے وقت آئے تھے۔ ان کے چائے لاتی وانیہ نے دروازے کے باہر کھڑے ہو الفاظ سنے اور دل میں کسک سی جاگ گئی۔

''مجھے بھی یہی مناسب لگتا تھا۔ اللہ نے مدد کی اور میری بہو نے خود چاہت کی ہے۔تمہا گھر میں اس کے لیے گنجائش نہیں بن رہی تھی یہاں وہ خود کو میرے اوپر بار محسوس کرتی ہے حال ایسا نہیں ہے، چلو ایک نہ ایک دن تو اس کی ش ہونی ہی ہے۔ اچھا ہے اپنے گھر بار کی ہوجائے اپنے مان کے ساتھ جیے گی۔آج نہیں تو کل آخرا رخصت کرنا ہی تھا۔'' سعیدہ خانم نے خفگی بھر انداز میں بھائی کو دیکھ کر کہا۔

''آپا..... شادی کے سارے معاملات اخراجات کے لیے میں حاضر ہوں۔آپ جب کہیں میں آجاؤں گا۔''

''ہاں، تمہاری موجودگی تو ضروری ہے الب معاملات و اخراجات کی فکر مت کرو، وہ یہاں۔ میری بیٹی بن کر رخصت ہوگی۔اتوار کو لڑکا آرہا ہے آکر مل لینا۔'' سعیدہ خانم بھائی سے مکمل طور پر خفا نہیں تو راضی بھی نہیں تھیں۔ کریم احمد نے مجبوری سے انہیں

دیکھا اور کچھ کہنے ہی والے تھے کہ وانیہ چائے لے کر آ گئی۔ سلام کرتی کپ تھما کر پلٹ گئی۔ کریم احمد نے... پُرملال نظروں سے بیٹی کو جاتے ہوئے دیکھا۔

☆☆☆

مُمی کو امید نہیں تھی کہ آپی جاتے ہی اپنی مہم پر نکل کھڑی ہوں گی۔ ان کے یہاں سے جانے کے دو دن بعد ہی نانو نے دھماکا کر دیا تھا۔ اس کے تئیں تو یہ دھماکا ہی تھا۔ بچوں کو حسبِ معمول سلانے کے بعد وہ ان کے پاس آ کر بیٹھا ہی تھا کہ انہوں نے اس کی سماعتوں میں گویا بم پھوڑ دیا۔

''صبیحہ نے تمہارے لیے لڑکی پسند کر لی ہے۔''

''کیا......؟ اتنی جلدی......؟ ابھی تو وہ گئی تھیں۔'' وہ کرسی پر اس طرح اچھلا جیسے واقعی اسے کرنٹ لگا ہو۔

''اس کی نظر میں لڑکی تو پہلے سے ہی تھی۔ بس تمہاری رضامندی لینے کے بعد وہ سلسلہ آگے بڑھانا چاہتی تھی۔'' نانو نے رسانیت سے سمجھایا۔

''میں نے ابھی مکمل رضامندی تو نہیں دی تھی۔ انہیں ہر کام کی جلدی کیوں رہتی ہے۔'' وہ جھنجلا کر بولتا نانو کو بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔

''جھوٹ مت بولو بچے......رضامندی تو تم نے دی تھی اور میرے سامنے ہی دی تھی۔'' نانو نے سرزنش کی تو وہ مزید جھنجلایا۔

''مگر ......میں نے اتنی بھی جلدی کے لیے نہیں کہا تھا۔ میں بات کرتا ہوں ان سے ابھی۔'' وہ اسی طرح پلٹا۔

''ہاں...... وہ بھی فون کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔'' کمرے سے نکلتے، نکلتے اس نے نانو کے الفاظ سنے......وہ جھنجلاتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ نانو اس کے الجھنے پر مسکراتی رہیں۔ کمرے میں آ کر بھی وہ اپنی جھنجلاہٹ پر قابو نہ پا سکا تو سیل فون اٹھا کر آپی کے بجائے شہود بھائی کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف مسلسل بیل بجتی رہی۔ اسے ایک دم خیال آیا کہ آپی اس وقت اپنے شوہر کے ساتھ ہوں گی۔ خیال آتے ہی اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ شہود بھائی بے حد سنجیدہ مگر ٹھنڈے مزاج کے انسان کے تھے۔ ان سے رسمی بات کے سوا کبھی بات نہیں ہوئی تھی۔ انہی کے سیل فون سے کال بیک آ رہی تھی۔ اس کی ساری جھنجلاہٹ ہوا ہو گئی۔ فوراً ہی کال ریسیو کرتے ہی بولا۔

''سوری......شہود بھائی، میں غلطی سے اس وقت کال کر بیٹھا۔ مجھے دراصل آپی سے......''

''یار......غلطی سے کبھی ہم سے بھی بات کر لیا کرو......میں بھی تمہارا کچھ لگتا ہوں۔'' شہود بھائی کی خوشگواری اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

''شہود بھائی اب آپ ہی تو بڑے ہیں ہمارے......میں تو ہمیشہ آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں۔''

''جیتے رہو، خوش رہو......تمہاری آپی بچوں کو دیکھنے ان کے روم تک گئی ہیں۔ آتی ہیں تو بات کرواتا ہوں۔'' سلسلہ منقطع کر کے اس کی جھنجلاہٹ پھر عود کر آئی۔ اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ وہ انتظار میں اِدھر اُدھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

☆☆☆

وانیہ کے لیے بھی اب کوئی معاملہ غیر متوقع نہیں رہا تھا۔ امی کی اچانک موت کے ساتھ کھلنے والے کئی رازوں کو جان کر اب وہ کسی بات پر بھی چونکتی نہیں تھی۔ صبیحہ بھابی نے مُمی کے حوالے سے اور اپنے گھر پر گزرے سانحے کا احوال سنا کر اسے حالات کے مطابق چلنے اور ڈھلنے کا موقع فراہم کر کے گویا اسے آئندہ کسی امتحان سے بچانے کی کوشش کی تھی اور وہ دل سے ان کے خلوص پر ممنون تھی۔ ورنہ تو بابا کی عدم توجہی نے اسے واقعی توڑ پھوڑ دیا تھا۔ امی کے بعد انہیں صرف بڑی امی اور اپنے اس گھر کی فکر تھی۔ اس کا خیال تو صرف فون پر خیریت معلوم کرنے تک رہ گیا تھا۔ وہ کسی سے کہتی نہیں تھی مگر اسے بابا کے بدل جانے کا بے حد ملال تھا۔ یہ ملال کوئی روگ بن جاتا، اس سے پہلے ہی اللہ نے اس کی زندگی کو نیا موڑ دے دیا تھا۔

اپنے گھر کی چاہت کسے نہیں ہوتی، بے شک وہ خواب سجانے والی لڑکی نہیں تھی مگر وہ خواب دیکھتی تو ضرور تھی۔ ایک اپنے گھر کا خواب اب اس کی آنکھوں میں بھی آٹھہرا تھا۔ جہاں وہ مکمل مان اور اعتماد کے ساتھ رہنے کی تمنا رکھتی اور یہ تمنا کسی بھی طرح پوری ہونے جا رہی تھی اس کے لیے یہی کافی تھا۔

☆☆☆

وہ ٹہلتے، ٹہلتے تھک کر بیٹھا تو صہبا آپی کی کال آگئی۔

''کہاں گم ہیں آپ......؟ یہاں پھلجڑی چھوڑ کر......'' ممی کا موڈ بیزار تھا۔ دوسری طرف صہبیٰ آپی کھلکھلائی۔

''بے فکر رہو...... ہم پوری آتش بازی کریں گے، تمہاری بارات پر۔''

''آپی میں ابھی مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں اگر آپ اس وقت اپنے بیڈروم میں ہیں تو باہر نکل کر بات کریں پھر نہ کہیے گا کہ......''

''تم کہو جو کہنا ہے میں لاؤنج میں ہوں۔'' صہبا کو اس کے موڈ کا اندازہ تھا۔

''دو دن میں آپ کو لڑکی کہاں سے مل گئی۔ اتنے بیزار ہیں اس سے اس کے گھر والے۔'' نادانستگی میں وہ، وہ بات کہہ گیا جو کچھ، کچھ سچ تھی۔

''بکواس نہیں کرو...... بھلا کوئی اپنی بیٹیوں سے بیزار ہوتا ہے؟ اور تم بھول رہے ہو، تمہاری شادی کی جلدی ہمیں ہے۔''

''اتنی جلدی بھی مت کریں، ایسا نہ ہو کہ میں عین وقت پر مکر جاؤں۔'' ممی نے گویا دھمکی دی۔

''ایسا غضب کیا تو سمجھ لو تمہاری بہن دو بچوں سمیت تمہارے دروازے پر آ کر بیٹھی ہو گی۔'' صہبا نے جواباً اسے دھمکایا۔

''یہ کیا بات ہوئی...... یہ تو زبردستی ہوئی۔'' وہ موبائل فون کو دوسرے کان کی طرف لگا کر چلایا۔

''یہ زبردستی نہیں ہے بھائی، میری سسرال کی عزت کی بات ہے، تم میری نند سے عین وقت پر شادی سے مکر جاؤ گے تو کیا وہ تمہاری بہن کو اپنے گھر بٹھائے رکھیں گے؟''

''آپ کی نند......؟ یہ کہاں سے ٹپک پڑی...... وہ بھی اتنی اچانک......'' ممی کی حیرت دیدنی تھی۔ آپی نے بنا دیکھے حظ اٹھایا۔ ''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ کے صرف دو عدد دیور ہیں اور وہ بھی باہر سیٹلڈ ہیں۔ کہیں ان میں سے کسی ایک کی جنس تو نہیں بدل گئی۔ جسے آپ میرے سر تھوپنے کے چکر میں ہیں۔'' وہ اپنی حیرت میں فضول بول گیا۔

''شٹ اپ...... کتنا فضول سوچتے ہو تم، پہلے پوری بات تو سن لو۔''

''آپی پلیز۔ سسرال کی ہمدردی میں بھائی کے ساتھ ظلم مت کرنا۔''

''ممی، ممی! خدا کے لیے چپ کر کے پہلے میری بات سن لو۔'' صہبا آپی ذرا سی دیر میں زچ ہو اٹھی تھیں۔

''سچی بات کوئی برداشت ہی نہیں کرتا۔'' وہ بچوں کی طرح روٹھا۔ ''باہر کی دنیا میں کیا کچھ بدل گیا ہے آپ کو خبر ہی نہیں۔''

''مجھے سب خبر ہے، چپ کر کے میری بات سنو۔ وانیہ، شہود کی ماموں زاد ہے، آج کل ہمارے گھر میں رہتی ہے۔ تم ویک اینڈ پر آؤ اور اس سے مل لو، دیکھ لو۔''

''آپی! شہود بھائی کے ون اینڈ اونلی ماموں کریم احمد کی دو عدد بیٹیوں کی شادی میں، میں خود شریک ہوا ہوں۔ یہ تیسری بیٹی کیا آرڈر پر ریڈی میڈ تیار کرائی ہے۔ وہ بھی اس عمر میں......؟'' وہ اپنی سنجیدگی کے باوجود فطری بذلہ سنجی کو روک نہ سکا۔

''اللہ...... ممی تم نے تو مجھے زچ کر دیا ہے۔ ساری تفصیلات نانو کو پتا ہیں...... ان سے پوچھ لینا۔ ابھی بس میں نے کہہ دیا ہے کہ تم سنڈے کو آ رہے ہو، اللہ حافظ......!'' انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''اچھی زبردستی ہے۔'' وہ اپنا سا منہ لے کر سوچتا رہ گیا۔

(باقی آئندہ)

اب صبح ہونے کو ہے

سیما رضا ردا



رات کی سیاہی آہستہ، آہستہ پھیل رہی تھی۔
صحرائے تھر کی پیاسی رات کا سفر تھا۔ کرشن نگر اندھیروں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ کچے پکے مکانوں سے ٹمٹماتی ہوئی پیلی زرد روشنیوں کا عکس کہیں، کہیں نظر آ رہا تھا۔ انہی اندھیروں کو کاٹتے ہوئے ایک جیپ اور اس کے ساتھ، ساتھ ایک ویگن تیزی سے گزری اور اس میں سے نکلتی ایک بے چین اور بلکتی آواز نے فضا کو مرتعش کر دیا۔

"اماں......! میں نہیں جاؤں گی تمہیں چھوڑ کر......اماں......!اماں......اماں...... مجھے روک لو۔"

یہ روتی بلکتی آواز کرشن نگر میں رہنے والی کسی بیٹی کی تھی...جواَب ہواؤں میں معلق ہو چکی تھی۔ صحرا میں اُگے کہیں، کہیں درختوں پر آرام کرتے پرندے اس آواز کو سن کر بے قرار ہو گئے۔ اپنے آشیانوں میں پہنچ کر بھی وہ پھڑ پھڑانے لگے۔

ایک عجیب اداسی، بے چینی فضا پر طاری تھی، کچھ دنوں سے اس دلکش علاقے کو کسی کی نظریں کھا رہی تھیں۔ جب یہاں قدرت مہربان ہوتی تو تھر میں برسنے والی بارشوں میں باہر سے آنے والے سیّاح یہاں کی سوغاتیں لے کر مدتوں اسے ذہن نشین کرتے۔

جھومر رقص کرتی الہڑ لڑکیاں، محنت کش خواتین اور جفا کش مرد ایک بوند عشق بادل کی مہربانی پہ نچھاور ہو جاتے۔ مور رقص کرتے اور زندگی اچھی لگنے لگتی۔ غربت کے دامن میں بسے افراد ان ہی خوشیوں پر اکتفا کرتے۔ نہ زیادہ کی خواہش تھی نہ کم پر شکایت، بس جینا چاہتے تھے، عزت سے بیٹیوں کی شادیاں کرتے اور خوش رہتے۔ موتی جیسی عزتیں رکھنے والے باسیوں کا دکھ، جلتے ہوئے نگر میں آہستہ آہستہ بس رہا تھا۔ میٹھی باتوں اور گرم نگاہوں جیسی لپکتی ذہنیت یہاں آن بسی تھی۔ جنت کا پھل کھا کر زخموں کی بیگار اذیت عورت کی قسمت میں لکھی جا رہی تھی۔ عورتیں غلام بنائی جا رہی تھیں۔ انسانیت کہاں تھی؟

☆☆☆

"گیارہ سو روپے...... ابھی تک اتنے جمع ہوئے ہیں۔" زرد بلب کی روشنی میں ماہی نے گلک سے رقم نکال کر دوبارہ گنی کہ ایک نوٹ نیچے گر گیا۔ اسے اٹھاتے، اٹھاتے وہی نسوانی چیخ اس کے کانوں میں گونجی جو کئی دنوں سے اسے پریشان کر رہی تھی۔ وہ جلدی سے نوٹ سنبھال کر اٹھی، کھڑکی تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی، زمین کی خاک اڑ اُڑ رہی تھی اور جاتی ہوئی گاڑیوں کے دھوئیں میں ہر چیز دھواں، دھواں تھی۔ وہ آواز اس کے ذہن و دل میں بس گئی تھی۔ وہ ہزار دھیان بٹاتی مگر یہ آواز اس کے دماغ سے نہیں نکلتی۔ خود کو سنبھال کر پھر پلنگ پر آن بیٹھی۔

سانول ابھی تک نہیں آیا تھا، وہ اس کے انتظار میں بیٹھی تھی، مورنی بے خبر سو رہی تھی۔ اس کی چھوٹی سی لاڈلی بہن۔ وہ پھر گلک سے رقم نکال کر گننے لگی۔ گیارہ سو روپے......یہ کل رقم تھی گلک میں جو اس نے کئی ماہ میں جمع کیے تھے، یہ ماہی جانتی تھی کہ کس طرح لڑ جھگڑ کر یہ پیسے بچائے تھے، کبھی سبزی خریدتے ہوئے، کبھی ریڑھی والے کے ساتھ ایک روپے پر تکرار، کبھی گوشت کی دکان پر قصاب کے ساتھ جھگڑا کرتے ہوئے اور کبھی پرچون والے سے تکرار کرتے ہوئے۔ اس نے ایک، ایک نوٹ بڑی محبت سے پھر گنا۔ پانچ روپے کا سکہ بھی گلک میں چھپ کر بیٹھا تھا۔ ماہی نے مسکرا کر اسے بھی پیسوں کے ساتھ ملا کر احتیاط سے رکھ دیا اور پھر اپنی ملگجی سی چادر کو ہاتھوں میں کٹورا بنا کر اللہ کے حضور گڑگڑانے لگی۔

"اللہ میاں جی پورے پندرہ سو روپے ہو جائیں تو میں اپنی مورنی کی چھوٹی سی خواہش پوری کر دوں گی۔ تو، تو میرے خوابوں کو پورا کرنے والا ہے۔ اللہ میاں جی، دیکھ میری عزت رکھ لے، مجھے پندرہ سو روپے چاہئیں، بس وعدہ اللہ میاں وعدہ۔"

وہ خود میں مگن آنسوؤں کا نذرانہ لیے اللہ کے حضور دعا گو تھی۔ تب ہی دھیرے، دھیرے قدموں سے سانول دروازے کی کنڈی کھول کر اندر داخل ہوا۔ تھکے، تھکے قدموں سے وہ سارے دن کی تکلیف اور پریشانی بھول کر اسے دیکھے گیا۔

ماہی کرشن نگر میں بسنے والی تمام لڑکیوں میں ذہین اور خوب صورت تھی۔ مخالف کو اپنے کھرے

لہجے سے شکست دے دیتی۔ کسی سے نہ ڈرنے والی، پہلے وہ اس کی محبت اور منگ تھی اور اب اس کی بیوی تھی۔ اس کا ہر حکم بجالانے والی، دکھوں اور خوشیوں کی ساتھی۔ سانول کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ ہر تیسرے چوتھے دن وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ جانے کیا گڑگڑاتی رہتی تھی۔ اشکوں سے اس کا چہرہ تر ہو رہا تھا۔ وہ خموشی سے اسے دیکھتے ہوئے سوچتا رہا۔

''جانے کیا پریشانی ہے۔ ماہی مجھے کیوں نہیں بتاتی۔'' غربت کے دامن میں زندگی گزارنے کے باوجود وہ ہمیشہ اسے مسکراتی ہوئی ملتی۔ اس کی خاطر وہ بالکل گھر داری کی ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک اچھی خدمت گزار بیوی۔

''تو کب آیا۔ اور یہاں کیوں کھڑا ہے؟'' ماہی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''میں تو کب سے یہاں کھڑا ہوں، تجھے ہی پتا نہیں چلتا۔ جانے کن الجھنوں میں ہے۔'' وہ شکوہ کرتا ہوا آگے بڑھا اور پھر پلٹ کر قمیص کی بغلی جیب سے چاکلیٹ کا پیکٹ نکال کر ماہی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ مورنی کو دے دینا۔ کراچی سے لایا ہوں، وہ سو رہی ہوگی اور ہاں ماہی غور سے بات سن، مورنی کو بلاضرورت گھر سے باہر نہ بھیجا کر۔''

''کیا مطلب؟'' وہ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''عجیب سے لوگ پھر رہے ہیں...... یہاں چاروں طرف ......شکاری ہیں، شکار کی تلاش میں معصوم بستیوں کا رخ کیا ہے۔''

''تو......؟''

''ویسے تو بہت ہوشیار بنتی ہے، بس زیادہ نہ اسے باہر بھیجنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی تو جا...... چل جا کر کھانا نکال......'' وہ غصے میں کہتا ہوا اندر چلا گیا تھا۔

''کچھ تو ہے۔'' ماہی سوچنے لگی۔ وہ اس طرح

کبھی کہتا نہ تھا۔

''کون شکاری ہیں؟''

''کھانا نکال دے ،ورنہ میں ایسے ہی سو جاؤں گا۔ پھر تو ساری رات روتی رہنا۔''

''اچھا آئی بابا......'' وہ سوچوں کا جال بُنتی رسوئی گھر میں آ گئی۔

☆☆☆

ماہی بے خبر سو رہی تھی مگر سانول کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ صبح چار بجے تک جاگتا رہا۔ ماضی میں کھویا ہوا کھڑکی سے تھر کی مٹی کو دیکھ رہا تھا۔ جب خدا مہربان ہوتا تھا، بادل اس طرف آ جاتے اور پھر صحرائے تھر کے تمام علاقے کے مکین جھومر رقص کرتے...... ''ماہی بھی کتنا خوب صورت رقص کرتی تھی یہاں کا مخصوص لباس پہن کر وہ چھا جاتی تھی۔ یہاں میرے ماں، باپ کی روحیں ہیں، جنہوں نے زندگی بھر محنت کی اور غربت کا مقابلہ کیا۔ کبھی اس گاؤں کو کسی نے بری نظر سے نہیں دیکھا۔ ماہی کتنی محنت سے چادریں، گج، ٹوپیاں، کُرتے تیار کرتی ہے۔'' وہ اس کا مال لے کر سیٹھ کے ساتھ کراچی جاتا اور جو ملتا ماہی کے ہاتھ پر رکھ دیتا...... مگر کئی مہینوں سے سیٹھ کی بد دیانتی نے اسے بد دل کر دیا تھا۔ وہ پیسوں میں ہیرا پھیری کرتا تھا۔ آگے سے کچھ کہو تو دھمکی دیتا...... اس کے ڈیرے پر بھی عجیب سے لوگوں کا آنا جانا تھا۔ جو اسے غلط لگتے تھے۔ وہ یہ باتیں ماہی سے چھپانا چاہتا تھا، اسے معلوم تھا کہ اگر ماہی کو معلوم ہو گیا تو وہ چین سے نہیں بیٹھے گی۔ مگر وہ غیرت مند تھا۔ وہ چاہتا تھا ماہی گھر سے باہر نہ نکلے، وہ اس کی غیرت بن کر گھر میں رہے، اس کی نیندوں میں کمی ہو رہی تھی۔ مزاج میں بھی چڑ چڑا پن آ گیا تھا۔ سورج سر پر آن پہنچا تو اسے ہوش آیا۔

''اوہ صبح ہو گئی...... جانا بھی ہے...... ماہی......!''

کہتا ہوا وہ غسل خانے میں جا کر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔

☆☆☆

''آؤ......آؤ......نذیراں ......کافی دنوں بعد آئیں۔'' وہ کُرتا فریم سے نکال رہی تھی اور مورنی اسے سوئی میں دھاگا ڈال کر دے رہی تھی۔

''کیا کروں وقت ہی نہیں ملتا۔ پتا نہیں کیوں سارے جانور بیمار ہوتے جا رہے ہیں، ان کی دیکھ بھال میں لگی رہتی ہوں۔ بڑی مشکل سے یہ چادریں میں نے تیار کر لی ہیں۔ میں نے سوچا، سانول بھائی جا کر دے دیں گے کیونکہ میرا میاں تو گھٹنے گیا ہوا ہے چار روز کے لیے۔'' نذیراں جب بولنے پر آتی تو اسے روکنا مشکل ہو جاتا۔

''کشمیراں کو بھی لے آتی۔ مورنی خوش ہو جاتی۔''

''اس کی دادی کہاں آنے دیتی ہے، اسے پہلو سے لگائے رہتی ہے، جیسے میں اسے لے کر اپنی ماں کے پاس چلی جاؤں گی۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔ ''اور سن ماہی...... تجھے پتا ہے ہماری بستی میں کچھ عجیب، عجیب سے لوگ آتے ہیں اور یہاں سے دو دور محلہ بستی میں ایسی پٹی پڑھاتے ہیں کہ مرد اُن کی باتوں میں آ جاتے ہیں اور عورتوں کو اپنے ساتھ شہر لے جاتے ہیں۔''

''کیا......؟'' ماہی کے ہاتھ میں بہت زور سے سوئی چبھی تھی۔

''دیکھ کر......'' مورنی تڑپ کر بولی۔

''وہ زلیخا کا میاں ہے ناں منحوس جو تجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، وہ ہی غیر آدمیوں کو لے کر علاقے میں پھرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان عورتوں کو شہر بھیجو، لاہور، کراچی میں ان کے لیے بہت کام ہیں اور ماہی یہ بھی کہہ رہا تھا کہ بڑی عورتوں کی مانگ کم ہے اور پندرہ سال تک کی لڑکیوں کی زیادہ ہے۔'' وہ رک، رک کر بولی۔

''ہائے ربّاں......'' ماہی دہل کر بولی۔

''ہاں، ہاں ماہی کتنی ہی عورتیں چلی گئی ہیں اور لڑکیوں کو بھی لے جا رہے ہیں، کہتے ہیں، بہت سے پیسے ملیں گے۔ یہ بڑی، بڑی کوٹھیوں میں بہت کام ہوتے ہیں، وہاں ضرورت ہے، تم لوگ عیش کرو گے عیش...... تمہاری بیٹیاں تو ڈولر ہیں ڈولر...... ان کو یہاں سے نکالو...... ہاں، ہاں سکینہ ادی نے تو اپنی بیٹی کو بھجوا دیا ہے۔ بڑی خوش نظر آ رہی ہے، چھ مہینے سے کسی نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔ مجھے تو بڑی پریشانی رہتی ہے، میرا گھر والا تو کشمیراں کے لیے کہہ رہا تھا کہ اس کو بھی بھیج دیتے ہیں، حالات بدل جائیں گے۔ ہائے میرا تو کلیجا باہر آ گیا۔ پورے ایک مہینے بات نہیں کی اس سے نہ بھئی نہ۔''

ماہی اس کی باتیں سن کر ہونے لگی۔ کیا ہو گیا تھا گاؤں کے مردوں کو اپنی ہی عورتوں کو غلام بنا کر بیچ رہے ہیں۔

''بات سن... ماہی! تو پہلے والی ہی بن جا۔ ان سب کو سمجھا، تیری بات میں تو دم ہے۔ وہ تیری این جی او والی باجی امینہ...... جن سے تو نے پڑھنا سیکھا تھا، کچھ کر ماہی...... تو پہلے والی ماہی بن کر سوچ......''

''پہلے والی ماہی؟'' وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں، ماہی! سب کے حقوق کے لیے لڑنے والی، تو کر سکتی ہے ماہی یہ لڑکیاں ہماری عزت ہیں، ان کو قید کر کے لے جانے والے یہ کون ہیں؟''

''اچھا سانول سے بات کروں گی پہلے...... تجھے پتا ہے وہ اب ان باتوں کو پسند نہیں کرتا۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''نہیں ماہی تو سانول بھائی کو بتا کہ کیا کچھ ہو رہا ہے یہاں...... اور ہو سکتا ہے انہیں۔ پتا بھی ہو۔'' نذیراں جذباتی ہو کر بولی۔ ''خیر میں چلتی ہوں۔ یہ مال سانول بھائی سے بھجوا دینا۔'' جھلستی دھوپ گھروں میں آباد ہو رہی تھی مگر جو کچھ گاؤں کی عورتوں کے ساتھ ہو رہا تھا، وہ اس واقعے سے ہی جھلستی جا رہی تھی۔

☆☆☆

چاندنی میں نہائے ماحول سے گزرتے ہوئے سانول سوچ رہا تھا کہ اس کی آمدنی کتنی کم سے کم ہوتی جا رہی ہے...... مگر ماہی کی محبت نے غربت کی تھکن کم کر دی تھی۔

''سارا دن کتنی محنت کرتی ہے، وہ بالکل میری ماں کی طرح ہوتی جا رہی ہے۔'' سانول اب ماں کو یاد کر رہا تھا۔

''میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا ماں کہ میں بڑا ہو کر اتنی محنت کروں گا کہ تمہاری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ تمہاری آنکھیں ٹھیک کرواؤں گا۔ تمہارے ہاتھ، تمہاری انگلیاں کتنی زخمی ہو گئی ہیں۔ ماں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اور ماں اس کے بچپنے پہ سادگی سے مسکراتی ہوئی زمیں دوز ہو گئی۔ ماہی اور اس کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے۔ اللہ نے ان کو ابھی اولاد کی نعمت نہیں دی تھی۔ مگر ماہی کی چھوٹی لاڈلی بہن مورنی دونوں کی آنکھوں کی رونق تھی۔ دونوں اسے دیکھ، دیکھ کر جیتے تھے۔ وہ جانے کیا، کیا سوچے جا رہا تھا۔ وہ اب گھر سے تھوڑے سے فاصلے پر تھا۔ جب اس کے کانوں سے کسی ویگن کے بریک چرچرانے کی آواز ٹکرائی اور کچھ دیر بعد گاڑی جھٹکے سے رکی۔ اس نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا۔

رات سوچ کی گہری تنہائی میں معلق تھی اور صحرا میں گونجتی بے قرار ہوائیں، آسرا اور بے آسرا عورتوں کی رگوں میں دوڑتے خون کو رستہ خاص بتانے والا چاند پژمردہ تھا۔ نسوانی آوازوں کا شور نمایاں تھا۔ ان کی مرضی کے خلاف یہ سفر تھا۔ وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی گھر کے قریب ہوتا گیا کہ اسے اپنی عزت زیادہ عزیز تھی۔

☆☆☆

سانول نے ماہی کے ہاتھ میں پیسے رکھے، جو زندگی گزارنے کے لیے ناکافی تھے۔

''بس یہی پیسے ہیں؟'' ماہی حیرت سے بولی۔

''میں کیا کروں، سیٹھ جو دیتا ہے وہ تیرے ہاتھ میں رکھ دیتا ہوں۔''

''اس نے کچھ پیسے روک کے ہوتے ہیں۔'' وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

''اب تو پان کھانا بھی چھوڑ دیا ہے تیری قسم......اور سگریٹ بھی صرف دن میں چار مرتبہ......'' وہ ناراضی سے بولا۔

''اپنی آنکھیں دکھا ذرا......'' ماہی فوراً ہی بولی۔

''یہ دیکھ لے۔'' اس نے فوراً ہی اپنی آنکھیں ماہی کی آنکھوں میں جیسے ڈالتے ہوئے کہا۔

سانول کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ وہ بے اختیار بولی۔

''سانول! تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اِدھر دکھا اپنا ہاتھ۔'' وہ اس کا ماتھا دیکھ کر بولی تھی۔

''تجھے تو بہت تیز بخار ہے، چل اندر چل، آرام کر......چل، چل......''

''ارے کچھ نہیں ہے مجھے، ٹھیک ہوں میں۔'' وہ اس کے ہاتھ کو نرمی سے جھٹکتے ہوئے بولا مگر وہ اس کی ضد کے آگے مجبور ہو گیا۔

☆☆☆

سانول کی طبیعت سنبھل نہیں پا رہی تھی۔ بخار کا زور بروز...بڑھتا جا رہا تھا۔ ماہی نے آرڈر کا سارا کام تیار کر کے رکھ دیا تھا مگر سانول روز بروز کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ کھا پی بھی نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے کہا کہ پیلیا ہو گیا ہے۔ شہر والے ڈاکٹر کو دکھا دو۔ ایک طرف سانول کی پریشانی اور دوسری طرف تیار مال تھا......جس سے گھر کی روٹی چلتی تھی۔ علاقے کے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ زیادہ طبیعت خراب ہو تو منٹھی والے ڈاکٹر کو دکھا دینا۔

''کیا کروں اسے دکھاؤں یا مال پہنچا کر آ جاؤں۔ پیسوں کی بھی ضرورت ہے۔'' اس نے بے بسی سے سانول کو دیکھا جو بے سُدھ پڑا تھا۔ وہ بڑبڑائی۔

''چلو ناں ماہی ہم خود ہی لے جاتے ہیں مال، خالہ نذیراں کو بھی لے جاتے ہیں، جلدی آ جائیں گے۔ چلو ناں ماہی۔'' مورنی ضد کرنے لگی۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' ماہی کو اس کی بات سمجھ آ گئی۔ ''مال دے کر حساب کر کے پھر سانول کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں۔'' وہ جلدی، جلدی چادر اوڑھنے لگی۔

''سانول بھائی، ہم آتے ہیں تم پریشان نہ ہونا۔'' مورنی بھاگی ہوئی تخت پر سوئے ہوئے سانول کے پاس گئی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ سانول نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں، مورنی کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

''کہاں؟'' نقاہت بھری آواز میں پوچھا

''اتنا سارا مال جمع ہو گیا ہے۔'' ماہی نے جواب دیا۔ ''مجھے فکر ہو رہی ہے، نذیراں کو لے کر جاؤں گی اس کا بھی مال ہے، میں اور وہ ساتھ ہیں، تو فکر نہ کر...آتے ہیں تو پھر ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں، چل مورنی۔'' وہ پاؤں میں چپل پہنتے ہوئے سامان اٹھانے لگی۔

''او......سن تو سہی......اِدھر سیٹھ کے ڈیرے پر جانے کی ضرورت نہیں، میں خود پہنچا دوں گا دو ایک دن میں......اتنا بھی کمزور نہیں ہوں میں۔''

مگر وہ سنی ان سنی کرتی ہوئی مورنی کے ساتھ سامان اٹھائے گھر کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ بیمار سانول کے چہرے پر فکر و پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

☆☆☆

ماہی اور نذیراں ساتھ، ساتھ چلتی ہوئی جا رہی تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر مورنی اور کشمیراں اپنی دُھن میں مگن خوش، خوش آگے بڑھ رہی تھیں۔

''ماہی! تو نے کچھ کوشش کی؟ گاؤں کی عورتیں تیری طرف دیکھ رہی ہیں، دیکھ وہ بے وقوف بنا کر ہماری بیٹیوں کو لے جا رہے ہیں، تجھے پتا ہے میرا میاں جاوید کتنا لالچی ہے، اس کا بس چلے تو وہ اپنی بیٹی کو بیچ دے۔'' وہ رونے لگی۔

''خدا نہ کرے، بھروسا رکھ، میں آج ہی امینہ میڈم سے بات کرتی ہوں۔'' ماہی نے اسے تسلی دی۔

''ماہی.....'' آگے جاتی مورنی نے پیچھے مڑ کر کہا۔

''وہ تجھے اپنا وعدہ یاد ہے ناں.....'' وہ اسکول کی عمارت کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

''ہاں مورنی! ضرور اس سال تجھے پڑھاؤں گی۔'' ماہی نے اس کی خواہش کو اپنے دل میں درد کی طرح محسوس کیا۔

مورنی خوش ہو کر پھر کشمیراں کے ساتھ آگے بڑھ گئی اور نذیراں بھی ماہی کو دیکھ رہی تھی۔ جو کہہ رہی تھی۔

''نذیراں پڑھائی بہت ضروری ہے۔ اس کو سمجھ کر ہمیں انسانیت سمجھ میں آتی ہے، ہمارا وقت شاید گزر گیا مگر میں نے جو کچھ امینہ میڈم سے سیکھا ہے، وہ مجھے صحیح اور غلط کا مطلب بتا گئی ہیں۔''

ماہی کی باتوں کو سنتے ہوئے دونوں سیٹھ کے ڈیرے پر پہنچ چکی تھیں۔ مردوں کا جمِ غفیر تھا، تھر کی محنت ڈبوں میں پیک ہو رہی تھی۔

ماہی بے خوف ہو کر بلا جھجک سیٹھ کے سامنے کھڑی تھی۔

''کیا بات ہے سانول نہیں آیا؟ جو اپنی بیوی کو بھیج دیا اس نے۔'' گہری رنگت والا اور بڑی، بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا یہ سیٹھ تھا جو ماہی کے مال کا جائزہ لے رہا تھا۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' ماہی نے سیٹھ کے انداز پر گھور کے تڑخ کے جواب دیا۔

''اچھا بھئی! اچھا نرمی سے بات کر۔'' سیٹھ ڈھٹائی سے مسکرایا۔

''جلدی سے دیکھو ایک، ایک دانہ محنت سے بنا ہوا ہے، کہیں کھوٹ نہیں ہے اور ہمارا حساب صاف کرو۔'' ماہی نے غصے سے کہا۔

''بات تو سچ ہے تیری، دانہ تو بالکل ٹھیک ہے۔'' سیٹھ ذومعنی انداز میں بولا۔

''چلو جلدی سے پیسے نکالو اور کتنا چیک کرو گے۔''

''دیتا ہوں بھئی۔'' سیٹھ کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا دراز سے پیسے نکالنے لگا اور ایک پرچی پر تفصیل لکھ کر ماہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یہاں انگوٹھا لگا دے۔''

''انگوٹھا چھاپ نہیں ہوں میں، اپنا نام لکھتی ہوں۔'' ماہی نے کہتے ہوئے قلم گھسیٹ کر اپنا نام لکھا۔

''آج کی محنت کے پیسے ہیں اور جو سانول کو تو نے بے وقوف بنا کر کچھ پیسے روکے ہیں وہ بھی تم دے دو۔''

''کیا؟'' سیٹھ ہکا بکا رہ گیا۔

''ہاں، میں سب جانتی ہوں، تم میرے شریف مرد کو ساتھ لے جا کر سارا دن تھکاتے ہو اور اپنا حصہ وصول کر کے ہمیں کیا دیتے ہو، اپنی قبر میں لے کر جاؤ گے کیا؟ چلو جلدی کرو۔'' ماہی اتنی بلند آواز میں کہہ رہی تھی کہ سیٹھ کو سخت سردی میں بھی پسینے آ رہے تھے۔ اس کی بولتی بند ہو گئی تھی۔ اسی وقت دو اجنبی مرد اندر داخل ہوئے، اندر کا منظر دیکھ کر حیران ہو گئے۔ ماہی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کھڑی تھی اور سیٹھ جلدی، جلدی اس کا حساب صاف کر رہا تھا۔ وہ دونوں ماہی پر نظریں گاڑے ہوئے تھے۔

ماہی نے اپنی محنت کا معاوضہ لیا اور ان دونوں اجنبیوں کو دیکھ کر سیٹھ سے بولی۔

''جب کوئی باہر کے لوگ علاقے میں آئیں تو ان کو بتاؤ کہ گاؤں کی بیٹیوں، عورتوں کو دیکھ کر نظریں

بلاعنوان

''میں نے زندگی کو ہمیشہ ویسا ہی سمجھا...... جیسی کہ یہ ہے تلخ ترین، کانٹوں سے بھری ہوئی...... یہ ایک حقیقت تھی کہ مجھے ہر وہ چیز نہیں ملی جس کی میں نے چاہت کی...... پہلے تو میں نے جی بھر کے احتجاج کیا اور پھر بالآخر ہار مان لی۔ آخر کب تک کوئی تقدیر سے لڑ سکتا ہے؟'' اتنا لکھنے کے بعد پھر میرے خیالات منتشر ہونے لگے، آخر ایک حساس دل رکھنے والی رائٹر کو اس کا آئیڈیل ماحول نہ ملے تو وہ کیسے اپنے چاہنے والے بے شمار قارئین کے لیے لکھ سکتی ہے۔ صبح سے تو گھر میں تماشا لگا ہوا ہے، اگر میں نے کام نہیں کیا تو کون سا طوفان آ گیا؟ اپنی اتنی ساری بیٹیاں بیٹھی ہیں، وہ کیوں نہیں کام کرتیں؟ جب دیکھو ساس صاحبہ میرے سر پر سوار ہو جاتی ہیں، میں نے اس لیے تو ان کے بیٹے سے شادی نہیں کی کہ نوکرانی بن جاؤں اور اپنا کیریئر بھول جاؤں، ہونہہ......

میں شہلا گل اپنی ماں کی لاڈلی بیٹی، دو بھائیوں کی اکلوتی بہن...... ملک کی بے حد مشہور نہ سہی کم نامور سہی...... لیکن رائٹر تو ہوں ناں... دو تین ناول تو لکھ ہی چکی ہوں اور انگلش لٹریچر میں ماسٹر کیا ہے، یہ کیا کم بات ہے، مقامی کالج میں لیکچرار ہوں اتنے اونچے مقام پر پہنچ کر اگر میں نے شادی کر لی تو اس لیے تو نہیں کی تھی کہ ساس کی خدمت کروں اور نندوں کو بٹھا کر کھلاؤں۔ پتا نہیں ڈائنیں کب دفع ہوں گی؟ شادیاں بھی تو نہیں ہو رہی ان کی...... اپنے بھائی پر پتا نہیں کیا جادو کرتی رہتی ہیں کہ وہ میری سنتا ہی نہیں...... لگتا ہی نہیں کہ یہ وہی ولید ہے جو شادی سے پہلے میرے آگے پیچھے پھرا کرتا تھا۔ ہر وقت ماں، بہنوں کے کام کرتا ہے، کبھی ابا کو مسجد چھوڑنے جا رہا ہے، کبھی سودا لا رہا ہے، کبھی دوا لا رہا ہے تو کبھی کچھ...اوہ دوا سے یاد آیا کہ امی کی دوا بھی ختم تھی، رات کو بتا رہی تھیں کہ دوا ختم ہونے والی ہے، فون کر کے ذرا بھائی کو تڑی تو لگاؤں کہ شادی کرنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ باقی رشتے ختم...... اب اگر امی، بھائی کو اپنے کام نہ کہیں تو اور کس کو کہیں؟ اگر دونوں بھائی ہی اپنی بیویوں کے کہنے میں آ گئے ہیں تو میرا فرض ہے کہ ان کو سمجھاؤں کہ ایسے تھوڑی ہوتا ہے! میری

احترام سے جھکاتے ہیں۔'' اور یہ کہتی ہوئی ڈیرے سے باہر آ گئی۔

''کون تھی یہ شیرنی......؟'' آنے والوں نے سیٹھ سے پوچھا۔

''اس گاؤں کی سب سے بہادر اونکھی لڑکی ...... شادی سے پہلے تو بہت جری اور منہ پھٹ تھی۔ شادی کے بعد گھر کی ہو گئی تھی مگر آج اس کی آنکھوں میں وہی تیور تھے۔'' سیٹھ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

''اچھا پھر کیا خیال ہے؟ ایسے ہی تیور اور رجھاؤ تو چاہیے ہمیں... پھر جال پھینک کر دیکھیں۔ سب ہی کمال کی تھیں، وہ دوسری بھی......'' وہ اجنبی ماہی کے ساتھ نذیراں اور مورنی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''کبھی سوچنا بھی مت...... جو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتا ہے، اس کی آنکھیں نکال دیتی ہے۔'' سیٹھ خوف زدہ ہوا۔

''اوئے بہت دیکھی ہیں۔'' وہ تمسخر سے بولا۔ '' چل شمشیر کے پاس چلتے ہیں...... بہت عورتوں کی ڈیمانڈ آئی ہے۔'' وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔

''بھائی میری بات کان کھول کر سن لے۔ اس کی طرف دیکھنا بھی مت...... وہ بہت وکھری ہے اور کچھ دنوں کے لیے تم لوگ میرے ڈیرے کو بھول جاؤ۔ مجھے کچھ خوف محسوس ہو رہا ہے۔ جاؤ بھئی جاؤ۔'' سیٹھ نے کہا۔

''ہونہہ بزدل کہیں کا...... بہت دیکھی ہیں ایسی لڑکیاں'۔ اس نے حقارت سے کہا...... مگر تھوڑی دیر کے لیے سیٹھ کے ڈیرے پر خاموشی چھا گئی۔ ایسی خاموشی جو انسانوں کو سوچنے کا وقت دے کر قسمتوں کے فیصلے کیا کرتی ہے۔

☆☆☆

ماہی سیٹھ کے ڈیرے سے نکلتے ہی کونے میں بنے ایک جنرل اسٹور میں آ گئی۔ چھوٹے سے کیبن میں فون کی بھی سہولت تھی۔ نذیراں حیران ہو کر ماہی کو

ماں نے انہی بھائیوں کے لیے ساری عمر نوکری کی..... کما کر کھلایا، ابو تو ساری عمر گھر بیٹھے رہے، ان کو عادت نہیں تھی کام کرنے کی..... بس سارا دن دادی اور پھوپیوں کے ساتھ بیٹھے رہتے یا بستر توڑتے رہتے..... ہونہہ بھائی فون نہیں اٹھا رہے، یقیناً بیویوں کے ساتھ بیٹھے ہوں گے، مجھے جیسے پتا ہی نہیں؟ ابھی جا کر خود چھاپا مارتی ہوں، چھوٹی بھابی نے آج بریانی بھی بنائی ہوگی، جمعہ ہے ناں..... چٹوری کہیں کی..... ساری کھا جائے گی، امی کو پتا نہیں اچھی والی بوٹیاں دے گی بھی یا نہیں..... ولید کو میسج کر دوں کہ وہ بھی وہیں آجائیں۔ ساس صاحبہ کو بتا دوں کہ آج سبزی ہی بنا لیں، ہم تو کھانا نہیں کھائیں گے۔

☆☆☆

آج جمعہ ہے، ضرور وہ منحوس پہنچے گی، خوشبو تو پہنچ گئی ہوگی کہ آج میں نے بریانی بنائی ہے، جب دیکھو ہمارے سروں پر سوار ہو جاتی ہے، بھائیوں کی لاڈلی ہے تو ہوتی رہے، بریانی ٹھکانے لگا کر آؤں۔ بلکہ ایسا کرتی ہوں کہ دال چڑھا دیتی ہوں، آئے ذرا آج مزہ چکھاتی ہوں رائٹر صاحبہ کو..... غلطی سے ایک دو کہانیاں کیا چھپ گئیں خود کو کیا چیز سمجھنے لگی ہے، ہونہہ..... مجھے اپنی پریشانیاں کم ہیں، جو یہ بھی آجاتی ہے ٹینشن بڑھانے اور ماں اور بھائیوں کے کان بھرنے..... ماں سے یاد آیا..... امی کو فون کر کے پتا تو کروں کہ آج بھائی ان کی طرف آئے مہینے کا خرچہ دینے یا پھر پچھلی بار کی طرح بھول گئے۔ پتا نہیں لڑکیاں جب بھابیاں بن جاتی ہیں تو ایسا کیوں کرتی ہیں؟ امی بیچاری کتنی مشکل سے گزارہ کرتی ہوں گی۔ ابھی تو دو بہنیں اور بھی بیٹھی ہیں، مائیں کتنی مشکل سے بیٹوں کی پرورش کرتی ہیں، ان کو کسی مقام پر پہنچاتی ہیں اور آنے والی سمجھتی ہی نہیں کہ وہ کسی کی عمر بھر کی پونجی کو کیسے لوٹ کر لے جاتی ہے۔ میں بھی کہاں کھو گئی۔ دال تو چڑھا دوں پھر شام کو امی کی طرف چکر لگاؤں گی اگر بھائی نہیں آیا تو بھابی کی ایسی خبر لوں گی کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔

تحریر: اُمِ نبیحہ گدو

دیکھ رہی تھی۔ پارہ صفت اس کی ادائیں تھیں۔ ماہی نے پلو کے ساتھ بندھے شیشے جڑے کپڑے کا بٹوا نکالا اور اس میں سے ایک پرچی نکالی اور لڑکے کو نمبر ملانے کو کہا۔ نمبر ملتے ہی ماہی بے قراری سے ساری صورتِ حال بتانے لگی۔ نذیراں کو اتنا سا احساس ہو گیا تھا کہ ماہی نے اپنا کردار ادا کر دیا ہے اور گاؤں کی عزت‘ گاؤں کی معصوم لڑکیوں کو اب کوئی غلام نہیں بنائے گا۔

فون رکھنے کے بعد ماہی کے چہرے پر سکون تھا۔ جیسے اس نے بہت کچھ پا لیا ہو۔

☆☆☆

”بہت اچھا کیا جو تو نے سیٹھ کے مزاج صاف کر دیے۔ جو بات تجھ میں ہے ماہی وہ کسی میں نہیں۔“ نذیراں اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا نذیراں‘ بس ہمیں ہمت کرنی ہوگی اور خود کو پہچاننا ہوگا۔ چل گھر چلتے ہیں۔ سانول کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔“

☆☆☆

”تو نے میری بات نہیں مانی۔ کیوں گئی تو سیٹھ کے ڈیرے پر؟ وہاں اچھے لوگ نہیں آتے، تو میری بیوی ہے۔“ سانول غصے میں کہہ رہا تھا۔ ”تجھے میری عزت کی پروا نہیں؟“

”دیکھ سانول میری بات سن۔“ وہ ملائمت سے بولی۔ ”میں تیری عزت ہوں تو تیری عزت کا خیال رکھنا بھی جانتی ہوں تو ایسی کم ہمت بات نہ کیا کر۔“

”میں کم ہمت نہیں ہوں..... میں اپنے گھر کا ذمے دار ہوں، کوئی میرے گھر کی طرف کیوں آنکھ اٹھائے..... تو خود بھی گئی اور مورنی کو بھی لے گئی۔ تجھے کچھ پتا بھی ہے؟“ سانول کی بات کاٹ کر وہ تیزی سے بولی۔ ”مجھے سب پتا ہے، چاہے تو مجھے کچھ نہ بتا..... صرف ہمارا گھر نہیں سانول.....! یہ سارے گھر ہماری عزتیں ہیں۔ ہمارے اماں، ابا کی

عزتیں اس مٹی سے ہیں تو ان سب کا دکھ ہمارا دکھ ہے اور سب کی عزتیں ہماری عزتیں...... تو اپنی سوچ کو بدل۔ میں نے تجھ سے بغاوت نہیں کی۔ تیرے ساتھ مل کر چلنا چاہتی ہوں۔ وہ ہمارے گاؤں کی کتنی لڑکیوں کو بہکا کر لے گئے ہیں۔ ان کا کچھ پتا نہیں اور تُو صرف اپنے گھر کو بچا رہا ہے۔ نہیں سانول......! سب کے بچنے میں ہی ہم سب کی عزت ہے۔'' سانول اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا اور شرمندگی بھی کہ اس نے خود ماہی کو غلام بنا کر رکھا ہوا تھا۔ اس کی سوچ پہ پہرے بٹھا دیے تھے کہ وہ صرف اس کی بیوی بن کر گھر میں رہے گی۔ مگر وہ ہیرا تھی۔

''اچھا اب زیادہ نہ سوچ کل کے سورج کا انتظار کر......'' وہ اسے خاموش دیکھ کر بولی۔ ''بس مجھ پر اعتبار کر...... میں تیری بیوی ہوں اور تیرے ساتھ سے میں زیادہ بہادر ہوں سانول......! میں اپنی مٹی کے لیے جیتی ہوں اور مٹی کی حفاظت کرنا چاہتی ہوں لیکن تجھ کو مجھ پر اعتبار کرنا پڑے گا۔''

''اچھا بابا......تو، تو میرا غرور ہے میری ماہی......! میں تیرے ساتھ ہوں، ہم مل کر اس گاؤں کی لڑکیوں کو بچائیں گے۔'' ماہی نے مسکراتے ہوئے آسودگی سے اپنا سر سانول کے کندھے پر ٹکا دیا۔

☆☆☆

کرشن نگر میں ایک رش کا عالم تھا، مختلف چینلز کے کیمرے روشن تھے، امینہ میڈم کے ساتھ شانہ بشانہ چلتی ہوئی ماہی ایک تمکنت کے ساتھ کھڑی تھی۔

''ماہی کا بے حد شکریہ کہ اس نے ہمیں ساری معلومات دیں اور اسی کی وجہ سے ہم کامیاب ہوئے اور حکومتی سطح پر ہمیں کامیابی ملی...... یہ بچیاں، یہ لڑکیاں ہمارا مان ہیں، ہماری آبرو ہیں، افسوس ہے مجھے ان مردوں پر جو باپ، بھائی ہوتے ہوئے پیسے کی چمک میں ہوس کو نہ پہچان سکے اور اپنی عورتوں کو غلام بنا کر خود سے دور کر دیا۔ انسان کا لالچ اس کو لے ڈوبتا ہے۔ ان معصوم کلیوں سے ان کے خواب مت چھینیں۔ انہیں تعلیم دیں، یہ اسکول ہم نے کس کے لیے بنایا ہے، ظاہر آپ سب کے لیے تاکہ صحیح اور غلط کی پہچان ہو سکے۔'' میڈم امینہ نے معصوم چہرے والی نادان لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

''اپنی غلام سوچوں کو روکیں اور ان کے خوابوں کو خواہشوں کو نہ کچلیں اور ان کو نہ روندیں۔ ان کی نسوانیت کو تار تار نہ کریں۔ یہ انسانیت کا قتل ہے اور اس قتل کو روکنا میرا اور آپ کا ہم سب کا کام ہے۔''

''ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔'' عورتیں یک زبان بول رہی تھیں۔

''ماہی ہماری نمائندہ ہے اور ہم حکومت کے ساتھ مل کر اپنے ملک کی خواتین کو ہنر کے میدان میں بین الاقوامی سطح پر لے جائیں گے۔ آپ اپنی بچیوں کو ہنر کے ساتھ تعلیم دلوائیں۔ یہ ان کا حق ہے، تعلیم خود ان کی صحیح سمت میں رہنمائی کرے گی۔''

سارے کیمرے، ٹی وی چینلز، ان لمحوں کو قید کر کے یہاں سے جا چکے تھے، ریڈیو کے نمائندے ماہی کا انٹرویو لے رہے تھے اور وہ فخر سے سر اٹھائے ہوئے تھی جو ہنر مند تھی اور تعلیم کا شعور بھی رکھتی تھی۔ سب حیرت سے منہ پھاڑے سکتے کی حالت میں تھے۔

''عورت کی عزت ایک قیمتی موتی جیسی ہے مگر اس موتی کی حفاظت وہی کرتا ہے، جو موتی کی قدر و قیمت جانتا ہے۔ یہ حوا کی بیٹی گلاب کی بھی پرکھ رکھتی ہے اور کانٹوں کی بھی اور جب اسے شعور مل جائے تو کانٹوں سے دامن بچاتی ہے اور گلابوں سے اپنا دامن بھر لیتی ہے۔ میرے گاؤں میں اب صبح ہونے کو ہے، اب اندھیرا نہیں......'' وہ علاقے کا غرور بنی سب کے دلوں میں اتر گئی اور احترام سے سب کے سر جھک گئے تھے۔



پگلی کہیں کی

قرۃ العین شکیل



آج کالی گھٹا نے اس طرح آسمان کا گھیراؤ کیا کہ دوپہر بارہ بجے ہی شام کا گمان ہونے لگا۔ اتنا خوب صورت موسم اور یہ کھانا...... سامنے رکھی مسور کی پتلی دال اور روٹی دیکھ کر میری آنکھوں میں سچ مچ آنسو آگئے، یہ نہیں تھا کہ میں کھانے کے لیے زندہ تھی یا پھر بہت زیادہ پیٹو تھی بس آج بھوک نے اس قدر نڈھال کیا کہ میں رونے بیٹھ گئی اوپر سے اتنا آفت موسم اور ہمسائے کے گھر سے آتی اشتہا انگیز کھانوں

کی خوشبو......

''آپا موٹر جل گئی ہے۔'' سامنے میری بارہ سالہ بہن منہ بسورے کھڑی تھی۔

''ہائے ربا!'' میری سانس اوپر کی اوپر ہی رہ گئی۔ اس وقت اگر کوئی مجھے موت کا مژدہ سنا دیتا تو اتنا افسوس نہ ہوتا جتنا یہ سن کر ہوا تھا۔ برتنوں کا انبار اور پورے ہفتے کے کپڑے اور موٹر بھی ہماری ایسی جو مہینے سے پہلے صحیح ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے آتے آنسو مارے صدمے کے خشک ہو گئے۔ میں کانپتی ٹانگوں کے ساتھ موٹر تک آئی جو بارش کی وجہ سے پوری طرح بھیگ چکی تھی اور جلنے کی بو کی وجہ سے وہاں کھڑا ہونا دشوار تھا۔

''مسفرا کیا ہوا؟'' اماں نے میری حالت کے پیشِ نظر مجھ سے سوال کیا۔

''اماں! موٹر جل گئی ہے۔'' میں روہانسی ہو گئی۔

''تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ میں سمجھی پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔'' میں نے حسرت بھری نظروں سے اماں کی جانب دیکھا...کیسے انہوں نے اتنی بڑی بات چٹکیوں میں اڑا دی۔

''اچھا اب اپنی شکل سیدھی کر میں پروین سے کہتی ہوں دو منٹ کے لیے اپنا پائپ لگا دے۔'' وہ کہہ کر پانی میں شڑپ، شڑپ کرتی باہر نکل گئیں اور میں اپنا سر پکڑ کر وہی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کچن سے آتی کھٹ پٹ کی آواز نے میری توجہ اس جانب مبذول کروائی اور میں فوراً کچن کی جانب لپکی۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہیں ابا......؟'' جواباً انہوں نے گہری سانس بھرتے ہوئے پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر فکر اور تفکرات کی پرچھائیاں دیکھ کر میں نے اپنی غائب دماغی کو کوسا۔ ابا دور دراز علاقوں میں فریم بیچنے جاتے تھے پر جس دن بارش ہوتی ان کا یہ کام ٹھپ ہو جاتا کیونکہ بسیں، ویگنیں بارش کی وجہ سے نہیں چلتی تھیں اور جو چلتیں وہ دُگنا کرایہ لیتیں اس لیے ابا روٹی چلانے کے لیے آلو چاٹ، آلو کے چپس اور کبھی کبھار سموسے لگا لیتے۔

''لائیں ابا میں کر لیتی ہوں۔'' آگے بڑھ کر میں نے ان کے ہاتھ سے آلوؤں والا تھیلا لے لیا جب تک میں آلو کاٹ کر فارغ ہوئی اماں بھی آ گئیں۔

''مسفرا جلدی سے کر لے جو کرنا ہے......'' میں نے پہلے آلو دھو کر اماں کو پکڑائے کہ ابا کو جا کر دے دیں۔ وہ ڈیوڑھی پر چیزیں لگا رہے تھے پھر جتنا بھی پانی تھا اس سے سنبھال کر سارے برتن دھوئے۔

''میری تو مت ہی ماری گئی ہے بھلا پہلے چنے اور آلو ابلنے کے لیے رکھ دیتی۔'' میں خود... بڑبڑائی۔ دھوئے ہوئے برتن وہی چھوڑ کر میں نے آلو اور چنے دھو کر چولھے پر چڑھائے پھر دو بالٹیاں بھرنے کے لیے باہر رکھیں۔ ایک ٹنکی پہلے ہی بھری جا چکی تھی۔ کچھ دیر میں پروین آ گئی،

''حد ہو گئی ہے تم لوگوں کی۔

کب سے پانی لیا ہوا ہے اب بس کرو۔'' اس کے ماتھے پر پڑی تیوریاں دیکھ کر میں نے بوکھلا کر اماں کی جانب دیکھا۔

''مسفرا جلدی سے دوسری بالٹی رکھ دے اس کے جانے تک بھر ہی جائے گی۔'' میں جو مجسمہ بن کر کھڑی تھی اماں کی ہدایت پر عمل کیا۔ پوری ڈیوڑھی اور صحن کیچڑ سے لت پت تھا، میں جو کام سے فارغ ہو کر وائپر لگانے کا سوچ رہی تھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کمرے میں آ گئی۔ پروین کے لہجے میں چھپی ہوئی تضحیک نے میرا دل تک چھلنی کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر کڑھنے کے بعد میں پھر باہر آ گئی۔ فضا میں آلو فرائی کرنے کی مہک تھی اور صبح سے جو میرا دل کچھ اچھا کھانے کو للچا رہا تھا یک دم ہر چیز سے بیزار ہو گیا۔

☆☆☆

آخری پریکٹیکل دے کر جب میں نے کالج

گیٹ کے باہر قدم رکھا تو پوری سڑک سنسان تھی عام طور پر یہاں جا بجا گاڑیاں ۔ بے پناہ ہجوم ،خوانچہ فروشوں اور چھابڑی والوں سے یہ سڑک بھری رہتی تھی۔ مگر آج سیکنڈ ٹائم میں پریکٹیکل ہونے کی وجہ سے خاصا سناٹا تھا۔ ویسے بھی اس مضمون کی بہت کم ہی لڑکیاں تھیں۔ میں ایک مرتبہ پھر کالج کے اندر آگئی۔ کالج بھی تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ صرف کلرک آفس کے سامنے بی اے کی چند لڑکیاں باتوں میں مگن تھیں۔

''اب کیا کروں......'' اکیلے جانے کے خیال سے میری ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ یہ پریکٹیکل دینے کے لیے میں اپنی خالہ کے گھر آئی ہوئی تھی کیونکہ ابا نے تو صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ میں رکشے کا کرایہ ہرگز نہیں دوں گا۔ اس لیے میں نے اپنے کزن کی منتیں کی کہ میرے یہ مشکل دن نکال دے۔ میں امتحان کے لیے خالہ کے گھر آگئی تھی جہاں سے یہ کالج نزدیک تھا۔ وہ خود ساختہ ہیرو نما کزن بڑی ناک بھوں چڑھا کر راضی ہوا تھا مجھے پک اینڈ ڈراپ کرنے کے لیے۔

''خبیث ،ذلیل!'' میں نے دل ہی دل میں اُسے اور ڈیٹ شیٹ بنانے والے کو کہ جس نے آخری پریکٹیکل سیکنڈ ٹائم رکھ دیا تھا خوب صلواتیں سنائیں۔ صبح جب میں تیاری کر رہی تھی تو وہ صاحب اپنی اماں سے گفت وشنید کر رہے تھے اور اس وقت مجھے اپنی قوتِ سماعت جس پر بڑا فخر تھا زہر لگی۔

''اماں یہ کیا مصیبت آپ نے میرے سر پر ڈال دی ہے پورے مہینے سے چمٹی ہوئی ہے، محترمہ کا باہر انتظار کرواتی دھوپ ہوتی ہے اس وقت۔'' میرا جی چاہا کہ اسے کھری، کھری سناؤں کون سا میں نے انتظار کروایا تھا۔ پر ہائے ری مروت......

''ہاں ،ہاں ہم نے کوئی ٹھیکا لیا ہوا ہے، اتنا مہنگا پٹرول ہے، لوگوں کو تو شرم ہی نہیں آتی۔'' خالہ نے بھی صاحبزادے کی ہاں میں ہاں ملائی اور جب

بہار آئی

بہار آئی ہے تم بھی آؤ گلاب رت ہے
ذرا تم بھی تو مسکراؤ گلاب رت ہے
خیال رکھنا کہ اب بھی رُت بدل نہ جائے
نہ اور گہرا ہو دل کا گھاؤ گلاب رُت ہے
گلاب رُت میں تو گل کھلتے ہیں چاہتوں کے
تم اپنی چاہت کے گل کھلاؤ گلاب رُت ہے
کئی دلوں کو خزاں نے تاریک کردیا ہے
تم ان دلوں میں دیے جلاؤ گلاب رُت ہے
خزاں رُت میں جو پھول شاخوں سے گر گئے ہیں
انہیں بھی اپنے گلے لگاؤ، گلاب رُت ہے
ہما کھلاؤ وفا کی کلیاں ہر ایک دل میں
ہر ایک کو ہمنوا بناؤ گلاب رُت ہے

شاعرہ: ایڈووکیٹ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا

اس نے مجھے صبح کالج اتارا تو میں نے مارے غیرت کے کہہ دیا تھا۔

'' کوئی ضرورت نہیں آنے کی میں خود ہی آجاؤں گی۔''

''کس کے ساتھ آؤ گی؟'' اب کہ اس کی خاندانی غیرت عود آئی۔

''کسی لڑکی کے ساتھ آجاؤں گی۔'' قدرے خفگی سے کہہ کر میں اندر آگئی اور اب کھڑی اس وقت کو کوس رہی تھی جب میں نے کہا تھا کہ خود ہی آجاؤں گی۔ شام کے ٹائم اتنا سناٹا ہو جائے گا میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ گیٹ کیپر بھی خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا، ناچار میں وہاں سے نکل آئی اور ایک سمت چلنے لگی۔ آگے جا کر سامنے دونوں اطراف سڑکیں تھیں۔

''یہ میں کہاں آ گئی۔ اس طرف تو روز نہیں جاتی تھی''۔ میں نے واپسی کا قصد کیا لیکن جب مڑ کر دیکھا تو کالج گیٹ کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ میں فٹ پاتھ پر چلتی گئی۔ سڑک کنارے دو لڑکیاں کھڑی تھیں ان کی موجودگی سے میری ڈھارس بندھی اور میں نیچے اتر کر ان کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ غالباً سڑک کراس کرنے کے لیے پر تول رہی تھیں۔

''میں راستہ بھول گئی ہوں کیا آپ میری مدد کرسکتی ہیں۔'' میں نے لجاجت سے کہا۔

''ہاں کیوں نہیں...... کہاں جانا ہے آپ کو؟''

باتیں کرتے ہوئے ہم سڑک کے درمیان آ گئے لیکن سامنے سے آتی گاڑی کی وجہ سے پیچھے ہٹنا پڑا۔

''پتا نہیں کہاں سے آ گئی ہے۔ ایسی لڑکیاں اچھی نہیں ہوتیں کوئی ضرورت نہیں منہ لگانے کی۔''

دوسری عورت ٹائپ تھی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے دوسری جانب پہنچ گئی اور میں وہی کھڑی اس کے الفاظ پر غور کرنے لگی۔

''یا اللہ اتنی بے عزتی......''

''باجی پرے ہٹ کر کھڑی ہو۔'' رکشا ڈرائیور نے سر باہر نکال کر مجھے ڈپٹا پر مجھے سنائی کہاں دے رہا تھا پھر کئی آتے، جاتے لوگوں سے پتا پوچھا۔ قریبی پان کے کھوکے کے نزدیک جا کر ایک بوڑھے آدمی سے پوچھا تو اس نے راستہ سمجھایا۔ اپنا کالج ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی یہ اجنبی جگہ تو واقعی کوئی بھول بھلیاں لگ رہی تھی۔ بہر حال کسی طرح باتیں سنتی سناتی میں دھکے کھاتی گھر تک پہنچ ہی گئی تھی۔

☆☆☆

''مسفرا تیری پھپو کا فون آیا تھا شادی کے لیے زور دے رہی تھی۔ اس لیے میں نے کہہ دیا تم آ جاؤ...... پھر مل کر بیٹھ کر تاریخ طے کر لیتے ہیں۔''

شلجم چھیلتا میرا ہاتھ چند ثانیے رکا پھر چلنے لگا پھر رکا۔

''افوہ...... کیا مصیبت ہے۔'' میں چھری وہیں پٹخ کر سرعت سے اماں کے مقابل کھڑی ہوگئی۔

''اماں آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آپ پھپو کو یہاں بلائیں۔'' مارے غصے کے میں نے یہ مشکل فقرہ پورا کیا۔

''تیری تو مت ماری گئی ہے مسفرا ...... شادی بیاہ کے معاملات بھلا لڑکیوں سے پوچھ کر طے کیے جاتے ہیں۔'' انہوں نے بے پروائی سے اپنے سر کو جھٹکا۔

''اماں مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ چند دنوں میں میرا رزلٹ آ جانا ہے پھر میں نوکری......''

''اپنی بکواس بند کر، میرا کیا دماغ خراب ہوا ہے جو تجھ سے نوکریاں کرواؤں۔ جا کر اپنا گھر بسا تاکہ میں بھی سکھ کی سانس لے سکوں۔'' اماں نے میرا جملہ بھی پورا نہ ہونے دیا اور اپنے ارشاد سنا دیے۔

''اماں کیا تیرا دل نہیں کرتا گھر میں پیسے آئیں، خوشحالی ہو......''

''پھر وہی بات، مسفرا میں اس گھر کو چلانے کے لیے تیری جوانی نہیں رولوں گی، اللہ کا شکر ہے اپنے حصے کا رزق مل رہا ہے۔ پھر کیوں تجھے در در کے دھکے کھانے دوں...... تو، تو کسی دوسرے آنگن کا پودا ہے جس پر اب میرا حق نہیں۔ اس لیے میں چاہتی ہوں تو جلد از جلد اپنے گھر کی ہو جا۔ اور پھر زندگی کی خوشیوں پر تیرا بھی تو حق ہے...... کیا تیرا دل نہیں کرتا تو زندگی اچھے طریقے سے گزارے جو کمیاں تو نے یہاں دیکھی ہیں وہاں ان کا ازالہ ہوگا ہم ماں، باپ تو صرف کوشش ہی کر سکتے ہیں۔'' یہ سب کہتے ہوئے اماں آبدیدہ ہوگئیں۔ اور میں اماں کے گلے لگ کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

پھر میں بیاہ کر پھپو کے گھر آ گئی۔ اتنا بڑا گھر اور ہر کام کے لیے الگ الگ ملازم۔ کئی دن تو میں زمین اور آسمان کے درمیان معلق رہی پھر آہستہ، آہستہ زندگی کی حقیقتیں واضح ہونے لگیں۔

''مسفرا میری گرے شرٹ نہیں مل رہی ، کہاں رکھی ہے؟''

''دراصل میں نے دھونے کے لیے کپڑے بھیجے تھے تو ابھی تک وہ لانڈری سے آئے ہی نہیں۔''

''جاہل عورت! کس نے کہا تھا دھلوانے کو وہ میری نئی شرٹ تھی۔'' وہ قہر بھری نظروں سے میری جانب دیکھ رہے تھے اور میں ان کی نظروں سے خائف ہو کر یہ بھی نہیں کہہ سکی کہ الماری تو بھری پڑی ہے کوئی بھی پہن لیں۔

''سوری حیدر، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ اب میں آپ سے پوچھ کر کپڑے دیا کروں گی۔'' پھر کہیں جا کر ان کا غصہ قدرے کم ہوا۔

''مسفرا......'' یہ میری پھپھو تھیں جو اَب مکمل روایتی ساس بن چکی تھیں۔

''جی پھپھو......!'' مؤدبانہ انداز میں، میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔

''کل میں نے تم سے کوئی کام کہا تھا۔'' وہ تیوری چڑھائے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔

''سوری پھپھو، کل حیدر لیٹ آئے تھے اس لیے ذہن سے نکل گیا۔'' میں نے شرمندگی سے نظریں جھکا لیں۔

''مسفرا تمہارے جیسی نکمی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ کوئی کام تم سے ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ غلطی میری تھی جو میں سمجھتی رہی کہ مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی اس گھر کے لیے سوٹ ایبل ہے۔'' پھپھو انتہائی تنفر سے کہہ رہی تھیں اور میں چپ چاپ وہاں سے اٹھ گئی۔ ٹی وی لاؤنج میں فل سائز پلازمہ ٹی وی پر میرا پسندیدہ reality شو آرہا تھا میں ہر بات جھٹک کر مزے سے وہ دیکھنے لگی، شو ختم ہوتے ہی میں اپنے کمرے میں جانے ہی لگی تھی کہ اوپر کے لاؤنج کی ریلنگ کے پاس کھڑی پھپھو خشمگیں نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھیں کیا کروں چند قدموں کے فاصلے پر کمرا تھا۔ جی چاہا بھاگ کر اندر گھس جاؤں۔

''پھپھو کوئی کام تھا؟'' اب کہ میں گردن اونچی کر کے پوچھنے لگی۔

''تمہیں میں نے جوس لانے کو کہا تھا۔''

''اوہ سوری!'' میں بگٹٹ کچن کی جانب بھاگی اور وہاں سے بھاگ، بھاگ کر جوس کا گلاس پھپھو کو تھما کر ہی دوسری سانس لی۔

''غلطی میری ہی تھی جو میں...... سوری پھپھو۔'' میرے لبوں پر مسکراہٹ عود آئی۔

''پگلی کہیں کی......'' یہ کہہ کر وہ پتا نہیں اندر کہاں غائب ہو گئیں اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کیوں اتنی بے عزتی کرواتی ہوں، اتنی عزت افزائی کے بعد کیوں میرے ماتھے پر شکن تک نہیں آتی تو جناب اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہاں پر عزتِ نفس کی پامالی ہوتی ہے تو بدلے میں ہر سہولت جو اماں کے گھر ناپید تھی بہ آسانی مل بھی رہی تھی۔ یہ باتیں تو اس سے کہیں زیادہ اچھی تھیں جب دل کسی شے کی فرمائش کرتا تو ہم اسے تھپک، تھپک کر سلا دیتے جب کسی چیز کے دستیاب نہ ہونے کے باعث دوسرے کی تضحیک آمیز باتیں سننی پڑتیں تو کوئی چارہ نہ رہتا۔

باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، میں شیشے کا سلائیڈنگ ڈور کھول کر باہر نکل آئی۔ ملازمہ نے پھرتی سے چائے اور موسمی پکوان میز پر لگانے شروع کر دیے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی پچھلی برسات کا منظر پوری جزئیات کے ساتھ میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ کس طرح میں اس دن گھن چکر بنی ہوئی تھی اور اب فراغت ہی فراغت...... میں نے اپنی نم آنکھوں کو رگڑا۔

''زندگی میں سب کچھ تو نہیں مل جاتا کسی نہ کسی چیز پر تو ہمیں سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔''



دلنشیں اداکارہ
سنبل اقبال سے دلآویز باتیں

جنوری کی ایک سردی صبح جب ہم اپنے آفس میں داخل ہوئے تو ہمارے کمرے میں سنبل بیٹھی ہوئی اپنا میک اپ کر رہی تھی۔ نازک اور کومل سی سنبل اپنا میک اپ خود کر رہی تھی جبکہ بیوٹیشن لبنیٰ بڑی مہارت سے اس کا ہیئر اسٹائل بنانے میں مصروف تھی۔ ویسے قارئین یہ بات ہم آپ کو چپکے سے بتا دیں کہ سنبل جتنی اچھی ڈراموں میں نظر آتی ہے اصل زندگی میں اس سے کہیں زیادہ پیاری ہے۔ آج وہ اپنے ایک نئے

آنے والے سیریل حسرتیں کی شوٹنگ کے سلسلے میں یہاں آئی ہوئی تھی۔ سنبل سے شوٹنگز کے سلسلے میں اکثر ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں......فون نمبرز کا بھی تبادلہ ہوا تھا کہ ہمیں اپنے قارئین کے لیے ان کے پسندیدہ سلسلے فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ کے لیے اس کی کہانی سننی تھی لیکن ہر بار کبھی ہماری اور کبھی سنبل کی مصروفیات آڑے رہی تھیں اور اس وقت سنبل کو اپنے کمرے میں پا کر اچانک ہی یہ آئیڈیا ہمارے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ اس کے میک اپ اور ہیئر اسٹائل بنانے کے دوران ہی اس کا افسانہ سن لیا جائے۔ سنبل بھی مسکراتے ہوئے فوراً ہی اس بات پر متفق ہوگئی۔

سنبل اقبال......''ہاں یہ تو اچھا آئیڈیا ہے۔ ویسے بھی آج شوٹنگ کے سلسلے میں پورا دن میں یہیں پر ہوں۔ وقفوں کے دوران آرام سے ہماری بات چیت ہوتی رہے گی۔''

تو قارئین 2015ء کی ہماری پہلی ہیروئن آج اپنے خوب صورت افسانے کے ساتھ ہماری مہمان ہیں۔ ویسے تو سنبل کے بے شمار ڈرامے اور سیریلز آپ لوگ دیکھ چکے ہیں لیکن کچھ عرصہ قبل چلنے والے ان کے سیریل رخسار نے کافی دھوم مچائی ہوئی تھی یہاں تک کہ لوگ ان کے نام کے بجائے انہیں رخسار کہنے لگے تھے۔



❖...... ہاں تو سنبل حسبِ روایت ہم کہانی کا آغاز تمہارے بچپن سے کرتے ہیں۔ ذرا ہمارے قارئین کو بھی اپنے اس حسین دور میں لے کر چلو۔

سنبل اقبال...... (ہماری بات پر سنبل کی خوب صورت آنکھیں جو مسکرا اٹھتے ہوئے مزید حسین لگ رہی تھیں جیسے مسکرانے لگیں۔) ''میں بہت ہی چپ طبیعت اور ریزروڈ قسم کی لڑکی ہوا کرتی تھی۔ ذہین بھی بہت تھی سبھی مارکس بھی بہت اچھے آیا کرتے تھے۔ کھیل کود میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی مجھے۔ امی اور پاپا چونکہ بہت زیادہ disciplined parents تھے اس لیے میرا بچپن کافی طور طریقے کے ساتھ گزرا۔ البتہ 7th کلاس کے بعد میں نے اسکول کی مختلف ایکٹوٹیز میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ میں نے فلوٹ بجانا سیکھا اور بیسٹ فلوٹر کہلائی۔ مجھے اس میں سیکنڈ پرائز ملا تھا۔ اس کے علاوہ اسکول میں ہونے والے ڈراموں میں بھی participate کرتی تھی۔ پیروڈی کرنے میں خوب ماہر تھی۔ اپنے فیئرویل پر اسکول میں ایک زبردست اسٹیج ڈراما کیا تھا میں نے۔'' بیتے دنوں نے جیسے بانہیں پھیلا کر اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

❖......اچھا تو تمہاری اداکاری کا یہ ٹیلنٹ God gifted ہے؟ ہم نے ہنس کر اسے دیکھا۔

سنبل اقبال ......''جی ہاں کیونکہ میرے

خاندان میں دور، دور کوئی بھی شوبز کی فیلڈ میں نہیں ہے۔ میں ہی واحد فرد ہوں جس نے اس شعبے میں قدم رکھا ہے۔"

❖ ......اسی بات پر ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم اس فیلڈ میں آ کیسے گئیں، تمہارے پیرنٹس نے کیا آسانی سے اجازت دے دی تھی؟ (ہمارے سوال پر وہ ہنس دی)

سنبل اقبال...... "بھئی اس کا جواب بڑا ٹیپیکل ہے کہ میں بس اتفاقیہ شوبز کی اس دنیا میں آئی ہوں۔ اصل میں میری امی کا بیوٹی سیلون تھا جس میں ٹی وی چینل کا کوئی شو ریکارڈ ہوتا تھا۔ ایک بار کسی ماڈل کو آنا تھا لیکن اتفاق سے وہ نہیں آ پائی۔ یہ بیوٹی سیگمنٹ کا پروگرام تھا۔ امی نے مجھے اس کی جگہ بیٹھنے کو کہا۔ میں ایکسائٹمنٹ میں بیٹھ گئی۔ دل ہی دل میں خوش بھی بہت ہو رہی تھی کہ ٹی وی پر نظر آؤں گی اور جب یہ پروگرام آن ائر ہوا تو فوراً ہی ایک کمرشل کی آفر آ گئی جو چپس کا تھا۔ اس وقت میری عمر محض سترہ سال تھی۔ اس کے بعد مزید کمرشل کیے پھر ڈراموں کے لیے آفرز آنی شروع ہو گئیں۔ امی کو تو راضی کر لیا لیکن پاپا نہیں مان رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایکٹنگ کو ٹائم بہت دینا پڑتا ہے اور پھر پڑھائی کی طرف توجہ نہیں دے سکو گی۔ امی نے انہیں کافی کنونس کیا آخر وہ اس شرط پر راضی ہوئے کہ میری روٹین میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ پڑھائی پر اس کا ذرا بھی اثر نہیں پڑنا چاہیے اور امی ہر شوٹ پر میرے ساتھ جائیں گی۔ میں نے ان سے ان تمام باتوں کا وعدہ کر لیا اور یوں میں نے اپنا پہلا سیریل جہنم کیا جو احمد کامران نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ جسے بہت ہی اچھا فیڈ بیک ملا۔ تب ہی انجلین ملک نے مجھے اپنے سیریل چنگاری میں بھی کاسٹ کر لیا جو میرے لیے ایک بہت بڑا بریک تھرو تھا۔ اس کے بعد مجھے کافی آفرز ملنی شروع ہو گئیں لیکن چونکہ مجھے ایگزام کی تیاری کرنی تھی اس لیے میں اپنی اسٹڈی میں بزی ہو گئی اور کوئی آفر ایکسیپٹ نہیں کی البتہ ایک دو ڈرامے ضرور کر لیے کہ ان میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ ایگزامز ختم ہونے کے بعد مجھے بابر جاوید کے ایک بہت بڑے سیریل روگ میں کام کرنے کی آفر ہوئی جو میرے کیریئر کے لیے سنگِ میل ثابت ہوا۔" وہ جتنی تفصیل سے بتا رہی تھی اتنی ہی توجہ سے ہم سن رہے تھے۔ میک اپ ہو چکا تھا اور لبنیٰ اب ان کے خوب صورت بالوں کو ایک نیا اسٹائل دینے میں بزی تھی۔

❖ ......اچھا سنبل یہ بتاؤ کہ 2014ء کے ختم ہونے تک تم میں اب کتنا کانفیڈنس آ چکا ہے؟

سنبل اقبال......"اب میں بہت کانفیڈنٹ ہو چکی ہوں۔ اپنے سب معاملات خود ڈیل کر لیتی ہوں۔ امی اب بھی مجھے پک اینڈ ڈراپ کرتی ہیں لیکن اب وہ میرے ساتھ شوٹ پر نہیں ہوتی ہیں۔" کانفیڈنس اس کے لہجے میں بول رہا تھا۔

❖ ......امی پاپا کے علاوہ خاندان کے دیگر لوگوں کا تمہارے شوبز میں آنے پر کیا ردِعمل ہوا؟

سنبل اقبال ......"میں چونکہ پنجابی فیملی سے ہوں تو وہاں ذرا شوبز میں آنے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تو خاندان میں بھی شروع میں اعتراض ہوا تھا خاص طور پر میری ننھیال والوں کو یہ بات زیادہ پسند نہیں آئی تھی لیکن چونکہ امی پاپا کی سپورٹ مجھے حاصل تھی اس لیے معاملہ بنا رہا۔"

❖ ......ارے ہاں! امی، پاپا کی باتیں تو ہو رہی ہیں لیکن ہم نے تمہارے بہن بھائیوں کے متعلق تو پوچھا ہی نہیں۔ کیا تمہارے علاوہ کسی اور کو شوق ہوا اس فیلڈ میں آنے کا؟

سنبل اقبال......(وہ جو بڑے ایکسپرٹ انداز میں اپنا میک اپ کر رہی تھی۔ blusher اپنے رخساروں پر لگاتے ہوئے اس نے ہمیں دیکھا۔) "ہم صرف دو بہنیں ہیں۔ میں بڑی ہوں اور میری چھوٹی بہن کو بھی مجھے دیکھتے ہوئے اس فیلڈ میں آنے کا شوق ہوا کیونکہ اکثر وہ میرے ساتھ شوٹس پر آیا کرتی تھی اور اب بھی اکثر آتی رہتی ہے۔ اسے بھی ایک سیریل کے لیے آفر ہوئی ہے جو اس نے قبول کر لی۔



آج کل وہ بھی اپنی سیریل کی شوٹنگ میں مصروف ہے جو ہم ٹی وی کے لیے ہے۔''

❖ ......ارے واہ یہ تو اچھی خبر ہے۔اس کا مطلب ہے تم دونوں کی کیمسٹری آپس میں ملتی ہے؟

سنبل اقبال......(ہماری بات پر اس نے فوراً ہی اثبات میں سر ہلایا۔)''جی ہاں وہ میری چھوٹی بہن ہی نہیں میری بیسٹ فرینڈ بھی ہے۔ہم ایک ہی روم شیئر کرتے ہیں۔کپڑے بھی ایک دوسرے کے پہن لیتے ہیں۔اپنے دل کی ہر بات ہم ایک دوسرے سے کر لیتے ہیں۔بہت دوستی ہے ہماری۔''

❖ ......اچھا لیکن کبھی لڑائی بھی تو ہوتی ہوگی پھر امی کس کا فیور کرتی ہیں؟ ہم نے اسے چھیڑا۔

سنبل اقبال......''کسی ایک کا نہیں دونوں کو برابر سے ڈانٹ پڑتی ہے لیکن ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے۔''

❖ ......سنبل بہن کے علاوہ دوستوں میں کوئی ایسی ہے جو تمہارے بہت کلوز ہو؟

سنبل اقبال......''میری کافی دوستیں ہیں لیکن بہت زیادہ کلوز نہیں۔اصل میں شروع ہی سے میری انڈرسٹینڈنگ اپنی فیملی سے زیادہ رہی ہے۔'' اس نے جواب دیتے ہوئے اپنے میک اپ کو آخری ٹچ دیا۔لبنیٰ بھی اپنا کام تقریباً ختم کر چکی تھی۔سنبل کو اب ڈریس چینج کرنا تھا۔اس وقت وہ جینز اور شرٹ میں ایک معصوم سی کالج گرل لگ رہی تھی لیکن جب وہ کپڑے بدل کر آئی تو فان اور گرے کلر کے کامبینیشن کی خوب صورت سی شرٹ، فان ہی کلر کے دوپٹے اور چوڑی دار پاجامے کے ساتھ مشرقی لک دیتی ایک پیاری سی لڑکی کے روپ میں نظر آرہی تھی۔اب شاید وہ اپنے ہونے والے سین کے لیے تیار تھی۔یہ شوٹ کسی ریسٹورنٹ کا تھا اور وہ کار کا انتظار کر رہی تھی۔ہم دونوں نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کہانی میں مزید رنگ بھرے۔

❖ ......اچھا سنبل یہ تو دوستی کی بات ہوئی ذرا یہ تو بتاؤ کہ عمر کے اس نوخیز دور میں کبھی کوئی دل کو اچھا بھی لگا؟'' ہم نے شرارت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

سنبل اقبال......''ہاں کیوں نہیں، اسکول کے زمانے سے ہی کوئی نہ کوئی پسند آتا رہا ہے لیکن بس بات پسند تک ہی محدود رہی ہے۔'' بڑے ہی دلچسپ انداز

میں اس نے جواب دیا تو ہمارے ساتھ، ساتھ لبنیٰ بھی ساختہ ہنس دیں۔

❖ ......اور تم نے کتنے دل توڑے ذرا یہ بھی تو پتا چلے؟ ہم نے اپنے سوال کے تسلسل کو جاری رکھا۔

سنبل اقبال...... ''یہ تو مجھے نہیں پتا بہر حال کافی لوگوں نے مجھے شادی کے پروپوزل تک دے ڈالے۔ میرے جواب نہ دینے پر میری امی کو فون کر کے ان سے ریکویسٹ کی کہ وہ مجھے اپنا لائف پارٹنر بنانا چاہتے ہیں لیکن میرے پیرنٹس جانتے ہیں کہ میں ابھی فی الحال دو سال تک بالکل شادی کے لیے راضی نہیں لیکن امی نے مجھے وارن کر دیا ہے کہ اگر دو سال تک میں نے اپنی کوئی پسند نہیں بتائی تو وہ اپنی مرضی سے میرا رشتہ طے کر دیں گی۔'' اپنی امی کی وارننگ کا بتاتے ہوئے وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

❖ ......ویسے سنبل تم نے اتنے اسمارٹ، اسمارٹ ہیروز کے ساتھ بڑے، بڑے سیریلز کیے ہیں کس کے ساتھ تمہاری کیمسٹری زیادہ میچ ہوئی؟ ہم نے کسی خوب صورت جواب کی آس میں سوال کیا اور ہمیں ناامیدی نہیں ہوئی۔ کچھ رنگ بکھر کر اس کے چہرے کو مزید خوب صورت بنا گئے)

سنبل اقبال...... ''ویسے تو میری شوبز میں سب سے اچھی دوستی ہے لیکن دو لوگ ایسے ہیں جن کے ساتھ کام کرتے ہوئے صحیح طور پر ذہنی ہم آہنگی محسوس ہوتی ہے ایک تو آغا علی ہیں اور دوسرے عفان وحید۔''

❖ ......ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو آغا علی کے ساتھ تبھی تمہارا پیئر زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔'' ہماری بات پر جیسے اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمک اٹھے۔

سنبل اقبال...... ''ہے ناں، آپ نے بھی یہ محسوس کیا ہے! شوبز زندگی میں تو سبھی نے کہا کہ ہم دونوں کا پیئر بہت اچھا اور نیچرل لگ رہا تھا۔ اس کے علاوہ رخسار میں بھی ہم دونوں کو ساتھ بہت پسند کیا گیا۔'' اس کے لہجے میں چھپی خوشی محسوس کر کے ہم نے اسے چھیڑا۔

❖ ......اور اگر یہ پیئر حقیقی زندگی میں بھی بن جائے تو کتنا اچھا ہو۔ سنبل ایمان سے سچ، سچ بتاؤ جہاں تمہارے اتنے پروپوزل آتے ہیں اگر آغا علی نے بھی اپنا پروپوزل دے دیا تو مان جاؤ گی؟

سنبل اقبال......(اس نے بڑی خوب صورت مسکراہٹ سے ہمیں دیکھا) ''ہاں مان جاؤں گی۔'' اس کے بے ساختہ جواب پر ہم سب ہنس دیے۔ (قارئین پلیز بات کو سیریس مت لیجیے گا کہ یہاں بات کا بتنگڑ بنتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ یہ تو ہنسی، ہنسی میں بات ہو رہی تھی۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری اتنی پیاری سنبل کے لیے لوگ قیاس آرائیاں کریں)

❖ ......اچھا سنبل یہ بتاؤ کہ اتنی کم عمری میں ملنے والی یہ شہرت کیسی لگ رہی ہے؟

سنبل اقبال...... ''شہرت کس کو اچھی نہیں لگتی بہت ہی انجوائے کر رہی ہوں۔ ہر جگہ وی آئی پی ٹریٹمنٹ ملتا ہے چاہے وہ خاندان کی کوئی تقریب ہو یا میں کہیں باہر ہوں۔'' پھر مسکراتے ہوئے اس نے مزید بتایا۔ ''خاص طور پر ٹریولنگ میں مجھے یہ شہرت کافی ایڈوانٹیج دیتی ہے کہ کئی بار اکانومی ٹکٹ پر مجھے فرسٹ کلاس یا بزنس کلاس میں بٹھا دیا جاتا ہے لوگ بہت پیار اور عزت دیتے ہیں۔ خوشی اس بات کی بھی ہوتی ہے کہ باہر ممالک میں بھی لوگ پہچان لیتے ہیں اور یقین جانیں میرے وہ فین اور بھی کریزی ہوتے ہیں بہت ہی زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہ لوگ۔''

❖ ......اچھا اپنے فینز کے حوالے سے کوئی مزیدار سا قصہ تو ہم سے شیئر کرو؟ ہمارے سوال پر جیسے کسی مزے دار سی یاد نے اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ بکھیر دی۔

سنبل اقبال...... ''یوں تو کافی قصے ہیں لیکن یہ دلچسپ قصہ میں ضرور سب سے شیئر کرنا چاہوں گی۔ ایک بار میں اپنی بہن کے ساتھ ایک شاپنگ مال میں شاپنگ کر رہی تھی کہ...... میں نے نوٹ کیا کہ دو لڑکیاں مسلسل میں جس طرف بھی جا رہی ہوں میرے پیچھے، پیچھے آ رہی ہیں اور مجھے دیکھے جا رہی ہیں۔ خیر پھر وہ

ہمت کر کے میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں کہ ہم آپ کے فین ہیں۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ان کی فرمائش پر میں نے ان کے ساتھ فوٹو بھی کھنچوالی کچھ دیر بعد میں نے نوٹ کیا کہ پھر وہ مجھے فالو کر رہی ہیں۔ میں نے رک کر پوچھا کہ کیا آپ کو کچھ کہنا ہے تو ایک لڑکی جھجکتی ہوئی بولی کہ کیا ہم آپ کو kiss کر سکتے ہیں؟ میں تو کچھ بول ہی نہیں سکی حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا کہ آخر یہ کیا کہہ رہی ہے اور پھر آگے بڑھ گئی تب وہ دوبارہ میرے پیچھے آئیں اور بولیں کہ آپ نے جواب نہیں دیا اور پھر جلدی سے ایک نے مرا گال پکڑ کر پیار کیا اور شکریہ ادا کر کے واپس مڑ گئیں میں ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔ آس پاس کے سبھی لوگ ہنس پڑے تھے۔'' سنبل یہ قصہ سنا رہی تھی اور ہم لوگوں کی بے ساختہ ہنسی سے کمرا گونج رہا تھا۔ سنبل اپنا افسانہ بھی مکمل کرتی جا رہی تھی اور درمیان میں اس کے شوٹس بھی جاری تھے۔ اب دوسرے شاٹ کے لیے وہ نیوی بلیو سوٹ میں ہمیں مزید نکھری نکھری سی نظر آ رہی تھی۔

❖ ......تمہارے اسکول اور کالج کی فرینڈز کا کیا ری ایکشن ہے تمہارے ٹی وی اسٹار بن جانے پر؟

سنبل اقبال ......''وہ لوگ بہت خوش ہوتی ہیں۔ میری کلاس فیلوز جب اپنے جاننے والوں کو بتاتی ہیں کہ سنبل ہماری کلاس فیلو یا ہمارے اسکول میں پڑھتی تھی تو اکثر لوگ ان کا یقین نہیں کرتے تب وہ میرے پاس آکر ثبوت کے طور پر خوب ساری تصویریں میرے ساتھ کھینچ کر لے جاتی ہیں۔'' سنبل کے لہجے میں اپنی دوستوں کے لیے پیار تھا۔

❖ ......سنبل اگر کبھی انڈین فلم کی آفر ہوئی تو accept کرلوگی؟

سنبل اقبال ......''ہاں بالکل کرلوں گی لیکن وہ رول جس میں ولگیریٹی نہ ہو۔'' سنبل نے فوراً جواب دیا۔

❖ ......تو اس بات پر ہمیں یہ بھی بتا دو کہ تمہارا فیورٹ ہیرو کون ہے؟

سنبل اقبال ......''سلمان خان!'' سنبل نے چمکتی آنکھوں سے فوراً ہی فیورٹ ہیرو کا نام لے ڈالا۔

❖ ...... یہ سارے خان واقعی میں بہت لکی ہیں۔ اپنے سے آدھی عمر کی لڑکیوں کے بھی ہنوز آئیڈیل بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے سوچا۔

سنبل اقبال......''ویسے مجھے ارجن رام پال بھی بہت پسند ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے مزید بتایا۔

❖ ......اچھا سنبل اپنے کیے ہوئے ڈراموں میں تمہارے فیورٹ سیریلز کون سے ہیں؟ ہمارے پوچھنے پر اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

سنبل اقبال......''مائی ڈیئر سوتن، روگ اور میرے خواب ریزہ ریزہ میرے فیورٹ سیریلز ہیں۔ ویسے رخسار میں میرے کام کو بہت سراہا گیا تھا۔''

❖ ......سنبل ان سب ڈراموں میں تمہارے کردار کافی دکھی اور مظلومیت سے لبریز نظر آتے ہیں۔ تمہیں ایک چھاپ سی لگتی ہوئی نہیں محسوس ہو رہی؟ ہم نے اس بار کچھ چبھتا ہوا سا سوال کر ڈالا۔

سنبل اقبال ......''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اصل میں یہ سارے ہٹ سیریلز تھے اور میں ان رولز میں پسند بھی کی گئی تھی شاید میرے چہرے پر جو معصومیت ہے اس کی وجہ سے بھی ڈائریکٹرز کو میں ایسے رول میں فٹ نظر آتی ہوں لیکن اب انشاء اللہ میں یہ چھاپ مٹانے جا رہی ہوں۔ انتہا اور حسرتیں میں میرے فینز مجھے بالکل مختلف رول میں دیکھیں گے۔'' اس کی آواز میں خوشی کھنک رہی تھی۔

❖ ......تم نے بالکل ٹھیک کہا سنبل۔ حسرتیں میں تمہارا کردار بہت منفرد اور خوب صورت ہے۔ یہ negative رول اپنے اندر بہت حسین رنگ چھپائے ہوئے ہے تمہارے امیج میں بہت چینج لائے گا یہ سیریل۔ ہم نے اس کی بات پر سو فی صد متفق ہو کر کہا اور افسانے کو مزید آگے بڑھایا۔

❖ ......غصہ آتا ہے تمہیں؟ ہمارے سوال پر وہ دھیمے سے ہنس دی۔

سنبل اقبال ......''غصہ کبھی کبھی آتا ہے لیکن

جب بھی آتا ہے بہت ہی خوفناک آتا ہے۔''

❖ ......امی، پاپا کو تمہاری کون سی عادت بری لگتی ہے؟

سنبل اقبال ......''میں جلد باز بہت ہوں اور اپنی جلد بازی میں کافی نقصان بھی اٹھائے ہیں میں نے۔ یہ بات ان لوگوں کو پسند نہیں ہے میری۔'' اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

❖ ......اور کون سی عادت ان کو پسند ہے تمہاری؟

سنبل اقبال......''میں کبھی ان سے کوئی غلط بیانی نہیں کرتی۔ کہنا ماننے والوں میں سے ہوں۔''

❖ ......یعنی بہت فرمانبردار بیٹی ہو تم۔ اچھا یہ بتاؤ جب کبھی گھر پر ہوتی ہو تو کام میں امی کا ہاتھ بٹاتی ہو یا کبھی کوکنگ وغیرہ کرنے کا موڈ ہوتا ہے؟

سنبل اقبال ......''جی ہاں میں گھر میں اکثر کوکنگ کرتی ہوں اور کچھ ڈشز میری اسپیشلٹی ہیں۔ میری بنائی ہوئی چائنیز ڈشز بھی سب کو بہت پسند آتی ہیں۔'' اب تقریباً شام ہونے والی تھی لیکن وہ بڑی دل جمعی کے ساتھ اپنی شوٹنگ میں مصروف تھی اور اس وقت سین کے ڈیمانڈ کے مطابق وہ سفید سوٹ میں ملبوس بہت زیادہ پیاری لگ رہی تھی شاید اس لیے بھی کہ سفید رنگ ہمارا بے حد فیورٹ کلر ہے۔

❖ ......تمہارے سارے ڈریسز بہت پیارے ہیں۔ کیا یہ تمہاری اپنی وارڈ روب کے ہیں؟

سنبل اقبال......(ہماری تعریف پر ایک فخریہ سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کو چھولیا۔) ''جی ہاں اور ان سب کپڑوں کی ڈیزائننگ میری امی نے کی ہے۔ وہ بہت اچھی ڈیزائنر ہیں۔'' اس کے انکشاف پر ہم نے حیران ہو کر اسے دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اس کے علاوہ گھر کی ساری ڈیکوریشن بھی وہی کرتی ہیں۔ بہت خوب صورت ڈیکوریٹ کیا ہوا ہے انہوں نے ہمارا گھر۔'' اپنی امی کے ٹیلنٹ کی وہ خود بھی معترف لگ رہی تھی۔ اب ہمارا آفس ٹائم ختم ہونے والا تھا لیکن بقول سنبل اسے ابھی مزید کافی دیر شوٹ پر رہنا تھا لیکن اس کے چہرے پر ذرا بھی تھکن نظر نہیں آرہی تھی۔

❖ ......کون سا گیم تمہیں اچھا لگتا ہے؟

سنبل اقبال......''میرا پسندیدہ کھیل باسکٹ بال ہے جسے میں نے بہت کھیلا ہے۔''

❖ ......اور کرکٹ پسند نہیں ہے تمہیں؟ ہم نے کچھ حیرانی سے پوچھا کہ پاکستان میں تو یہ کھیل کریز بنا ہوا ہے۔

سنبل اقبال......''کرکٹ مجھے بدترین ناپسند ہے۔'' اس نے بہت صاف گوئی سے کہا تو اس کے لفظ بدترین کہنے پر ہنسی آگئی۔ اس کی بھی شوٹ تیار تھی اور ہمارے بھی جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اپنے کام کے دوران وہ وقفے، وقفے سے اپنی اس بات چیت سے وہ ہمیں بھی اندر سے فریش کرتی رہی تھی۔ ہمیں یہ سمپل اور پیاری سی لڑکی سچ مچ بہت اچھی لگی تھی۔

❖ ......اچھا سنبل ایکٹنگ کے علاوہ تمہاری اور کوئی ہابی ہے؟

سنبل اقبال......''مجھے شاپنگ کرنا بہت ہی اچھا لگتا ہے میں بہت زیادہ شاپنگ کرتی ہوں اور بہت انجوائے کرکے کرتی ہوں۔'' اس نے بہت مزے لے کر بتایا۔

سنبل کا بلاوا آچکا تھا وہ جانے کو تیار کھڑی تھی۔ اپنا افسانہ مکمل کروانے کے بعد سنبل نے ہنس کر ہمیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چلیں اچھا ہوا آج ہمیں موقع مل ہی گیا کب سے ٹل رہا تھا یہ پروگرام۔''

ہم نے بھی مسکراتے ہوئے اسے خدا حافظ کہا۔ عزیز قارئین ہمیں امید ہے کہ ہماری اس بہت سویٹ سی ہیروئن کا یہ میٹھا سا افسانہ آپ نے خوب انجوائے کیا ہوگا۔ اگر کوئی تشنگی رہ گئی ہو تو ہمارا وعدہ ہے کہ اگلی بار اسے دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

☆☆☆

ہے دو جہاں کی بہار تم سے

شائستہ زرّیں

پھر ہوائے بہار نے آکر
دل چھوا دستِ مہرباں کی طرح

موسمِ سرما پیغام بہار دیتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔ پھول کھلنے کے اس موسم میں گلستاں ہی میں نہیں گھروں اور دلوں میں بھی رونق، شادمانی، شادابی اور خوش رنگی کا دل خوش کُن احساس ہوتا ہے اور یہ احساسِ جاوداں محض بہار ہی سے نہیں بلکہ مجسم بہار یعنی صنفِ نازک سے بھی ہوتا ہے۔ بلاشبہ

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

گویا کائنات میں بکھرے قوسِ قزح کے تمام رنگ صنفِ نازک کے مرہونِ منت ہیں۔ مانا کہ صنفِ نازک اور بہار میں گہری مماثلت ہے۔ اس کے باوجود صنفِ نازک کی زندگی میں ایسی کوئی ہستی ضرور ہوتی ہے کہ اُس کی تمام تر بہاریں جس کے دم سے قائم ہیں۔

صحنِ چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
آپ آگئے تو ساری بہاروں پہ چھاگئے

اور صنفِ نازک جو اپنی ذات میں انجمن ہوتی ہے، آدھی دنیا کہلاتی ہے۔ بہار رُت میں ایک دن ایسا بھی آتا جو عالمی سطح پر صنفِ نازک سے منسوب ہوتا ہے۔ ۸ مارچ آہنی حوصلے والی صنفِ نازک کے خود کو منوانے کا دن، جب تمام خواتین ایک پلیٹ فارم پر کھڑی ہوکر اپنے مسائل کے حل کے لیے کوشاں ہوتی ہیں۔ خزاں میں پھول کھلانے کے عمل میں کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرتیں بھلا لگتا ہے بے لوث جذبے کے ساتھ میدانِ عمل میں اترنے والی یہ صنفِ نازک جب عالمی یومِ نسواں پر اپنی ہم صنف کو پُر بہار پیغام دیتی ہے۔

ان ہی امور کے پیشِ نظر بہار نمبر کے سروے کے لیے ہم نے چند صنفِ نازک سے معلوم کیا کہ

سوال: صنفِ نازک اور بہار میں کیا مماثلت ہے؟ آپ کی زندگی میں بہار کس کے دم سے ہے؟

سوال: عالمی یومِ نسواں کے موقع پر اپنی کس ہم صنف کو کون سا پُر بہار پیغام دیں گی؟

ڈاکٹر صبیحہ عیسیٰ
(پیتھالوجسٹ)

ا: بہار اور خواتین دونوں ہی تازگی لاتی ہیں، دونوں کے بغیر زندگی پھیکی، پھیکی ہوتی ہے۔ گھر



ڈاکٹر صبیحہ عیسیٰ

میں ایک عورت نہ ہو تو گھر اجاڑ نظر آتا ہے، بالکل اسی طرح سے جب تک پیڑوں پر نئے پتے، نئی کونپلیں نہیں پھوٹتیں وہ خوشنما نہیں ویران لگتے ہیں۔ بے شک کائنات میں جتنے بھی حسین رنگ ہیں وہ صنفِ نازک کی وجہ سے ہی تو ہیں اور بہار بھی دنیا میں رنگ بکھیر دیتی ہے۔ میری زندگی کی بہار میرے بچوں اور ان کی پود کے دم سے ہے۔

۲: تمام پاکستانی خواتین اور لڑکیوں کے لیے میرا پیغام ہے کہ ایسے کام کریں کہ خوشبو اور خوشیوں کی لہر بن جائیں آپ کی وجہ سے ڈپریشن نہیں تازگی کا احساس ہونا چاہیے۔ آگے بڑھنے اور ملک وقوم کی بقا و خوشحالی کی لگن اور امنگ سے بھرپور زندگی بسر کریں۔ خود بھی مثبت عملی اقدامات کریں اوروں میں بھی یہ جذبہ جگائیں۔ بہار بن کر چھا جائیں گی۔

عاصمہ شیرازی
(اینکر پرسن)

ا: صنفِ نازک اور بہار میں کوئی فرق نہیں۔ جن کے یعنی صنفِ نازک کے دم سے تصویرِ کائنات میں رنگ



عاصمہ شیرازی

ہوا ان کا وجود ہی بہار ہے، میرے گھر، بہار میرے بچوں اور شوہر سے ہے۔

بس ایک ''بیٹی کی بہار'' کی کمی ہے۔ وہ آ گئی تو ہر سو بہار ہی بہار ہے۔

۲: اپنی ماں کو ہی پیغام دوں گی جن کی وجہ سے ہماری زندگیوں میں بہار ہے اور ایسی بہار ہمیشہ ہمارے گھر میں رہے، آمین!

تیری حیات کا ہر لمحہ شادماں گزرے
بہار سجدے کرے تو جہاں، جہاں گزرے

ڈاکٹر ھما بقائی
(چیئر پرسن شعبۂ سوشل سائنسز۔آئی بی اے)

ا: بہار بھی سب کو اچھی لگتی ہے اور صنفِ نازک بھی، دونوں ہی کو پروان چڑھانے کے لیے، اپنی



ڈاکٹر ہما بقائی

زندگی میں مستقل رکھنے کے لیے جن عوامل کی ضرورت ہے اس کا خیال نہ معاشرہ کرتا ہے اور نہ ہی ماحولیات، دونوں کو پسند کرنے کے باوجود ان کے نکھار کی ذمے داری لینے کو، مشکل فیصلے کرنے کو کوئی بھی تیار نہیں۔ ہر

دہ پل جب میری نظر اپنے بچوں بالخصوص چھوٹی بیٹی ایشا کی طرف اٹھتی ہے۔میرے لیے بہار ہے، میری ہرخوشی اپنے بچوں سے منسلک ہے۔

۲:وہ تمام بچیاں جو اسکولوں میں پڑھتی ہیں ان کو صرف ایک ہی پیغام دینا چاہتی ہوں کہ ضرور،ضرور،ضرور پڑھ لو اور تعلیم کے میدان میں اتنا آگے نکل جاؤ کہ تم پر حاوی ہونا چاہنے والی قوتیں اس کے بارے میں سوچ بھی نہ سکیں اور تعلیم کا حصول ہی واحد راستہ ہے تمہاری زندگی کو پُر بہار بنانے کا۔دلی دعا ہے کہ مہکے سدا بہار کی صورت تیرا وجود!

(آمین)

فضیلہ قاضی

(ٹی وی آرٹسٹ)

ا:خوب صورتی اور تازگی کا یکساں احساس۔ میری زندگی کی تمام بہاریں میری فیملی، میرے میاں اور بچوں کے دم سے ہے۔

۲:اپنی ساری ہم صنف کو ایک ہی پیغام دوں گی کہ اوروں کی زندگی کو مشکل بنانے کے بجائے اپنی زندگی کو آسان بنائیں، دوسروں سے حسد کریں گی تو خود بھی چین اور سکھ سے نہ رہ سکیں گی۔اس کے لیے ضروری ہے کہ اوروں کی زندگی میں مداخلت نہ کریں اس طرح آپ خود بھی خوش رہیں گی اوروں کو بھی خوش رہنے دیں گی۔صحت مند رہیے۔آپ صحت مند ہوں گی تو شادابی خود بخود آجائے گی۔اسی لیے ''بہار بن کے جیو، بہار بن کے رہو''۔

روبینہ جون

(چیف نرسنگ سپرنٹنڈنٹ۔پی ایچ ڈی اسٹوڈنٹ ،پبلک ہیلتھ)

ا:بے شک خواتین اور بہار میں تعلق محسوس ہوتا ہے لیکن یہ کلیہ تمام خواتین پر صادق نہیں آتا۔ایسا صرف ان خواتین کے لیے کہہ سکتے ہیں جنہیں دیکھ کر خوشگوار احساس ہوتا ہے۔ایک ماں ہونے کے ناتے



روبینہ جون

یقیناً میرے بچے ہی میری بہار ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میری بہار زندگی میں ہر روز آنے والی چھوٹی، چھوٹی خوشیوں کے دم سے بھی ہے۔میں کسی چھوٹی سی خوشی سے بھی بہت سی خوشیاں کشید کرتی ہوں جو بڑی



فضیلہ قاضی

خوشیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔
۲: میں تمام خواتین سے یہی کہوں گی کہ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی مثبت سوچیں اس کے خوشگوار اثرات شخصیت پر بھی مرتب ہوں گے۔ اپنے گھر، شوہر اور بچوں کی منفی باتیں نظر انداز کر دیجیے۔ اپنے مثبت طرزِ عمل سے ان میں غیر محسوس طریقے سے تبدیلی لائیں، شوہر پر شک نہ کریں، اس سے تعلق میں بھی فرق پڑے گا اور گھر کا ماحول بھی خوشگوار ہوگا، اگر شوہر سے کوئی اختلاف ہے، شکایت ہے تو بچوں کے سامنے لانے کے بجائے خاموشی سے آپس میں بات کریں۔ وہ رویہ اختیار کریں جس کے خوشگوار اثرات سے آپ کی شخصیت پُر بہار بن جائے۔

منزہ ارشاد

(معلمہ بیکن ہاؤس اسکول)

۱: جس طرح موسم بہار رنگوں اور خوشبوؤں کا پیغام لے کر آتا ہے بالکل اسی طرح صنفِ نازک کا وجود اس کائنات کا رنگ ہے۔ خوشبو ہے اور پھولوں کی طرح نازک ہے۔ میری زندگی کی بہار میرے بچے ہیں۔



منزہ ارشاد

اگر وہ نہ ہوتے تو یہ زندگی ایک بیاباں کے مانند ہوتی، شاید میرے ہاتھ کبھی دعا کے لیے نہیں اٹھتے اور نہ ہی میں محبت کی گرمی اور گداز محسوس کر پاتی۔
۲: میرا پیغام میری بیٹی عائشہ کے لیے ہے، ہمیشہ خود پر فخر کرو کیونکہ خواتین مردوں کے برابر نہیں بلکہ ایک بہن، ایک بیٹی اور ایک ماں کے روپ میں وہ ان سے کہیں زیادہ افضل ہیں۔

ڈاکٹر فرح خان

(آر جے۔ وائس اوور آرٹسٹ)

۱: صنفِ نازک اور بہار ایک ہی چیز ہیں جس طرح بہار کے بعد خزاں آتی ہے اور خزاں کے بعد بہار آنے کی پوری امید ہوتی ہے تو یہ اسی شان کے ساتھ



ڈاکٹر فرح خان

واپس آتی ہے لیکن اگر صنفِ نازک کی بہار وقت کے ساتھ، ساتھ ختم ہو جائے تو بہار کی امید نہیں جگائی جا سکتی لیکن اگر صنفِ نازک کو دائمی خوشیاں مل جائیں تو یہ بہار واپس آسکتی ہے۔ میری زندگی کی بہار میرے بچوں اور شوہر کے دم سے ہے۔
۲: اپنی بھابی تسنیم گوگی سے کہوں گی کہ لوگوں کی

باتوں میں آ کر کبھی اپنے آپ کو کمزور نہ سمجھو، مردوں کے شانہ بشانہ کام کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا سکتی ہو۔ جو تم کو کمزور سمجھتے ہیں ان سے ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ محنت اور عزم کے ساتھ کامیابی حاصل کرو۔ ایک دن وہ آئے گا کہ یہ خود تمہارا احترام کریں گے اور اچھے الفاظ میں یاد رکھیں گے۔

عبیل جاوید

(ہوسٹ، مصالحہ چینل)

۱: صنفِ نازک بھی خوشگوار، نازک اور خوب صورت ہوتی ہیں اور پھول بھی خوشگوار، نازک اور خوب صورت ہوتے ہیں۔ صنفِ نازک اور بہار کے سارے ہی رنگ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ میری بیٹی کی ولادت میرے لیے کسی بہار سے کم نہیں، میری ساری بہاریں میرے آنگن میں کھلنے والے اس حسین پھول ہی کے دم سے ہیں۔

۲: عالمی یوم نسواں کے موقع پر میں اپنی بیٹی ہی کو پُر بہار پیغام دوں گی کہ

ہر پل تو خوشیوں میں کھیلے



عبیل جاوید

مہکیں سدا دن رات تیرے

(آمین)

اریج فاطمہ

(ٹی وی آرٹسٹ)

۱: لڑکیاں بھی حسین ہوتی ہیں اور بہار بھی۔ دونوں ہی میں نکھار ہوتا ہے۔ میری زندگی کی بہار میرے تمام گھر والوں کی وجہ سے ہے۔



اریج فاطمہ

۲: تمام لڑکیوں کے لیے ایک ہی پیغام ہے کہ عزتِ نفس سے بڑھ کر اہم کچھ بھی نہیں اگر یہ آپ کی زندگی میں ہے تو بہار ہی بہار ہے ورنہ؟

حنا الطاف

(ٹی وی آرٹسٹ)

۱: دونوں ہی خوشیاں پھیلاتی ہیں۔ میری فیملی خاص کر امی، ابو کے دم سے کہ آج میں ان دونوں خاص کر امی کی وجہ سے اس مقام پر ہوں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے، آمین!

۲: میری عزیز دوست ڈاکٹر عینا! جس طرح میری زندگی میں اپنی آمد سے بہاروں کے رنگ بھر دیتی



حنا الطاف

ہے اس کے لیے یہی دعائیہ پیغام ہے کہ ”زندگی بھر تندرستی کے ساتھ بہاروں کی طرح مسکراتی رہیے۔“

فاطمہ آفندی
(ٹی وی آرٹسٹ)

ا: دونوں ہی خوب صورت ہیں، دونوں ہی خوشیاں



فاطمہ آفندی

لاتی ہیں۔ اور میری زندگی کی بہار میرے بیٹے کے دم سے ہے جو میری زندگی میں بہت سی خوشیاں لایا۔

۲: امی نے مجھے بہت لاڈ پیار سے پالا۔ میری عمدہ پرورش کی، ہر موقع پر مجھے سپورٹ کیا، ہمیشہ مجھے پھولوں کی طرح رکھا۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اپنی امی کو یہ بہاروں بھرا پیغام دوں کہ ”جیسے آپ نے مجھے پھولوں کی طرح رکھا آپ بھی عمر بھر پھولوں کی طرح مہکتی رہیں، آمین!“

ذہب خان
(اسکوئش کھلاڑی)

ا: خواتین کی شخصیت اور بہار کے تمام رنگ ایک جیسے ہوتے ہیں، دونوں ہی زندگی میں رنگ بھر دیتے ہیں۔ میری زندگی کی بہار میری فیملی خاص طور پر



ذہب خان

بابا اور امی کے دم سے ہے۔

۲: میں اپنی بہن نیہا کمال کو پیغام دینا چاہتی ہوں کہ اسکوائش کی دنیا میں کچھ ایسے کمالات دکھاؤ کہ جس سے صرف تمہیں ہی نہیں پاکستان کو بھی کامیابی ملے۔ انجوائے کرو اور بہار بن کر جیو۔

قارئینِ اکرام!

تمہی ہو روحِ روانِ ہستی، سکوں نظر کا، دلوں کی مستی
ہے دو جہاں کی بہار تم سے، تمہی سے پھولوں میں تازگی ہے

صنفِ نازک کو خراجِ تحسین پیش کیے جانے والے اس شعر میں سارے رنگ بہار کے ہیں۔ گویا دونوں میں قدرِ مشترک خوشی و شادابی کا روح پرور احساس ہے جو کائنات پر چھائے یا زندگی پر محیط ہو مشکبار کر دیتا ہے۔ صنفِ نازک نہایت کم عمری ہی سے مٹی کے گھروندے بناتے، بناتے نہ صرف خود دل میں گھر بنالیتی ہے بلکہ گھر کی اولین ضرورت بھی بن جاتی ہے۔ اس کی ہر خوشی ہر سکھ اپنے گھر اور گھر والوں سے منسوب ہوتا ہے۔ بالخصوص ایک ماں کے لیے اس کی بیٹی اور بیٹی کے لیے ماں کا وجود مثلِ بہار ہوتا ہے بہر دو جانب دلی تعلق میں دل کی آواز یہی ہوتی ہے کہ

میری بہار تم سے ہے
مجھ میں نکھار تم سے ہے
میرا قرار تم سے ہے
میری حیات تم سے ہے

ماں اور بیٹی ایک دوسرے کی کمزوری بھی ہوتی ہیں اور طاقت بھی۔ اپنی پھول جیسی نازک بیٹی کو آہنی حوصلے ماں ہی دے سکتی ہے۔ بہار کی اس رُت میں ہر سال ۸ مارچ کو منایا جانے والا عالمی یومِ نسواں صنفِ نازک کے آہنی حوصلوں کا بیّن ثبوت ہے۔ عالمی یومِ نسواں کے موقع پر جہاں صنفِ نازک کے خلاف سماجی رویّوں اور مردوں کی خواتین پر حکمرانی اور سفاک برتاؤ کا چرچا ہوتا ہے وہاں اپنے مسائل کے حل اور حقوق کی پاسبانی اور بازیابی کے لیے خواتین کے بلند عزائم اور خود کو منوانے کی جدوجہد میں ان کے مثبت کردار کے ساتھ ہی اپنی ہی صنف کے خلاف صف آرا ہونے کا منفی جذبہ بھی نظر آتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ عالمی یومِ نسواں کے موقع پر صنفِ نازک آپس کے تمام اختلافات بھلا کر فراخ دلی، وسیع النظری اور کشادگیِ ذہن کے ساتھ اپنی ہم صنف کی خوبیوں کا اعتراف کریں، انہیں سراہیں، ان کی راہ کے کانٹے چن کر ان کے لیے راہ ہموار کریں، کامیابی کی شاہراہ پر آگے بڑھنے اور بڑھانے میں خلوصِ نیت سے ان کے ساتھ تعاون کریں۔ صنفِ نازک کی ایک دوسرے کے لیے مثبت فکر و عمل سے بڑھ کر عمدہ اور پُر بہار سوغات اور کیا ہو سکتی ہے بھلا!

☆☆☆

بیٹیاں

اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات اگر محمدؐ کے لیے پیدا کی تو کائنات کی خوب صورت تخلیق عورت کو قرار دیا کیونکہ عورت ماں، بہن، بیوی کے روپ میں گھر کی رونق ہے اور بیٹی کی صورت میں باپ اور بھائیوں کے دل کا قرار بھی ہے اور گھر کے لیے رحمت بھی۔ ایک حدیث رسولؐ ہے کہ اگر آپ کے گھر میں مفلسی ہے تو اپنی بہن کی یا بیٹی کی دعوت کیا کرو تا کہ اللہ رب العزت کا کرم ہو اور رزق میں برکت عطا ہو۔

مرسلہ: سنبل ملک اعوان، لاہور

دعا

اپنے حصے کا کام کیے بنا دعا پر بھروسا کرنا حماقت ہے اور اپنی محنت پر بھروسا کر کے دعا سے گریز کرنا تکبر ہے۔

مرسلہ: شبانہ ملک، ڈی جی خان

موت

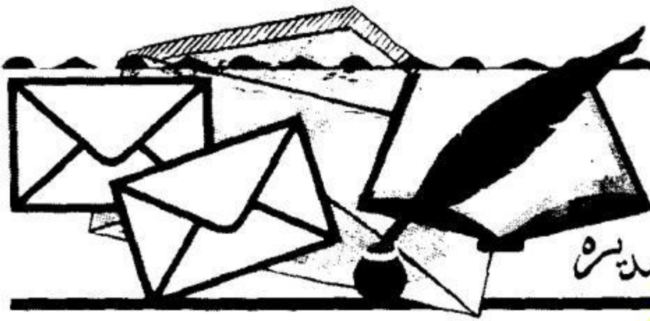
رشتوں کی موت کبھی قدرتی نہیں ہوتی ان کو انسان خود مارتا ہے کبھی نفرت سے کبھی نظر اندازی سے اور کبھی غلط فہمی سے۔

مرسلہ: نگہت معین، کراچی

غلط فہمی

رشتوں کی رسی تب کمزور ہوتی ہے جب انسان اپنے اندر غلط فہمی سے پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب بھی خود بنا لیتا ہے۔

مرسلہ: حنیفہ ملک، ڈی جی خان



بہنوں کی محفل

مدیرہ

★ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

★ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود وسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

★ پیاری بہنو! جیسا کہ آپ جانتی ہیں کہ فرانس کے اخبار چارلی ہیبڈو نے ہمارے پیارے نبی ﷺ آقائے دو جہاں کی ناموس پر حملہ کرتے ہوئے توہین آمیز اور اشتعال انگیز خاکے شائع کر کے دنیا کے دوارب مسلمانوں کے دلوں پر گہرا زخم لگایا ہے پھر صرف یہی نہیں بلکہ مغربی دنیا کے متعدد حکمرانوں نے جمع ہو کر اس ملعون اخبار کے ساتھ اظہارِ یک جہتی بھی کیا ہے۔ وہ ممالک جو اپنے آپ کو مہذب کہتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنے غیر مہذب ہونے بلکہ انتہائی جاہل ہونے کا بھی ثبوت دیا ہے اور یہ سب وقفے، وقفے سے اس لیے ہو رہا ہے کہ مسلمانوں میں اشتعال پھیلایا جائے اور انہیں دہشت گرد ثابت کیا جائے...... مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ نہ تو کوئی محبوب خدا کی شان گھٹا سکتا ہے اور نہ ہی عاشقانِ محمدؐ کی تعداد میں کوئی کمی واقع ہو سکتی ہے۔ اللہ رب العزت کا احسان ہے اور فضل وکرم ہے کہ اس نے ہمیں خاتم النبیین ﷺ کی امت میں پیدا فرمایا...... اور کوئی بھی دہریہ کچھ بھی کر لے اسے اپنے مذموم مقاصد میں کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوگی...... اس لیے احتجاج ضرور کریں مگر اپنے ملک کی املاک کو نقصان ہرگز نہ پہنچائیں۔

ہماری بہت سی بہنوں کی یہ شکایت عرصے سے چل رہی ہے کہ انہیں پاکیزہ خاصی تاخیر سے ملتا ہے اور بعض مقامات پر تو ایک ماہ بعد مل پاتا ہے...... میں جانتی ہوں اکثر بہنیں لائبریریوں سے کرائے پر حاصل کر کے بھی پڑھا کرتی ہیں اور یہ سب بہنیں پاکیزہ میں اپنی شرکت بھی یقینی چاہتی ہیں تو آپ سب سے یہ وعدہ ہے کہ آپ کا خط خواہ کتنا ہی پرانا ہو، مراسلات کتنی ہی تاخیر سے کیوں نہ ملیں وہ پاکیزہ میں ضرور جگہ پائیں گے...... آپ نے صرف ایک ہی بات کا خیال رکھنا ہے کہ وہ معیاری ہوں...... خط تو آپ بے شک ٹوٹی پھوٹی اردو، انگریزی یا علاقائی زبان میں بھی لکھ کر بھیج دیں...... وہ انشاء اللہ ضرور شاملِ اشاعت ہوگا۔

★ ہمارے قارئین کو ذیشان رسول کی شادی کی کوریج کا انتظار ہوگا۔ انشاء اللہ جلد ہی آپ رنگین تصاویر کے ساتھ بھرپور احوال پڑھ سکیں گے۔ اس لیے بس تھوڑا سا انتظار کر لیں...... اور پھر پڑھیں تفصیلی احوال جس کو پڑھ آپ اپنے کو خود اس تقریب میں موجود سمجھیں گے۔ بالکل......!

★ انتہائی ضروری کام کے تحت ایک ہفتے کے لیے میں اپنے شوہر عبدالرب صدیقی، بیٹے ضیا اور بہو حنا کے ساتھ اسلام آباد گئی۔ کراچی اور اسلام آباد کے موسم میں زمین آسمان کا فرق تھا...... یہاں ہم پنکھا چلا کر کمفرٹر اوڑھ کر سوتے ہیں اور وہاں ہر کمرے میں ہیٹر جل رہے تھے...... میری بیمار اور کمزور ماں نے اپنی بانہوں میں مجھے سمیٹ لیا اور جب تک میں اسلام آباد میں رہی۔ وہ مجھے یوں دیکھتی رہیں جیسے مجھے اپنی آنکھوں میں بھر رہی ہوں...... یہاں میری ملاقات شاعرہ اور مصنفہ خالدہ نسیم اور رفاقت جاوید سے ہوئی معلوم ہوا رفاقت جاوید کی دو نئی کتابیں آئندہ ماہ آنے والی ہیں اور خالدہ نسیم کی شاعری کتابی صورت میں آنے کے لیے پر تول رہی ہے۔ پروین شاکر ٹرسٹ کی صدر بیگم پروین عاطف سے بھی ملی۔ بے حد دھیمے لہجے میں بولنے والی خاتون ہیں، انہوں نے مجھ سے بطور خاص کہا کہ میں پروین شاکر سے اپنی پہلی ملاقات کا احوال انہیں لکھ کر بھیجوں اور وہ تصاویر بھی جو پروین شاکر کے ساتھ ہیں انہیں لازمی بھیجوں...... میں نے اسلام آباد اہلِ قلم کانفرنس میں صرف ایک ہی بار شرکت کی تھی...... اس موقع پر وہ تصاویر پاکیزہ میں شائع ہوئی تھیں...... میرے پاس تو شاید وہ پاکیزہ بھی نہ ہو...... مگر میں نے ان سے ایک ہلکا سا وعدہ کر لیا...... اسلام آباد میں پاکیزہ کے دیرینہ قاری اور شہید لیفٹیننٹ راشد احمد خان کے والدین سے ملاقات ہوئی۔ خورشید بہن اور شبیر بھائی سے یہ ہماری تیسری ملاقات تھی۔ پیسہ تو بہت سے لوگوں کے پاس ہوتا ہے مگر وہ ان کے لیے ہی ہوتا ہے، بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے پیسے کو دوسرے پر خرچ کر کے خوش ہوا کرتے ہیں۔ شبیر بھائی نے اپنے شہید بیٹے راشد کی یاد میں سندھ میں ایک نیا شہر راشد آباد بنایا ہے جس میں بلاتعصب وتفریق پاکستان کے ہر صوبے کا بچہ پڑھ رہا ہے، وہاں فنی تربیت حاصل کر رہا ہے۔ پھر انہیں اچھی جاب بھی مل جاتی ہے، انہوں نے ایک ایسا ماڈل شہر بنایا ہے کہ جس میں تعلیم اور صحت کا معیار بین الاقوامی سطح پر رکھا گیا ہے۔ راشد آباد کے بارے

میں آپ مزید معلومات ویب سائٹ سے بھی حاصل کر سکتے ہیں، یہ تو ہم نے ہمیشہ سے سنا تھا کہ مری کے لوگ خوب صورت بھی ہوتے ہیں اور بہت محبت کرنے والے بھی۔ ہماری پاکیزہ کی مری سے وابستہ بہنیں بھی ایسی ہی ہیں۔ جب ہم دو دن کے لیے مری گئے تو وہاں پاکیزہ کی دیرینہ تبصرہ نگار اور شاعرہ گلشاد نذیر سے ملاقات ہوئی۔ وہ معروف مرحوم ڈاکٹر نذیر کی اہلیہ ہیں۔ ان کا اسپتال مظفر آباد میں ہے۔ وہ اس کی نگرانی کرتی ہیں۔ مری میں اپنے بزنس کو دیکھتی ہیں۔ سماجی کارکن بھی ہیں۔ این جی اوز کے لیے کام کر چکی ہیں۔ ان کی فیملی سیاسی طور پر بھی فعال ہے اور وہ ایک سیاسی جماعت سے بھی وابستہ ہیں اور پتا نہیں کیا، کیا کر رہی ہیں...... مگر ان کی سب سے بڑی خوبی محبت ہے، انہیں اپنی والدہ کے پاس پنڈی جانا تھا اس لیے وہ ہمارے ساتھ لنچ میں شریک ہو کر پنڈی چلی گئیں مگر وہاں جا کر بھی ہر چار گھنٹے کے بعد وہ ہماری خیریت پوچھ رہی تھیں۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ کتنی محبت کرنے والی بہنیں موجود ہیں۔ اللہ ان سب کو سلامت رکھے۔ میری پیاری امی، میرے دونوں بھائی، بھابیاں، بھتیجے، بھتیجیوں نے جس محبت سے ہم سب کی میزبانی کی اس کے لیے تو کچھ کہہ ہی نہیں سکتی۔ میں جس ضروری کام کے لیے گئی تھی وہ پورا بھی نہیں ہوا...... مگر واپسی پر رنجیدہ ہرگز نہیں تھی کہ میں اپنی ماں کے گلے لگ کر آئی ہوں۔ اور اس سے قبل کہ آپ سرگرمیوں سے آگاہ ہوں آئیں پہلے ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ آیت کریمہ یہ ہے۔


لا الٰہ الا انت سبحانك انی كنت من الظالمين

ترجمہ ﴿ تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے، میں قصورواروں میں سے ہوں (نوٹ) یہ حضرت یونسؑ کی مشہور دعا ہے، جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ سے کی تھی۔ یہ آیت کریمہ کہلاتی ہے۔ اس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں۔

★ ★ ★

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ مصنفہ شیریں حیدر، اسلام آباد عمرے کی سعادت حاصل کر کے آگئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ مصنفہ اختر شجاعت، کراچی کی پیاری سی بیٹی ردا نے بی اے کا امتحان نمایاں کامیابی سے پاس کر لیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ مصنفہ سیما مناف، کراچی ان دنوں اپنے بھانجے شارق رومی کی شادی میں شرکت کرنے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ شکاگو (امریکا) گئی ہوئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ماہ پارہ نسیم، کراچی عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب گئی ہوئی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز شعیب، سوات عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب گئی ہوئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار شہلا نواز، لاہور کے بھائی حیدر علی کی شادی سندس طارق کے ساتھ سادگی سے انجام پائی۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا خالد ان دنوں مسقط سے کراچی آئی ہوئی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ ناول نگار رفاقت جاوید ان دنوں اپنے شوہر کے ساتھ اسلام آباد سے سرگودھا گئی ہوئی ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسرت رانی تحلیل کی بہن رفعت وسیم اپنی فیملی کے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کر کے آئی ہیں جہاں انہوں نے سب پاکیزہ بہنوں کے لیے دعا کی۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ناہید بنت نور، واہ سیمنٹ ورکس کے بھتیجے کے ہاں بیٹی اور بھتیجی وردا کے ہاں پیارا سا بیٹا تولد ہوا ہے اور ہماری ناہید اب دادی بھی بن گئی ہیں۔ (مبارکاں)

☆ گزشتہ دنوں شاعر و مصنفہ یمنیٰ احمد کے بھائی رضوان احمد صدیقی کی شادی مونا نوال کے ساتھ ہوئی۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر ناہید ندیم صدیقی کا پہلا شعری مجموعہ آگہی، کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے، جس میں نظمیں اور غزلیں آسان فہم انداز میں لکھی گئی ہیں۔ کتاب پر قیمت درج نہیں ہے جو قاری یہ کتاب حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ حسب توفیق صدقات اور زکوٰۃ دے کر کامسیٹس یونیورسٹی اسلام آباد سے منسلک کامسیٹس ٹیچنگ اسپتال سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ کتاب کی آمدنی مریضوں پر خرچ کی جائے گی۔ (ماشاءاللہ)

☆ معروف شاعرہ عنبرین حسیب عنبر نے ماشاءاللہ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی ہے۔ (مبارک باد)
☆ گزشتہ دنوں ٹی وی کے ایک چینل پر معروف شاعرہ شگفتہ شفیق نے اپنا انٹرویو دیا اور اپنی نظمیں، غزلیں، سنائیں۔ (ماشاءاللہ)
☆ ان دنوں ہماری پیاری مصنفہ نیلوفر عباسی، نیویارک سے کراچی آئی ہوئی ہیں۔ (خوش آمدید)
☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار سمیرا حمید فاروق اب ڈیفنس کراچی میں شفٹ ہوگئی ہیں۔ (ماشاءاللہ)
☆ مصنفہ، شاعرہ اور پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ام ایمان قاضی کوٹ چھٹہ بہت جلد عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب جانے والی ہیں۔ (ماشاءاللہ)
☆ پاکیزہ کی مستقل نگار شگفتہ ناصر، فیصل آباد نے بتایا ہے کہ عظمیٰ آفاق کے دبئی کے سفرنامے سے متاثر ہوکر وہ پہلے دبئی اور پھر عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب جارہی ہیں۔ (مبارک باد)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار طیبہ عنصر مغل، راول پنڈی ان دنوں بیمار ہیں۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا ابی بی، راول پنڈی بسترِ علالت پر ہیں۔
☆ پاکیزہ کی شاعرہ نجمہ اصغر، کراچی شدید بیمار ہیں۔ بلڈ پریشر بے حد بڑھ جاتا ہے۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز تنویر بخاری، کراچی جوڑوں کے درد میں مبتلا ہیں۔
☆ شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار امینہ عندلیب، سلانوالی ہنوز بسترِ علالت پر ہیں۔
☆ شاعرہ مصنفہ اور تبصرہ نگار فریدہ جاوید فری علیل ہیں۔
☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار سمیرا مجاہد، صادق آباد ان دنوں بیمار ہیں۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز صبیح، سندھ ان دنوں بیمار بھی ہیں اور پریشان بھی ان کے لیے دعا کریں۔

★★★

انتقالِ پُرملال

☆ مصنفہ رفعت ہمایوں، کراچی کے سولہ سالہ بیٹے سید محمد عمر کا انتقال ہوگیا ہے۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری نازفرقان عالم کی اس ماہ برسی ہے۔
☆ معروف ڈینٹل سرجن ڈاکٹر احمد باری کی تیرہ سالہ بیٹی کنزہ انتقال کرگئی۔
☆ معروف رائٹر، فلم ساز اور ہدایت کار علی سفیان آفاقی لاہور میں انتقال کرگئے۔ مرحوم کی جاسوسی پبلی کیشنز کے ساتھ ایک طویل عرصے تک قلمی وابستگی رہی ہے۔
نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کی دعا کریں۔

★★★

✉ سیما یاسمین مجتبیٰ، کراچی سے۔ "فروری کے پاکیزہ میں آپ کا اداریہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ منظر ہم حال میں ہی دیکھ چکے ہیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اب لوگ ایسے ہی ہوگئے ہیں۔ آپ کا قلم بہت سچا ہے، اختر شجاعت کا اسلامی مضمون مکمل دینے کا بہت شکریہ...... ایسا لگتا ہے کہ وہ روح کے ساتھ لکھتی ہیں جو روح میں ہی اتر جاتا ہے۔ ایسے منفرد مضامین یا تو ابتدا میں لگائیں یا بہنوں کی محفل کے فوراً بعد لگائیں تا کہ ایک دم سے وہ مل جائیں، عظمیٰ آفاق کا سفرنامہ اس ماہ بھی بہت خوب صورت ہے ان کا اندازِ بیان بہت برجستہ ہے، عام زندگی کی باریکیاں بے حد خوب صورتی سے تحریر میں موجود ہیں۔ وہاں کے بازاروں کے بارے میں بہت سچی تصویر ہے کہ واقعی دبئی کے بازار بہت شاندار ہیں۔ ناول ہم نے کوئی نہیں پڑھے، ہاں افسانوں میں ناہید سلطانہ اختر اور سیما سراج کی تحریریں بہت پسند آئیں۔ جلترنگ کی کیا بات کریں...... وہ تو ہوتا ہی اچھا ہے۔ ہاں فیس بک پر آپ کے نام سے کئی آئی ڈی دیکھی ہیں۔" (پیاری سیما تبصرے کا شکریہ...... سفرنامۂ دبئی ایک اسلامی ملک کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے ساتھ، ساتھ ایک خواہش بھی دکھائی گئی ہے کہ ایسا اچھا انتظام ہمارے ملک میں بھی ہونا چاہیے۔ فیس بک پر میری صرف ایک ہی آئی ڈی ہے، جس کو میں بہ مشکل ہفتے میں ایک بار استعمال کرتی ہوں۔ باقی سب فیک ہیں، ہاں ناہید سلطانہ، سیما سراج اور اختر شجاعت شکریہ کہتی ہیں)

☜ فرزانہ قادر، میانوالی سے۔ ''ایک لمبے عرصے بعد اس محفل میں شریک ہو رہی ہوں۔ عذرا باجی کو بیٹے کی شادی کی مبارک باد...... ترکِ وفا کی آخری قسط پڑھی، میری جانب سے بے حد مبارک باد، نایاب جیلانی کے لیے...... نگہت سیما بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ دبئی کی سیر بے حد اچھی لگی۔ اب مجھے انتظار ہے عظمیٰ آپی کے عمرے کے احوال کا...... اس میں ان کا اندازِ تحریر سنجیدہ ہوگا...... فروری کا پاکیزہ بہت اچھا لگا، اس میں ایک فقرہ تو حاصلِ مطالعہ تھا...... خوشی کا دوسرا نام محبت ہے۔'' (پسندیدگی کے لیے ممنون ہوں، نایاب جیلانی اور نگہت سیما شکریہ کہتی ہیں)

☜ شمیم فضل خالق، پشاور سے۔ ''عظمیٰ کا سفر نامہ پڑھا...... جو بہت پسند آیا۔ کیا طرزِ تحریر ہے، عظمیٰ ڈیر ایک پیارا سا ناول لکھو کہ تم میں لکھنے کے جراثیم موجود ہیں، یقیناً تمہارا ناول بھی لاجواب ہوگا۔ میں پشاور کے سانحے کا ذکر نہیں کروں گی ڈیئر...... کہ مجھے ڈپریشن ہونے لگتا ہے، فریدہ جاوید فری تمہیں میرا افسانہ پسند آیا، تمہاری محبتوں کا شکریہ، جلترنگ میں ہائے ری مجبوری پسند آیا...... اللہ تمہارے قلم کو اور بھی مضبوطی عطا فرمائے۔ فریدہ افتخار سے ناراض ہوں دوست ہے میری لیکن مجال ہے کہ کبھی میرے افسانے کے بارے میں کچھ لکھے...... تعریف نہ سہی تنقید تو کر سکتی ہیں ناں بھابی...... پاکیزہ ابھی بس اتنا ہی پڑھا ہے، جلترنگ، سفر نامہ اور بہنوں کی محفل...... اس لیے تبصرہ ادھار رہا۔'' (پیاری شمیم ادھار محبت کی قینچی ہے اس لیے آئندہ بھرپور تبصرہ ہونا چاہیے۔ فریدہ افتخار ان دنوں امریکا گئی ہوئی ہیں اس لیے آپ کی یہ شکایت امریکا پہنچائی جا رہی ہے)

☜ افسر سلطانہ، کراچی سے۔ ''معراج صاحب اور عذرا رسول کو ان کے بیٹے کی شادی کی مبارک باد پہنچا دیں۔ تصاویر کا شدت سے انتظار ہے۔ جنوری کے شمارے میں آپ کا ناولٹ بے حد پسند آیا۔ نگہت اعظمی اور شمیم فضل خالق کی تحریروں نے بھی متاثر کیا۔ فروری کا شمارہ قسطوں میں پڑھا گیا۔ شمع ہدایت مکمل شائع ہوا۔ بے حد معلوماتی بھی تھا۔ ایسی تحریریں یقیناً باعثِ نجات ہیں۔ اختر کی سادہ لیکن جامع تحریریں ہمیشہ ہی دل سے پسند آتی رہی ہیں۔ انشاء اللہ آئندہ بھی فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ اعتبارِ وفا جوں جوں بڑھتا جا رہا ہے دلچسپی بھی بڑھ رہی ہے۔ امید ہے نگہت اس بار بھی مایوس نہیں کریں گی۔ ناہید سلطانہ اختر کی ہر تحریر ڈائجسٹ کا مان بڑھا دیتی ہے۔ ان کے انٹرویو کی منتظر ہوں۔ ہم دبئی کے ہو گئے اس سفر نامے کی برجستگی پر عظمیٰ کو کتنی مبارک باد دوں ساتھ، ساتھ مزاح سے بھرپور...... معذرت کے ساتھ اس بار پیمبر آپ کے جلترنگ کے مقابل کمزور تھا۔ ناتا مختصر ہونے کے باوجود پسند آیا۔ باقی سلسلے بھی اچھے رہے۔ اداریہ کے فوراً بعد بہنوں کی محفل پڑھتی ہوں اور اگلی محفل کا انتظار رہتا ہے۔ عنیزہ سید اور شگفتہ شفیق کو مبارک باد پہنچا دیں۔ تمام مرحومین کی مغفرت کی دعاؤں کے ساتھ ان تمام بیماروں کے لیے دعا گو ہوں جو اسپتال اور گھروں میں صحت یابی کے منتظر ہیں۔ عقیلہ حق اور رضوانہ پرنس کو اللہ رب العزت صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ اور آخر میں آپ کی محبتوں کا شکریہ...... یہ آپ کی وہ محبت ہے جو آپ ہم سب سے کرتی ہیں۔ بہت ممنون اور مشکور ہوں آپ نے میرے بغیر کہے بہن کی صحتیابی کی دعا کے لیے خبر لگا دی۔ میری تمام قاری بہنوں سے اب بھی درخواست ہے کہ وہ میری چھوٹی بہن کے لیے مکمل صحت یابی کی دعا کریں۔ اس کے بچے چھوٹے ہیں اور چھوٹے بچوں کے لیے ماں کتنی اہم ہوتی ہے۔'' (اللہ آپ کی بہن قیصر سلطانہ کو کلی صحت اور زندگی دے۔ تبصرے کا شکریہ، ذیشان کی شادی کا احوال تصویروں کے ساتھ انشاء اللہ آپ جلد ہی پڑھ سکیں گی)

☜ اُم ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ سے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے میں ایک اہم اور خوب صورت بات بتائی آپ نے بعض لوگ اس قسم کے رویوں کے ساتھ دوسروں کے لیے امتحان بن جاتے ہیں۔ سب سے پہلے بہنوں کی محفل کی باری آئی ہے کہ کسی بھی دلچسپ کہانی سے کم مزہ نہیں ہے اس میں۔ سانحۂ پشاور کا ذکر اس دکھ کو ایک بار پھر تازہ کر گیا۔ اس دکھ کے اظہار کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ عذرا صاحبہ کو بیٹے کی شادی کی بے حد مبارک باد، تمام علیل بہنوں کے لیے صحت یابی کی دعا ہے، آمین۔ جلترنگ میں مجھے تمناؤں کے رنگ اور جھوٹی کہیں کی نے مزہ دیا۔ پاکیزہ ڈائری ہر بار تب زیادہ اچھی لگتی ہے جب میرا نام ہو اس بار تو عظمیٰ نے میری شاعری کو جگہ دی۔ بہت شکریہ عظمیٰ......! شائستہ زریں اس بار ایک اہم اور منفرد سروے رائٹرز کے لیے لے کر آئیں۔ رائٹرز سے ہونے والی ملاقات ہمیشہ اچھی لگتی ہے وہ کسی بھی صورت میں ہو...... اس ماہ کے پاکیزہ میں سب سے مزیدار عظمیٰ کا سفر نامہ تھا۔ عظمیٰ آپ کی کتاب کے شائع ہونے کا پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اسما قادری کا موضوع اس بار بہت اچھا لگا۔ ہمارے معاشرے میں جہاں جوائنٹ فیملی کا رواج عام ہے وہاں تو ہر گھڑی آزمائش کی ہے اب یہ عورت پر ہے کہ وہ کیسے اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہوئے رشتوں میں توازن بھی برتتی ہے۔ سیما سراج مختصر کہانی میں بھی کچھ مردوں کی فطرت کے کچھ رنگ نمایاں کر گئیں۔ رضوانہ پرنس کے ناولٹ میں مجھے لگا کہ ان کو عروہ کو اس سے بھی زیادہ سزا دینی چاہیے تھی۔ بہر حال اس نے ایک غلط قدم تو اٹھایا ہی تھا ناں...... خولہ بنتِ حوا نے بالکل ٹھیک عکاسی

کی، اکثر گھروں میں بہو اور بیٹی کے کاموں پر مختلف ردِعمل کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، جنگل کے پھول کی یہ قسط دلچسپ تھی، ناہید سلطانہ اختر ہمیشہ کی طرح جب بھی آئیں کچھ خوب ہی لے کر آئیں۔ ترکِ وفا کا ایک خوب صورت سا اختتام کر کے دل خوش کر دیا نایاب جیلانی نے۔ نگہت سیما کے ناول میں دلچسپی برقرار ہے۔'' (بھرپور تبصرے کا شکریہ)

ﷺ ہالہ احمد، کراچی سے۔ ''فروری کے پاکیزہ میں سب سے دلچسپ اور بہترین تحریر...... جو میرے خط لکھنے کا محرک بھی بنی ہے وہ عظمیٰ باجی کی ہم دبئی کے ہوگئے۔۔ ویلڈن اتنی سادگی، اتنی بے ساختگی...... مزہ آگیا۔ سیما سراج کی مختصر کہانی نے آخر دل دہلا کر رکھ دیا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ اسما قادری کا ناول بہت پسند آیا تھا۔ رضوانہ پرنس کا ناولٹ اپنے عنوان سمیت اچھا لگا۔ جلترنگ کی تو ہمیشہ ہی کیا بات ہوتی ہے۔ جھوٹی کہیں کی سب سے زیادہ مزیدار تھا۔ بہنوں کی محفل پچھلے دو ماہ سے کافی مختصر سی لگ رہی ہے۔ فرحانہ ناز ملک کی تصویروں کا تو میں بھی شدت سے انتظار کر رہی ہوں۔ کیونکہ میں نے ابھی تک ان کی کوئی تصویر نہیں دیکھی ہے۔ عذرا آنٹی کو میری طرف سے دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پہنچا دیجیے گا۔ شادی کی تصاویر اور احوال کا انتظار ہے۔ امینہ عندلیب کے لیے دلی دعائیں اور نیک خواہشات...... جو دلچسپ واقعات لکھ کر بھجوانے کے حوالے سے آپ نے قارئین کی رائے لی ہے تو میں اس کے لیے کہنا چاہوں گی کہ یہ سلسلہ صرف نئی مصنفات ہی کے لیے کیوں؟ نئے پرانے سبھی اس میں شرکت کریں تو زیادہ اچھا لگے گا۔ ہر ماہ تین یا چار واقعات شائع ہو سکتے ہیں اگر مختصراً لکھے ہوئے ہوں تو......'' (آپ کی مزاحیہ تحریر قابلِ اشاعت ہے اور تجویز بھی اچھی لگ رہی ہے۔ ایک صفحے کے لیے کوئی مزے دار سا واقعہ کوئی بھی بہن لکھ کر بھیجے مگر وہ پڑھنے والوں کو بھی دلچسپ ہی لگے۔ یہ خیال ضرور رہے)

ﷺ سلمیٰ غزل، کراچی سے۔ ''فروری کا پاکیزہ اس تبصرے کے شوق میں پورا پڑھ لیا مگر ڈر یہ لگ رہا ہے کہ بے حد کہنہ مشق اور قابل مصنفین ناراض ہی نہیں ہو جائیں کیونکہ ہم ٹھہرے کم عقل یا کوتاہ بین کہ نایاب جیلانی کا ترکِ وفا جو یقیناً عمیق گہرائی، بے پناہ مطالعہ اور لاجواب تحریر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سر سے گزر گیا...... یوں کہ مزہ نہیں آیا۔ مجھے ہلکی پھلکی تحریر جیسے رفعت شبانہ کا ناتا، سیما سراج کی مختصر کہانی اور ناہید سلطانہ اختر کا بلاعنوان، لاجواب اور بامقصد لگے۔ رضوانہ پرنس بہت اچھی لکھاری ہیں اور انہوں نے بابل کی دہلیز کا اینڈ خلافِ توقع بہت اچھا کیا ہے لیکن جب پہلی اینٹ غلط ہو تو پوری عمارت ٹیڑھی ہی بنے گی۔ بھاگنے والی لڑکیاں ماں، باپ کی کھوئی ہوئی عزت واپس نہیں دلا سکتیں۔ چاہے سونے کی بن جائیں اور نہ اس زمانے میں شوہر اور تایا اتنے اچھے ہوتے ہیں۔ اسما قادری کی تحریر پرانی بوتل میں نئی شراب جیسی ہے موضوع پرانا لیکن انہوں نے سورۂ نور کے حوالے سے تحریر میں چار نہیں بلکہ آٹھ چاند لگا دیے۔ اور ایک ٹپ میں وہی ٹپ بہنوں کی نذر کرتی ہوں جو خود زیرِ استعمال ہو۔ روزانہ مکمل سورۂ بقرہ ایک ساتھ یا تھوڑی تھوڑی پورے دن میں پڑھ لیں پھر اللہ کی رحمت اور گھر میں برکت دیکھیں۔'' (تبصرے کا شکریہ اور جزاک اللہ)

ﷺ ظلِ شاہین، رحیم یار خان سے۔ ''اداریہ بارہ ربیع الاول کے متبرک و مقدس دن کے حوالے سے نہایت ہی بہترین ہے ایک، ایک لفظ موتی کے مانند لگا۔ سبحان اللہ...... پھر دین کی باتوں سے فیض یاب ہوئے۔ آپ کی تحریر کچی ڈوری رشتے کی...... ہلکے پھلکے انداز میں ایک اصلاحی تحریر آپ نے پیش کی۔ ایک بے پروا اور کچھ سائیکی سے شوہر کی کہانی...... جس میں تین خود غرض کردار...... مسٹر جاوید، مسز جاوید اور عارفہ شامل تھے۔ ویسے زویا نے بھی شوہر کو کچھ نظر انداز کیا۔ بعض اوقات رشتوں کو تقویت دینے کے لیے مثبت جذبوں کا اظہار ضروری ہوتا ہے۔ بہر حال اختتام آپ نے بہت اچھا کیا۔ پھر اپنا فیورٹ ناول اعتبارِ وفا پڑھا۔ یہ قسط بھرپور تجسس لیے ہوئے تھی۔ کہانی کچھ آگے بڑھی، ایک خاتون کردار کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ عتیقہ محمد بیگ کا افسانہ گھونسلا پڑھا۔ تحریر میں اصلاحی رنگ تھا۔ کہتے ہیں ناں کہ بعض اوقات ہزاروں دلائل کسی بحث میں کام نہیں آتے بس کسی ایک نکتے پر بات سمجھ آجاتی ہے۔ نگہت عظمیٰ کا آخری روزن حامد کے گھر کا کلچر پڑھ کر تو واقعی دل گھبرا سا گیا۔ عورت شوہر کی خاطر سب کچھ برداشت کرتی ہے۔ مگر صالحہ کو اپنی قربانیوں کا کوئی صلہ نہیں ملا۔ عظمیٰ کا سفرنامہ دبئی افسانوں سے زیادہ اچھا لگا۔ باجی جان عظمیٰ کی تحریریں بھی آپ کی طرح فطری انداز، سادگی اور بے ساختگی لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ تصنع و بناوٹ سے پاک اور بچوں کی گفتگو کو تو ایسے لکھتی ہیں گویا بچے ہمارے سامنے ہی بیٹھے ہیں اور ہم ان کی باتوں سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ مسلسل مسکراہٹ رہتی ہے لبوں پر جب تک عظمیٰ کی تحریر کا اینڈ نہیں ہو جاتا۔ اور جھیل میں روشنیوں کے رقص کو تو ہم نے پڑھ کر بھی انجوائے کیا۔ ماشاءاللہ زورِ قلم اور زیادہ...... (اس سفرنامے کو شائع کرنے کا ہمارا اولین مقصد یہ تھا کہ ایک مسلمان ملک کی ترقی، کامیابی اور امن و امان کی شاندار صورتِ حال سے ہم بھی کچھ سیکھیں) مستقل سلسلے میں پاکیزہ ڈائری اس بار نعتوں سے سجی ہے۔ بہت اچھا لگا روحانی مشورے بہترین رہے۔'' (تبصرے کا شکریہ آپ کی آراء پہنچائی جارہی ہے)

ﷺ ایڈووکیٹ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا سے۔ ''سانحۂ پشاور کا ذکر کروں یا سرگودھا کے اسپتال میں ڈاکٹروں کی نااہلی،

سہولیات کے فقدان کی وجہ سے ہونے والی اموات یا تھر میں بھوک، غذائی قلت سے مرنے والے بچوں کا......ہم لوگ اپنا فیوچر اپنے ہاتھوں سے ختم کررہے ہیں، کس کس کا نوحہ لکھیں ۔کس، کس کو روئیں۔ یاالہٰی ان ظالموں کی پکڑ کب ہوگی۔ ان کے پیٹوں کا دوزخ کب بھرے گا۔ آج میری پاکیزہ پڑھنے والی تمام ماؤں سے درخواست ہے پلیز اپنے بچوں پر کڑی نظر رکھیں ان کی ہر سرگرمی کو چیک کریں، یہ مادر پدر آزادیاں ہماری نسلوں کو تباہ کررہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ برے کو نہیں برے کی ماں کو مارو......سارا قصور ایسی ہی ماؤں کا ہے۔ اچھی تربیت کبھی کسی کو دہشت گرد نہیں بنائی۔ خدارا اپنے بچوں کو دولت مند بنانے اور دولت اکٹھا کرنے کے طریقے بتانے کے بجائے اچھا مسلمان اور اچھا پاکستانی بنانے پر زور دیں۔ ٹائٹل گرل کی کیپ تو آؤٹ آف فیشن ہے ہاں مفلر اچھا لگ رہا ہے، محترمہ منہ کھولے حیرت سے ہمیں دیکھ رہی ہیں کہ یہاں ٹائٹل پر تو سعدیہ کو ہونا چاہیے تھا۔ اداریے میں سادہ سی بات بڑے خوب صورت انداز میں کہی گئی۔ اگر ہم تعریف کریں تو اس وقت سو میں سے سو نمبر عظمٰی کے حصے میں آرہے ہیں۔ مگر ایک بات عظمٰی نے کسرِ نفسی کی حد کردی یار تم ایک ذہین ماں کی بہت قابلہ بیٹی ہو، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ اور پلیز اب لکھتی رہو، بریک نہ دینا اور ایک راز کی بات بھی بتا ڈالو، یہ نہاری، حلیم، پائے کھانے والے تمہاری طرح اسمارٹ کیسے رہ سکتے ہیں۔ ہم تو ان کے قریب سے بھی گزر جائیں تو دو، تین کلو کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ سروے میں موبائل اور نیٹ محبت میں رائٹرز کو دیکھ کر اچھا لگا، صائمہ کے مفصل جواب سب پر بازی لے گئے مگر صائمہ یہ ہمارے دور والی بات کیا ہوئی۔ اقبال بانو محبت کی رائٹر ہوکر محبتاں دے خلاف ووٹ پا گئیں۔ اے خیر نئیں، شیریں صاحبہ اس مصروف دور میں ایک دن محبت کے نام نہ ہوتا تو کسی کو محبت یاد نہ رہتی۔ یہ تو دستک ہے ان ذہنوں پر جنہیں عادت ہے بھول جانے کی۔ سیما سراج کی شارٹ اسٹوری رشتوں کے گھناؤنے روپ کو اجاگر کررہی تھی۔ مکمل ناول محبتوں کے رنگ، ایک امپریسو تحریر ہے جو سب کے دل میں اتر گئی۔ رضوانہ پرنس بھی بڑی طمطراق سے چھائی رہیں۔ ناولٹ ہر لحاظ سے بھرپور تھا۔" (بھرپور تبصرے کا شکریہ......ہاں تمہاری پیاری تصویر اگر واقعی ٹائٹل پر آجائے تو دھوم مچ جائے گی۔ مگر ہمیں فکر ہے کہ ہماری سعدیہ کو نظر نہ لگ جائے کہ ماشاءاللہ تین بچوں کی ماں اتنی خوب صورت اور تنی فریش ہے۔ ماشاءاللہ)

✍ شائستہ زریں کی رائے کراچی سے۔ "اداریہ ہمیشہ کی طرح پُرمغز بالخصوص آخری فقرہ حاصلِ مطالعہ رہا......سلسلے وار تمام ناولز خوب جارہے ہیں۔ ترک وفا کا انجام غیر متوقع لیکن نہایت عمدہ رہا۔ رفعت شبانہ نے خوب صورتی سے لکھا......ناہید سلطانہ اختر اس ماہ چھا گئیں۔ اس ماہ کی ٹاپ کی تحریر بھی رہی......اختر شجاعت کی ایمان افروز تحریر بہت اثر انگیز رہی۔ عظمٰی آفاق کی تحریر کیا خوب ہے، کہنے کو... سفرنامہ ہے مگر طنز و مزاح کے پھول کھل رہے ہیں۔ جلترنگ کا ساز اپنا اثر دکھاتا ہوا نظر آیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ عظمٰی کا یہ سفرنامہ خبرنامہ بھی ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ اسما قادری کا مکمل ناول بہت پسند آیا۔ بے حد مبارک باد......" (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

✍ مسز حمید خان، بدین سے۔ "پاکیزہ بہت اچھا ماہنامہ ہے، اس کی سطر سطر سے میں بہت کچھ سیکھتی ہوں، مجھے کسی ایسے ادارے کے بارے میں معلومات چاہئیں جو قسطوں پر قرضہ فراہم کرسکے۔ میں ایک چھوٹی سی جگہ پر رہتی ہوں۔ اس بارے میں زیادہ جانتی نہیں ہوں۔ مجھے صدقات اور زکوٰۃ بھی نہیں چاہئیں۔ مجھے تھوڑا سا قرضہ چاہیے جسے میں قسطوں پر اتار سکوں۔" (پیاری بہن اگر کسی نے ایسی معلومات ہمیں بھیجی تو اسے میں بہنوں کی محفل میں ہی شامل کرلوں گی)

✉ بہن این اے، پشاور۔ بیٹا شادی کے لیے از خود کوششیں مت کرو، شادی ہر ایک کی ہوجاتی ہے، آج کل لڑکے باتیں بھی بنا لیتے ہیں، عشق و عاشقی بھی بگھار رہے ہیں مگر شادی کے نام پر مجبوریوں اور ذمّے داریوں کی فہرست سنا دیتے ہیں، اگر تمہاری چھوٹی بہنوں کا رشتہ طے ہوگیا ہے تو فکر کی کوئی بات نہیں......اب لائن سے کسی کی شادی نہیں ہوا کرتی......شادی کے لیے آزمودہ دعائیں تم بھی پڑھو۔ کسی بھی دن تم مجھ سے فون پر بات کرلو۔ 021-36981952

✍ سمیرا حمید فاروق، کراچی سے۔ "تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضر ہورہی ہوں مگر اس کی اصل وجہ عظمٰی آفاق کا خوب صورت سفرنامہ، اس قدر برجستگی اتنی دلچسپی کے ساتھ اور پھر کہیں بھی کسی بھی وجہ سے کوئی شو نہیں ماری گئی۔ مجھے عظمٰی سے کہنا ہے کہ اس سفرنامے کے بعد وہ اگر ائرپورٹ جائیں، ریلوے اسٹیشن، کسی شادی میں یا ٹریفک جام میں پھنسیں وہ دلچسپ انداز میں ضرور پاکیزہ میں لکھیں کیونکہ وہ منظر نامہ لکھنے میں ماہر نظر آرہی ہیں۔ ناولوں میں نگہت سیما کا ناول اوّل جارہا ہے۔ بہت خوب صورت انداز میں لکھ رہی ہیں۔ نایاب جیلانی نے بہت اچھا لکھا مگر بے حد طوالت نے بہت بور کیا......رفعت شبانہ کا افسانہ پسند آیا۔ ناہید سلطانہ کی تحریر تو ہمیشہ اچھی لگتی ہے اور بہنوں کی محفل تو کسی بھی رسالے میں ایسی نہیں ہوسکتی۔" (نوازش)

✍ رخسار انصاری، کراچی سے۔ "سب سے پہلے بہت، بہت شکریہ آپ کو میرا خط شائع کرنے کا......میں بتا نہیں سکتی کہ

میں کتنی خوش ہوں مگر آنٹی میرا نام غلط لکھا گیا ہے رخسانہ نہیں رخسار انصاری ہے، پلیز آنٹی میرا نام ٹھیک کر دیجیے گا۔ اب تحریروں پر آتی ہوں آپ کا ناولٹ پڑھا جنوری کا بہت خوب...... آنٹی پلیز لکھتی رہا کریں ناں...... آپ سمیرا یونس ہارون کا ناول ہمیں درکار ہے تو مجھے اتنا پسند آیا کہ بتا نہیں سکتی اور باقی سب ہی اچھے تھے۔ عظمیٰ آفاق تو گھر بیٹھے دبئی کی سیر کروا رہی ہیں۔ بہت مزہ آ رہا ہے۔ ابھی میں نے اپنا کراچی ہی نہیں گھوما...... عظمیٰ نے تو دبئی گھما دیا تھینک یو......" (اس دفعہ آپ کا نام صحیح شائع کیا جا رہا ہے۔ تبصرہ تمام تحریروں کے بارے میں لکھا کریں تو ہمیں زیادہ مزہ آئے گا)

✉ عظمیٰ زہری، اوستہ محمد، بلوچستان سے۔ "اس بار تو عظمیٰ آفاق باجی نے میدان مار ہی لیا جہاں دیکھو عظمیٰ باجی کے دبئی کے قصے چھڑے ہوئے تھے، سب کے چہرے پر ایسی خوشی تھی جیسے ہم خود دبئی گئے ہوں۔ اب یہی دیکھ لیں گھر بیٹھے، بیٹھے ہم دبئی گھوم آئے بہت کچھ جان لیا دبئی جانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اسی لیے تو ہم پاکیزہ کے فین ہیں، پاکیزہ کا نعرہ ہر دم لگاتے ہیں، (پاکیزہ زندہ باد!) اور پھر مجھے کچھ کہنا ہے نے زبردست بات سے آگاہ کیا کہ ہمیں سوچ سمجھ کر بولنا چاہیے .... نان اسٹاپ ہو کر تو کبھی نہیں بولنا چاہیے۔ ایک نظر اعتبار وفا کو دیکھ لیتے ہیں نگہت سیما باجی آپ نے ایمل کے ڈیڈی کو مار ڈالا اب ایمل کو ان رازوں کے بارے میں کیسے پتا لگے گا۔ جو اُن کے ڈیڈی کی زبان پر آتے، آتے رہ گئے۔ پچھلی بار تو میں نے پوچھا تھا کیا واقعی ارتفاع، ایمل کی بیٹی نہیں لیکن آپ نے سچی میں اسے کسی اور کی بیٹی بنا ڈالا۔ یہ قسط پردہ اٹھانے میں بھرپور رہی۔ رفعت شبانہ آپی آپ نے کمال کر دیا۔ نایاب آپی مجھے تو الفاظ ہی نہیں مل رہے میں کیا لکھوں جس شان سے ترکِ وفا شروع ہوا اسی شان سے ختم بھی...... ہاں مون کے لیے برا لگا اس بیچاری کو کچھ بھی نہیں ملا۔ بلاعنوان کے کیا کہنے ناہید آنٹی لکھیں اور مزہ نہ آئے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ویسے بھی انسان خود پر تجربہ نہ کرلے کسی اور پر یقین کم ہی آتا ہے۔ زاہدہ پروین بھی ہٹ جا رہی ہیں ڈاکٹر خاور کی اماں کو شرمین کی بے عزتی کرنے کا صلہ مل ہی گیا۔ اسما باجی آپ نے بہت، بہت اچھا لکھا ہے محبتوں کے رنگ کو کیا خوب ہی رنگ دیا ہے۔"
(آپ کے پُرمحبت تبصرے میں بھی ہمیں آپ کے پیار کی قوسِ قزح نظر آ رہی ہے)

✉ نگینہ ضیا بخش، کراچی سے۔ "باجی میری بیٹی صباحت ضیاالدین جو کہ کلاس ہفتم کی طالبہ ہے ان کے اسکول بہبود گرلز سیکنڈری اسکول کی طرف سے آئی بی اے کراچی میں تقریری مقابلہ منعقد ہوا جس میں میری بیٹی صباحت ضیاالدین نے تیسری پوزیشن حاصل کی اور کیش پرائز بھی جیتا۔ (مبارک باد) بہبود ایجوکیشن کی چیئر پرسن میڈم تنویر، میڈم خدیجہ آپا، میڈم مسرت، میڈم شاہینہ، مس زونیرا مبارک۔ مس ارم، مس نسرین، مس کرن، مس کومل وقار، مس سدرا، مس عائشہ، مس بلقیس، مس سلمیٰ، مس عروج، مس عاصمہ اور میری بہت پیاری ٹیچر جس کی ابھی شادی بھی ہوئی ہے۔ یہ سب اساتذہ پاکیزہ کی مستقل قاری ہیں اور تمام ٹیچرز بہت محنت سے پڑھاتی ہیں۔ اور میری دعا ہے کہ اللہ ان سب کو خوش رکھے، آمین۔ صباحت کی دوست نمرا محمود نے دوسری پوزیشن حاصل کی ہے۔ (ہماری طرف سے ان کو بہت، بہت مبارک باد قبول ہو) نگہت سیما اور رفاقت جاوید کے ناول زبردست ہیں۔ مکمل ناول اسما قادری کا بہت پُراثر رہا۔ باقی ناہید سلطانہ اختر، غزالہ جلیل راؤ، خولہ بنت حوا، عالیہ حرا، سیما سراج کی تحریریں خصوصی طور پر پسند آئیں۔ اختر شجاعت کے پُرعقیدت مضمون سے فیض یاب ہوئے ویل ڈن...... عظمیٰ آفاق سعید، ہم دبئی کے ہوگئے کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ زبردست...... شائستہ کا سروے، بہت اچھا لگا۔ مجھے اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں پلیز...... اور جن بہنوں کی خوشی ملی دکھ ملے جو بیمار ہیں ان سب کے ساتھ میں برابر کی شریک ہوں۔" (آپ کا اور بہبود ایجوکیشن سے منسلک تمام ٹیچرز کا بھی بے حد شکریہ...... جو وہ پاکیزہ کو اتنا پسند کرتے ہیں)

✉ نسیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد سے۔ "ہر ماہ تبصرہ لکھتی اور پوسٹ کروانے تک ٹائم گزر جاتا...... خیر دین کی باتوں سے مستفید ہو کر تمام مرحومین کے لیے دعا کی اور بیمار بہنوں خاص طور پر امینہ عندلیب کے لیے۔ عظمیٰ کا سفرنامہ کیا تھا بلکہ بغیر ٹکٹ سارا دبئی گھوم آئے بغیر ٹانگ کے پھدکتی مرغیاں چکن تکہ کے نام پر پڑا بہر حال مزے کا تھا یہ سفرنامہ دبئی سے پاکستان واپسی پر دیکھا کہ آپی صاحبہ بھی رشتے کی کچی ڈور پکڑے بیٹھی ہیں پھر جو اس ڈور کا سرا پکڑا تو آخری سرے تک ہو کر ہی پلکیں جھپکیں۔ ہمیں درکار ہے تو کیسا مزے کا سیکرٹ بنا ہوا تھا ان چاروں میں موبائل کے ذریعے، منفرد انداز اور خضر صاحب کی شرارتیں، جاسوسیاں اپنی عزیز دل و جان منگیتر کا خیال رکھنا نانی امی کی محبت۔ ماہین کی امی کا کرارا تھپڑ یہ سب رشتوں کو محبت سے جوڑنے کے انداز بے غرض محبت بھرا...... خلوص سب بہت اچھا لگا، آخری روزن نگہت اعظمی کی پڑھی بہت اچھی بات لکھی کہ اگر انسان اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے غراتا ہے جبکہ یہ جانوروں کی فطرت ہے تو انسان کہلانے کا حقدار نہیں۔ وہ میرے گمان میں رہا، نزہت جبیں ضیا کی۔ میں بڑوں کی وہی بات سچ ثابت ہوئی کہ جوڑے آسمانوں میں بنتے ہیں۔ شمیم فضل صاحبہ کی طرف دار دل پڑھی بے شک خدا رحیم بھی ہے اور کریم بھی مگر

انسان بڑا بے صبرا ثابت ہوا ہے۔ گھونسلا میں تو نورین نے ایک چڑیا سے سبق سیکھا مگر غور کریں تو محبت، اتحاد، قناعت پسندی، نظم و ضبط بہت سے سبق ہیں جو ہم جانوروں سے ہی سیکھ سکتے ہیں۔ ترک وفا کی مون ہمارے دماغ کو بھی ٹیلی پیتھی سے چمکا کر ہی رہے گی شاید...... شریک سفر کے نام سیما سراج کا خط مزے کا تھا۔ خوفناک خراٹوں میں بھی کیسے لطیف جذبات چھپے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر زاہدہ پروین کے ساتھ ہم بھی صحرا میں دھنسے رہے سارا دن مگر پانی صاف کرنے والا سفوف ایک دن ان تک پہنچانے سے کیا ان کا تمام زندگی کا پانی صاف ہوگیا؟ اور دیگر ادویات جو ہم پہنچا سکیں کیا اب کبھی ختم نہ ہوں گی تو پھر صرف ایک روزہ کیمپ چہ معنی دارد؟" (کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہوتا ہے۔ ابھی ایک ڈاکٹر زاہدہ گئی ہیں، انشاء اللہ آئندہ دوسری ڈاکٹرز جائیں گی)

✍ خولہ عرفان، کراچی سے۔ "پہلی دفعہ آپ کی محفل کا حصہ بننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ماشاء اللہ پاکیزہ اپنی روایت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ سب افسانے بہت جاندار ہیں، اندازِ بیان اور ماحول کی صحیح عکاسی افسانہ نگار کی اپنے موضوع پر گہرے تجزیے کے ساتھ مضبوط گرفت کا ثبوت دیتی نظر آتی ہے۔ زندگی میں بکھری بہت ساری حقیقتوں پر سے بہت خوبی سے پردہ اٹھتا ہے اور معاشرے میں بکھری سچائی خوب صورت لفظوں کے پیرائے میں قاری کے ذہن کو متاثر کرتی ہے جہاں تک ناولٹ اور ناول کا تعلق ہے تو وہ ایسے ناموں کا حوالہ رکھتے ہیں جو اپنی پہچان آپ ہیں، ان محترم مصنفین پر ناچیز کا تبصرہ چھوٹا منہ بڑی بات لگے گا لیکن سب واقعی بہت، بہت...... شاندار ہیں۔" (اس محفل میں خوش آمدید، پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ...... آپ کی شرکت سے مجھے دلی خوشی ہوگی)

✍ امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔ "باجی انجم انصار کا ناولٹ کچی ڈوری رشتے کی بہت اچھا لگا۔ ہمارے اردگرد کی یہ کہانی ہے۔ نئے سال کے لیے خواب شائستہ زریں کی کاوش بہت اچھی رہی میری دعا ہے کہ ان نوجوان بہن، بھائیوں کے خواب پورے ہوں آمین۔ بہن شگفتہ شفیق نے مجھے بہت محبت سے یاد کیا۔ آج کل غائب ہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی۔ آنٹی ذکیہ بلگرامی، سیما مناف، فریدہ جاوید، ڈاکٹر میمونہ، ہالہ ملک، ذکیہ ایوب، شیریں ظفر اور عذرا مونا، اللہ تعالیٰ سب کو شفائے کاملہ عطا فرمائے آمین اور میری تمام پیاری بہنوں کو اللہ پاک سلامت رکھے خوش رہیں، صحت زندگی کے ساتھ، باجی ڈاکٹر ممتاز ضیا کا تبصرہ اے ون رہا۔ دل کھول کے تعریف، تنقید کرتی ہیں۔ رضوانہ نرگس، نکہت سیما، عنبرین ندیم (مائیں) ادیبہ صغیرہ بانو اللہ تعالیٰ سب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ سنبل بہن آپ بہت اچھی ہیں، اچھے جذبات رکھتی ہیں سب کے لیے ماضی کو بھول جاؤ، اچھے دن بھی تو آتے ہیں، یونیفارم کی شرٹ وائٹ تھی اسکائی بلیو کا آڈر ملا، میری ماں کے پاس دوگز فلیٹ کپڑے کے پیسے نہیں تھے۔ پندرہ پیسے کا رنگ منگوا کر شرٹ ڈائی کی اسکول میں ٹیچرز نے طعنے دیے۔ اگر نہیں ماں کے پاس پیسے مت پڑھو۔ یہ انسلٹ اسمبلی میں ہوئی تھی میں آج تک نہیں بھولی۔ امی نے حوصلہ دیا چپ کروایا۔ ماں کی ان تھک محنت، صبر، شفقت آج ہم اس مقام پر ہیں۔ انہی ٹیچرز سے آج ملتی ہوں دعائیں دیتی ہیں۔" (زندگی میں نرم اور گرم حالات ہوتے ہی ہیں مگر ہمیشہ اچھی باتوں کو یاد رکھنا چاہیے اور بری باتوں کو بھول جانا چاہیے کہ اس میں ہماری ہی بھلائی ہوتی ہے)

✍ فرزانہ، راول پنڈی سے۔ "دسمبر کا پاکیزہ پڑھا جو کہ فرحانہ ناز ملک نمبر تھا بہت دکھ ہے، بہت افسوس ہے کہ ایک گھر کے چار لوگ ایک ساتھ اللہ کو پیارے ہوئے میں ان کے گھر والوں سے آپ سے تمام لکھنے پڑھنے والوں سے تعزیت کرتی ہوں۔ فرحانہ ناز ملک کا ناولٹ یقین پڑھا بہت خوب صورت اس نے لکھا اس نے اینڈ میں سونی کو مار ہی دیا اور سب کی سونی بھی مرگئی، فرحانہ کا انٹرویو بھی بہت مزے کا تھا انجم جی آپ فرحانہ کی کوئی تصویر بھی لگائیں، میں بھی دیکھ لیتی ہو سکے تو ضرور لگائیں۔ ہر شمار خاص ہوتا ہے میرے لیے۔ میں پرانے پاکیزہ بھی ڈھونڈ کر لاتی ہوں سب سے پہلے روحانی مشورے پڑھتی ہوں جو کہ پاکیزہ کی جان شان آن ہیں۔" (پیاری فرزانہ آپ کا خط بے حد تاخیر سے ملا ہے مگر شامل ہے انشاء اللہ فرحانہ ناز کی تصویر ہم ضرور شائع کریں گے)

✍ فرخندہ لطیف، رحیم یار خان سے۔ "اپیا جانی مجھے آپ کی محبت نے مجبور کیا کہ آپ سے حالِ دل کہہ سنایا جائے کیونکہ میں نے دیکھا کہ بہت سی بہنوں کے مسائل آپ نے ماں بن کر حل کیے۔ اسی لیے اپنی سب سے بڑی خواہش کو پورا کرنے کا خیال آیا تو اس کو پورا کرنے کے لیے مجھے آپ کی مدد لینے کا خیال سب سے پہلے آیا۔ جس طرح آپ قارئین بہنوں سے محبت کا اظہار کرتی ہیں اس چیز نے میری جھجک کو دور کر دیا۔ اپیا مجھے لکھنا ہے۔ افسانے، ناول، ناولٹ کچھ بھی بس اپنے اندر کو الفاظ کی صورت سطحِ قرطاس پر موتیوں کی صورت بکھیرنا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے آپ کی مکمل مدد اور رہنمائی درکار ہے۔ مجھے کہا تو بہت لوگوں نے آپ کا اندازِ بیان پُرلطف اور بے ساختہ ہے لیکن رہنمائی کسی نے نہیں کی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ نے اس چیز کا ٹھیکا نہیں لیا لیکن اپیا جانی برائے مہربانی مجھے اپنی شاگردی میں لے لیں۔" (گڑیا اس محفل میں خوش آمدید...... میں استادی کی منزل پر تو نہیں پہنچی ہوں مگر آپ کی حوصلہ افزائی کے لیے تیار ہوں، آپ اپنی

شاعری اور مختصر افسانہ ہمیں ارسال کریں...... انشاء اللہ آپ بھی موتی جیسے لفظوں سے اچھی باتوں کا پیغام پہنچائیں گی)

✍ **شہزادی کائنات یونس، کراچی سے۔** ”پاکیزہ ہم سب کزنز کا بے حد پسندیدہ ماہنامہ ہے اسی کی وجہ سے میرے اندر لکھنے کی ہمت ہوئی میری نظمیں اکتوبر 14ء کو چھپیں بے حد ڈھیروں شکریہ۔ جزاک اللہ۔ ہم سب کزنز کلثوم، ہدیہ، غزال پارا سب آپ کی فین ہیں سب سے زیادہ سلسلے وار امانت پڑھ کر ڈسکس کرتے تھے اور جلترنگ چھوٹی بہن اور کزنز کو سنا کر ہنس، ہنس کر بے حال ہوجاتے ہیں۔ ناول اعتبار وفا بھی کچھ کم نہیں آپ کا ایک بار پھر بے حد شکریہ کہ آپ نے میری نظمیں چھاپ دیں۔ افسانوں پر بھی نظرِ کرم فرمائیں۔“ (آپ کی نظمیں تو واقعی بہت اچھی ہوتی ہیں، اگر افسانے بھی ہمارے معیار کے مطابق ہوئے تو ضرور شائع کیے جائیں گے)

✍ **ذکیہ ایوب، کراچی سے۔** ”ٹائٹل اچھا لگا، اداریے میں تم نے بہت اچھی بات بتائی ہے، کم بولنا اور دوسرے کی بات کو سننا آج کل بہت ضروری ہے۔ ترک وفا کی آخری قسط پڑھ لی۔ مالا اور عیسیٰ کو تو ملوا دیا، آفاق بھی سرخرو ہوگیا۔ اس ناول میں تجسس خوب رہا۔ جب ہی تو اگلی قسط کا انتظار رہتا تھا۔ نگہت سیما کا اعتبار وفا بھی ٹھیک جارہا ہے۔ رنگ خلش میں استاد کا کردار حیرت انگیز ہے، ایسے استاد کہاں پائے جاتے ہیں؟ رضوانہ پرنس کی تحریر پڑھی...... شایان کا کردار بہت مضبوط تھا۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ عالیہ حرا کی تحریر نصیحت آموز رہی۔ جو چیز ہمارے مقدر میں نہیں ہے وہ ہمیں کبھی نہیں مل سکتی۔ اسما قادری کی تحریر اچھی تھی۔ ثنا چند لمحوں کے لیے بھٹک ضرور گئی تھی مگر اریبہ نے بہت خوب صورت انداز میں قرآن پاک سے رہنمائی کر کے ثنا کو احساس دلایا اور اپنا گھر بھی بچالیا۔ عظمیٰ تمہارے سفرنامے بہت دلچسپ ہوتے ہیں، تمہاری آنے والی کتاب کا عنوان ذرا سا گھوم لوں میں بہت منفرد لگا۔ انشاء اللہ ضرور منگواؤں گی۔ گزشتہ ماہ میرا تبصرہ شائع نہیں ہوا...... ویسے مجھے سلمیٰ غزل کا خط پڑھ کر مسکرانا پڑا...... انہیں اعتراض بھی کس بات پر ہوا ہے؟ وہ بھی ہر ماہ جلدی تبصرہ بھیجیں...... اور ہر ماہ شامل ہوں، جب ہماری میزبان اتنی اچھی ہے تو ہم تو ہر ماہ آئیں گے، جلترنگ واہ، واہ، سی ویو کی سیر اور پچاس کے ہندسے کی تکرار دلچسپ رہی۔ اختر شجاعت کی مکمل جامع تحریر تھی۔ بہت ہی خوب صورت انداز میں ایک ساتھ پڑھنے میں بہت کچھ ملا، اختر اللہ تم کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے، آمین۔“ (تبصرے کا شکریہ)

✍ **حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین سے۔** ”پاکیزہ ملا سب سے پہلے اداریہ پڑھا اور یہ جملہ دل میں گھر کرگیا کہ محبت کا دوسرا نام خوشی ہی تو ہے۔ جی ہاں جس طرح آپ ہم قاری بہنوں میں محبتیں بانٹتی ہیں دل خوشی سے جھوم اٹھتا ہے، نایاب جیلانی کا ترک وفا آخر اپنے اختتام کو پہنچا بلاشبہ ان کا یہ ایک عمدہ ناول تھا۔ ہنستی مسکراتی رضوانہ پرنس کا ناولٹ پسند آیا۔ رفعت شبانہ کی تحریر بھی عمدہ تھی۔ سیما سراج کی مختصر کہانی ماؤں کے لیے سبق آموز اور متاثر کن تھی۔ شائستہ زریں کا سروے پڑھا صائمہ اکرم اور رفاقت جاوید کی تصویریں و تحریریں دونوں ہی پسند آئیں۔“ (تبصرے کا شکریہ، آپ کا ایک افسانہ ہی قابلِ اشاعت ہے، رہی بات آپ کی نظم کی تو آج تک کسی ناول، افسانے پر کسی رائٹر کے بارے میں کوئی نظم نہیں شائع ہوئی تو عظمیٰ کے سفرنامے پر میں کیوں شائع کرتی)

✍ **طیبہ عنصر مغل، راول پنڈی سے۔** ”آپ کی پُرشفقت آواز کا تذکرہ باقی بہنوں سے سنا تھا مگر آپ سے فون پر بات کر کے یوں لگا کہ میں تو ہمیشہ سے آپ کی دوست رہی ہوں۔ اتنا ڈھیر سارا پیار کہاں سے لاتی ہیں، جو بٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے۔ میں انشاء اللہ بہت جلد ڈائجسٹ پڑھ کر تبصرہ بھیجنے کی کوشش کروں گی، مجھے بھی پڑھنے کی جلدی ہے۔“ (اللہ آپ کو کلی صحت عطا فرمائے، جب آپ بہنیں مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں تو گڑیا محبت کا جواب ہمیشہ محبت ہی تو ہوا کرتا ہے)

✍ **سدرہ کلثوم مروت، ضلع لکی مروت سے۔** ”میں نے آپ کے کہنے پر اپنی شاعری الگ لفافے میں بجھوائی خدا معلوم کہ آپ کی خدمت میں پہنچی یا نہیں۔ (آپ کی نظم مل گئی ہے) پاکیزہ کے لیے کیا کہوں اس کی تعریف کے لیے اگر لکھنے کی جسارت کروں بھی تو کم ہے، خدا سے دعا ہے اسی طرح پھلتا پھولتا رہے چار سو اپنی روشنی بکھیرتا رہے۔“ (آپ کو اپنی سالگرہ بہت، بہت مبارک ہو، اللہ کرے آپ کا نیا سال سلامتی اور محبت سے مزین ہو، آمین)

✍ **فرزانہ نگہت، راول پنڈی سے۔** ”جنوری کا پاکیزہ اپنی مخصوص آن بان شان کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا اور بے حد اشتیاق و دارفتگی کے ساتھ اول تا آخر پڑھا۔ نگہت سیما صاحبہ حسبِ معمول ٹاپ پر جارہی ہیں لیکن مون صاحبہ والے ناول میں جواَب ٹیلی پیتھی اور مستقبل بینی کے اسباق پڑھائے جارہے ہیں ان کا کچھ مزہ نہیں آرہا۔ ہم سائنس سے کبھی واسطہ نہ رکھنے والیوں کے تو یہ باتیں سر سے گزر جاتی ہیں۔ مصنفہ کو چاہیے، اصل کہانی پر توجہ دیں، ادب کو ادب سے واسطہ ہونا چاہیے۔ (اب تو آپ نے آخری قسط پڑھ لی ہوگی) اور اپنی پسندیدہ شمیم فضل خالق بڑے عرصے بعد دکھائی دیں۔ ان کا افسانہ بڑے ذوق شوق سے پڑھا اور گھبرائیں نہیں آپ کا بھی۔ ویسے آپ کا جلترنگ ہی پاکیزہ کی جان ہے۔ اللہ کرے آپ ہزاروں سال جئیں اور اس طرح جلترنگ لکھتی رہیں۔ اللہ

تعالیٰ آپ کو جنت میں بھی ہمیں جلترنگ سنانے کی توفیق دے، آمین۔'' (تبصرے کا شکریہ...... جنت میں تو ہر سو بہاراں ہوگی، جلترنگ سننے کی کسی کو کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے)

✍ انیس جبار خان، آزاد کشمیر سے۔ ''ترکِ وفا میں کھوگئی، مالا اور عیسیٰ کی خوشی کو دل سے محسوس کیا۔ ایسے جیسے یہ جیتے جاگتے لوگوں کا ملاپ ہو۔ جنگل کا پھول پڑھتے خرم کی آنٹی کی موت اور ریشم کا رونا دیکھ کر بے ساختہ ہنس، ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئی۔ کیونکہ بالکل ایسا ہی ملتا جلتا سین حقیقت میں میرے ساتھ ہوچکا ہے، جب میں نے نانو اور خالہ کو اپنے ساتھ خوب رلایا تھا۔'' (آپ ہمیشہ خوب ہنستی رہیے، آپ کا خط پڑھ کر ہمیں جب بہت مزہ آئے گا جب آپ تفصیل سے تبصرہ لکھیں گی)

✍ عطیہ زاہرہ، لاہور سے۔ ''فروری 2015ء کا شمارہ میرے سامنے ہے، سرورق بہت ہی خوب صورت ہے، موسم کی مناسبت سے ہے، اس کے علاوہ میں نے سب سے پہلے بہنوں کے خطوط کا مطالعہ کیا ہے، پاکیزہ کے خطوط اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس میں کہانیوں کے تبصروں کے ساتھ، ساتھ اپنے تجربات بھی بانٹے جاتے ہیں، مجھے یہ بات بہت پسند ہے، اس کے علاوہ خوشی اور غمی میں بھی پاکیزہ اپنی بہنوں کے ساتھ رہتا ہے۔ میں بھی اپنی خوشی آپ سب سے بانٹنا چاہتی ہوں، اور وہ یہ ہے کہ انشاء اللہ فروری کے شروع میں نواب سنز راول پنڈی سے میرا پہلا ناول سلگتی دھوپ کے صحرا مارکیٹ میں آرہا ہے۔'' (مبارک باد، آپ کا افسانہ باری آنے پر شائع ہوجائے گا)

✍ شہلا نواز، لاہور سے۔ ''سب سے پہلے عذرا آنٹی کو ذیشان بھائی کی شادی کی بہت، بہت مبارک ہو، بہت خوشی ہوئی کہ انہوں نے سادگی کو اولیت دی اور اس سے بھی زیادہ خوشی دلہن کا باحجاب ہونا پڑھ کر ہوئی تصاویر کا شدت سے انتظار ہے۔ اس مرتبہ کا پاکیزہ بہت اچھا لگا کہانیاں کافی اچھی لگیں مختصر کہانی ناتا سوچ کے درو اکر گئی۔ ناہید سلطانہ کی بلاعنوان خاصے کی چیز تھی خاص طور پر ان کی نستعلیق اردو کہانی کی جان تھی۔ ترکِ وفا ختم ہوگئی شکر ہے ہمیں بالکل پسند نہ تھی۔ ہم دبئی کے ہوگئے، واہ، واہ زبردست سب سے پہلے سفرنامہ پڑھا۔ عظمیٰ آفاق کا اندازِ بیان اللہ کرے زورِ قلم ہو اور زیادہ شائستہ زریں کا سروے حسبِ سابق موضوع اچھا تھا اور مصنفات کی خیال آرائیوں سے ہم سو فی صد متفق ہیں۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ ''کچھ سانحے ایسے ہوتے ہیں جن کے بعد ہم کبھی اپنی جگہ پر نہیں آتے۔ آرمی پبلک اسکول میں ہونے والی درندگی نے ہمیں اندر تک ہلا دیا ہے، یہ کیا ہوگیا ہے، ظالموں نے کتنی ماؤں کی گودیں اجاڑیں، خون کی ندیاں بہادیں یہ سب کیسے ہوگیا، سب کیسے سفاک تھے۔ معصوم بچوں نے کیا بگاڑا تھا کسی کا۔ جگر چھلنی کردیا ہے۔ ہمارے اسکول ویران کردیے، کتنا سناٹا ہے، کتنا دکھ ہے، کتنا درد ہے، اب ہم اپنے بچوں کو اسکول کیسے بھیجیں گے۔'' (بے شک اب تو بس یہی دعا ہے کہ اللہ ہم پر رحم و کرم کرے اور ہمارے ملک کو امن و آشتی کا گہوارہ بنادے)

✍ ذوالنورین، ہری پور ہزارہ سے۔ ''باجی رسالہ دیر سے ملنے کی وجہ سے خط لکھنے میں تاخیر ہوجاتی ہے اور میں ہر ماہ سوچتی ہوں کہ اب لکھوں گی لیکن پھر دیر ہوجاتی ہے (دیر سے ہی سہی مگر لکھا ضرور کرو) سب سے پہلے میری طرف سے عذرا رسول صاحبہ کو بیٹے کی شادی بہت، بہت مبارک ہو۔ اسما قادری کا مکمل ناول بہت سبق آموز تھا خاص کر ان لڑکیوں کے لیے جو محرم اور نامحرم کے فرق کو بھلا دیتی ہیں۔ افسانوں میں مختصر کہانی سبق آموز تحریر تھی اور خصوصی مضامین کے کیا کہنے اختر شجاعت صاحبہ نے دل موہ لیے، ہم دبئی کے ہوگئے پڑھ کر تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم بھی دبئی میں گھوم رہے ہوں لیکن جونہی رسالہ بند کرتے ہیں خود کو ہری پور میں پاتے ہیں۔'' (ہاں بھئی اس طرح تو ہوتا ہے)

✍ کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔ ''جنوری کے پاکیزہ میں صحرا میں میڈیکل کیمپ ہم بھی زاہدہ کے ساتھ محوِ سفر رہے تھے۔ کچی ڈوری سے ہم پریشان ہوتے ہیں مگر الحمدللہ ہم تو پکی ڈوری ہیں۔ اعتبارِ وفا، رنگ خلش، ترکِ وفا چلیں اینڈ دیکھیں گے۔ وہ جنگل پہ کسی کا تبصرہ اچھا لگا کہ جنگل کا پھول شہر کے گلدان میں سجانے چلی ہیں زاہدہ اللہ خیر کرے۔ ذکیہ بلگرامی کی سوال و جواب والی طلبِ مدینہ گزارش بھی پسند آئی۔ سیدھی دل میں اتر گئی۔ عظمیٰ کا دبئی سائیکل والا سین ہم نے خواب میں ٹرائی کرلیا تھا۔ اس بار تمام مراسلے، کارنر ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ماموں اور ممانی رفعیہ ابدالی کی امی پسند آئیں۔ انجم بہت شکریہ، حمد و نظم لگانے کا...... ارادہ تو یہ ہے کہ دوسری شاعری کبھی نہ لکھوں...... صرف حمد و نعت...... مگر آپ نے پسند فرمائی تو گاہے بہ گاہے پرانی و نئی شاعری مع حمد و نعت بھیجتی رہوں گی۔ (جی ضرور) عظمیٰ کی تحریر بھرپور لطف دے گئی۔'' (دلچسپ تبصرے کا شکریہ)

✍ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ''فروری کا شمارہ سرد ہواؤں میں حرارت آمیز لمس دے گیا۔ ٹائٹل موسم کے حسبِ حال تھا۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح ونڈرفل، سلسلے وار ناول ترکِ وفا کا خوشگوار اختتام ہوا۔ بہت سے پیچ و خم الجھاؤ، پریشانیاں اور ٹیڑھے راستوں سے گزر کر بالآخر مالا اور عیسیٰ بامراد ٹھہرے۔ انوکھا اور یادگار ناول مدتوں ذہن کے...... قرطاس پر جگمگاتا رہے گا جبکہ رنگ خلش کی

کہانی آہستہ، آہستہ قدم جمارہی ہے۔ اعتبار وفا میں بھی کئی گتھیاں کھل رہی ہیں۔ جنگل کا پھول اپنے پورے جوبن پر ہے۔ مکمل ناول محبتوں کے رنگ میں وقت پر عاقب نے ثنا کی زندگی میں محبت کے رنگ بھر کرا سے بھٹکنے سے بچالیا۔ شمع ہدایت، اختر شجاعت کا روح پرور مضمون جسے پڑھ کر روح تر و تازہ ہوئی۔ اب بات ہوجائے شمارے کے سب سے خوب صورت سفر ہم دبئی کے ہوگئے کی اتنا زبردست، دلچسپ اور مزیدار ہے منہ سے بے اختیار نکلا ہم تو عظمیٰ کے ہوگئے۔ اکثر ہڑ بڑی میں میرے شامی کبابوں کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے۔ شوہر کو pamper کرنا پڑھ کر ہنس، ہنس کر پیٹ میں درد ہوگیا۔ بہنوں کی محفل میں ذیشان کی شادی کا پڑھا۔ دل خوشی کے مارے بے قابو ہوگیا۔ میری طرف سے معراج رسول صاحب اور عذرا رسول کو بیٹے کی شادی کی بہت، بہت مبارک ہو۔ اللہ اس جوڑی پر اپنی ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے۔'' (پُرمحبت دعاؤں کے لیے ممنون ہوں)

٭ رفعیہ ابدالی، کراچی سے۔ ''سرورق کی من موہنی سی ماڈل اچھی لگی۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح دل میں اتر گیا۔ نگہت سیما کا سلسلے وار ناول بہت اچھا جارہا ہے۔ نایاب جیلانی کے ناولٹ کا انجام اچھا تھا۔ منی ناول جنگل کا پھول کی قسط کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ افسانوں میں ناتا، بلاعنوان، اگر اپنا ہوتا میں زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کیا گیا۔ سیما سراج تو بہت اچھا لکھتی ہیں لیکن ان کی مختصر کہانی مجھے پسند نہیں آئی کہ وہ پاکیزہ نہیں تھی۔ عالیہ حرا کی تحریر بہت زبردست تھی۔ خصوصی مضامین میں ہم دبئی کے ہوگئے بہت مزے کا تھا خاص کر بات ہے رسوائی کی پڑھ کر بے حد ہنسی آئی۔ عظمیٰ آپ بہت سادگی سے ہر بات لکھ دیتی ہیں۔ رضوانہ پرنس کا ناولٹ بھی اچھا تھا لیکن حقیقت میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ رنگ خلش میں نمرا کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہونے جارہا اگلی قسط کا انتظار ہے۔ کارنر میں دعا بہت اچھی لگی۔ اسما قادری کا مکمل ناول محبتوں کے رنگ نے اپنا رنگ دکھا ہی دیا۔ مزے کی تحریر تھی۔ اختر شجاعت کا مضمون شمع ہدایت سے ہم نے ہدایت حاصل کی۔ پاکیزہ ڈائری اور جلترنگ کے سب ہی خاکے اچھے تھے۔ پاکیزہ میں میری امی کی زندگی کا دلچسپ واقعہ شائع کر کے مجھے آپ نے بہت زیادہ خوشی دی۔ شائستہ زریں کے سروے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ مجھے اس قسم کی خرافات بالکل پسند نہیں ہے۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ جو آپ کا جیون ساتھی بنے وہی آپ کی محبتوں کا صحیح حقدار ہے۔ بہنوں کی محفل میں سانحۂ پشاور میں آپ نے صحیح کہا کہ کس، کس کو پرسہ دیں یہ سانحہ اہلِ پاکستان کو کبھی نہیں بھول سکتا ہے۔ ہمیشہ خون کے آنسو رلائے گا۔ آپ کو پوتی کی اور عذرا رسول کو شادی کی مبارک باد ہو۔ ان کے بیٹے اور بہو کی تصویر دیکھنے کا اشتیاق ہے (جلد ہی دیکھ لیں گی) رضوانہ پرنس نے جس طرح لکھا ہے مجھے بھی بالکل ایسا لگتا ہے۔ رضوانہ آپی اور میرا درد مشترک ہے۔ انہوں نے تو یہ لکھا ہے کہ جب میں اکیلی ہوتی ہوں تو ہر طرف مجھے امی نظر آتی ہیں۔ میں تو دن بھر اکیلی رہتی ہوں۔ ویسے انجم آپی نے آپ کو اچھا مشورہ دیا ہے میں بھی اپنے بھائی کی شادی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ لیکن میرے دونوں بھائی مجھے ٹالنے کے چکر میں ہیں۔ آخر میں اپنی تمام قارئین بہنوں سے میری گزارش ہے کہ وہ میرے لیے دعا کریں۔'' (تبصرے کا شکریہ، آپ بے فکر رہیں ہماری قاری بہنیں آپ کے لیے خوب میٹھی، میٹھی دعائیں کریں گی)

٭ فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔ ''فروری کا پاکیزہ جلد مل گیا۔ موسم کی مناسبت سے سرورق اچھا لگا۔ آپ کی باتیں تو ہیں ہی گرانقدر موتیوں جیسی، بصیرت افروز مضامین ہمارے دل کی کثافت دھوتے ہیں۔ اختر شجاعت کا شمع ہدایت نہایت پاکیزہ مضمون رہا۔ رفعت شبانہ کا ناتا موجودہ حالات میں درست لگا۔ بات تو صرف احساس کی ہے۔ ترک وفا ختم ہوا۔ بوجھل پن کے احساس کے ساتھ جانے کیوں لطف نہ آیا۔ ناہید جی کی کیا بات ہے۔ بلاعنوان کا عنوان ہی کچھ سمجھ نہ آیا۔ انہوں نے بے حد گہرائی سے بات سمجھائی، آخر کب تک؟ عورت معاشرے کے ان خداؤں کی بھینٹ چڑھتی رہے گی؟ جنگل کا پھول خوشبوئیں مہکا رہا ہے۔ خولہ صاحبہ نے خوب لکھا۔ رضوانہ پرنس کا بابل تیری دہلیز پرائے آردائی کے ڈرامے خطا جیسا لگا کہیں کہیں ویسے ناولٹ اچھا تھا۔ رنگ خلش کی تعریف کے الفاظ نہیں۔ عالیہ حرا کا ناولٹ سو سو لگا۔ مختصر کہانی جھنجوڑ گئی کچھ لوگ رشتوں کا بھی پاس نہیں رکھتے۔ بدفطرت، بد نظر ہوتے ہیں۔ اسما قادری کا محبتوں کے رنگ، نئے موضوع پر خوب صورت ناول رہا۔ سمجھانے کا انداز کس قدر دلکش رہا۔ عظمیٰ کی دبئی یاترا لکھ کر ہمارے شوق کو بڑھا رہی ہیں۔ عظمیٰ کا برجستہ انداز ہی اسے دلفریب بنا رہا ہے۔ وہ بنا کچھ خوف کیے من وعن لکھے جارہی ہیں، ویل ڈن۔ سروے جاندار رہا۔ مجھ سے اگر پوچھیں تو میں یہی کہوں گی کہ موبائل، نیٹ کی محبت صبح اور شام... والی بات ہے۔ باقی جلترنگ تو ہے ہی کھٹی میٹھی املی جیسا۔'' (اور تمہارا یہ تبصرہ بھی کھٹی میٹھی املی جیسا ہے)

٭ نازنین آفریدی، پشاور سے۔ ''ایک بات جو میں پاکیزہ میں شدت سے نوٹ کر رہی ہوں کہ کہانیاں تو بہت اچھی ہوتی ہیں پاکیزہ کی لیکن کیا باقی پاکیزہ کو بھی بہت بہترین نہیں ہونا چاہیے۔ اگر آپ کو برا لگے تو معذرت خواہ ہوں مگر کیا آپ کو نہیں لگتا کہ پاکیزہ میں کچھ نئے سلسلے شروع کرنے کی ضرورت ہے اور کچھ پرانی اور فضول چیزیں ختم کر دینی چاہیے۔ میں صرف تنقید نہیں کروں گی

بلکہ یہاں آپ کو اپنی آرا اور تجاویز بھی دوں گی مگر بات صرف تجاویز دینے سے نہیں بنے گی ان کے اوپر آپ لوگ اگر عمل پیرا بھی ہوں تو واہ پاکیزہ کو چار چاند لگ جائیں گے۔ پاکیزہ ایک ادبی رسالہ ہے۔ آپ کو یہ نہیں لگتا کہ اس میں ایک سلسلہ شعرا کا کلام، ان کی غزلیں، نظمیں شائع کرنے کے لیے مختص کیا جانا چاہیے جو کہ پہلے تھا بھی ایسا۔ بہنیں نظمیں، غزلیں بھیجتی تھیں مگر اب پتا نہیں کیوں یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔ پاکیزہ میں پہلے بیوٹی کلینک تھا مگر پتا نہیں کیوں اسے بھی بند کر دیا ہے۔ اب ضروری تو نہیں کہ ہر بہن کو ہی میک اپ کرنا آتا ہو جیسے میں تو بہت ایڈوانس شہر میں رہتی ہوں مگر مجھے میک اپ کرنا نہیں آتا تو اسی طرح ہمارے گاؤں میں رہنے والی بہنوں کا کیا حال ہوگا۔ دوسرا ضروری تو نہیں کہ اس میں میک اپ کرنا ہی سکھایا جائے۔ چکنی جلد، نارمل جلد، خشک جلد کے لیے ٹوٹکے بھی پوچھے جاسکتے ہیں کیونکہ جلدی امراض تو ہر موسم میں لوگوں کے ساتھ لگے ہی رہتے ہیں یا اگر چہرے پر داغ دھبے، دانے ہیں یا کسی نے بال لمبے کرنے کے لیے کچھ پوچھنا ہے، پوچھا تو کچھ بھی جاسکتا ہے۔ بننا سنورنا تو عورت کا پیدائشی حق ہے۔ مہندی کے ڈیزائن بھی بتائے جاسکتے ہیں۔ اگر حسن و خوب صورتی سے متعلق کوئی سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا جائے تو بہنیں کتنی خوش ہو جائیں اور پاکیزہ بھی خواتین کا ہی پرچا لگے۔ آنٹی میرا مقصد تنقید کرنا نہیں پاکیزہ کو بہترین بنانا ہے۔ پلیز اس جانب توجہ دیں۔'' (نازنین اس محفل میں خوش آمدید اور اگر تمہاری تجاویز ہماری دیگر بہنوں کو بھی پسند آئیں تو ان پر عمل کرنے میں ہم کیوں دیر کریں گے)

✍ **رابعہ یاسمین**، کوئٹہ سے۔ ''ہم جو تیس سال سے پاکیزہ پڑھ رہے ہیں تو اتنا تو ہمارا بھی حق بنتا ہے کہ کبھی کبھار ہی کوئی چیز شائع کر دیں۔ تا کہ جی خوش ہو جائے۔ میں نے آمنہ حماد کو بھی کئی بار فون کیے مگر...... (جہاں تک مجھے یاد ہے آپ کا افسانہ قابل اشاعت ہے) پاکیزہ آپ کی محنت سے روز بروز ترقی کر رہا ہے۔ اداریہ میں ہر بار ایک بہترین پیغام ہوتا ہے۔ نفسی الرسی کی یہی سوچ ہو تو کافی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ فرحانہ ناز ملک کے بارے میں پڑھ کر بے حد دکھ ہوا۔ جتنی خوب صورت وہ تھیں ان کی تحریر بھی اتنی ہی خوب صورت تھی۔ اللہ ان کے بیٹے کو صحت یاب کرے اور گھر والوں کو صبر دے، آمین۔ اینہ عندلیب کے لیے دعا کرتی ہوں کہ وہ ٹھیک ہو جائیں۔ ان کے خطوط بہت پُرخلوص ہوتے ہیں۔ میری طرح وہ بھی کئی سالوں سے پاکیزہ کی قاریہ ہیں یہ اور بات ہے کہ ان کے خط ہر بار شائع ہوتے ہیں اور ہمارے غائب ہو جاتے ہیں۔ نزہت اصغر سے کہنا ہے کہ اس بار وہ آپ کا ایک بھرپور انٹرویو کریں۔ تصویروں کے ساتھ۔ اس بار آپ کی تصاویر بہت اچھی آئی تھیں۔ عظمیٰ کی پارٹی بہترین تھی۔ ان سے کہیں کہ کوئی افسانہ ضرور لکھیں۔ اعتبار وفا بے حد پسند ہے اور باقی افسانے بھی اچھے تھے۔'' (آپ کی تمام فرمائشیں نوٹ کر لی گئی ہیں اور کوئی حکم......)

✍ **عائشہ خالد، ماہا بلوچ**، میر پور خاص سے۔ ''آپی پاکیزہ ملا...... آپ کا پیغام بہت اچھا لگا۔ پڑھ کر کر اتنی خوشی ہوئی کہ قلم اٹھا لیا باجی سندھی اپلیک ورک کے نام سے میرا آن لائن پیج بھی الحمدللہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ پاکیزہ بہنوں کے لیے اپلیک ورک میں یہ ڈریس میں ڈسکاؤنٹ ہوگا۔'' (جن بہنوں کو دلچسپی ہوگی وہ آپ سے یعنی ماہا بلوچ سے رابطہ کریں گی)

✍ **گل رعنا**، کراچی سے۔ ''ہم تو پاکیزہ کے دیوانے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ آپ پاکیزہ میں جگہ دیں یا نہیں دیں۔ ہم تو انتظار میں کھڑے رہیں گے۔ افسانہ ہو مذہبی معلومات...... جلترنگ ہو یا کھانے کی تراکیب...... ناول، ناولٹ، کوئی چیز بھی کسی دوسرے پرچے کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور بہنوں کی محفل تو پورے رسالے کی جان ہے۔ نیا سال مبارک ہو، ویسے ہمارا نیا سال تو محرم سے شروع ہو بھی چکا۔ مگر چلیں انگریزوں کی تقلید بھی کر لیں۔ اللہ ہمارے ملک کو دہشت گردی سے پاک کرے۔ کرپشن، لوٹ مار سے محفوظ رکھے۔ اللہ پاک فوج کو سلامت رکھے۔'' (آپ کا افسانہ نا قابلِ اشاعت ہے)

✍ **نازیہ**، کراچی سے۔ ''میں پاکیزہ کی پرانی قاری ہوں، اپنے قارئین سے التجا کرتی ہوں کہ وہ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ مجھے اولاد کی نعمت سے ضرور نوازے۔'' (آپ خود بھی دعا کیجیے، ہمارے قارئین بھی ضرور دعا کریں گے)

✍ **مسرت رانی خلیل**، کراچی سے۔ ''جنوری کا پاکیزہ ٹائٹل سے لے کر آخری صفحے تک پسند آیا۔ پاکیزہ کے ہر افسانے اور ناولٹ میں کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہوتا ہے۔ آپ کا ناولٹ بھی پسند آیا اور مکمل ناول بھی اے ون رہا۔ ان سطور کے توسط سے میں یہ بھی کہنا چاہتی ہوں کہ آج کی لڑکیاں اب ہر بات کا ترخ سے جواب دینے لگی ہیں جو ٹی وی ڈراموں سے سیکھ رہی ہیں اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' (تبصرے کا شکریہ...... ٹی وی ڈرامے اگرچہ اچھی باتیں بھی سکھا رہے ہیں کہ کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ ویسے صرف لڑکیاں ہی نہیں لڑکے ان سے زیادہ کہیں خودسر اور چرب زبان ہو گئے ہیں)

✍ **آنسہ شازیہ**، کراچی سے۔ ''میں تو سوچ رہی تھی کہ نئے سال کے جنوری پاکیزہ میں آپ ہمیں یہ ضرور بتائیں کہ سال گزشتہ کون، کون سی کتابیں زیادہ پڑھی گئیں۔ جوانوں کو کس ادب سے دلچسپی رہی اور خانہ دار خواتین نے کن کتب سے استفادہ کیا۔

میں چونکہ لائبریری سے کتب لاکر پڑھا کرتی ہوں اس لیے اس طرح کی سروے رپورٹس مجھے ہمیشہ سے اچھی لگا کرتی ہے۔ معذرت کے ساتھ مگر مجھے مایوسی ہوئی کہ ایسا آپ نے کچھ بتایا ہی نہیں۔'' (اس محفل میں خوش آمدید...... آپ کو نہ مایوس ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ہی معذرت کرنے کی کوشش کریں۔ ہم آپ کو نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا کے بارے میں بتا دیتے ہیں کہ جو کتاب سب سے زیادہ ہر ملک میں پڑھی گئی ہے اس کا نام ہے فیس بک...... کیوں ٹھیک کہا ناں...... میں بھی فیس بک پر موجود ہوں۔ آپ رابطہ کرنا چاہتی ہیں تو کرسکتی ہیں۔ دیگر کتب کا نمبر تو بہت بعد میں آتا ہے)

☜ مہوش سمرن راجپوت، سیالکوٹ سے۔ ''عظمیٰ آپی کا ملائشیا کا ٹرپ جب پڑھا تو ہر جگہ یہی لگا کہ ہم ان کے ساتھ تھے کہ ماشاءاللہ بڑی خوب صورت منظر کشی کی تھی اور اب دبئی کے بارے میں پڑھ کر ایسا ہی لگ رہا ہے کہ لفظوں میں موتی جڑ دیے گئے ہوں۔ اللہ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے، آمین۔ میں آئندہ بھرپور تبصرے کے ساتھ خط بھی لکھوں گی۔ فی الحال ایک پریشانی چل رہی ہے۔''
(پیاری مہوش اللہ تعالیٰ آپ کی اور آپ کے اہل خانہ کی ہر پریشانی دور فرمائے، ہاں آپ کے تبصرے کی منتظر رہوں گی)

☜ مہرو میر، کشمیر سے۔ ''ہم نے پیپرز دیے تھے رزلٹ آگیا ہے فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے ہیں۔ (کون سی جماعت میں پاس ہوئی ہو) سرورق اس بار دلکش تھا اور امانت کا اینڈ ہوگیا جو کہ بہت اچھا تھا۔ اعتبار وفا بھی اچھا جارہا ہے آگے جا کر راز کھلے گا۔ ترک وفا کی بات کی جائے تو یہ ہمیں سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس بار ہمیں زیادہ کی امید تھی کہ تمام راز کھل جائیں گے مگر خیر...... باقی تحریریں بھی اچھی ہیں خاص کر زندگی بدلتی ہے، یہ پڑھ کر لگا واقعی زندگی بدلتی ہے اور فرحین اظفر کی ع سے عورت م سے مجبور واقعی عورت معاشرے میں سب سے زیادہ مجبور ہوتی ہے، بہت سی مجبوریاں ہیں جو کہ اسے کیا کچھ کرواتی ہیں۔ اسے اپنا آپ مار کر معاشرہ میں رہنا پڑتا ہے۔ علم، معرفت الٰہی کے صفحات بڑھا دیں۔ باقی پاکیزہ کی تحریریں معاشرتی رویوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ محترمہ سیما سراج سے نشست بھرپور تھی۔ نزہت اصغر نے اچھی محفل سجائی۔ جلترنگ بہت مزے کا تھا۔ نہیں، نہیں ہم نے کھایا نہیں صرف چکھا ہے۔ روحانی مشورے ہمیں اچھے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر دے، آمین۔'' (دیکھیے آپ کا پرانا خط ہم نے لگا دیا ہے، آپ ہر ماہ باقاعدگی سے ہمیں تبصرے بھیجیں وہ دیر سے سہی مگر لگے گا ضرور)

☜ نیلوفر خان، بارہ کہو سے۔ ''مدیرہ صاحبہ کسی بھی رسالے کے لیے یہ میرا پہلا خط ہے، میں کافی عرصے سے پاکیزہ پڑھتی آرہی ہوں چونکہ اب میری بیٹیاں بھی پڑھتی ہیں تو ان کے اصرار پر اپنی رائے بتا رہی ہوں۔ پہلے کے افسانے اگرچہ صرف محبت کے موضوع پر ہوتے تھے مگر پھر بھی وہ بہت پسند کیے جاتے تھے اس زمانے کی تمام رائٹرز کو میں نے پڑھا ہے، آج کل نئی، نئی لکھنے والیاں آرہی ہیں مگر کسی میں وہ بات نہیں...... اگر اندر کی اسٹوری اچھی ہوگی تو دوسری افسانوی باتیں نہیں ہوں گی، مثلاً منظر کشی وغیرہ...... ویسے بھی ہمارے آس پاس یہی ہورہا ہے اس وجہ سے ایسا ہے۔ دوسرے کیا ریگولر تبصرہ نگار الگ ہوتے ہیں جو ہر مہینے شامل ہوتے ہیں آخر نئے، نئے لوگ بھی تو خط لکھتے ہوں گے۔ مدیرہ صاحبہ سے گزارش ہے کہ دلچسپ سے دلچسپ چیزیں ڈالیں ویسے ربیع الاول کے حساب سے کسی نعت خواں کی باتیں ہوتیں۔ کیا ہر کوئی آپ کے رسالے میں لکھ سکتا ہے یا اپنا تعارف کروانا پڑتا ہے۔ تفصیل بتانی پڑتی ہے، مطلب آپ کس طرح کسی کی کہانی سلیکٹ کرتے ہیں۔ پلیز میری یہ باتیں ضرور شامل کریں۔'' (جن لوگوں کی تحریریں سلیکٹ کی جاتی ہیں تو اس میں صرف یہی دیکھا جاتا ہے کہ وہ پاکیزہ کے حساب سے معیاری ہیں یا نہیں...... کسی کا انٹرویو افسانہ لگانے سے پہلے نہیں لیا جاتا۔ اچھی تحریر اپنا تعارف آپ ہوتی ہے۔ تبصرہ نگاروں میں نئے اور پرانے دونوں شامل ہوتے ہیں۔ اب ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ نئے تبصرے لگانے کے لیے میں پرانے تبصرے نگاروں کو سرے سے شامل ہی نہیں کروں۔ اگر آپ کوئی کہانی بھیجنا چاہتی ہیں تو ضرور بھیجیں۔ پڑھ کر بتادیں گے کہ آیا وہ پاکیزہ میں لگ سکتی ہیں یا نہیں)

☜ نفیسہ آرا، راس الخیمہ، یو اے ای سے۔ ''کافی عرصے سے میں آپ کی باقاعدہ قاری ہوں اور کچھ نہ کچھ بھیجتی بھی رہتی ہوں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ دبئی میں رسالے کم آتے ہیں آپ پلیز تمام اسٹیشس میں رسالے بھیجا کریں پھر شاپ کیپر کے پاس ختم ہوجاتے ہیں۔ (جی ضرور) آپ لوگوں کو سال نو مبارک ہو۔ ذرا فہرست کی تصویر رنگین دے دیتیں کہ سورج طلوع ہورہا ہے نئے سال کا...... کیوں میرا آئیڈیا درست نہیں لگا۔ عظمیٰ آفاق نے اب کے دبئی کا سفرنامہ اپنے قارئین کو دیا آپ اور عظمیٰ سے میرا ابھی رابطہ ہوجاتا تو اپنے گھر بلاتی ویسے اب تو پورا پاکستان ہی دبئی کی سیر کرچکا ہوگا۔ یہاں رہنے والوں سے اور رشتے داروں کی فرمائشیں پوری کرتے، کرتے عمر بسر ہورہی ہے۔ اللہ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ ہاں میری بھیجی دو تراکیب ضرور شامل کیجیے گا۔ اشعار بھی بھیجتی رہتی ہوں۔'' (گڑیا آپ کے خطوط اور مراسلات تو شامل ہوتے رہتے ہیں۔ ہاں جب آپ کراچی آئیں تو رابطہ کرسکتی ہیں)

✉ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ''ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے روحانی مشورے پڑھے۔ آپ نے ربیع الاول کے حوالے سے نبی کریم ﷺ سے ماخوذ دعائیں لگا کر سب کا دل خوش کر دیا۔ یہ ایسی تحریریں ہیں جن کو بار بار بھی لگایا جائے تو بھی کم ہے۔ جو بہنیں روحانی مشورے فوٹو اسٹیٹ کروا کے آگے لوگوں میں تقسیم کیا کرتی ہیں وہ بھی نیکی کے کام میں شریک ہو جاتی ہیں۔ عظمیٰ آفاق کا دبئی کا سفرنامہ بے حد دلچسپ تھا۔ سلسلے وار ناولوں میں نایاب جیلانی چھائی رہیں۔ سمیرا یونس کا مکمل ناول بھی اچھا لگا اور انجم انصار کا ناولٹ تو واقعی نئے سال کا تحفہ لگا۔ بے حد سبق آموز اور عام فہم اس لحاظ سے اس میں فلسفہ نہیں تھا۔ جو ہمیں سخت ناپسند ہے۔ ایسی تحریریں ہمیں بہت اچھی لگتی ہیں جو دل کو چھولیں جیسے نگہت اعظمی، شمیم فضل خالق اور زاہدہ پروین۔'' (پسندیدگی کے لیے ممنون ہوں)

✉ زبیدہ علی، حویلیاں سے۔ ''یہ شکایت ہے کہ فون پر بات بہت مشکل سے ہوتی ہے پھر جلدی کٹ جاتا ہے۔ اس کا کیا ہو سکتا ہے۔ خط لکھنے کی چور ہوں، مہربانی ہوگی کہ یہ خط نایاب جیلانی کی ترکِ وفا سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ یہ نایاب کس عمر کی خاتون ہیں، اتنا عمیق مشاہدہ کہ ذاتی تجربے کا گمان ہو رہا ہے اور اوپر سے اتنی معلومات کیا انہوں نے ٹیلی پیتھی پر کتابیں پڑھ رکھی ہیں؟ آپ کا ایک رسالہ شاید سسپنس میں محی الدین نواب صاحب ایسے قصے لکھا کرتے تھے اب تو کافی بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔ ویسے پاکیزہ میں نے کبھی کبھی پڑھا مگر جب بھی پڑھا اچھا پڑھنے کو ملا۔ مگر پھر بھی اس کے کارنرز کبھی کبھی دہرائے ہوئے لگتے ہیں یا پھر...... ایک بات اور کہوں اگر برا نہ مانیں، چاہیں چھاپیں یا نہیں کہ آپ کے ہاں ہر وقت گیدرنگ اور پارٹیوں کے احوال وغیرہ پڑھنے کو ملتے ہیں کیا دوسرے رسالوں میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ اس طرح وہیں کے رہنے والے تو خوب ملتے رہتے ہیں اور ہم اتنی دور والے رہ جاتے ہیں۔ آپ لوگ اتنا بڑھا چڑھا کر احوال نہ دیا کریں۔ رضوانہ پرنس کا منی ناول اچھا تھا۔ یہ والا تو کچھ بور، بور سا ہے خیر...... کسی نہ کسی کو تو پسند آرہا ہوگا۔'' (پیاری بہن...... اس محفل میں اگر آپ شرکت کرنا چاہتی ہیں تو آپ کو تبصرہ لکھ کر بھیجنا پڑے گا۔ اگر آپ کے پاس خط لکھنے کا وقت نہیں ہے تو ای میل کے ذریعہ بھیج سکتی ہیں۔ اب ایسا تو نہیں ہو سکتا ناں کہ ہم قلم لے کر فون پر بہنوں کے تبصرے لکھیں۔ جس طرح آپ مصروف ہیں، دوسرے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ رضوانہ پرنس کی تحریر ہمارے قارئین کو بے حد پسند آتی ہیں۔ مگر ہر تحریر ہر ایک کو نہیں آسکتی۔ اور یہ کوئی انہونی بات نہیں...... ہاں آپ کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ہمارے ہاں تقریب کی کوریج بڑھا چڑھا کر کی جاتی ہے۔ بلکہ کلی احوال ... تو لکھا جاتا ہی نہیں ہے)

★ پاکیزہ کے اپریل و مئی کے شمارے خصوصی شمارے سالگرہ نمبر ایک اور دو ہوں گے۔ ان ضخیم شماروں میں اپنی شرکت یقینی بنانے کے لیے آپ اپنے خوب صورت مراسلات، اپنی تصویر کے ساتھ اپنے مختصر انٹرویوز یا اپنی کسی یادگار سالگرہ کا احوال جلد از جلد ارسال فرما دیں۔ جو بہنیں تصویر کے بغیر یہ احوال لکھ کر بھیجنا چاہتی ہیں تو وہ بھی بھیج سکتی ہیں مگر جلدی کیجیے...... کہ ڈاک کا نظام اچھا نہیں ہے اور تاخیر سے ملنے والی تصویریں ان شاندار نمبرز میں جگہ نہیں پا سکیں گی۔

اب آیئے درود پاک پڑھ کر دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم میرے جسم کو شفا دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یا رب العالمین مجھ سے میری اولاد سے اور میرے تمام عزیز و اقارب سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا اور ہر گناہ، ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا۔ اپنی نظر میں چھوٹا اور دوسروں کی نظر میں بڑا بنا دینا اور دونوں جہاں میں مجھے خیر عطا کرنا کہ بے شک تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے اور تیری ثنا سب سے بڑی ہے اور تیری پناہ عزت والی ہے اس لیے صرف اپنا محتاج رکھنا اور اپنی شان کے حساب سے اپنا رحم و کرم اور فضل کرنا...... بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

یا مجیبُ یا مجیبُ یا مجیب

دعا گو آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.C فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35895313 EXT 107,118



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمدِ باری تعالیٰ

خدائے جہاں دے سہارا مجھے
بلندی کا کر استعارہ مجھے
کرے جو کبھی وہ اشارہ مجھے
منافع کی صورت خسارہ مجھے
میں غیروں کی چوکھٹ پر سجدہ کروں
ہوا ہے نہ ہوگا گوارا مجھے
بجا ہے میں مٹی کی تخلیق ہوں
خدا نے مگر ہے سنوارا مجھے
بھنور سے ہے الجھا سفینہ مرا
الٰہی دکھا دے کنارہ مجھے
میں در در پہ سجدہ کروں کس طرح
میرے رب نے ہے آخر پکارا مجھے
ہمہ دم جو آنسو رواں ہیں شفق
خدا آپ دے گا سہارا مجھے

شاعرہ: نیر رانی شفق، ڈی جی خان

نعتِ رسول مقبول ﷺ

وہ اِک خوشبو
جسے میں کھوجتی ہوں
سونگھتی ہوں
پا بھی لیتی ہوں
مگر احساس کی حد تک!
وہی خوشبو تو سانسوں میں بسی ہے
اسی سے دل کی ہر دھڑکن سجی ہے
اسی کی یاد میں آنکھیں ہیں پُر نم
اسے میں کھو نہیں سکتی
جدا بھی ہو نہیں سکتی
وہ خوشبو تو میرے آقا ﷺ کی خوشبو ہے
معطر جس سے ہے سارا زمانہ
یہی حق ہے یہی حق کا فسانہ

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی
مرسلہ: شازیہ محبوب، کراچی

خوشی

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ میں جب اللہ سے کوئی دعا کرتا ہوں اور وہ قبول ہو جائے تو میں خوش ہوتا ہوں اور نہ قبول ہو تو زیادہ خوش ہوتا ہوں کیونکہ دعا قبول ہو میری رضا ہے اور نہ قبول ہو میرے اللہ کی رضا ہے اور میں اپنے اللہ کی رضا میں زیادہ خوش ہوتا ہوں۔

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

فرمانِ الٰہی

حضرت ابو درداؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں بادشاہوں کا مالک اور بادشاہوں کا بادشاہ ہوں، بادشاہوں کے دل میرے قبضے میں ہیں جب بندے میری اطاعت کرتے ہیں، میں ان پر بادشاہوں کے دل رحمت اور نرمی کے ساتھ پھیر دیتا ہوں اور بندے جس وقت میری نافرمانی کرتے ہیں، میں ان کے دل خفگی اور عذاب کے ساتھ پھیر دیتا ہوں۔ وہ انہیں برا عذاب پہنچاتے ہیں، تم اپنے نفسوں کو بادشاہوں کے لیے بد دعا کرنے میں مشغول نہ رکھو بلکہ ذکر اور عاجزی، گریہ و زاری میں اپنے نفسوں کو مشغول کرو تاکہ میں تمہیں

بادشاہوں کے شر سے کفایت کروں یعنی تمہیں ان کے شر سے بچاؤں۔''

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

سامانِ تجارت

حضرت عیسیٰؑ نے دیکھا کہ شیطان چار گدھوں پر سامانِ تجارت لادے لا رہا ہے۔ آپؑ نے پوچھا۔

''اے مردود! یہ کیا لے جا رہا ہے؟''

شیطان نے کہا۔ ''یہ مالِ تجارت ہے اور ایک گدھے پر ظلم، دوسرے پر خیانت، تیسرے پر مکرو فریب اور چوتھے پر حسد لادا ہوا ہے۔''

حضرت عیسیٰؑ نے پوچھا۔ ''اس مال کا خریدار کون ہے؟''

شیطان نے کہا۔ ''ظلم حکمرانوں اور بادشاہوں کے کام کی چیز ہے وہ اس کو خریدتے ہیں، خیانت، تاجروں کے ہاتھ فروخت کرتا ہوں مکرو فریب عورتوں کا پسندیدہ مال ہے اور حسد کی علما کے ہاں مانگ ہے۔ میرے تمام مال کے گاہک موجود ہیں۔''

از: حمیرا نوشین، منڈی بہاؤ الدین

کوئی تو ہو

کیا ہوا
جو ایک اور تارا ٹوٹ گیا
کیا ہوا
جو ایک اور پھول
ڈالی سے ٹوٹا اور بکھر گیا
کیا ہوا
جو ایک اور آنسو
پلکوں کی باڑھ سے ٹوٹ کر گرا
اور مٹی میں مل گیا
تارا ہو یا پھول
یا پھر آنسو
ان کے مقدر میں ٹوٹنا ہی لکھا ہے
لیکن کاش
کوئی تو ہو
جوان تاروں کی چمک
پھولوں کی مہک
اور آنسوؤں کی نمی
کو محسوس کر سکے
کوئی تو ہو
جوان کے یوں ٹوٹ کر بکھر جانے پر دکھی ہو
ان کے فنا ہو جانے کا احساس کر سکے
صرف ایک لمحے کے لیے ہی
کاش کوئی تو ہو

کلام: عالیہ ضیا

مرسلہ: صبا سلطانہ، کیماڑی، کراچی

انٹرویو کارنر

میرا نام انیسہ زینب ہے، عمر اٹھارہ سال ہے۔ بی اے کی طالبہ ہوں۔ مجھے مطالعے کا خاصا شوق ہے مگر کبھی ڈائجسٹ نہیں پڑھے۔ امی اور بڑی بہنیں پڑھتی ہیں۔ البتہ پہلے میں پاکیزہ کبھی کبھار پڑھ لیتی تھی مگر اب تو باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے افسانے بھی لکھ رہی ہوں مگر نظمیں اور غزلیں بہت سی لکھ چکی ہوں۔ مزاحیہ مضمون بھی لکھنا پسند ہے اب پاکیزہ میرا پسندیدہ ڈائجسٹ ہے۔

انیسہ زینب، پنجاب

خوشبو

میرے وجود میری سانسوں میں ہے مہکی تری خوشبو، خوشبو
تیرے جذبات، تیرے احساس کی خوشبو، خوشبو
تیری آنکھیں، تیری باتیں، تیرے انداز کا یہ دھیما پن
مجھ کو لوٹے لیے جاتی ہے یہ خوشبو، خوشبو
مجھ پر ہر لمحہ لطف و عنایت کا خیال
دل کا در وا کیے جاتی ہے یہ خوشبو، خوشبو
گفتگو میں وہ الفاظ کا رنگین چناؤ
مجھ کو مسحور کیے جاتی ہے خوشبو، خوشبو

زندگی اپنی بسر ہو تیرے ہی نام کے ساتھ
کاش تحفہ مجھے دے جائے یہ خوشبو، خوشبو

از: فرحت احمد، کراچی

باتوں سے خوشبو آئے

☆جو آپ کو خوشی میں یاد آئے، آپ اس سے محبت کرتے ہیں مگر جو غم میں یاد آئے وہ آپ سے محبت کرتا ہے۔

☆شکر ادا کریں اس رب کا جو برداشت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا مگر اوقات سے زیادہ سکھ دیتا ہے۔

☆اگر کامیابی حاصل کرنی ہے تو خود سے زیادہ اللہ پر یقین رکھو۔

☆ہر ایک کو سنیں، ہر ایک سے سیکھیں کیونکہ ہر کوئی سب کچھ نہیں جانتا مگر ہر ایک کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہے۔

☆روزانہ دو نفل شکرانے کے ادا کر کے دیکھو...... اللہ کتنا نوازتا ہے۔

از: زریں زبیر کوٹھاری، کراچی

غزل

تیری پیاری، پیاری آنکھیں
سارے جگ سے نیاری آنکھیں
جب دیکھا محسوس ہوا ہے
سب سے خوب تمہاری آنکھیں
پھولوں کا گلدستہ ہیں یہ
خوشبو سی دلداری آنکھیں
تاروں جیسی چمکیں ہر دم
روشن دیپک، خماری آنکھیں
تیری آنکھوں جیسی کب ہیں
ہم نے لاکھ سنواری آنکھیں
قاتل جیسے نین تمہارے
جیسے تیز کٹاری، آنکھیں
دے ہے دعائیں خانم کا دل
غم سے ہوں یہ عاری آنکھیں

شاعرہ: فریدہ خانم، لاہور

زندگی کی خوشبو

☆مخلوق خدا سے محبت...... یتیموں کا خاص خیال رکھنا۔

☆غیبت سے اجتناب، معاف کرنا۔

☆والدین کا احترام...... غصے سے پرہیز۔

☆تکبر سے دوری...... وعدے اور علاج کو پورا کرنا۔

☆مہمان نوازی...... نیک لوگوں کی صحبت۔

☆بیمار کی عیادت، سادگی، پاکیزگی۔

☆سلام میں پہل...... نفس کی مخالفت۔

☆خوش اخلاقی، توکل، خوش خلقی۔

از: ماہا بلوچ، میرپور خاص

غزل

بہت تھک چکی ہوں سفر کرتے، کرتے
خفا زندگی کو بسر کرتے، کرتے
ابھی بچ رہی ہے میری زندگانی
بہت کر چکی مختصر کرتے، کرتے
حوالے محبت کے تم کو ملیں گے
کسی دل میں شام و سحر کرتے، کرتے
محبت میں مجھ کو بھلا کیا ملا ہے
تمہاری طرف یہ نظر کرتے، کرتے
مری قسمتوں میں تو تاریکیاں ہیں
اسے کیا ملا در بدر کرتے، کرتے

شاعرہ: فریدہ فری، لاہور

مہکتی کلیاں

☆جس کی دو بیٹیاں ہوں اور اس نے ان کی اچھی طرح تعلیم و تربیت کی، اس کے لیے جنت ہے۔

☆علم، مومن کا گم شدہ مال ہے، جہاں سے ملے حاصل کرلو۔

☆ خاموشی، غصے کا بہترین علاج ہے۔
☆ ضائع کیا گیا وہ علم جس پر عمل نہ کیا جائے۔
☆ سحر خیزی میں پرندوں کا سبقت لے جانا، بندے کے لیے باعثِ ندامت ہے۔
☆ مال خرچ کرنے سے ختم ہو جاتا ہے لیکن علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔
☆ اپنی عادتوں کو بہتر بنائیں کیونکہ آپ کی عادتیں آپ کا عمل بن جاتی ہیں۔

از: نور افشاں، شکار پور

بہار کا گیت

شام سہانی آئی ہے
ہر سو خوشبو لائی ہے
چھائے رنگ بہار کے
میلے ہیں یہ پیار کے
سکھیوں کے ہیں آج مزے
پورب پچھم خوب سجے
منظر ہار سنگار کے
میلے ہیں یہ پیار کے
چپکے سے یہ راز بتا
کیسے تیرا روپ سجا
پردے ہیں اسرار کے
میلے ہیں یہ پیار کے
نور بھرا ہے آنکھوں میں
گونجے نغمے کانوں میں
پائل کی جھنکار کے
میلے ہیں یہ پیار کے
رنگ برنگی ریلا ہے
حسن بھرا یہ میلا ہے
لمحے ہیں دیدار کے
میلے ہیں یہ پیار کے

شاعرہ: نیر رانی شفق
مرسلہ: صبا نور، لیہ

ماں

☆ اللہ نے کہا۔ ماں میری طرف سے قیمتی اور نایاب تحفہ ہے۔
☆ جنت نے کہا۔ ماں وہ ہستی ہے کہ میں بھی اس کے قدموں تلے ہوں۔
☆ سمندر نے کہا۔ ماں وہ دھنک ہے جس میں ہر رنگ پنہاں ہے۔
☆ شاعر نے کہا۔ ماں ایک ایسی غزل ہے جو سننے والوں کے دل میں اتر جاتی ہے۔
☆ مصنف نے کہا۔ ماں وہ ہستی ہے جس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔

دعا نے کہا۔ ماں وہ شخصیت ہے جو اولاد کی خوشی کی دعا مانگتی ہے۔

اور یہ میری دعا...... اللہ ہر ایک کی ماں کو سلامت رکھے اور ہر ماں کو اس کی اولاد کی ہر خوشی دیکھنا نصیب ہو، آمین۔

از: ظل شاہین، رحیم یار خان

دل کی حالت

جیسے جیسے شام ہے ڈھلنے لگی
دل کی حالت بھی جاناں بدلنے لگی
دل اکیلا بہت اور پریشان ہے
تو مجھ سے خفا کیوں مری جان ہے
ہیں اداسی کے سائے در و بام پر
دل اب بھی ہے دھڑکے تیرے نام پر
تو ہی دنیا میری، تو ہی چاہت میری
تو ہی زندگی، تو ہی محبت میری
اب تو آجا کہ سانسیں ہیں رکنے لگیں
اب تو آجا کہ آنکھیں ہیں تھکنے لگیں
بے کلی دل کی جاناں ہے بڑھنے لگی
دیکھ آجا صنم شام ڈھلنے لگی

شاعرہ: سیدہ جیا عباس، تلہ گنگ



ایک خط

"پیارے میاں جانی......!

سچیاں محبتاں......!

آپ تو گھر آتے ہیں تو اپنی ماں بہنوں میں اتنا مصروف ہو جاتے ہیں کہ مجھ سے بات کرنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا...... آفس جاتے ہیں تو وہاں افسرانہ اکڑ اتنی زیادہ آجاتی ہے کہ بیوی کا فون سن کر چپڑاسی سے کہلوا دیتے ہیں کہ صاحب اس وقت بہت زیادہ مصروف ہیں گھر میں بات کرنے کا ٹائم نہیں ہے۔

اس لیے آج آپ کو آپ کے دفتر کے ایڈریس پر خط لکھ رہی ہوں۔

نیا سال شروع ہونے والا ہے...... میری بھابی کی بہن جب نجومی کے پاس گئیں تو وہ مجھے بھی لے گئی تھیں...... اس نے ہزار روپے تو مجھ سے بھی ضرور لیے مگر باتیں اتنی اچھی بتائی ہیں کہ آپ بھی خوش ہو جائیں گے۔

اس نے کہا کہ یہ نیا سال بیویوں کا ہوگا۔ یعنی اس سال شوہر صاحبان اپنی، اپنی بیوی کا حکم مانیں گے...... ایمان سے میرا تو دل خوشی سے بے حال ہے پندرہ سال شادی کو ہو گئے آپ نے میری کوئی پانچ باتیں بھی نہیں مانی ہوں گی...... اور اب آپ میری ہر بات مانا کریں گے...... اللہ! کتنا اچھا لگے گا۔

نجومی نے دوسری بات یہ بتائی کہ آپ اس جنجال پورے سے نکل کر میرے میکے سے قریب مکان میں مجھے لے جائیں گے...... سچ میں اپنا مکان ایسا پیارا سیٹ کروں گی کہ پورا خاندان حیران رہ جائے گا کہ فرخندہ ذاکر نے کتنا پیارا گھر سجایا ہے۔

مجھے نجومی نے یہ بھی بتایا کہ آنے والے سال میں شوبز میں آجاؤں گی۔

ذاکر یقین کرو...... جوائنٹ فیملی سسٹم کی ایک خوبی جو بے حد شاندار ہے وہ یہ ہے کہ اس میں رہنے والا ہر شخص از خود فنکار بن جاتا ہے۔ یعنی اس کو کوئی انسٹی ٹیوٹ جوائن ہی نہیں کرنا پڑتا...... اب آپ سے کیا چھپانا...... میں ٹی وی کے ایک چینل کے لیے جب اپنا آڈیشن دینے گئی تو اس نے مجھ سے پانچ منٹ باتیں کرنے کے بعد ہی کہہ دیا کہ ہم اپنی آئندہ آنے والی سیریل میں سائڈ ہیروئن لینے کو تیار ہیں...... میں نے کہا پہلے آپ مجھے بتائیں کہ میرا ہیرو کون ہوگا۔ وہ بولے ہیرو کوئی بھی ہو آپ کو اس سے کیا مطلب مگر ہیروئن تو آپ ہیں، پلیز ذاکر! اگر تم میرے ساتھ ٹی وی چینل چلو تو شاید... وہ تمہیں بھی لے لیں...... اگر ہیرو نہیں لیں گے تو کم از کم تمہیں میرا شوفر یا کک میں ضرور لے لیں گے...... کم از کم تم میری وجہ سے ٹی وی پر نظر تو آجاؤ گے۔

ہاں سب سے خاص بات تو میں بتانا ہی بھول گئی تھی...... وہ یہ کہ نئے سال میں آپ مجھے زیرو میٹر گاڑی بھی دلوائیں گے۔

اب آپ گھر آکر مجھے بتائیے کہ نئے سال میں میرے ارمان کتنے فی صد پورے ہو جائیں گے۔

فقط آپ کی پیاری بیوی......

فرخندہ ذاکر"

اور اس شب ذاکر اپنی بیگم پر آکر اتنا چیخے جتنا کبھی وہ پندرہ سالوں میں نہیں چیخے ہوں گے۔ فرخندہ نے رو، رو کر آنکھیں سجا لیں مگر وہ ان کی کسی

بات سے اتفاق نہیں کر رہے تھے۔ تھک ہار کر انہوں نے اپنی بھابی کی بہن کو فون کر کے بتایا کہ نجومی نے ان کے بارے میں تمام پیش گوئیاں غلط کی ہیں...... نئے سال میں اس کی بتائی ہوئی کوئی پیش گوئی پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی۔

تب بھابی کی بہن نے بھی آزردہ سے لہجے میں کہا۔

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے کہ وہ کوئی اچھا والا نجومی نہیں تھا۔ میرے بارے میں اس نے جو بتایا ہے مجھے بھی بالکل غلط لگ رہا ہے۔“

”خواہ مخواہ میرے ہزار روپے ضائع گئے۔“ فرخندہ کو افسوس ہو رہا تھا۔

”پریشان مت ہو، میں اب تمہیں ایک اچھے نجومی کے پاس لے کر چلوں گی۔ وہ پیسے تو زیادہ لیتا ہے مگر اس کی پیش گوئیاں بالکل اصل ہوتی ہیں۔“

”نہیں بھئی...... مجھے تو تم رہنے ہی دو...... اس کی پیش گوئیوں کو میرے میاں جی فیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بیویوں کا سال تو کیا کوئی دن نہیں ہوتا...... تو ہمارے بارے میں پیش گوئیاں کیسے صحیح ہو سکتی ہیں۔“ فرخندہ آزردہ سے لہجے میں کہہ رہی تھیں جسے ان کی بھابی کی بہن سن کر ہاں میں ہاں ملا رہی تھی...... ایسا ہی کچھ ان کے ساتھ بھی تو ہوا تھا۔

عمریا بیتی جائے

آج پھر راشدہ کا سسکتا ہوا فون آیا تھا جسے سن کر میں افسردہ ہو گئی۔ یہ بچی کچھ عرصے سے مجھے روزانہ فون کر رہی ہے اور ہر فون پر مجھے یہی بتاتی تھی کہ اس کی شادی نہ ہونے کی وجہ سے اسے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

”آنٹی آپ سوچ بھی نہیں سکتیں...... مجھے اپنے ساتھ کی لڑکیوں کے سامنے کتنی شرمندگی ہوتی ہے۔“ ایک شام وہ مجھ سے بڑے تاسف سے کہہ رہی تھی...... اس کی آواز آنسوؤں کے باعث بھرائی ہوئی تھی۔

”اس میں شرمندگی کی کون سی بات ہے؟“ مجھے حیرت ہوئی۔ ”اب یہ ضروری تو نہیں ہے کہ سب سہیلیوں یا سب کزنز کی شادیاں ایک ساتھ ہو جائیں...... لائن سے شادیاں کہاں ہوا کرتی ہیں؟“

”مگر آگے پیچھے تو ہوتی ہیں ناں...... مگر میری شادی کا تو دور، دور تک کوئی امکان نہیں ہے۔“

”تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو...... کیا پتا کس کی قسمت کب کھل جائے......؟ وقت کا کوئی پتا تھوڑی ہوتا ہے......“ میں نے اسے سمجھایا۔

”آنٹی آپ بھی کیسی باتیں کر رہی ہیں...... میرے گھر میں تو آج تک کوئی عورت مجھے دیکھنے کے لیے نہیں آئی، پسند یا ناپسند کرنا تو آگے کی منازل ہیں۔“

”مگر بیٹا رشتے تو ہر لڑکی کے آتے ہیں...... خاندان سے، عزیز و اقارب میں سے...... اچھے برے...... ہر طرح کے آتے ہیں اور جب آئیں گے تو تمہارے گھر کے بڑے ٹھونک بجا کر قبول بھی کریں گے۔“

”مگر میرے اب تک نہیں آئے اور نہ ہی آئیں گے......“ وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”تم اتنی بددل کیوں ہو؟“ ایک دن جب وہ عادت کے مطابق آنسوؤں سے رندھی ہوئی آواز میں مجھ سے باتیں کر رہی تھیں...... میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میری دونوں بھابیاں میری دشمن ہیں...... وہ دونوں مجھ سے سخت نفرت کرتی ہیں...... میں بات کروں تو ہنس کر اڑاتی ہیں۔“

”اگر نفرت کرتی ہیں تو انہیں تمہاری شادی جلد سے جلد کر کے یہاں سے نکال باہر کرنا چاہیے تاکہ انہیں سکون مل جائے۔“

”نہیں، یہ بات نہیں ہے...... وہ چاہتی ہیں کہ انہیں میری صورت میں فری کی ملازمہ ملی رہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ میری شادی کسی صورت میں نہ ہو۔“

”تمہاری ایک بہن شادی شدہ ہے...... اس

سے تم کیوں نہیں کہتیں...... بہن اور بھابی میں تو فرق ہوتا ہے۔''

''میری بہن بھی بڑی مکار سی ہے...... وہ چاہتی ہے کہ جب وہ اپنے بچے لے کر اپنے میکے میں آئے...... تو میں ہمیشہ اس کی اور اس کے بچوں کی خدمت کرتی رہوں، میری ماں بہت سیدھی عورت ہیں اور اپنی بہوؤں کے ہاتھوں یرغمال بنی ہوئی ہیں...... جو وہ کہتی ہیں اُن کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہیں...... دونوں بھائی زن مرید ہیں، بجائے اس کے بھائی اپنی بیویوں پر حاوی ہوں...... میری دونوں بھابیاں ان پر چھائی ہوئی ہیں...... وہ جو کہتی ہیں میرے بھائی مانتے ہیں، میری طرف تو دیکھتے بھی نہیں۔'' راشدہ کی باتیں سن کر میرے ذہن میں وہ تمام افسانے گھوم گئے...... جہاں ایک ہیروئن غموں کے پہاڑ میں گھری ہوئی ہوتی تھی اور اس کے چاروں طرف صرف بدخواہوں کے غول تھے اور وہ مظلوم تھی۔

''اللہ تعالیٰ کسی اچھے سے ہیرو کو جلدی سے بھیج دے...... جو راشدہ کو ان ظالموں کے چنگل سے نکال کر لے جائے......'' میں اس کے لیے بڑے خشوع سے دعا مانگتی۔

ایک دن میں نے راشدہ سے کہا...... ''تم اپنی شادی کے لیے دعا مانگا کرو...... دعا مومن کا ہتھیار ہوتی ہے۔''

''اللہ آنٹی آپ بھی کیسی باتیں کر رہی ہیں...... میں تو عرصہ پانچ سال سے دعاؤں کے ساتھ، ساتھ وظیفے بھی کرتی ہوں جہاں اور جس جگہ مجھے شادی کے لیے وظائف لکھے نظر آتے ہیں وہ میں پڑھنا شروع کر دیتی ہوں...... پتا نہیں کس کو فائدہ ہوتا ہے...... مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔''

''بیٹا تم پڑھنا شروع کر دو...... گھر میں بیٹھی رہتی ہو تو تم زیادہ پریشان رہتی ہو...... پڑھو گی تو تمہاری توجہ بھی بٹے گی۔''

''آنٹی مجھے پڑھنے کا بالکل بھی شوق نہیں ہے...... جب میں اسکول میں پڑھتی تھی تو میرے سر میں ہر وقت درد رہتا تھا اس لیے میں نے ساتویں جماعت سے ہی پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔''

''راشدہ بیٹا کم از کم میٹرک تو کر لو...... پڑھائی کبھی بیکار نہیں جاتی...... ہمیشہ کام آتی ہے۔''

''ارے نہیں آنٹی...... میٹرک اور ساتویں جماعت میں کوئی اتنا لمبا چوڑا فرق نہیں ہوتا...... میں خط لکھ سکتی ہوں...... دھوبی کا حساب لکھنا آتا ہے، مہینے کے بجٹ بنانا جانتی ہوں، گھر چلانا آتا ہے، اس کا حساب کتاب کرنا اتنا اچھا آتا ہے کہ کسی پڑھی لکھی لڑکی کو بھی نہیں آتا ہوگا۔''

''وہ کیسے......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''جب کبھی میرا شوہر (آہ بھر کر کہا گیا) گھر چلانے کے لیے بالفرض دس ہزار روپے دے گا تو میں پندرہ ہزار کا حساب کر کے اس سے ہر ماہ پانچ ہزار بہ آسانی کھینچ سکتی ہوں۔ یوں بھی زندگی کے تجربے...... کتابوں میں تھوڑی لکھے ہوتے ہیں، یہ تو وقت ہمیں سکھاتا ہے کہ وقت سے بڑا کوئی استاد نہیں ہوتا۔'' اس نے کچھ ایسے سنجیدہ سے لہجے میں کہا مجھے یوں لگا کہ راشدہ کسی پختہ عمر کی تجربے کار عورت کی طرح سوجھ بوجھ رکھتی ہے۔

راشدہ کی باتیں سن کر بے حد دکھ ہوتا تھا...... ایک دن ایک بہن نے فون کر کے مجھ سے ایک خواہش کی۔ ''باجی آپ میرے بھائی کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی بتائیں جو گھر کے کام کاج میں طاق...... سمجھدار ہو...... کم از کم گریجویٹ ضرور ہو......''

''گریجویٹ تو شاید نہیں...... مگر لڑکی بڑی اچھی ہے......'' میرے ذہن میں اچانک راشدہ کا خیال آگیا۔

''نہیں آنٹی، ہمارا بھائی گریجویٹ لڑکی ہی چاہتا ہے...... وہ جاہل بیوی کا ساتھ ہرگز نہیں چاہے

گا۔'' تب میں چپ ہوگئی...... ظاہر ہے ہر ایک کی اپنی، اپنی خواہش ہوتی ہے...... میں کیوں اس سے ساتویں فیل لڑکی کی سفارش کرتی جو بڑی عمر کی بھی تھی اور جسے پڑھنے لکھنے کا شوق بالکل نہیں تھا۔

میں سوچ رہی تھی کہ اگر راشدہ کی تعلیم انٹر بھی ہوتی تو میں کسی سے یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ وہ بی اے کا امتحان پرائیوٹ دے، دے گی۔

پورے دس دن راشدہ کا فون نہیں آیا اور جب آیا تو وہ بری طرح سسک رہی تھی۔

''آنٹی، میری آخری سہیلی کی بھی منگنی ہوگئی...... صرف میں ہی بدنصیب بچی ہوں، جس کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا جس کا نہ کوئی حال ہے نہ کوئی مستقبل...... مجھے تو لگتا ہے کہ میری زندگی ......سب کی خدمت گزاریاں کرتے، کرتے ختم ہو جائے گی...... اللہ کسی کو ایسی بہن نہ دے جیسی میں ہوں، کسی کو میری فکر نہیں ہے۔'' راشدہ کی باتیں سن کر میرے بھی آنسو نکل آئے اور میں نے پوچھا۔

''بیٹا تمہاری عمر کتنی ہو چکی ہے؟'' یہ جملہ پوچھتے ہوئے میرے ذہن میں دور کہیں یہ شبہ تھا...... کہ کہیں وہ کسی دن مجھ سے یہ نہ کہہ دے کہ وہ چالیس کراس کر چکی ہے۔ ایسے میں اسے یقین دلانا مشکل ہو جائے گا کہ آج کل کسی کے بیٹے کی عمر بے شک چالیس سال کی ہو مگر اس کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اسے کم عمر لڑکی ملے جو کسی صورت بیس، بائیس سال سے زیادہ نہ ہو۔

مگر جب اس نے اپنی عمر بتائی تو میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ سارے لفظ میرے ذہن میں تحلیل ہوگئے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس سے بہت کچھ کہوں مگر میرے منہ سے ایک آواز بھی نہیں نکلی۔

اس نے رندھی ہوئی آواز میں مجھے بتایا تھا۔

''آنٹی میں پچیس فروری کو پورے سترہ سال کی ہو جاؤں گی۔'' (نوٹ یہ سو فیصد سچا واقعہ ہے)

☆☆☆

غزل

تو جو نہیں تو کچھ بھی نہیں چاہے لاکھ سجے دربار سجن
تیری دید کی آنکھیں پیاسی ہیں بس لوٹ آ اِک بار سجن

ہیرے موتی مال منال، تیرے سوا سب خام خیال
کہیں چاہ ملا کہیں چاہ ملی پر کرتے رہے انکار سجن

تو نے جب چاہا تو وصل ہوا جب چاہا ہجر کو اوڑھ لیا
تو جو چاہے تو جب چاہے تیری بات پہ کیا تکرار سجن

چاہے ہاتھ دعا سے تھک جائے چاہے کاسۂ دل خالی ہو
تجھے مانگا تھا تجھے مانگیں گے اِک بار نہیں سو بار سجن

میں کو جی میرا دل کو جا تیرے عشق میں ہوئے نہال
تیری نسبت میری خوش بختی مجھ میں عیب ہزار سجن

من اور آنکھیں گروی رکھ کر چاہ پہ سود بیاج نہ لے
دل کا سودا سچا سودا مت کر کاروبار سجن

جب آنکھیں موندوں خواب تیرے جب کھولوں تیرا خیال
میں لاکھ چھڑاؤں دامن پر تیری یاد سے نہیں فرار سجن

عشق کی بازی کھیلی ہم نے سب کچھ ہار کے جیتی ہم نے
تو نین چرا کر ہم سے ہماری جیت کو نہ ہار سجن

تجھ سنگ جوہی، بیلا، چمپا، خوشبو رنگ اور روپ
تو بچھڑا تو اب میں جوگن کیسا ہار سنگھار سجن

شاعرہ: اُمِّ ثمامہ، جھڈو سندھ



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆ عروبہ ناز......کوٹلی

ہر بار گرہ دے کہ کسی آس نے جوڑا
ہر بار میں دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا ہوں

☆ سیدہ رفیعہ ابدالی......کراچی

قلق انہیں نہیں گر دوستوں کے چھٹنے کا
طبیعت اپنی بھی کچھ، کچھ سنبھلتی جاتی ہے

☆ جبیں ہاشمی......بھیرہ

کوئی پاتال تھا جس میں اتر جاتے تھے ہم دونوں
جہاں بس دل دھڑکتے تھے وہ خلوت یاد آتی ہے

☆ بشریٰ باجوہ، اوکاڑہ

ہواؤں میں عجب سی بے کلی ہے
دلوں کے بادباں سمٹے ہوئے ہیں
ادھوری خواہشوں کا غم نہ کرنا
کہ سارے خواب کب پورے ہوئے ہیں

☆ صبا کمال......فیصل آباد

عمر رائگاں کردی تب یہ بات مانی ہے
موت اور محبت کی اِک نئی کہانی ہے
کھیل جو بھی تھا جاناں اب حساب کیا کرنا
جیت گو کسی کی ہو، ہم نے ہار مانی ہے

☆ نگہت اعوان......سرگودھا

جو شاد پھرتے تھے کل آج چھپ کے روتے ہیں
ہزار شکر غمِ پائدار اپنا ہے
اسی لیے تو یہاں لوگ ہم سے جلتے ہیں
کہ جی جلانے میں کیوں اختیار اپنا ہے

☆ شہلا محمود......واہ کینٹ

اِک دیا دل میں جلانا بھی، بجھا بھی دینا
یاد کرنا بھی اسے روز بھلا بھی دینا
کیا کہوں یہ مری چاہت ہے کہ نفرت اس کی
نام لکھنا بھی مرا، لکھ کے مٹا بھی دینا

☆ زرینہ خان......بارہ ہو

میرا معیارِ وفا ہی مری مجبوری ہے
رخ بدل کر بھی تجھے اپنے مقابل پایا
نذر کرتا رہا میں پھول سے جذبات اسے
جس نے پتھر کے کھلونوں سے مجھے بہلایا

☆ ارم......کراچی

نہیں سجدے کیے ہم نے کبھی غیروں کی چوکھٹ پہ
ہمیں جس کی ضرورت ہو خدا سے مانگ لیتے ہیں

☆ فرحت احمد......گلشن حدید، کراچی

نہیں فرصت یقیں مانو ہمیں کچھ اور کرنے کی
تری یادیں، تری باتیں بہت مصروف رکھتی ہیں

☆ بشریٰ ملک......ٹیکسلا

نہیں اِک شخص بھی مخلص اگر تم سے جہاں بھر میں
کمی تم ذات میں اپنی کہیں کوئی خطا ڈھونڈو

☆ جبیں نیاز......ملتان

یہ کس مقام پہ سوجھی تمہیں بچھڑنے کی
کہ اب تو جا کے کہیں دن بدلنے والے تھے

☆ نرگس نسیم......صابہ موہڑہ

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

☆ نگہت حسین......اسلام آباد
اس قدر ظرف تو رکھتے ہیں زمانے والے
زندگی چھین کے جینے کی دعا دیتے ہیں
☆ رابعہ عمران......ڈی جی خان
ہماری آنکھ میں کب دیر تلک ٹھہرا ہے کوئی
یہ تو تم تھے کہ پہلی نگاہ میں اپنے سے لگے
☆ فصیحہ علی......حیدر آباد
ہے قائم تجھ سے میری سانسوں کا تسلسل
نہیں تجھ سا کوئی تیرے ہی مقابل
☆ حمیرا نوشین......منڈی بہاؤ الدین
جدائی بھی نہ ہوتی زندگی بھی سہل ہو جاتی
جو ہم اِک دوسرے سے مسئلہ تبدیل کر لیتے
☆ فصیحہ آصف خان......ملتان
راستے مجھ کو لیے پھرتے ہیں قریہ قریہ
میں چلوں تیری طرف فاصلہ بڑھتا جائے
☆ کوثر خالد......جڑانوالہ
وطن کے ہیں اگر کانٹے تو بھر لو اپنے دامن میں
اگر ہوں پھول پردیسی نہ چھونا بے وفا ہوں گے
☆ مسز فرح امجد......ٹاؤن شپ، لاہور
ابھی بھرم کے پھول کھلے ہی رہنے دو
جانے کب پتّی پتّی بکھر جائے
☆ صائمہ سجاد......کوہاٹ
حالات کی ضربوں نے صورت ہی بدل ڈالی
مجھ سے مری تصویر ذرا بھی نہیں ملتی
☆ پروین افضل شاہین......بہاول نگر
ملا نہ وہ تو ظفر لوٹ کر نہ آئیں گے
یہ شرط باندھ کر اس بار گھر سے نکلے ہیں
☆ ارم خان......ڈی جی خان
ایک بوجھ وہ دل پہ ڈال گئے
گر حال سے وہ بے حال گئے
دل مانگا اور پھر توڑ دیا
وجہ پوچھی تو پھر ٹال گئے

☆ ساجدہ ظفر......کمالیہ
دلوں میں پھول اُگائیں نئی محبت کے
کدورتوں کو دلوں سے مٹائیں اب کے برس
کچھ کرو اب کے بہاروں کا ایسا استقبال
بہاریں آئیں تو آ کر نہ جائیں اب کے برس
☆ سائرہ ارم......کمالیہ
میری زندگی کا ساتھی میرے بخت کا ستارا
تیری آرزو نے لوٹا تیری جستجو نے مارا
میں بساطِ زندگی پر غم آرزو کی بازی
کبھی ان کی شہ پہ جیتا کبھی دل کی شہ پہ ہارا
☆ ارم کمال......فیصل آباد
اگر جینا ہی ٹھہرا ہے تو اس میں دلکشی رکھنا
مرے لوگو! ہمیشہ زندگی کو زندگی رکھنا
☆ صبا......لاہور
جو ہو سکے تو بُھلا دینا رنجشیں دل کی
محبت کا تقاضا ہے کہ درگزر کرنا
تیرے طرزِ تغافل سے کیا گلہ ہمیں
شاید ہمیں آتا ہی نہیں دلوں میں گھر کرنا
☆ زبیدہ علی...... حویلیاں
نہ جانے کیا ہوا ہے سال بھر میں
دیا روشن سے مدھم ہو گیا ہے
ہمیں معلوم ہے اتنا کہ ایک سال
ہماری عمر سے کم ہو گیا ہے
☆ ثوبیہ ظہور......ضلع اٹک
بات اتنی ہے کہ اِک موڑ پہ رستہ بدلا
دو قدم ساتھ چلا وہ بھی ہزاروں کی طرح
بادباں کھولے جو میں نے تو ہوائیں پلٹیں
دور ہوتا گیا اِک شخص کناروں کی طرح
☆ شہلا احمد......لاہور
تُو تو سرمایۂ ہستی ہے تیرا ذکر ہی کیا
ہم تو دشمن کو بھی اے دوست دُعا دیتے ہیں

☆☆☆

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



اسپرنگ چکن

اجزا: مرغی کا گوشت، آدھا کلو۔ (گولڈن پیس) سویا ساس، دو کھانے کے چمچ۔ نمک، کالی مرچ، حسبِ ذائقہ۔ چائیز سالٹ، دو چائے کے چمچ۔ دکنی مرچ ،(وائٹ پیپر) حسبِ ذائقہ۔ اراروٹ، دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب: چکن کو کانٹے سے اچھی طرح گود لیں۔ سویا ساس میں تمام اشیا ملا کر اس میں مرغی میرینیٹ کر کے ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ کڑاہی میں تیل درمیانی آنچ پر گرم کر کے ایک، ایک پیس اس میں ڈال کر سنہرا ہونے تک تل لیں۔

ساس کے لیے اجزا...... کیچپ، دو کھانے کے چمچ۔ چلی ساس، دو کھانے کے چمچ۔ سویا ساس، دو چائے کے چمچ۔ لال یا سفید سرکہ ایک چائے کا چمچ۔ دکنی مرچ، آدھا چائے کا چمچ۔ یہ تمام چیزیں مکس کر کے ساس بنالیں۔ تلی ہوئی چکن ساس کے ساتھ کھائیں

عرشیہ جنید' کراچی

فرائیڈ پران (جھینگے)

اشیا: جھینگے، ایک کلو۔ میدہ، دو کھانے کے چمچ۔ سرکہ، ایک پیالی۔ کارن فلاور، دو کھانے کے چمچ۔ کالی مرچ، آدھا چائے کا چمچ۔ اوریگانو، آدھا چائے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ چائنیز نمک، ایک کھانے کا چمچ۔ ہری مرچ، چار سے پانچ عدد۔ ہرا دھنیا، باریک کاٹ لیں، دو چائے کے چمچ۔ انڈے، دو عدد۔ بیکنگ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔

ترکیب: جھینگے اچھی طرح صاف کر کے نمک اور سرکے میں پندرہ منٹ کے لیے چھوڑ دیں اور پھر جالی میں نکال کر رکھ دیں۔ ایک پیالے میں تمام اشیا اچھی طرح انڈے کے ساتھ مکس کر لیں اور اس میں جھینگے میرینیٹ کر کے کچھ دیر رکھ کر ایک، ایک کر کے تل لیں۔

جبین نیاز، ملتان

چٹپٹی مچھلی

اشیا: مچھلی، ایک کلو۔ نمک حسبِ ذائقہ۔ لہسن کے جوئے، دس سے بارہ عدد۔ کٹی ہوئی لال مرچ، دو کھانے کے چمچ۔ سفید زیرہ، دو کھانے کے چمچ۔ ثابت دھنیا، دو کھانے کے چمچ۔ املی کا گودا، ایک پیالی۔ چاٹ مسالا، ایک کھانے کا چمچ۔ تیل حسبِ ضرورت۔

ترکیب: مچھلی کو صاف دھو کر خشک ہونے رکھ دیں۔ دھنیا اور زیرے کو توے پر ہلکا سا بھون کر موٹا موٹا کوٹ لیں۔ مسالا بنانے کے لیے پہلے املی کی چٹنی بنالیں جس کے لیے املی کے رس میں کٹی ہوئی لال مرچ، بھنا ہوا کٹا ہوا دھنیا، زیرہ ڈال دیں اور پانچ سے سات منٹ ہلکی آنچ پر پکا کر گاڑھی ہونے پر چولھے سے اتار لیں۔ لہسن کے جوؤں کو دھو کر چھیل لیں اور اس میں نمک ملا کر مچھلی پر اچھی طرح مل لیں۔ املی کی چٹنی مکمل طور پر ٹھنڈی ہو جائے تو مچھلی کے قتلوں کو اس میں ڈال کر پندرہ سے بیس منٹ کے

لیے رکھ دیں۔ فرائنگ پین میں تیل کو گرم کریں اور مسالا لگے ہوئے مچھلی کے قتلوں کو ہلکا سنہری فرائی کر کے نکال لیں۔ یہ قتلے تھوڑے سے ٹھنڈے ہو جائیں تو ان پر چاٹ مسالا چھڑک کر دوبارہ سے تیل میں سنہری فرائی کر کے نکال لیں۔

زرمینہ خان، بارہ کہو

سلاد رول

اشیا: چکن بریسٹ، ایک عدد۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ پسا ہوا لہسن، ایک چائے کا چمچ۔ کٹی ہوئی کالی مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ سرکہ دو کھانے کے چمچ۔ براؤن شوگر، ایک چائے کا چمچ۔ سلاد کے پتے، حسبِ ضرورت۔ بند گوبھی، آدھی پیالی۔ گاجر، آدھی پیالی۔ زیتون، دس سے بارہ عدد۔ شملہ مرچ، چار کھانے کے چمچ۔ مایونیز، دو کھانے کے چمچ۔ مسٹرڈ پیسٹ، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ سموسوں کی چوکور پٹیاں، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: چکن کو صاف دھو کر خشک کر لیں اور ایک پیالے میں نمک، لہسن، کالی مرچ، سرکہ اور براؤن شوگر ملا کر اس کو میرینیٹ کریں۔ آدھا گھنٹا رکھنے کے بعد اسے ہلکی آنچ پر پکنے رکھ دیں۔ چکن بریسٹ جب اپنے ہی پانی میں گل جائے تو اسے چولھے سے اتار لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر اس کے پتلے پارچے کاٹ لیں۔ گاجر اور بند گوبھی کو کش کر لیں، شملہ مرچ کے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں۔ مایونیز میں گاجر، بند گوبھی، شملہ مرچ اور زیتون ملائیں اور ساتھ ہی مسٹرڈ پیسٹ بھی شامل کریں۔ سلاد کے پتوں کو دھو کر خشک کر کے رکھ لیں۔ سموسے کی پٹیوں کو توے پر ہلکا سا سینکیں اور سلاد کے پتے پر رکھ دیں۔ اس پر گاجر اور گوبھی کا مکسچر پھیلا کر لگائیں پھر چکن کا پارچہ رکھیں اور چاہیں تو دوبارہ سے گاجر اور گوبھی کا مکسچر لگا کر سلاد کے پتے کو ٹائٹ رول کر لیں۔ دس منٹ فریج میں رکھنے کے بعد اس رول کو چاہیں تو قتلوں کی طرح کاٹ لیں یا رول کی شکل میں ہی خوب صورت سے پلیٹر میں سجا کر پیش کریں۔

نفیسہ آرا، دبئی

چاکلیٹ شیفون

اشیا: کوکنگ چاکلیٹ، سو گرام۔ جیلاٹن پاؤڈر، دو کھانے کے چمچ۔ چینی، ایک پیالی۔ آئسنگ شوگر، دو کھانے کے چمچ۔ پانی، آدھی پیالی۔ انڈے کی سفیدی، دو عدد۔ فریش کریم، دو پیالی۔

ترکیب: پانی ابالیں اور ابال آنے پر اس میں چینی ڈال کر دس سے بارہ منٹ پکا کر شیرہ بنائیں اور چولھے سے اتار لیں۔ جیلاٹن میں دو کھانے کے چمچ نیم گرم پانی ملا کر اسے ڈبل بوائلر پر پکائیں پھر اسے چینی کے شیرے میں ملا کر ٹھنڈا کرنے رکھ دیں۔ چاکلیٹ کے چھوٹے ٹکڑے کر کے پیالے میں ڈالیں اور پیالہ ابلتے ہوئے پانی میں رکھ کر پگھلا لیں۔ جب پگھلنے پر آ جائے تو اس میں ایک پیالی کریم ڈال کر ملا لیں اور چولھے سے اتار لیں۔ صاف، خشک پیالے میں انڈے کی سفیدیوں کو الیکٹرک بیٹر سے سخت ہونے تک پھینٹیں۔ پھر جیلاٹن مکسچر کو برف کے پیالے پر رکھ کر پھینٹیں اور اس میں آدھا چاکلیٹ کا مکسچر ملا لیں۔ اس مکسچر کو انڈے کی سفیدیوں میں ملائیں۔ شیشے کے پیالے میں چاکلیٹ کا آدھا مکسچر ڈالیں پھر اس پر انڈے کا تیار شدہ مکسچر ڈال دیں اور ٹھنڈا کرنے فریج میں رکھ دیں۔ کریم کو پیکٹ سے نکال کر صاف خشک پیالے میں ڈالیں اور اس میں آئسنگ شوگر ڈال کر ٹھنڈی کر لیں۔ پھر برف کے پیالے پر رکھ کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ ٹھنڈے کیے ہوئے پیالے کو فریج سے نکال کر اس پر کریم پھیلا کر ڈالیں اور اوپر سے چاکلیٹ چپ سے سجا دیں۔

عنبرین خالد، حیدر آباد

☆☆☆

سندیسے

پاکیزہ بہنیں





ضرب جمع تقسیم

ہمارا معاشرہ بھی کیا ہے۔ جوتے اے سی والے شوروموں میں بکتے ہیں، کھانے پینے کی چیزیں فٹ پاتھ پر فروخت ہوتی ہیں، جہاں چاول درمیانہ سو روپے کلو ہے لیکن یہاں موبائل سم مفت میں ہے۔ آٹا، گھی اور سودا سلف کا حصول بہت دشوار ہے مگر ٹارگٹ کلنگ عام کام ہے، جہاں پلیٹیں صاف کرنے کے لیے اصل لیموں کا استعمال کیا جاتا ہے، شربت میں مصنوعی لیموں استعمال ہوتا ہے۔

یہ ہے ہمارا لائف اسٹائل!

لوٹا

نہیں بکتا لوٹا کوئی زمانے میں
خواہ وہ اسمبلیوں میں ہو یا غسل خانے میں
لوٹے اس جہاں میں صورتِ خورشید جیسے ہیں
اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر نکلے، اِدھر ڈوبے

از: سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ

نہ جانے کیوں

میرے گھر کے لان میں
ہر رنگ کا پھول کھلا ہے
مگر میرا دل ہے
مرجھایا سا

از: نجمہ اصغر، کراچی

یادیں

یہ یادیں بھی ناں، چنبیلی کے بوٹے کے مانند ہوتی ہیں بس آنکھیں موندو اور ان کے ان خوشبوؤں کی نگری میں جا پہنچو، جہاں ہر طرح کے علامتی غنچے کھلے رہتے ہیں۔ کبھی نگاہ غنچۂ انتظار کو فوکس کر لیتی ہے تو اس سے منسوب کئی یادوں کے در وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر کبھی نظر سرخ گلاب کے علامتی محبت بھرے پھول پر جا ٹھہرے تو بس پل بھر میں فضا میں افسانوی و رومانوی سی ہو جاتی ہیں اور پتا بھی نہیں چلتا کہ اچانک کتنی ساعتیں گزر گئیں۔

پروین افضل شاہین، بہاول نگر

حماقت

حق تجھ کو تو پانے کا جتایا ہی نہیں ہے
جانِ جہاں ہم نے تو وفا کی عبادت کی ہے
تیری آنکھوں کی شرارت کو محبت جانا
کم فہم تھے سو ہم نے حماقت کی ہے
یہ جو محفل میں ویرانے کا گماں ہوتا ہے
کس سے کہیں کس نے عنایت کی ہے

سیدہ جیا عباس، تلہ گنگ

مہکتا ہوا گلاب

جب زندگی کا درد بڑھتا چلا گیا
ہمارا ان سے رابطہ گھٹتا چلا گیا
وہ بادِ نسیم تھا تو ہم مہکتا ہوا گلاب
ہم دیکھتے رہے اور چاند گھٹتا چلا گیا
وہ حسن وہ جوانیاں وہ نادانیاں کہاں
وقت کی آنچ پہ سراپا پگھلتا چلا گیا

وہ اِک سراب تھا یا ایک خوب صورت خواب
جو ماضی کی تپتی ریت میں دھنستا چلا گیا
از: نورین، کراچی

تھکن

مشکل راستے چلتے، چلتے تھک جاتے ہیں
ہم تجھ تک آتے، آتے تھک جاتے ہیں
دھیرے، دھیرے دن راتوں میں کھو جاتے ہیں
یاد تجھے ہم کرتے، کرتے تھک جاتے ہیں
رہتے، رہتے رہ جاتی ہے دل میں حسرت
ارمان پورے ہوتے، ہوتے تھک جاتے ہیں
ڈھلتے، ڈھلتے ڈھل جاتا ہے وقت کا سورج
عمر کے پنچھی اڑتے، اڑتے تھک جاتے ہیں
مرسلہ: شبنم کنول، گاؤں پاپا نگری

وہ اور میں

وہ مجھ سے
کل ملنے آ رہی ہے
اور......
میرے ہاتھوں سے
صبر کی لکیر
اُڑ کر
چلی گئی ہے
شاعر: کلیم دانش
مرسلہ: فردوس شاہی، لاڑکانہ

خواہش

اپنی اطاعت کا حسن و جمال دے
مجھے اپنی محبت میں تو ڈال دے
طلبِ دنیا میں ہوں غافل تیری یاد سے
گناہوں کا زنگ میرے دل سے اتار دے
میرے نفس کو پاکی میں ڈھال دے
میری روح کو تو سنوار دے
بس اتنی سی خواہش میری ہے یا اللہ
میرے من سے تو دنیا نکال دے
مرسلہ: بشریٰ باجوہ......اوکاڑہ

جب لوگ

جب لوگ ہی جذبوں کی توقیر نہیں کرتے
ہم بھی کوئی دکھ اپنا تحریر نہیں کرتے
دل چیرتا ہے کیسے لہجے کا روکھا پن
کرتی ہے زبان وہ کچھ جو تیر نہیں کرتے
از: ارم کمال، فیصل آباد

اپنا

اپنے بھی سوتیلے ہیں
بیگانے بھی سوتیلے ہیں
ماں، باپ کا وہ واحد رشتہ
جو صرف اپنا ہوتا ہے
مرسلہ: مسز فرح امجد، ٹاؤن شپ لاہور

انتظار

آج کے دور میں
دقیانوسی سی لڑکی ہوں
رستہ دیکھتی رہتی ہوں
شہزادے کا......
شاعرہ: فریدہ خانم، لاہور

سید بہادر علی شاہ کے نام

کبھی فرصت کے لمحوں میں میرے دل میں تم آ جانا
تمہیں جاناں سکھا دیں گے محبت کس کو کہتے ہیں۔
از: سیدہ حیا عباس شاہ، تلہ گنگ

پاکیزہ مصنفات کے نام

جو اس کے چہرے پر رنگِ حیا ٹھہر جائے
تو سانس وقت سمندر، ہوا ٹھہر جائے
وہ مسکرائے تو ہنس، ہنس پڑیں کئی موسم
وہ گنگنائے تو بادِ صبا ٹھہر جائے
از: صبا نور، لیہ

☆☆☆

ادارہ



حضرت یونس علیہ السلام

حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اور نبی تھے۔ آپ موصل کے رہنے والے تھے اور حضرت ہود علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نینوا کے باشندوں کی طرف ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا۔ اس زمانے میں نینوا میں قوم ثمود آباد تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے مرتبہ نبوت کا اعلان کرنے کے بعد بستی والوں کو دعوت ایمان دی اور بہت عرصے تک دعوت دیتے رہے مگر کوئی بھی ایمان نہیں لایا بلکہ حضرت یونس علیہ السلام کو طعنے دینے شروع کر دیے کہ اگر تمہیں نبی ہونے کا دعویٰ ہے تو جاؤ اپنے رب سے عذاب منگوالو، آخر حضرت یونس علیہ السلام نے تنگ آ کر اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے عذاب کی درخواست کی جسے منظور کر لیا گیا اور یہ کہا کہ تین دن کے اندر عذاب نازل ہوگا۔ چنانچہ وقتِ مقررہ پر عذاب نازل ہونے لگا تو تمام قوم نے اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری شروع کر دی اور بت پرستی سے توبہ کر کے ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے عذاب کو روک دیا لیکن حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر چل دیے۔ آپ کا یہ فعل اللہ کو ناپسند آیا لہٰذا آپ کو مچھلی کے پیٹ میں جانا پڑا جو تنور کے مانند تھا تو مچھلی کے پیٹ میں آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور اطاعتِ الٰہیٰ میں کمی کا اقرار کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور آپ کو دوبارہ بستی والوں پر احکام نبوت سرانجام دینے کا حکم دیا۔ وہ دعا جو حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں پڑھی وہ حسبِ ذیل ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کی دعا

لَآاِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْن

ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے، میں قصورواروں میں سے ہوں۔ (پ ۱۷ سورۂ انبیاء آیت ۸۷)

یہ حضرت یونس علیہ السلام کی مشہور دعا ہے جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں خدا سے کی تھی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ خدا کے حکم کا انتظار کیے بغیر اپنی بستی والوں کو چھوڑ کر چلے گئے تھے اور کشتی میں سوار ہوگئے تھے۔ وہاں سے پانی میں کود گئے اور مچھلی نے آپ کو نگل لیا پھر اپنی خطا کا اعتراف کیا تو مچھلی سے نجات حاصل ہوئی۔

''یہ آیت ،آیت کریمہ کہلاتی ہے اس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں۔ جو شخص کسی ایسی مصیبت و پریشانی میں مبتلا ہو جس کا کوئی خاطر خواہ ازالہ ہوتا ہوا نظر نہ آتا ہو تو اسے چاہیے کہ سوا لاکھ مرتبہ اس آیت کا ورد کرے، اگر خود نہ پڑھ سکتا ہو تو اپنے اہلِ خانہ اور پڑھنے والوں کے ذریعے سوا لاکھ مرتبہ اس آیت کا ورد کروائے۔ انشاء اللہ جو مراد اللہ کے حضور پیش کرے گا ضرور پائے گا۔ کاروبار، ملازمت اضافہ رزق، لڑائی جھگڑا، شادی یا جو بھی مسئلہ ہوا انشاء اللہ ضرور حل ہوگا۔

اس آیت کے باطنی اسرار بھی بے پناہ ہیں۔ جو مرید یا طالبِ صادق اپنے رہنما کے کہنے سے اس آیت کا ورد رمضان المبارک میں کرے یا اعتکاف میں کرے تو اس پر بے شمار غیبی حقائق کا مشاہدہ ہوگا اور روحانی منازل بڑی تیزی سے طے ہوں گی۔ اس کے اثرات جلالی ہیں۔

حضرت طالوت علیہ السلام کی دعا

حضرت طالوتؑ ایک اسرائیلی بادشاہ تھے۔ اللہ تعالیٰ

نے آپ کو بادشاہت عطا کی کیونکہ آپ شجاعت اور علم میں اپنے زمانے میں یکتا تھے۔ انہیں ایک ظالم بادشاہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لہٰذا جب طالوت علیہ السلام اور آپ کے ساتھی جالوت کی فوج کے مقابلے کے لیے گئے تو انہوں نے اللہ کے حضور دعا مانگی کہ یاالٰہی! ہمیں کافروں کے مقابلے میں فتح عطا فرما اور وہ دعا یہ ہے۔

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ o

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ہم میں صبر کو زیادہ کردے، ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے گروہ پر ہمیں فتح عطا فرما (پ۲، سورۃ بقرہ آیت ۲۵۰)

جہاد کے موقع پر مسلمانوں کے لیے سجدہ ریز ہو کر اس دعا کا پڑھنا بہت ہی مفید ہے، تبلیغ کرنے والے کا جب کسی ظالم سے واسطہ پڑ جائے اور وہ طرح، طرح کے دکھ اور مصائب دینا شروع کردے تو اس دعا کا ورد انشاء اللہ دشمن کو پسپا کردے گا۔

یہ راہِ خدا میں جہاد کرنے والے غازی کی دعا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ جب حضرت طالوت کی فوج دشمن جالوت کی فوج کے مقابلے پر آئی اور ان کا آمنا سامنا ہوا تو حضرت طالوت کے ساتھی غازیوں نے مولا کریم سے صبر، استقامت اور فتح طلب کی۔ مادی اسباب کی موجودگی میں بھی کافروں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے تائید الٰہی و نصرتِ الٰہی پر نظر رہنی چاہیے۔

حضرت ایوب علیہ السلام

حضرت ایوب علیہ السلام اللہ کے وہ پیغمبر ہیں جن کی زندگی پیغمبرانِ حق میں ایک مثالی صابر کی تھی کیونکہ صبرِ ایوب بڑا مشہور ہے اور آپ کا جسم ایسی تکلیف میں مبتلا رہا کہ جسے برداشت کرنا بڑا مشکل تھا لیکن آپ نے اس تکلیف پر اتنے لمبے عرصے کے لیے صبر کیا کہ آپ کا صبرِ بے مثل اور لافانی بن گیا۔

حضرت ایوب علیہ السلام بڑے مالدار اور خوشحال تھے، اللہ تعالیٰ نے بڑی شان و شوکت اور عظمت و عزت دی تھی۔ بے شمار نعمتوں سے مالا مال کیا تھا لیکن اتنی نعمتیں پاکر بھی آپ ہر وقت یادِ الٰہی میں مصروف رہتے اور اللہ کی راہ میں اپنا تن من دھن قربان کرتے رہتے تھے۔ پھر دیگر انبیا کی طرح آپ پر بھی سخت امتحان آیا مگر آپ برگزیدہ نبی تھے۔ اللہ کی طرف سے دی گئی آزمائش پر پورے اترے آپ کا مال و متاع سب راہِ خدا میں جاتا رہا۔ حتیٰ کہ بیماری اور مصیبت نے آگھیرا۔ یہاں تک کہ آپ کے جسم میں کیڑے پڑ گئے آپ شہر چھوڑ کر ویرانے میں چلے گئے مگر وہاں بھی اتنی تکلیف کے باوجود یادِ خدا سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں ہوئے آخر سو سال کی طویل بیماری کے بعد آپ نے اللہ کے حضور شفایابی کی دعا مانگی تو آپ شفایاب ہوگئے......اور اللہ تعالیٰ نے پھر اپنی نعمتوں سے نواز دیا اس شفایابی کے لیے آپ نے جو دعا مانگی تھی وہ دعائے ایوب کے نام سے مشہور ہے اور دعا حسبِ ذیل ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ o

ترجمہ: کہ مجھ کو تکلیف پہنچ رہی ہے اور تو (تو) سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔

(پ ۱۷، سورۃ انبیاء آیت ۸۳)

یہ وہ دعا ہے جو حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنی طویل بیماری کی شفایابی کے لیے پڑھی تھی اور اس دعا سے زاہدوں اور اللہ کی راہ پر چلنے والوں کو یہ سبق ملتا ہے کہ شدید سے شدید مصیبت میں نہیں گھبرانا چاہیے اور نہ ہی مایوس ہونا چاہیے۔ بلکہ ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی رہنا چاہیے۔ حضرت ایوبؑ نے جب مندرجہ بالا دعا پڑھی تو اللہ کی رحمت امڈ آئی۔ وہ اولاد جو چھن گئی تھی وہ واپس مل گئی۔ جو شان و شوکت ختم ہوئی تھی وہ دوبارہ بحال ہوگئی۔ گویا کہ اس دعا کے اثر سے حضرت ایوب علیہ السلام کی ہر تکلیف رفع ہوگئی۔

☆☆☆



شوابے ہومیو کلینک





اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

آنکھوں کا مسئلہ

کنیز فاطمہ..........رحیم یار خان

محترم، میری بیٹی کی عمر دس سال ہے۔ پیدائشی اس کی ایک آنکھ بند تھی پھر کچھ دن بعد ٹھیک بھی ہوگئی۔ تین سال کی عمر میں اس نے قریب سے ٹی وی دیکھنا شروع کردیا تو اس کی آنکھوں سے پانی خارج ہونے لگا اور لال ہونا شروع ہوگئیں۔ اب اس کی دائیں آنکھ بڑی اور بائیں آنکھ چھوٹی محسوس ہوتی ہے۔ آنکھوں میں خارش ہوتی ہے، جب خارش ہوتی ہے تو وہ لال ہوجاتی ہیں۔ جو آنکھ چھوٹی ہے اس میں زیادہ خارش ہوتی ہے اسے ملتی بھی ہے اور اس سے کبھی کبھی پانی بھی نکلتا ہے۔ نظر بھی کچھ کمزور ہوگئی ہے۔ کوئی اچھی دوا تجویز کردیں۔

جواب: اب تک آپ نے کیا علاج کیا؟ یہ نہیں لکھا۔ بچی کو ماہر امراضِ چشم کو ضرور دکھائیں۔ فی الوقت ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Euphrasia 30 اور Ruta 30، Belladona 30 کے ۵،۵ قطرے دن میں ۳ مرتبہ آدھا کپ پانی میں ڈال کر پلائیں۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

اپریل 2015

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

____

اور CMS Eye Drops کا ۱،۱ قطرہ دن میں ۳مرتبہ آنکھوں میں ڈالیں ۔ ۳ماہ بعد دوبارہ کیفیت بتائیں۔کھانے میں گاجراور بادام کا استعمال بڑھادیں۔

☆☆☆

پتّے میں پتھریاں

نازش کریم.................بہاولپور

مجھے تقریباً ایک سال سے پتّے میں پتھریاں ہیں جو کہ سائز میں بہت چھوٹی چھوٹی ہیں .... میں پہلے ایلو پیتھک اور ہومیو پیتھک کی دوائیں کھا چکی ہوں۔اب حکیم کا علاج ہو رہا ہے۔لیکن پتھریاں ابھی اسی طرح ہیں۔ڈاکٹروں نے آپریشن بتایا ہے۔برائے مہربانی مجھے اس کا اچھا سا علاج ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے بتائیں۔ میں آپ کو بہت دعائیں دوں گی۔

جواب۔ہر قسم کی چکنی غذا اور بادی چیزوں سے پرہیز کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Chelidonium Q اور Calc.carb30 کے 5,5 قطرے آدھے کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

☆......☆......☆

عورتوں میں گنج پن

نسرین...........بہاولنگر

میری عمر 32 سال ہے۔ڈاکٹر صاحب میری زیادہ پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ میرے سر کے بال ایک سال کے اندر تیزی سے گرنے کی وجہ سے سر میں کئی جگہ گنج ہوگیا ہے۔سر کی جلد سرخ نہیں کالی کالی



سی ہے جب بال اترتا ہے سر سے تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے جڑ سے اکھاڑا ہے۔ میرے بال بہت زیادہ تھے۔اب بہت کم رہ گئے ہیں۔اور اب بھی مسلسل گر رہے ہیں۔ مجھے زیادہ پریشانی اس بات کی ہے کہ جو بڑا گنج ہے وہ ماتھے کے اوپر ہے اور ڈر ہے کہ ماتھا خالی نہ ہو جائے۔

جواب۔غذا میں نمک، چکنائی اور میٹھی چیزوں کو کنٹرول کریں، چہل قدمی کیا کریں۔اپنے آپ کو مصروف رکھیں، پانی کا استعمال بڑھائیں۔ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں Calc carb 200 کے پانچ قطرے ہفتہ میں ایک دفعہ لیں۔ Bacilinum 200 کے 5 قطرے ہر 15 دن بعد لیں۔جس دن یہ دوائیں استعمال کریں اس دن کوئی اور دوا استعمال نہ کریں۔ Graphites30 کے 5 قطرے ½ کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔

☆......☆......☆

بچوں کو بھوک کیوں نہیں لگتی؟

ماریہ نذیر.................کوٹ ادّو

میری بچی بڑی ذہین ہے، نرسری میں پڑھتی ہے، بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔وہ روٹی بالکل نہیں کھاتی، نہ چاول شوق سے کھاتی ہے چند ایک فروٹ کھالیتی ہے۔فیڈر میں دو حصے دودھ ہوتا ہے اور ایک حصہ پیپسی، چینی نہیں ڈلواتی۔اکثر رات کو پیشاب کر دیتی ہے، جسمانی طور پر بالکل ٹھیک ہے نہ اسے کبھی بخار ہوا نہ موشن...... یہ بھی بتائیں کہ پیپسی



والا دودھ اس کے لیے نقصان دہ تو نہیں۔ کوئی اچھی سی دوا بھی بتائیں۔ شکریہ۔

جواب۔ اکثر مائیں بچوں کے متعلق یہ شکایت کرتی ہیں کہ ان کے بچے کو بھوک نہیں لگتی یا وہ صحیح سے نہیں کھاتے۔ اس کی وجوہات ہیں، نمبر 1: آپ کی محبت کہ آپ اس کو سب کچھ کھلا دینا چاہتے ہیں اس کے پیٹ (معدے) کی گنجائش سے زیادہ۔

نمبر 2: بار بار کھلانا، کولڈ رنک، شربت چپس، بسکٹ ٹافیاں کھلانا۔ جب ہم بچوں کو یہ سب چیزیں کھلاتے رہیں گے تو بھوک ان کو کب لگے گی۔

نمبر 3: کوئی اندرونی بیماری یا خرابی جو عموماً کم ہوتی ہے۔ آپ اپنی بچی کو عمر کے حساب سے کھلائیں اور پانی پلائیں۔ پیک شدہ اور کیمیکل سے بنی چیزوں سے بچائیں۔ صاف، تازہ، قدرتی غذا دیں۔ کولڈ رنکس کوئی بھی اور یہ سب بازاری شربت کلر اور ایسنس کا مجموعہ ہوتے preservatives ہیں۔ یہ انتہائی مضرِ صحت ہیں بلکہ درحقیقت زہر ہیں۔ فیڈر سے کبھی بچوں کو دودھ نہ پلائیں یہ بیماری کا منبع ہے۔ بچی کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Alfalfa Q کے 5, 5 قطرے اور Calc.Phos30 کے 3, 3 قطرے آدھے کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

☆......☆......☆

انجائنا

لعل جان............کوئٹہ

میری عمر 60 برس ہے، شادی شدہ گھریلو خاتون ہوں، عرصہ دو سال سے مجھے دل کی تکلیف ہے۔ آج کل مجھے سردی لگنے سے بھی سینے میں آگے پیچھے درد ہوتا اور جبڑوں اور بائیں کہنی تک ہوتا ہے۔ مالش کرنے اور ٹکور سے کچھ دیر کے لیے آرام آجاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبان نے جو دوائیاں تجویز کیں وہ ایک ایک سال تک لیں۔ ان دوائیوں سے سر بوجھل ہوجاتا ہے اور کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ مجھے چلتے وقت گھٹن ہوتی ہے۔ جب ٹھہر جاتی ہوں تو درد اور گھٹن ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اب زیادہ درد کے وقت صرف زبان کے نیچے رکھنے والی گولی استعمال کرتی ہوں۔ میں اب ہومیو ادویات استعمال کرنا چاہتی ہوں۔ آپ میرے لیے دوائی تجویز کریں۔ ایکو کے مطابق دل کا ایک والو کمزور ہے۔ اب جبکہ موسم بدل رہا ہے مجھے سینے میں پیچھے یعنی پشت میں درد زیادہ ہوتا ہے۔ جب زیتون کے تیل کی مالش کرتی ہوں تو درد اور اکڑن سے آرام آنا شروع ہوجاتا ہے۔ برائے کرم مجھے ان علامات کی روشنی میں کسی اچھے نسخے سے مستفید فرمائیں، نوازش ہوگی۔

جواب۔ گھی تیل، مرغن اور میٹھی غذاؤں کا استعمال نہ کریں۔ نمک اور نمکین چیزیں بھی کنٹرول کریں۔ پانی زیادہ پیا کریں اور پیشاب روکا نہ کریں۔ سبزیاں اور فروٹ کا استعمال بڑھائیں۔ چہل قدمی ضرور کریں۔ جو بھی ادویات آپ کو تجویز کی جارہی ہیں وہ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کرنی ہیں۔ دل کی تکلیف جب بھی ہو Arnica200 40 نمبر کی گولیوں میں بنالیں اور حسبِ ضرورت استعمال کریں۔ Crataegus Q اور Cactus Q کے 5, 5 قطرے ½ کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ

استعمال کریں

☆......☆......☆

لیکوریا

ایمان..........کراچی

مجھے لیکوریا کی بہت زیادہ شکایت ہے۔کپڑے پر لگے تو پیلا داغ چھوڑ دیتا ہے،جسم پر لگے تو شدید خارش ہوتی ہے۔

جواب۔ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Kreosote30 کے 5 قطرے 1/2 کپ پانی میں 3 مرتبہ لیں اور Ptk 60 کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ لیں۔

☆......☆......☆

گردے کی خرابی

شاہدہ..........ٹنڈو الہیار

۱۔پیشاب میں سخت بدبو۔

۲۔تھوڑی دیر بھی پیشاب کموڈ میں رہ جائے تو سڑی ہوئی بدبو۔

۳۔ سر میں درد،بوجھ اور بھاری پن اور نیند کی کیفیت۔

۴۔مختلف دوائیں کھائیں لیکن کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔

۵۔پیشاب کم ہی ہوتا ہے لیکن بار بار۔پیشاب کرنے میں درد ہوتا ہے۔

۶۔جسم میں خارش یا دانے نہیں ہیں۔گرمی بہت لگتی ہے۔

۷۔جسم اور چہرے پہ ورم۔

۸۔بلڈ پریشر ہے۔دوا کھاتی ہوں۔کنٹرول ہے۔



۹۔السر، کبھی قبض کبھی موشن۔

جواب۔محترمہ آپ نے اپنی رپورٹس منسلک نہیں کیں۔Urine D/R,LFT وغیرہ......Renal Function test کرا کر اس کی رپورٹ بھیجیں۔فی الحال ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Ptk 89 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ اور Ptk 15 اور Ptk 16 کی ایک ایک گولی دن میں 3 مرتبہ لیں 4 ہفتے بعد رپورٹس کے ساتھ حال بتائیں۔

☆......☆......☆

ڈسمینوریا و لیکوریا

اے آر..........حیدرآباد

میں کافی عرصے سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں۔ہومیو کلینک میں اپنا مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں دوا تجویز کیجیے۔میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے کافی عرصے سے یہ تکلیف ہے ماہانہ ایام تاریخ سے 2 دن پہلے ہی آنا شروع ہوجاتے ہیں مگر ٹھیک سے نہیں آتے۔پیڑو میں بہت تکلیف ہوتی ہے جو پیچھے کمر تک ہوتی ہے،میں نے ایک سال پہلے ڈاکٹر کو بھی دکھایا تھا۔انہوں نے کہا کہ خون کی کمی ہے اور بس گولیاں دیں۔مگر مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ میرا وزن بہت بڑھ گیا،پیٹ بھی نکل آیا ہے۔اب میں کوئی دوا استعمال نہیں کر رہی ہوں۔آپ برائے مہربانی اس کا علاج بتایئے تاکہ میری تکلیف دور ہو سکے۔بہت مشکور ہوں گی۔

جواب۔بی بی غذا کو متوازن کریں چکنی و مرغن غذائیں اور میٹھی چیزوں سے پرہیز کریں۔ورزش

ضرور کریں، ہلکی ورزش چلنا ہے۔ کم از کم ایک گھنٹا ضرور ٹہلیں صبح یا شام کے وقت (صبح پارک میں یا شام کو میدان میں) مثبت سوچ اپنائیں اور اپنے ذہن کو مصروف رکھیں، اچھے کاموں کی طرف۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Puls 30 اور Borax 30 کے 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ ایک گھونٹ پانی میں استعمال کریں۔ ہر ہفتہ Calc200 کی ایک خوراک 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں لیں اور Ptk 60 کی ایک، ایک گولی دن میں 3 مرتبہ لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

☆......☆......☆

سر کا گنج

محسن نظام............لاہور

میرے سر کے بال بہت عرصے سے گر رہے ہیں جس کی وجہ سے بعض حصوں میں گنج پن پیدا ہو گیا ہے جس سے میں بہت پریشان ہوں۔

دوسرا مسئلہ وردوں کا ہے۔ میرے ہاتھ پیروں میں اکثر درد رہتا ہے۔

جواب۔ محسن، آپ نے بال گرنے کا ذکر تو کر دیا لیکن یہ نہیں لکھا کہ کب سے اور کیسے گرتے ہیں؟ نہاتے وقت، کنگا کرتے وقت یا عمومی طور پر کسی بیماری کے بعد ایسا ہوا ہے یا کسی واقعہ کے بعد۔ عمر کے ساتھ قد اور وزن بھی لکھیں تاکہ اندازہ ہو کہ آپ کتنے صحت مند ہیں۔ ہاتھ پیروں میں درد کس وقت ہوتا ہے؟ ان کو کس طرح آرام ہوتا ہے؟ لہٰذا تفصیل سے دوبارہ خط لکھیں کیونکہ تجویز نسخہ میں تشخیص کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

نسوانی خرابیاں

رمشا سلطان............اسلام آباد

میری عمر 24 سال ہے۔ مجھے آٹھ نو سال سے لیکوریا کی شکایت ہے۔ ہر ماہ ماہانہ ایام کے بعد مجھے لیکوریا ہوتا ہے۔ ماہانہ ایام پہلے ٹھیک ہوتے تھے، اب ان میں بے قاعدگی ہو گئی ہے۔ پہلے چہرے کی ٹھوڑی پر بال نہیں تھے لیکن گزشتہ دو سال سے ٹھوڑی کے نیچے گھنے بال بھی آنا شروع ہو گئے ہیں۔ لیکوریا کی وجہ سے نسوانی حسن بھی متاثر ہوا ہے۔

جواب۔ بی بی آپ نے اپنا وزن اور قد نہیں لکھا جس سے اندازہ ہو کہ آپ کی جسمانی صحت کیسی ہے، خون کی کمی کتنی ہے اور ذہنی طور پر زندگی سے کتنی مطمئن ہیں؟ گوشت، گاجر، چقندر، ٹماٹر، پالک وغیرہ زیادہ استعمال کریں اور ورزش بھی کیا کریں۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Pulsatilla30.ovatista30 ہر شیشی میں سے 5,5 قطرے ½ کپ پانی میں لیں اور Ptk 60 کی ایک، ایک گولی دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

☆☆☆